J. & K. ACADEMY ... Acc. No ... Price ... SRINAGAR.
112

تاریخ ادبیاتِ ایران

از

ڈاکٹر رضازادہ شفق

ترجمہ

سید مبارز الدین رفعت ایم۔ اے (عثمانیہ) حیدرآباد دکن

رفیقِ اعزازی ندوۃ المصنفین

Acc. No = 112

ندوۃ المصنفین اردو بازار دہلی

...c. No
Price
SRINAGAR.

سلسلہ مطبوعات ندوۃ المصنفین

(۶۱)

تاریخ ادبیاتِ ایران

از

ڈاکٹر رضا زادہ شفق

مترجمہ

سید مُبارز الدین رفعت ایم اے (جامعہ عثمانیہ) حیدر آباد دکن

رفیق اعزازی ندوۃ المصنفین دہلی

جس میں قبل اسلام ایرانی ادبیات سے لے کر صفوی اور قاچاری دَور تک کی ادبیات، شاعری اور اس کے اثرات کی مکمل تفصیل مورخانہ اور محققانہ ترتیب کے ساتھ دلپذیر قالب میں بیان کی گئی ہے

ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

فہرستِ مطالب

انڈکس

عرض مترجم

مادرِ علمی جامعۂ عثمانیہ میں میٹرک سے لے کر ایم اے تک چھ سال فارسی ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اور پھر اسی ادارہ میں کئی سال تک فارسی ادب کے معلم کی حیثیت سے میرے دل میں بار بار یہ ہوک سی اٹھتی رہی کہ اردو میں ایرانی ادبیات کی تاریخ پر ایک جامع اور متوسط حجم کی کتاب پیش کی جائے۔ ہماری زبان میں فارسی ادب پر متعدد کتابیں موجود ہیں۔ اس میں شعر العجم جیسی بلند پایہ تنقیدی کتاب موجود ہے، سخندان پارس جیسی دلکش کتاب بھی موجود ہے۔ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کے کچھ حصے بھی اردو میں منتقل ہو چکے ہیں اور دو چار کتابیں ان کے سوا اس موضوع پر اور بھی لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن کوئی ایسی کتاب میری نظر سے اردو میں اب تک نہیں گذری جو بیک وقت فارسی نظم و نثر کی تاریخ کے ساتھ ساتھ پورے ایران کی ادبیات کی بھی تاریخ ہو۔ ایسی کتاب جو عام پڑھنے والوں سے لے کر بی اے تک کے طالب علموں کے لئے مفید ہو۔ جس میں نہ ضرورت سے زیادہ پھیلاؤ ہو اور نہ ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہو۔ خیال تھا کہ ایسی ایک کتاب خود ہی تالیف کروں۔ لیکن ایسی تالیف کے لئے جس فراغت، جس اطمینان اور جن اسباب کی ضرورت ہے ان سے میں محروم ہوں۔ اتفاق کی بات ہے کچھ سال اُدھر ڈاکٹر رضا زادہ شفق کی تاریخ ادبیات ایران (بزرگ) منظر عام پر آئی۔ بڑی حد تک یہ کتاب اسی طرح لکھی گئی ہے جیسی میں لکھنی چاہتا تھا۔ خیال ہوا ان حالات میں

اسی کو اردو کے قالب میں منتقل کر دینا کچھ نامناسب نہ ہوگا۔

ڈاکٹر شفق جامعہ طہران میں فارسی ادبیات کے معلم ہیں۔ ایرانی قومیت کے احیاء کے شوق میں ان کا دامن بھی غلو کے دھبوں سے پاک نہیں، تاہم ایران کے موجودہ مصنفوں کے مقابلہ میں یہ بہت غنیمت ہیں۔ انھوں نے اوروں کی بہ نسبت زیادہ اعتدال سے کام لیا ہے۔

ہندوستان میں فارسی کی نشو ونما کو اہل ایران اپنی فارسی سے الگ ایک ہندی اسکول یا "سبک ہندی" مانتے ہیں۔ ڈاکٹر شفق نے اس "ہندی سبک" یا ہندی اسٹائل پر مختصر طور پر کچھ لکھا ہے اور بعض فارسی گو ہندی شاعروں کا حال بھی درج کیا ہے۔ تاہم یہ ہمارا کام ہے کہ اپنے اس کارنامے پر مستقل اور مفصل کتابیں لکھیں، غیروں سے اس بارے میں توقع رکھنا فضول ہے۔

مجھے امید ہے بعض کوتاہیوں کے باوجود یہ کتاب فارسی ادب پر اردو میں پڑھنے والوں کے لئے کافی مفید ثابت ہوگی اور اس ذخیرۂ ادب میں ایک اچھا اضافہ سمجھی جائے گی۔

مبارز الدین رفعت

مئی ۱۹۴۹ء حیدرآباد دکن

پہلا حصہ

قبل اسلام ایرانی ادبیات

مقدمہ

ایران قدیم میں ادب موجود تھا

قدیم ایران ایک نہایت بلند پایہ تمدن کا مالک تھا۔ اس کا اپنا رسم خط اور اپنی کتابت بھی لیکن اس دور کے اکثر علمی اور ادبی آثار طویل مدت اور دنیا کے انقلابات کی وجہ سے ناپید ہو گئے ہیں۔ اگرچہ اس زمانے کے کچھ کتبے باقی رہ گئے ہیں، اور یہی تنہا اس دعوی کے اثبات کا بین ثبوت ہیں۔ تاہم قدیم تاریخیں بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان تاریخوں کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؛

اوّل۔ یونانی ماخذ ہرمیپوس ازمیری تیسری صدی قبل مسیح کا ایک مصنف گذرا ہے۔ یہ ایران کے ہخامنشی بادشاہوں کا ہم عصر تھا۔ اس نے ایک ایرانی کتاب کا ذکر کیا ہے جس سے اس کا مقصود اوستا ہے۔ ہروڈوٹ نامی یونانی مورخ نے اپنی کتاب اول کے دسویں باب میں لکھا ہے کہ پادشاہ ماد (دیاکو) ———— باختری ایران کا شمالی حصہ ———— اپنے سامنے ہر ایک کے مقدمے سنتا اور خود فیصلہ کرتا ہے۔ اس شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ممالک ایران میں دادرسی کا انتظام موجود تھا۔ کتزیاس یونانی اردشیر کے دربار کا حکیم تھا۔ اس نے جو کتاب ایران سے متعلق تالیف کی ہے اس میں اس نے ایرانی دربار

کے روز ناموں سے استفادہ کیا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں واقعات کو خاص درباری روزناموں میں درج کیا جاتا تھا۔

کسنرنفن نے بھی اپنی کتاب "پرورش کوروش" میں ایران میں مدارس اور تعلیم و تربیت کے وجود سے بحث کی ہے اسی طرح حکیم افلاطون، مورخ پلوٹارک اور دوسرے لوگوں نے بھی اسی طرح کی باتیں لکھی ہیں ؛

دوم۔یہودی ماخذ توراۃ میں ایرانی دربار کے تاریخ ناموں کا ذکر آیا ہے اور صراحت کے ساتھ ان کا حال بیان کیا گیا ہے۔ توراۃ کا یہ حصہ خود ہخا منشیوں کے زمانے میں تالیف ہوا ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں پارسیوں اور مادیوں کے قوانین کا کئی بار ذکر آیا ہے ؛

سوم۔اسلامی ماخذ اسلام کی ابتدائی صدیوں کی تاریخی کتابوں میں جیسے تاریخ طبری، مسعودی حمزۂ اصفہانی، کتاب اغانی، کتاب فہرست اور دوسرے مصنفوں کی کتابوں میں ایران قدیم کی بہت سی کتابوں کا ذکر آیا ہے اور ان کا نام لیا گیا ہے ؛

چہارم۔ایرانی ماخذ اوستا کے جو حصے اس وقت موجود ہیں ان کے مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں اوستا موجودہ اوستا سے کہیں زیادہ ضخیم تھی اور قدیم ایران میں مختلف علوم اور دین سے متعلق کئی کتابیں موجود تھیں ؛

ان نقلی دلیلوں کے سوا عقلی دلیلوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایران جیسی زبردست مملکت، جس نے کوروش اور داریوش جیسے بادشاہ پیدا کئے شہری اور فوجی تمدن کو درجۂ کمال پر پہنچایا تھا۔ اس نے ان مسائل کو ضبط تحریر میں لانے پر اتنا زور دیا کہ انھیں کتبوں پر بھی کندہ کرایا یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں وہ لکھنے پڑھنے سے نابلد ہوگی اور اس کی اپنی کتابیں اور اپنا ادب نہ ہوگا ؛

زبان کی ابتداء اور ارتقاء

علماء نے انسانی بولی کے بارے میں جو تحقیقیں کی ہیں اس سے ابھی تک قطعی نتائج حاصل نہیں ہو سکے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ابتداء میں انسان دنیا کے کسی ایک خطہ میں پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ دوسرے مقاموں پر منتقل ہوا یا کئی ایک مقاموں پر پیدا ہوا۔ پہلے مفروضہ کے لحاظ سے دنیا کی تمام زبانوں کی اصل ایک ثابت ہوتی ہے، کیونکہ کسی وقت تمام قومیں یکجا ہوں گی اور ایک گروہ کی صورت میں رہتی ہوں گی۔ دوسرے مفروضہ کی رو سے آج سے ہزاروں لاکھوں سال پہلے طرح طرح کی بولیاں وجود میں آئیں۔ اصل کے لحاظ سے یہ ایک دوسرے سے بالکل الگ تھیں۔ اس وقت دنیا میں جو سینکڑوں بولیاں بولی جاتی ہیں ان میں سے چند ہی ایسی ہیں جو ایک اصل سے تعلق رکھتی ہیں۔ بہر حال نہ پہلے مفروضہ کے قطعی ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے اور نہ دوسرے مفروضہ کا یقینی ہونا تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ زبان کی ابتداء اور اس کے آغاز کے بارے میں علماء السنہ نے جو تحقیقاتیں کی ہیں اور جو نظریئے بیان کئے ہیں وہ بڑے اہم ہیں۔ ان نظریوں میں سے ایک نظریہ بطور مثال یہاں پیش کیا جاتا ہے یہ نظریہ زبانوں کی ترقی اور ان کی کاملیت کے لحاظ سے ان کی تقسیم کا نظریہ ہے۔ اس نظریہ کی رو سے ابتداء میں زبان سادہ تھی اور سادہ اور سطحی معنیٰ کے بیان تک محدود تھی۔ اس کے بعد بتدریج اس میں طرح طرح کے کلمے بننے شروع ہوئے اور معنیٰ میں اور گہرائی پیدا ہوتی گئی اس نظریہ کی بنیاد موجودہ زبانوں کی تاریخ کے مطالعہ پر رکھی گئی ہے۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جتنی انسانی

بولیاں موجود ہیں ان کے بارے میں قیاس ہے کہ ان کو اپنی موجودہ حالت تک پہنچنے کے لئے تین ارتقائی منزلیں طے کرنی پڑی ہیں اور ہمارے زمانے میں بھی اس کے ہر ارتقائی منزل کے نمونے موجود ہیں۔ پہلی منزل یک رکنی زبان (Monosyllabic Language) کی ہے۔ اس منزل میں عام کلمہ بالکل خام حالت میں ہوتا ہے۔ اس میں صرف ایک ہی رکن پایا جاتا ہے یعنی مرکب اور کئی رکنی کلمہ کا وجود پایا نہیں جاتا۔ ان کلموں کے معنی بہت مختصر اور بعض وقت تو مبہم ہوتے ہیں سابقے اور لاحقے کا وجود نہیں ہوتا۔ الفاظ اپنی خام یا ریشے کی حالت میں ہوتے ہیں یعنی اصل کلمہ پر کوئی چیز بڑھائی نہیں جاسکتی اور یہ ریشے باہم ترکیب نہیں پاتے جن سے نئے معنی پیدا کئے جائیں اس لئے جملہ بنانے میں ان ہی اصل کلموں یا ریشوں کو الگ الگ کسی ترکیب کے بغیر کہنا پڑتا ہے۔ انسانی بولی کا اپنی ابتدائی منزل میں یہی حال تھا اور بعض زبانیں اسی حالت پر قائم ہمارے زمانے تک چلی آئی ہیں ایسی زبانوں میں مشہور زبانیں چینی، انامی سیاسی، اور برمی زبانیں ہیں۔

دوسری منزل پیوندی زبان کی منزل ہے۔ اس منزل میں کلمے یا حقیقت میں زبان کے ریشے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح ایک سے زیادہ ریشے آپس میں مل کر معنی دیتے ہیں اور اپنے اصلی معنی میں تنوع یا تبدیلی یا وسعت پیدا کر دیتے ہیں یوں نئے نئے کلمے اور طرح طرح کے معانی پیدا ہونے لگے۔ ظاہر ہے یہی صورت زبان کی ترقی کی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ گوناگون ترکیبوں سے گوناگون معانی بیان کئے جاسکتے ہیں۔ موجودہ زبانوں میں جو زبانیں اس منزل میں ہیں ان میں جاپانی، کوریائی، ارالی، آستائی (یعنی معنولی اور اس کی قسمیں، فن لنڈ کی زبان، مجاری، ترکی اور افریقہ کی بعض قدیم زبانیں شامل ہیں

تیسری منزل زبان منصرف کی منزل ہے۔ یہ منزل تینوں منزلوں میں سب سے زیادہ ارتقائی منزل ہے۔ اس منزل میں زبان کے ریشوں کی بناوٹ اور ان کی شکل میں تبدیلیاں پیدا ہوجاتی ہیں اس طرح گوناگوں ترکیبیں نہایت آسانی کے ساتھ وجود میں آسکتی ہیں یعنی

آسانی کے ساتھ ان کو منصرف کیا جا سکتا ہے اور انھیں مختلف شکلوں میں ڈھال کر ان سے گہرے اور وسیع مطالب و معانی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ متمدن دنیا کی مشہور زبانیں جو اس منزل میں ہیں ان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک گروہ ہند واروپائی یا آریائی کہلاتا ہے اور دوسرا سامی ؀

ہند واروپائی کا عنوان اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس گروہ کی زبانوں کی وہ مشترک اصل جو کسی وقت ایک مرکز میں بولی جاتی تھی وہی تھی جس سے ہند واروپائی زبانیں نکلی ہیں اس مشترک اصل زبان کو آریائی زبان بھی کہا گیا ہے کیونکہ ہند قدیم کی کتابوں کی رو سے آریا یا آری اس اولین قوم کا نام ہے جس کی یہ زبان تھی اور وہ اپنی پیدائش کے دو ہزار سال بعد اپنے اصلی مسکن سے ہجرت کر کے اور کئی ملکوں کے علاوہ ہندوستان بھی آئی تھی۔ آریاؤں کے مسکن کے بارے میں بھی عالموں کے نظریوں میں اختلاف ہے۔ بعض اسے ہندوستان اور بعض مشرقی ایران قرار دیتے ہیں۔ غالباً ایران کا لفظ بھی جو اپنی قدیم شکل میں ایریانہ اور آریانہ (یعنی آریاؤں کا مسکن) تھا، اسی دور کی یادگار ہے۔ لیکن بہت سے علماء کے نزدیک ہند واروپائی زبان کا اصلی وطن یورپ کا شمالی اور دریائے ڈینیوب کے آس پاس کا علاقہ ہے۔ یہ قوم حضرت عیسیٰؑ سے دو ہزار سال پہلے یہاں سے جنوب میں یعنی بحر سفید (ابیض) کے سواحل اور مشرق میں ایران اور ہندوستان میں ہجرت کر گئی۔ اس لحاظ سے ہند واروپائی زبانیں اسی قوم کی زبانیں ہیں اور آریائی زبانوں کا اطلاق بیشتر ایرانی اور ہندی گروہ کی زبانوں پر ہوتا ہے۔

سامی زبانوں کی اصل جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی خطہ میں پیدا ہوئی، پھر قوموں کی ہجرت کے ساتھ ساتھ یہ شمال میں آئی اور ایشیائے کوچک اور بحیرۂ اوقیانوس کے ساحلوں پر پروان چڑھی، سامی گروہ کی مشہور زبانوں میں بابلی، سریانی، عبری یا عبرانی، حمیری یا جنوب کی عربی الامی، فنیقی، حبشی، اور عربی زبانیں شامل ہیں۔

۲۔ خط کی ابتداء اور ایرانی خطوں کا آغاز ظاہر ہے ابتداء میں انسان لکھنے پڑھنے سے بالکل
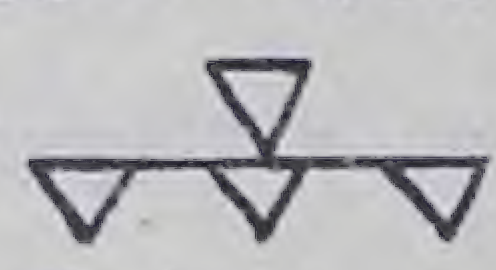
ناواقف تھا، اس کے پاس کوئی خط نہ تھا، اپنا مطلب سمجھانے کے لئے بس اسے اپنی اسی ٹوٹی پھوٹی زبان سے کام لینا پڑتا تھا جو اس وقت بہت ناقص اور بڑی محدود تھی۔ انسان نے لکھنا کب سیکھا یہ تو ٹھیک معلوم نہیں لیکن اتنا تو اچھی طرح معلوم ہے کہ انسان کی پہلی تحریر بڑی سادہ اور بچوں جیسی تھی دیکھنے میں بڑی بھونڈی اور بڑی بھدی۔ اس میں چیزوں کی تصویر کھینچ کر اپنا مطلب بیان کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ایسے خط کو "تصویری خط" کہتے ہیں اب بھی بعض قومیں اسی منزل میں ہیں۔ ہم ذیل میں آلاسکا کی قدیم اور نیم وحشی قوم کا خط مثال کے طور پر درج کرتے ہیں۔ یہ خط لکڑی کی تختیوں پر کندہ ملا ہے۔
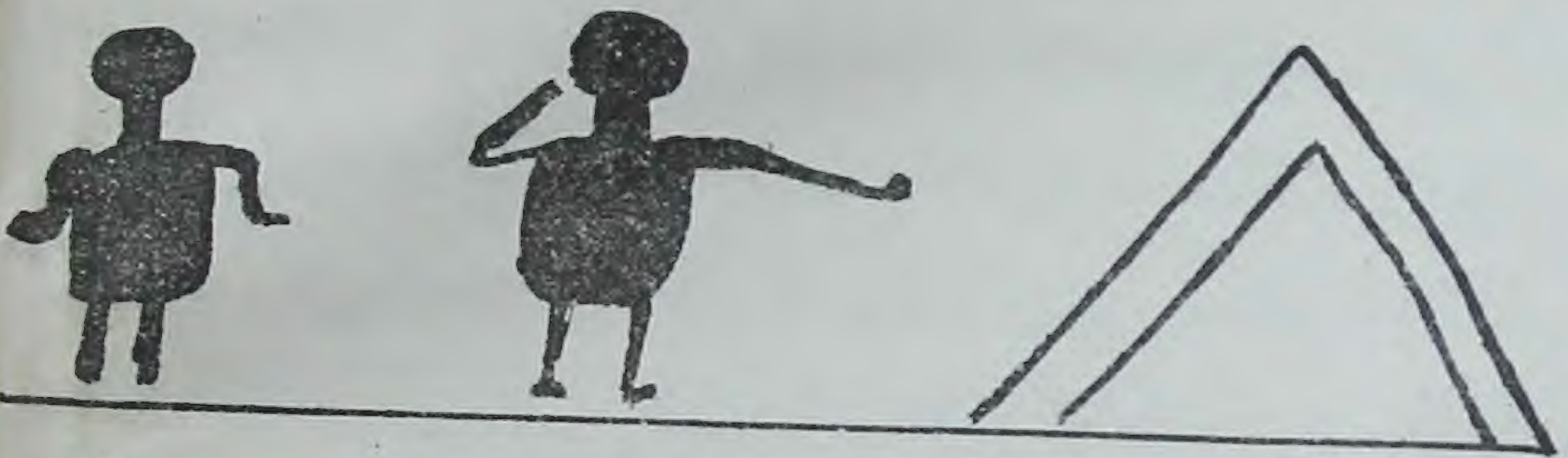
اس تصویر میں لٹکے ہوئے خالی ہاتھ قدیم قوموں کے پاس ناداری اور پریشانی کے ہیں دوسری تصویر میں ایک آدمی ایک ہاتھ منہ پر رکھے ہے اور ایک ہاتھ سے خیمہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ چادر خالی ہے اور اس میں کھانے کی کوئی چیز نہیں۔ گویا اس تصویر میں قحط کی طرف اشارہ ہے۔ ظاہر ہے پوری تصویر معین کلموں میں مقید نہیں اور ہر دیکھنے والا اس کو پڑھ لے سکتا ہے اور اس کا مفہوم یہی ہوگا کہ کھانے کی چیزیں نایاب ہیں۔ اس طرح کے خط کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ لکھنے والے کو ایک خط لکھنے کے لئے سینکڑوں تصویریں کھینچنی پڑتی ہیں۔ پھر غیر مرئی یا بے جسم محسوسات جیسے محبت، خلوص اور لطف و کرم کا اظہار بھی ممکن نہیں اور کامل مرکب جملے بھی لکھے نہیں جا سکتے۔

ظاہر ہے ایسا خط صنعت کی ترقی اور انسانی فکر کے راستے میں حائل رہا، وہ انسان کی

روز بروز کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے خط میں بتدریج تبدیلیاں ہونے لگیں۔ آہستہ آہستہ تصویریں سادہ ہونے لگیں، یہاں تک کہ چیزوں کا پورا پورا نقش غائب ہوتا گیا اور اس کی صرف علامت باقی رہ گئی اور لوگوں کے نزدیک ان علامتوں کے معنی معین ہو گئے۔ اس طرح ہر تصویر کی جگہ ایک علامت نے لے لی۔ مثلاً ہمارے پاس بھی دو چھوٹے متقاطع افقی اور عمودی خط جمع کی علامت ہے۔ یہ جمع کرنے کی تصویر نہیں اور نہ لفظ ہے جو پڑھا جائے بلکہ صرف علامت ہے۔ اسی طرح تصویری خط میں بھی ہر مفہوم کے لئے ایک علامت مقرر ہو گئی۔ مثلاً قدیم آسوری مملکت میں تین عمودی میخوں کے اوپر ایک چوتھی میخ کی علامت جیسی کہ اس شکل میں دکھائی گئی ہے ▽▽▽ بیجوں کی علامت تھی، اصل میں سنبل کی شکل تھی جیسی کہ یہ شکل ہے ⫸ اس طرح خط تصویری کی منزل سے گذر کر علامت نویسی کی منزل میں داخل ہوا، اور ہر تصویر کے لئے ایک علامت مقرر ہو گئی اس قسم کے خط کو علماء نے تصویر فکر یا فکر نگاری (IDEOGRAMME) کا نام دیا ہے

خط کی ترقی کی تیسری ارتقائی منزل ابجد کی ہے۔ ابجدی الفاظ اصل میں فنیقی زبان سے آئے ہیں۔ فنیقیوں نے ہر حرف کو ایک ایک جانور یا ایک ایک چیز کے نام کی پہلی آواز کے برابر مقرر کیا۔ اور اس اسم کو وہ حرف دے دیا۔ اس طرح پہلے حرف کو الف قرار دیا جس کے معنی فنیقی زبان میں بھینس کے ہیں اس کی پہلی آواز جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں (ا) تھی۔ دوسرا حرف انھوں نے (بت) قرار دیا، جو عربی لفظ بیت کی اصل ہے اور گھر کے معنی دیتا ہے "الفابت" یا الفباد کی اصطلاح ان ہی دو فنیقی لفظوں سے بنی ہے اسی طرح دوسرے حرف بھی اسی ترتیب سے بنائے گئے۔ یونانیوں نے فنیقیوں سے یہ حروف سیکھے اور فنیقیوں کی ترتیب کے مطابق ان کا نام "الفابتا" رکھا۔

الفبا کی اہمیت اور اس کی افادیت ظاہر ہے۔ کیونکہ الفبا کا حرف ایک نہ ایک انسانی آواز یا تلفظ کا نمائندہ ہے۔ چونکہ تمام انسانی آوازیں چالیس پچاس سے بڑھ کر نہیں۔ اس لئے

ہزاروں تصویروں یا علامتوں کی جگہ انسان کے لئے بس تیس سے لے کر پچاس حرفوں کا یاد کر لینا کافی ہے اور تمام کلموں کو وہ ان سے لکھ سکتا ہے۔

اس مقدمے کے بعد جو اہم بات ہم سمجھانا چاہتے ہیں اور جس کا جاننا ہمارے لئے ضروری ہے اور بڑی قدر و قیمت رکھتی ہے، یہ ہے کہ ایران والوں نے حضرت عیسیٰؑ سے تین ہزار سال پہلے یعنی ماد بادشاہوں کے دور میں بابل کا میخی خط اختیار کیا جو فکر نگاری کی منزل میں تھا اور ابھی الفبا کی منزل میں داخل نہ ہوا تھا۔ ایرانیوں نے یہ خط اختیار کر کے اپنے طور پر فنیقیوں کی طرح حروف ہجا ترتیب دے۔ یہ بات ایرانیوں کی ہوش مندی، اور علم و ادب میں ان کی ذکاوت و ذہانت کی ایک بڑی دلیل ہے اور تمدن اور انسان کے ارتقا کی تاریخ کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے

میخی خط

میخی خط کو اس لئے یہ نام دیا گیا ہے کہ قدیم انسان کے پاس لکھنے کا کافی سامان نہ تھا اس لئے وہ لوہے یا لکڑی کی کیل سے مٹی کی تختیوں پر تحریر نقش کر دیتا تھا۔ اس خط کی شکل میخ سے ملتی جلتی تھی۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں یہ خط بھی ابتدا میں تصویری، پھر علامت نگار پھر فکر نگار اور آخر میں حرف نگار بنا۔ ایرانی میخی خط دوسرے تمام میخی خطوط جیسے بابلی وغیرہ سے سادہ تر اور صحیح تر ہے کیونکہ ایران کے عالموں نے نہ صرف بابل کی فکر نگاری کو ابجدی حروف میں تبدیل کر دیا بلکہ ان کی شکل بھی اور آسان کر دی انھوں نے ٹیڑھی میڑھی پیچیدہ میخوں کو ترک کر دیا اور صرف عمودی اور افقی میخوں کو اختیار کر لیا یہ اصلاح بہت بڑی اصلاح تھی۔

تمام ہخامنشی سنگین کتبے اسی میخی خط میں ہیں۔ اس خط کے حروف ابجد (۳٦) ہیں اور ان کی ترتیب یہ ہے:-

ان حروف کا تلفظ :

جی (۱۱)	جا (۱۰)	چا (۹)	خا (۸)	گو (۷)	گا (۶)	کو (۵)	کا (۴)	اُ (۳)	اِ (۲)	آ (۱)

۲۰	۱۹	۱۸	۱۷	۱۶	۱۵	۱۴	۱۳	۱۲	۱۱	۱۰
فا	؟	با	پا	دو	دی	دو	تو	تا	جی	جا
۳۱	۳۰	۲۹	۲۸	۲۷	۲۶	۲۵	۲۴	۲۳	۲۲	۲۱
لا	رو	را	وی	وا	یا	مو	می	ما	نو	نا
						۳۶	۳۵	۳۴	۳۳	۳۲
						ھا	ورا	شا	زا	سا

توضیح : ۱- اوپر جو حروف ممدود لکھے گئے ہیں وہ بعض جگہ مقصور بھی پڑھے جاتے ہیں جیسے اِ اُ کَ . . . الخ

۲- ان (۳۶) حرفوں کے سوا ایک تیڑھی میخ بائیں سے دائیں بنائی جاتی ہے۔ یہ خط فاصل کی علامت ہے۔ اس کے سوا ایرانی میخی خط میں پانچ فکر نگاری علامتیں بھی ہوتی ہیں ایک لفظ شاہ (خشایشیہ) کے لئے ایک لفظ بادشاہ (دھیو) کے لئے، ایک زمین (بومی) کے لئے اور ایک علامت لفظ خدا (اھورمزدہ) کے لئے ؛

۳- ثا یا ث کا تلفظ عربی حرف ث جیسا ہی ہے۔

۴- درا یا درہ ایک حرف شمار ہوتا ہے اور اصل میں ذالی ہے، جس میں رَ کی خفیف سی

آواز بھی مدغم ہوتی ہے۔ اس کا تلفظ سیر یا ثرِ بھی لکھا ہے :

اب مثال کے طور پر ہم قدیم فارسی کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں جو میخی خط میں لکھا گیا ہے۔
یہ داریوش کے ایک کتبے سے لیا گیا ہے جو تخت جمشید پر کندہ ہے :

ان الفاظ کا تلفظ اور معنیٰ :

دارَیواوش خشاَیشیَه وَزرْکَ خشاَیشیَه
خشاَثیاناَمْ خشایثیه دَهیوُ ناَمْ هشتنا سپُهیا
یُوشَرَ ھخامنشیاهیِ اِمَمْ تچَرَمْ اَکنَوُش[۱]

داریوش شاہ بزرگ شاہ شاہان شاہ کشورہا ردیدھا، پسر گشتاسب ہخامنشی نے یہ قصر بنوایا۔

اوستائی خط میخی خط کے سوا ایرانی ایک اور خط بھی استعمال کرتے تھے۔ ایرانیوں نے یہ خط بھی سامی خط سے لیا ہے۔ غالباً اسی عہد میں جب کہ پتھر پر کندہ کرنے کے لئے میخی خط استعمال ہورہا تھا یہ خط ہاتھ سے لکھنے کے لئے استعمال کیا جارہا تھا۔ ایران قدیم کی مذہبی کتاب اوستا اسی خط میں لکھی گئی ہے۔

اوستا اب جس خط میں لکھی جاتی ہے اس کی اصل پہلوی ہے۔ اور یہ بھی قدیم ہاتھ سے لکھے جانے والے خط کی یادگار ہے۔

یہ خط بھی دوسرے بیشتر سامی اصل کے خطوں کی طرح بائیں سے دائیں لکھا جاتا ہے۔ اس خط میں مجموعی طور پر (۴۴) حروف ہوتے ہیں اور ایرانی عالموں نے چھٹی صدی عیسوی کی ابتدا میں پچھلے ناقص حروف ابجد پر اس کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے حروف کو نئی شکل دی اور اس پر اعراب کا اضافہ کرکے اسے مکمل کیا۔ پہلوی ابجد کے ناقص حروف میں اعراب، حروف میں داخل ہیں اور اس میں بعض حرفوں کو کئی طرح پڑھا جاسکتا ہے اوستائی ابجد میں تمام آوازیں اور اعراب حروف میں داخل ہیں اس لئے اس زبان کے پڑھنے اور لکھنے میں تلفظ کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اس مکمل ابجد کی ترتیب اس زمانے کے ایرانیوں کی ہوشمندی اور ذکاوت کی

---

[۱] تچر وہی لفظ ہے جو اب بھی تچر کہلاتا ہے۔ تچر: قصر، دستائی (برہان قاطع)، ای، یا ہی موصول ہے، اکنوہم ای گوئیم: خدا (ای) کہ یا حسند ائیکہ۔

دلیل ہے. ذیل میں ہم اوستائی ابجد درج کرتے ہیں :

۱ اَ ۔ ۲ آ ۔ ۳ اِ ۔ ۴ ای ۔ ۵ او (چھوٹا) ۔ ۶ اد ۔ ۷ اِ (کلمہ کے بیچ میں)

۸ اِ ۔ ۹ اِ (طویل) ۔ ۱۰ اُ ۔ ۱۱ اُو (طویل) ۔ ۱۲ آو ۔ ۱۳ اَن ۔ ۱۴ اَ (غنہ کے ساتھ)

۱۵ ک ۔ ۱۶ ح ۔ ۱۷ خُو ۔ ۱۸ گ ۔ ۱۹ غ (گہ) ۔ ۲۰ اَنگ (غنہ کے ساتھ) ۔ ۲۱ چ ۔ ۲۲ ج

۲۳	۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰	۳۱
ز	ژ	اَنگ	ت	ش	د	ذ	ن	پ
۳۲	۳۳	۳۴	۳۵	۳۶	۳۷	۳۸		۳۹
ف	ب	و	م	ی	ی	ی (چھوٹی)		ر
۴۰			۴۱			۴۲	۴۳	۴۴
و (کلمہ کی ابتدا میں)			و (کلمہ کے وسط میں)			س	ش	ش
۴۵	ھ							

توضیح :

۱- ۳۶ اور ۳۷ دو شکلوں کا ایک حرف ہے اور (ی) ہے۔

۲- لبعض حروف بظاہر ہم شکل ہیں انھیں ترتیب کے لحاظ سے پہچانا جا سکتا ہے۔

اب ہم ذیل میں اوستا کے متن سے ایک جملہ نقل کرتے ہیں، اس کا تلفظ اور اس کے معنی ہم آئندہ صفحوں میں پیش کریں گے :

پہلوی خط

لفظ پہلوی کے بارے میں جو تحقیقات کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کی اصل پَرتَوْ ہے جو اشکانی قوم کا نام ہے۔ اس لفظ میں پہلے "ت" بدل کر "ل" ہو گیا اور یہ لفظ پَلْثَوْ ہو گیا۔ پھر "ث" بدل کر "ھ" ہو گیا اور یہ لفظ پَلْھَوْ بن گیا۔ اس کے بعد اس لفظ میں پھر تبدیلی ہوئی اور یہ پلہو سے پَہْلَوْ ہو گیا اور اس پر نسبتی "ی" کے بڑھانے سے پہلوی کہلایا۔ یہاں اس لفظ سے وہ رسم خط اور وہ زبان مراد ہے جو اشکانی اور خاص طور پر ساسانی دور میں ایران کی زبان تھی۔ پہلوی خط آرامی خط سے جو سامی خطوں میں شامل ہے، لیا گیا ہے۔ یہ خط دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے۔ قدیم اوستائی خط بھی، جو اب ناپید ہو گیا ہے، غالباً اسی خط سے ملتا جلتا تھا جو کچھ ساسانی کتبوں اور زردشتی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلوی خط کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو قدیم خط یا خط کِلدہ کہتے ہیں یہ خط کتبوں کے سوا اور کہیں باقی نہیں رہا۔ دوسرے کو کتابی ساسانی یا پہلوی خط کہتے ہیں۔ بیشتر ساسانی آثار اور خاص کر پہلوی کتابیں جو اس وقت موجود ہیں اسی خط میں لکھی ہوئی ہیں۔

پہلوی رسم الخط کی اور خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس خط میں سامی زبان کے بہت سے الفاظ لکھے جاتے ہیں اور فارسی میں پڑھے جاتے ہیں۔ جیسے ہم اس علامت "ـــ" کو جو عربی کا عشر ہے لکھتے اور "دس" تلفظ کرتے ہیں، اسی طرح پہلوی میں (مثلاً) "ملکان ملکا" لکھتے اور شاہنشاہ پڑھتے ہیں۔ پہلوی کے اس طرز کو جس میں سامی الفاظ لکھے اور فارسی میں پڑھے جاتے ہیں "ہزوارش" کہتے ہیں۔

پہلوی ابجد کی ترتیب حسب ذیل ہے:

ان حروف کا تلفظ :

۱	۲	۳	۴	۵	۶
ا، آ، ھ، خ	ب	ق	ک	د	لفظ کے آخر میں ھ کی آواز

۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳
ن، و، ر، ل	ز	ی، د، گ، ج	ک	غ	ر، ل	م

۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸
س	چ، ج	پ، ف	ش	ت

توضیح :

اوپر جو حروف دیئے گئے ہیں ان کے سوا بھی کچھ حروف بعض پہلوی کتابوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اسی طرح نمبر ا، ۹، اور ۱۲ وغیرہ کے تلفظ سے ظاہر ہے کہ ایک حرف کئی آوازوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے پہلوی ابجد مشکل ترین ابجد ہے۔

ذیل میں کتاب کارنامک اردشیر بابکان کی ایک عبارت پہلوی خط میں درج کی جاتی ہے:

اوپر کی عبارت کا تلفظ :

پون کار شَمَکْ ای ارتخششیری پاپکان ایتُون نپشتْ یَقُو لیمُوْنْتْ اَیْکْ مَرکْ ای اِلکساندرْ اَرو مَیلکْ اَیْران شَتَرْ ۲۰۰ او ۴۰ کُوتکْ خوتائیْ بَهُوْنْتْ

(۲) اس عبارت کو اس طرح بھی پڑھا جا سکتا ہے :

پہ کارنامکی ارتخششیری پاپکان ایتون نپشت اِستاذْکو پس ھیچ مَرْگی اَلِکساندر اَرُوَمیلکْ اُیراَنشتر دوبیست وچھل کُوْتکْ خدائی بود -

(۳) موجودہ فارسی میں اس کو اس طرح پڑھا جائے گا :

بکارنامہ اردشیر بابکان چنین نوشتہ (است) کہ پس از مرگ اسکندر رومی ایران شہر دویست وچھل کدخدائی بود (دوسو چالیس کا عدد ہندسوں میں لکھا گیا ہے ۔)

ساسانی دور کے آخر میں ایرانی عالموں نے ناقص پہلوی خط کو مکمل کیا اور جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، اوستائی خط ایجاد کیا ۔

۳۔ قدیم ایران کی زبان

قدیم ایران کی زبان کا رشتہ اور تعلق

قدیم ایران کی زبان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اس سے یہ واضح ہے کہ یہ زبان منصرف زبانوں میں شمار کی جاتی ہے اور اس کا تعلق ہند و ارو پائی زبان سے ہے جس سے دنیا کی اور بہت سی مشہور زبانیں نکلی ہیں ۔ اس لحاظ سے متمدن دنیا کی مشہور ترین زبانوں سے جیسے سنسکرت، یونانی لاطینی، ٹیوٹانی، اسکنڈنیائی اور سلافی زبانوں سے اس کا گہرا تعلق ہے ۔ قدیم ایران کی کئی شاخیں ہیں ۔ ان میں مشہور ترین زبان تو وہ ہے جو ہخامنشی دور کی پرانی پارسی کہلاتی ہے ۔ اس زبان میں

بادشاہوں نے اپنے نامے اور کتبے لکھے ہیں جو ہخامنشی دور سے باقی چلے آرہے ہیں۔ دوسری زبان اوستائی ہے جس میں زرتشت کی مذہبی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ گویا یہ زبان خاص طور پر مذہبی پیشواؤں کی حد تک محدود تھی۔

السنہ کے ماہر عالموں نے ہند وارو پائی زبانوں کی پیدائش اور ان کے آپس کے تعلق پر کافی تحقیق کی ہے۔ انھوں نے مختلف حیثیتوں سے ان زبانوں کے شجرے بنائے ہیں۔ ہم ذیل میں ان زبانوں کا ایک ایسا شجرہ پیش کرتے ہیں جو عام طور پر مسلم سمجھا جاتا ہے:

اس نقشے کے مطابق تمام ہند واروپائی زبانیں اپنی صرف و نحو کی خصوصیات کے لحاظ سے دو بڑی شاخوں میں بٹ جاتی ہیں۔ دونوں میں اختلاف کی مثال کے طور پر سنٹ (سو CENT) کے لفظ کو انتخاب کیا گیا ہے جن زبانوں میں اس لفظ کو (ن) کے بغیر پڑھا جاتا ہے انھیں ایسی زبانوں سے الگ کر دیا گیا جن میں اس لفظ کا تلفظ (ن) کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مثلاً اس عدد کا تلفظ سنسکرت میں سَتِم، فارسی میں سد (صد) اور روسی میں اِسْتو کیا جاتا ہے۔ لاطینی میں اس کا تلفظ سِنْتم یا کنتُم ہے، فرانسیسی، انگریزی، جرمنی اور اس گروہ کی دوسری زبانوں میں اس کا تلفظ (ن) کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ایک شاخ کو سَتِم اور دوسری کو کنتُم کا نام دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں سنٹ (سو = CENT) کا لفظ صرف نمونہ اور مثال کے طور پر لیا گیا ہے۔ ورنہ ان دونوں شاخوں کی زبانوں کی صرف و نحو میں بہت سے اختلافات موجود ہیں۔

قدیم پارسی

قدیم پارسی کے آثار میں سے اب چند کتبوں، اور ظروف، آلات، ترازو کے پتھروں اور نگینوں پر کچھ تحریروں کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ السنہ کے ماہر عالموں کی تحقیق یہ ہے کہ ان تمام باقیات میں چار سو سے زیادہ اصلی الفاظ نہیں ملتے۔ یہ تحریریں جو بیستون، الوند، استنجر، شوش ایشیائے کوچک اور مصر میں ملی ہیں، ہخامنشی بادشاہوں کے فرمان ہیں اور میخی خط میں پتھر پر کندہ کئے گئے ہیں۔ ان میں بادشاہوں کے نام ہیں۔ ان کے خاندان کا ذکر ہے۔ ان کے زیر فرمان ملکوں کی تفصیل ہے۔ ان کی فتوحات اور کارناموں کا تذکرہ ہے۔ یزدان پاک کی تعریف اور جھوٹ اور ناپاکی کی مذمت لکھی ہے۔ ان میں سب سے بڑا کتبہ بیستون میں داریوش کا ہے۔ اس کتبے میں تقریباً چار سو سطریں ہیں۔ ہر سطر میں (۵۰) حرف ہیں، ہر حرف تین سے لے کر پانچ میخی علامتوں سے مرکب ہے۔ اس طرح اس کتبے میں تقریباً پچھتر ہزار میخی علامتیں ہیں۔

داریوش نے اس کتبے میں اپنے وہ کارنامے بیان کئے ہیں جو اس نے سرکشوں اور سلطنت کے مدعیوں کی سرکوبی اور امن و عدل قائم کرنے کے سلسلہ میں انجام دئے تھے۔ کتبے میں اس نے اپنی سلطنت کے تمام ملکوں کا نام لیا ہے۔ اھورمزد بزرگ کی حمد اور تعریف کی ہے اور ہر قسم کے جھوٹ اور ناپاکی کی برائی کی ہے داریوش کے کتبے سے پہلے اس کے دادا اریارمنہ اور کورش اعظم کے بھی ایک دو سطری کتبے موجود ہیں۔ اس طرح داریوش کے بعد کے بادشاہوں نے بھی یعنی خشیارشا، اردشیر اول، اردشیر دوم، کوروش خرد، اور اردشیر سوم نے بھی اپنے کتبے میخی خط میں لکھوائے

ہیں۔ ان میخی کتبوں میں بہترین کتبے تخت جمشید، نقش رستم، نقش رجب، دشت مرغاب کرمانشاہ سے قریب کوہ بیستون، ہمدان سے قریب کوہ الوند میں واقع ہیں۔ ایران سی باہر وان اور نہر سوئز کے قریب داریوش کے کچھ کتبے ملے ہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں ان میں سب سے اہم اور سب سے مفصل بیستون اور تخت جمشید کے کتبے ہیں۔

یہاں ہم مثال کے طور پر بیستون اور تخت جمشید کے کتبوں کے جملے نقل کرتے ہیں۔ ان پر اتنا طویل زمانہ گذر جانے کے باوجود اب بھی ہماری موجودہ زبان کے الفاظ کے ساتھ ان الفاظ کی مشابہت نمایاں ہے:

اَدَمْ دَارَیَوَاوُشْ خشایَثْیَہ وَزَرْکَہ خشایَثْیَہ پارْسہ ای خشایَثْیَہ دَھْیوُ نامْ وِیشتا سْپَھِیا یُوثْرُ اَرْشامھیا پنا ھَخا مَنِشْیَہ

من داریوش ہستم شاہ بزرگ شاہ شاہان شاہ پارس شاہ ممالک پسر گشتاسب نوہ ارشامہ ہخامنشی۔

ثَتی دارَیوَاُوشْ خشایَثْیَہ مَنا پِیتا وِیشْتاسْپَہ وِیشْتا سْپھیا پِیتا اَرْشامَہ اَرْشامِھیا پِیتا اَریارامْنَہ اَرْیارَا مْنَھیا پِیتا چیَشْپِشْ چیَشْپَاِیشْ پِیتا ھَا خَامِنِشْ

گوید داریوش پادشاہ پدر من گشتاسب است پدر گشتاسب ارشامہ پدر ارشامہ اریارامنہ پدر اریارامنہ چیشپش ہخامنش۔

نقش رستم کے ایک کتبے سے:

بَغَہ وَزَرْکَہ اَوْرَ مَزْدَا ھَی اِیمَمْ بومیمْ اَدَا ھَی اَوَمْ اَسْمانَمْ اَدَا ھَی مَرْتیَمْ اَدَا ھَی شِیا تِیَمْ اَدَا مَرْتِیَھِیا۔

خدای بزرگ است اورمزد آنکه این بوم (زمین) را آفرید آنکه آن آسمان را آفرید آنکه انسان را آفرید آنکه شادی را آفرید برای انسان ۔

تالی دارَیوَتوُش خشایثیه اَوَهیرادی آوَرَمَزدَا اُوپستامْ
آبَرَ اُوتا اَنیاهَه بغاهه تِیَیْ هَنتیْتاْ
نَی اَرَیکَه آهم نَی دِرَوْغنَه آهم نَی زُورکَرَ آهم ہ نی اَدَمْ
نی مَئی تَوما اُو یارَی اَرِشتام اُو پَری آیمِ[1]

گوید داریوش پادشاہ برای این اورمزد یاری کرد و خدایان دیگر کہ ہستند
نہ دشمنکام ہستم نہ دروغگو ہستم و نہ زورکن نہ خودم نہ خاندانم از پی راستی رفتم (پیروی کردم)

اوستائی زبان

زرتشت کی مذہبی کتاب کو ہم اوستائی زبان کہتے ہیں۔ اصل میں یہ قدیم ایران کی ایک شاخ ہے اور قدیم پارسی کی رشتہ دار ہے۔

یہ زبان ایران کے شمال میں رائج تھی اور زیادہ تر مذہبی پیشواؤں اور مقدس کتابوں کی زبان

---

[1] خشایثیہ = شاہ ۔ وزرک = بزرگ ۔ دھیو = دہ مملکت یوثرہ = پور، بیٹا نپا = نوہ، پوتا ۔ ثتی = گوید ۔ پتیا = پدر ۔ بغر = خدا ۔ ھی = (ای) کہ ۔ ادا = ساختہ ایم ۔ این بومی = زمین ۔ آسمانہ = آسمان ۔ مَرِتیَہ = مرد ۔ شیاتیہ = شادی ۔ اوھیرادی = بدیں سبب اس لئے ۔ اَوَپستہ = یاری ۔ آبَرَ = آورد ۔ اوتا = و ۔ انیاھیہ = دیگر، دوسرے ۔ بتی = آنانکہ، وہ ھنتیتا = ہستند، ہیں ۔ نی = نہ ۔ اریکہ = دشمن کام ۔ دروغنہ = دروغگو، جھوٹا ۔ زورکر = زورکس، زور کرنے یا دکھانے والا ۔ مئی = مال من، میرا مال ۔ توما = نژاد، نسل، تخم، خاندان ۔ اریادی = انرپی ۔ آرشتہ = راست ۔ اوپری آیم = از پی اش رفتم، میں نے اس کی پیروی کی ۔

تھی۔ اس کے آثار کتبوں وغیرہ پر نہیں ملتے۔ ہخامنشی دور کی مذہبی کتابیں سکندر کے حملہ اور پھر ایران میں سو سالہ سلوکی حکومت کے دور میں ناپید ہوگئیں۔ اگرچہ اشکانی بادشاہوں نے اس زبان کے اور ایران کے گم شدہ آثار کے احیاء کی کوشش کی لیکن ان کے دربار میں یونانی زبان اور یونانی آداب ہی کو زیادہ رسوخ حاصل رہا۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ بلاش نے کتاب اوستا کے احیاء کی کوشش کی۔ اس کے بعد جیسا کہ مشہور ہے اردشیر بابکان کے حکم پر اوستا کو جمع کرکے اسے مرتب کیا گیا۔ اس وقت جو اوستا ملتی ہے اس پر کافی طویل زمانہ گزر چکا ہے اور اس میں کئی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ گاتھا یا مقدس نغمے جو اوستا کی کتاب یسنا کے اجزا ہیں اپنی ترکیب اور اپنے انداز کے لحاظ سے قدیم ترین حصے ہیں اور ممکن ہے خود زرتشت کے کہے ہوئے ہوں۔

تاریخوں میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی اوستا موجودہ اوستا سے کہیں زیادہ ضخیم تھی۔ موجودہ اوستا میں پانچ کتابیں ہیں: یسنا، ویسپرد، وندیداد، یشت اور خردہ اوستا۔ ان سب میں خدائے بزرگ بے ہمتا آھورمزد، ایزدون اور فرشتوں کی حمد و ثنا پاکی، سچائی، نکوکاری اور سعی و عمل کی تعریف اور دیوؤں، اہرمنوں، جھوٹ، خیانت، اور فریب کی برائی ہے۔ اسی طرح ان میں مذہبی اوامر، احکام اور اذکار درج ہیں۔ کچھ حصوں میں تاریخی واقعات داستانیں اور روایتیں پیش کی گئی ہیں۔

یہاں ہم نمونے کے طور پر کتاب یسنا کا ایک جملہ اور اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔ اس جملہ کا اصل متن صفحہ ۹ اور ۱۰ پر دیا جاچکا ہے:

وِیش اَیَم ابذ تَپَنتو وی دیوٗ نہو دیوٗ یو نہوش
مِسرَو شو مشیتو اشَیش وَنُوھی ابذ میشتَو[۵۱]

[۵۱] ویش۔ وی: کنار دور (بی)۔ ایم = ازیں پس۔ ابذا = این جا، دریں جا۔ تپنتو = بیفتند، فتند دیونہو = دیوان دیو پو (دیوان مادہ)۔ ونہوش = خوب۔ شیتو = اقامت کند۔ و نوھی = خوب (مونث)۔ مشتو = اقامت کند (فعل مونث غایب)

موجودہ فارسی میں اس کا ترجمہ :

دورافتند این جا ازاین پس دورہ باشند دیوان۔ سروش خوب راین جا) اقامت کناد، اشیش خوب این جا۔ اقامت کناد

اوستا کا ادبی پہلو

اوستا کے بعض حصے ادبی خوبیوں کے حامل ہیں۔ ان میں مناظر قدرت کے بیان اور خدا کی تعریف میں فصیح اور شیریں جملے ملتے ہیں۔ اسی طرح اوستا میں لفظی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس کا کچھ حصہ منظوم اور مقفی تھا۔ چنانچہ گاتھا جو اوستا کا قدیم ترین حصہ ہے۔ یہ نظم و ترتیب ابھی تک باقی ہے۔ گاتھا میں تمام ترنغمے، مناجاتیں اور بلند پایہ اخلاقی اشعار ہیں اور اس میں اس زمانے کے لطیف ترین دینی احساسات کی عکاسی کی گئی ہے۔

زرتشت کی ایک گاتھا میں دنیا کے پیدا کرنے والے کی، زمین اور آسمان کی ماہیت کی اور انسان کے وظائف بندگی کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور اس کا ہر قطعہ اس جملہ کے ساتھ شروع ہوتا ہے:

تَتَ تِوا پرِسَہ اِرِشْ مُوئی وَلوَچا اَ ھورا[1]

از تو می پرسم براستی، بمن بفرما ای اھورا

جیساکہ ہم مقدمہ میں بتا چکے ہیں، کتبوں، پارسی اور اوستائی کتابوں کے سوا یونانی اور عبرانی ماخذوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بادشاہوں کے دربار میں وقائع نگاری کا بھی رواج تھا اور اس وقت ایران میں مدرسے، علوم اور کتابیں موجود تھیں۔ لوگوں میں طرح طرح کی داستانیں مشہور تھیں۔ ایران کے بادشاہ موسیقی اور سرود کے خاص سرپرست تھے ان کے درباروں میں گانے والے اور گانے والیاں موجود رہتی تھیں۔ یہ لوگ بادشاہ کی بزم میں نغمہ

---

[1] تت : تورا۔ پرسہ : پرسم (پرسیدہ شدہ)۔ اِرِش : راستی۔ موئی : مرا۔ وَئوچا : آگاہ کن (بگو، دیج، دانہ، واژہ)۔

سرائی کیا کرتے تھے ۔ اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ نغمے موزوں کلام ہوگا۔ کیونکہ آہنگ اور وزن ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔

اوستائی زبان میں شعر

اوستا کے اشعار کا وزن ہر مصرع کے حروف ہجا کی تعداد پر ہوتا تھا۔ یہ وزن ان عروضی اوزان سے جو بعد اسلام ایران میں رائج ہوئے مختلف ہے۔ یہاں ہم مثال کے طور پر کتاب یشت سے ایک نظم نقل کرتے ہیں جو مہریشت کے فقرہ (۶) میں آئی ہے :

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

موجودہ حروف میں اس کا تلفظ :

تَمْ اَمَوَنْتَمْ یَزَتِمْ سُورِمْ دامو هوْ سِوِشْتِمْ
میثْرَمْ یَزَئِ زَئوَرْ ثرہ ابیو [1]

موجودہ فارسی میں اس کا ترجمہ :

آن ایزد نیرومند توانا و در میان موجودات توانا ترین را، مہر را با زُوتر می ستائیم۔

---

[1] تم: ازت، آن۔ آمونت : توانا۔ یزت : ایزد۔ سورہ: نیرد، زور۔ دامن ہ (دام) : موجود، مخلوق۔ سو: توانا۔ سوشتمہ توانا ترین۔ میثرہ: مہر۔ یزہ: ستایش، عبادت۔ اجش زئور: عنوانیست کہ بہ یک نوشابہ مقدس دادہ شدہ

جیساکہ ہم دیکھ رہے ہیں ان تینوں مصرعوں میں سے ہر ایک مصرع میں آٹھ حروف ہجا موجود ہیں اور نظم کا وزن ان پر ہی رکھا گیا ہے ۔

کتاب یسنا ۹ م ۵ کے خردہ اوستا سے ایک اور مثال :

تلفظ :

یَمَہَ خْشَترَ اَوْرَوْھَہ نَیْت اَوْتَمْ آنھَہ نُیت
گرَمَمْ نُیْتْ زوَرِوَ آنھَہ نُیْتْ مرثیوْسْ نُیْتْ اَرَشکوْ
دَیوَ او دائو له

ترجمہ : درپادشاہی جم نامدار نہ سرما بود نہ گرما !

۵؎ یم : جم ۔ خشتر : شہر ، شاہنشاہی ۔ آدرو : نامدار ، باشکوہ ۔ اوت : سرما ۔ زورو : پیری ۔ زرد : زال ۔ میرثیوش : مرگ ، فنا ۔ آرسک : حسد ، رشک ۔ دات : دادہ ۔ دیویہ : دیو

نہ پیری بود نہ مرگ　　نہ رشک دادہ دیوان

اس قطعہ کے ہر مصرع میں بھی آٹھ حروف ہجا ہیں اور یہ موزوں کلام ہے۔

پہلوی زبان

پہلوی زبان قدیم پارسی کی ایک شاخ ہے۔ یعنی قدیم پارسی کلمات اور کلام کی ترکیب میں زمانے کے ساتھ ساتھ جو تبدیلیاں ہوئیں وہ پہلوی زبان کی صورت میں نمودار ہوئیں بالکل اسی طرح جیسے خود پہلوی بھی بتدریج موجودہ فارسی میں بدل گئی۔ اس لحاظ سے اس زبان کو پہلوی کی بجائے درمیانی پارسی بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ زبان قدیم پارسی اور موجودہ فارسی کے درمیان واقع ہے۔

پہلوی زبان کی ایک مثال (کتاب گجستک آبالش سے) :

ایذون گوبند کو گجستک اُبالش زندیٗ از ستخر بود۔ مردی وہ زبان دوست بوذ او روزی گرسنہ (گرہ سک) او تشنہ۔ آتشگاسی آمذ کو باژگیرم او او نوکس ہوذ۔

موجودہ فارسی میں اس کا تلفظ :

چنیں گوبند کہ ملعون ابالش زندی از استخر بود۔ مرد خوب روان (مہربان) و دوست بود و روزی گرسنہ و تشنہ بہ آتش گاہ آمد کہ باج گیرد و آنجا کس بنود [۵]

کارنامہ اردشیر بابکان (کارنامکی از تخشیری پاپگان) سے ایک اور مثال :

پہ کارنامکی اس تخشیری پاپکان ایتون نپشت اِستنْد کو پس اَج مرگی آلکساندر آ رُ مِیکْ ایر انشتر ۲۴۰ کوتک خوتائیٗ بوذ اسپہان

---

[۵] یہاں باج کا لفظ برکت یا فیض کے معنی میں آیا ہے۔

او پارس اوکوسیقائی آوَیشْ نزدیکتر پہ دستی اردوان سرداس بوذ۔
پاپک مرزبان اُوشَترْ دارِی پارس بود

موجودہ تلفظ :

بکارنامۂ اردشیر بابکان چنین نوشتہ است کہ پس از مرگ اسکندر رومی ایران شہر (۲۴۰) کدخدائی بود۔ اصفہان و پارس و اطراف آن بدست اردوان سردار بود۔ بابک مرزبان وشہروار بود [1]

پہلوی ادبیات

جیساکہ اوپر بتایا جا چکا ہے پہلوی ادبیات کا بیشتر حصہ زردشتی مذہب کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ دین زردشت کی کتابیں اسی زبان میں لکھی گئی ہیں ایسی دینی کتابوں کا کچھ حصہ اوستا کے متن پر، کچھ اوستا کی شرح پر اور کچھ دوسرے دینی مسائل پر مشتمل ہے۔

دینی کتابوں کے بعد گنتی کی کچھ ایسی کتابیں بھی باقی رہ گئی ہیں جنھیں داستانوں اور حکایتوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس حصہ کی باقیات ہیں جو ایران پر عربوں کے تسلط رسم خط کی تبدیلی، اور دین اسلام کی اشاعت کی وجہ سے ناپید ہوگیا۔ کیونکہ قدیم عربی اور ایرانی کتابوں میں بہت سی ایسی پہلوی کتابوں کا ذکر ملتا ہے جن کا اب کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ان میں سے بعض کتابیں علمی اور فلسفیانہ ہیں جو ساسانی دور میں اور خاص کر خسرو انوشیروان کے دور حکومت میں موجود تھیں، اور یونانی اور سنسکرت سے پہلوی زبان میں ترجمہ ہوئی تھیں۔ اس کے سوا قراین اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی مصنفوں نے جن میں مذہبی علما بھی شامل

---

[1] ایتون : ایدون = چنین ۔ استن : استاذ (ایستاد) = علامت ماضی قطعی بجائے "است" موجود ۔ اچ = از ۔ کوتک خدائی = کدخدائی ۔ حکومت ۔ کوستی = ساحل کنارہ، اطراف ۔ اویش : ایشیان = اش ۔ او = و۔

ہیں، اسلام کی ابتدا میں کتابیں لکھی تھیں۔ لیکن اسلام کے غلبہ اور عربی زبان کی ترویج کے بعد ایسی کتابیں جو قلمی اور نادر تھیں بتدریج ناپید ہوتی گئیں اور جو کچھ زرتشتی مذہب کے پیرو دوسری صدی ہجری یا اس کے بعد ہندستان لے گئے یا جو کچھ ایران میں محفوظ رکھا اس کے سوا اب کچھ باقی نہ رہا۔

پہلوی زبان کی جو اوستائی کتابیں باقی رہ گئی ہیں وہ اوستا کے پانچ حصوں پر مشتمل ہیں یا ان کے بعض اجزا پر جیسے وندیداد، یسنا، ویشتاسب یشت، اہورمزد یشت، خورشید یشت، ماہ یشت، ماہ نیایش وغیرہ۔

پہلوی میں اوستا کے سوا مشہور مذہبی کتابوں میں دینکرت (یعنی اعمال دین) ہے اس کتاب میں زرتشتی عقاید، آداب، مراسم، احکام، اوامر اور قصص سے بحث کی گئی ہے۔ ایک اور کتاب بندھشن (یعنی آفرینش) ہے۔ اس میں اہورمزد کی پیدائش، اہرمن کی سرکشی، اس کے بعد آفرینش اور مخلوقات کی خصوصیات کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

غیر مذہبی کتابوں میں جو کتابیں سب سے زیادہ مشہور ہیں ان میں ایک کارنامک اردشیر بابکان ہے۔ یہ مختصر کتاب اگرچہ بنیادی طور پر افسانہ ہے اس کے باوجود اس کی بڑی تاریخی اہمیت بھی ہے اور ساسانی دور کی تاریخ کے لئے فائدہ سے خالی نہیں۔ ایک اور کتاب خسرو گواتان (یعنی خسرو پسر گباد یا قباد) اور اس کا غلام ہے۔ ایک اور کتاب یادگار زریران، ہے جسے شاہنامہ گشتاسب بھی کہتے ہیں۔ دین زرتشت کے پیرو گشتاسپ اور اس دین کے دشمن ارجاسپ کے درمیان جو لڑائیاں ہوئیں ان کا حال اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ میں بھی گشتاسپ کا حال بیان کیا ہے۔ غالباً اس نے یہ حالات اسی کتاب سے لئے ہیں۔

پہلوی زبان میں شعر ان موجود پہلوی کتابوں میں منظوم کلام بھی پایا جاتا ہے، اور ساسانی دور کے جو کتبے حاجی آباد میں موجود ہیں ان میں بھی موزوں کلام موجود ہے۔ ان نمونوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ساسانی دور میں اشعار موجود تھے۔ اس دعوے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ باربد اور ایسے دوسرے موسیقی داں اور گوتے ساسانی بادشاہوں

کے درباروں میں موجود تھے۔ یہ راگ کے ساتھ شعر گاتے اور چنگ اور بربط بجایا کرتے تھے۔ یہ رسم ہخامنشی دور میں بھی پائی جاتی تھی اور بعد کے آنے والے اسلامی دوروں میں بھی جاری رہی۔ جو کتابیں باقی رہ گئی ہیں اور اسلامی کتابوں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلوی اشعار عروضی وزن کے نہیں ہوتے تھے بلکہ وزن ہجائی ہوتا تھا۔ ذیل میں تیسری صدی عیسوی کے ایک منظوم کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مانویوں کی ان تحریروں کا ایک نمونہ ہے جو ترکستان کے شہر تورمان میں ہاتھ آئی ہیں :

آپر یوانی پرستگان

پرستگان روشنان فرھگان کردگاران !!

بغان نھمان اَ د ! مہرسپندان استاودان

ہیاران زورمندان[1]

موجودہ الفاظ میں قطعہ کا تلفظ :

آفرین فرشتگان !

فرشتگان روشنان ! فرھگان کردکاران

بغان نھمان وَ ! مہرسپندان اوستادان

یاران زورمندان

اس قطعہ کے معنیٰ :

فرشتگان روشن بافروکردار نیرومند مہرسپندان ستودہ یاران زورمند۔

جیساکہ اوپر کے قطعہ سے ظاہر ہے اس کا عنوان "آمریوان اے پرستگان" یا آفرین فرشتگان

---

[1] پرستک : فرشتہ فرہ : فرہ۔ فرّ۔ بغ : خدا۔ خداوند۔ نھم د قوی، زورمند۔ مہرسپند : مانویوں کی اصطلاح میں عنصر اور جوہر۔ اَستَوُا : ستودہ۔

بمعنی مدح و سپاس فرشتگان ہے۔ اس کا وزن ہجائی ہے اور مفاعلن مفاعلن کے برابر ہے۔

قبل اسلام ایرانی ادبیات پر ایک اجمالی نظر

جو کچھ ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں اس سے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ قدیم ایران میں اس کا اپنا رسم خط، ادبی زبان، اور اس کے اپنے علوم، ادبیات اور نظم و نثر موجود تھے۔ آثار و قرائن سے اور تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان دوروں میں علوم اور فلسفہ موجود تھا۔ شاہی درباروں میں ان کی محفلیں منعقد کی جاتی تھیں اور موبدان علوم کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اسی طرح علم طب کو بھی بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ چنانچہ ہخامنشی شہنشاہ داریوش نے مصر کے ایک مذہبی پیشوا کو جو ایران میں قید تھا حکم دیا کہ وہ مصر واپس جا کر وہاں طب کا مدرسہ کھولے۔ یہ واقعہ ایرانی بادشاہوں کی علم دوستی اور اس کی سرپرستی پر دلالت کرتا ہے۔ ایران قدیم میں تاریخ نویسی کا بھی رواج تھا اور ابتدا ہی سے ایرانی مورخ واقعات کے ضبط و ثبت کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ مذہبی اور افسانوی اور دوسری کتابوں کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

ساسانیوں کے دور میں فلسفہ و حکمت اور اجتماعی علوم یونانی اور سنسکرت سے پہلوی زبان میں منتقل ہوئے اور انھوں نے ملک کے علم و ادب کے خزانے میں اضافہ کیا۔ اخلاقی اور اجتماعی علوم پر اچھی اچھی کتابیں اتنی لکھی گئی تھیں کہ عربوں کے تسلط، عربی زبان کی ترویج اور ایرانی مصنفوں کی کتابوں کے تلف ہونے کے باوجود بہت سی کتابیں پہلی صدی ہجری تک بھی باقی رہیں۔ چنانچہ عربی کتابوں میں ان کتابوں کے نام لئے گئے ہیں۔ بعض کے مطالب نقل ہوئے ہیں اور بعض عربی میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ چنانچہ "المحاسن والمساوی" یا "المحاسن والاضداد" یا کتاب "الادب الکبیر" اور کتاب "الادب الصغیر" پہلوی زبان کی اخلاقی کتابوں سے اقتباس اور ترجمہ کی گئی ہیں جن کا پہلوی نام "شایست و ناشایست" تھا۔

قدیم ترین زمانوں میں بھی ایران میں منظوم کلام موجود تھا، اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، قدیم شعر کا

وزن ہجائی تھا۔

ماخذ:

فقہ اللغہ ایران (جرمنی)، خصوصاً جلد دوم میں "ہرمیپوس" اور "کنزیاس" الفاظ ملاحظہ ہوں۔
تاریخ ہرودوت، کتاب اول، باب ۱۰۰
کتاب تربیت کوروش، تالیف کزونفن، فصل اول و دوم تاریخ ایران، از اشپیگل، جلد سوم، صفحہ ۶۸۲
افلاطون، رسالہ الکیبادیس
"پلوٹارک" از ڈاکٹر رضازادہ شفق، مجلۂ مہر شمارہ چہارم، سال اول سنہ ۱۳۱۲ طہران۔
توراۃ، خصوصاً کتاب عذرا، باب ۴
گاتھا اور اوستا کے ترجمے از پورہ داؤد
اخلاق ایران باستان، خاص طور پر ملاحظہ ہو صفحہ ۷۵، تالیف دینشاہ ایرانی سنہ ۱۳۰۹
مانی پر تحقیقات، از ولیم جیکسن
مقالات آقای بہار، مجلۂ مہر شمارہ سال پنجم، طہران، سنہ ۱۳۱۶

دوسرا حصہ

بعد اسلام ایرانی ادبیات

۱۔ عرب حملہ سے فردوسی کے عہد تک

۲۱ھ سے چوتھی صدی ہجری کے آخر تک

جیسا کہ پہلے حصہ میں مختصر طور پر بیان ہو چکا ہے، ساسانی عہد میں دینی، علمی، ادبی اور تاریخی آثار تالیف اور ترجمہ ہوئے تھے اور شعراء، اور درباری کلام کے متعلق جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دور میں منظوم کلام موجود تھا اس قسم کے منظوم کلام کے نمونے اس سے پہلے پیش کئے جا چکے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم دور میں ادبی آثار کا دامن کچھ ایسا وسیع نہ تھا۔ بلکہ ادب صرف درباریوں اور مذہبی پیشواؤں کی حد تک محدود تھا۔ ساسانی دور کے آخر میں ان دونوں طبقوں یعنی درباریوں اور مذہبی پیشواؤں کے اخلاق اور ان کی طرز زندگی میں دربار میں فتنہ و فساد اور نئے نئے مذہبی فرقوں کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہو چکا تھا اس لئے کہنا چاہیئے کہ طلوع اسلام کے وقت ایرانی ادبیات کا چہرہ کچھ ایسا روشن نہ تھا اور ان دونوں طبقوں کی خرابی کی وجہ سے ادبیات میں بھی زوال و انحطاط پیدا ہو گیا تھا۔

عربوں کے دور میں ایرانی ادبیات ۲۱ھ تا ۲۰۵ھ

آنحضرت صلعم کی ہجرت سے اکیس سال بعد ایرانیوں اور عربوں میں وہ مشہور جنگ جسے عربوں نے فتح الفتوح کا نام دیا ہے، نہاوند کے مقام پر ہوئی۔ اس جنگ میں ساسانیوں کے آخری

بادشاہ یزدگرد سوم جس نے عربوں کے ساتھ پہلی لڑائی کے بعد کئی جھڑپوں کے لئے بہت بڑی فوج جمع کرلی تھی، شکست کھائی۔ اگرچہ یزدگرد نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ عربوں کے مقابلہ کا اٹھا نہ رکھا اور ہر طرح ان کا مقابلہ کیا، لیکن عربوں نے اسے موقع نہ دیا، اور اس موقع پر حاکم مرو ماہویہ جیسے بعض ایرانی مرزبانوں نے اس کے ساتھ دغا کی اور ایران کا یہ ستہ اور پریشان حال بادشاہ ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں بھاگتا بھاگتا آخر کار خراسان پہنچا۔ لیکن یہاں بھی اسے اپنی کوششوں میں کامیابی نہ ہوئی۔ مرو میں اس نے ایک پنہارے کے پاس پناہ لی اور جیسا کہ مشہور ہے غافل پنہارے نے اس کے قیمتی لباس کی طمع میں اسے مار ڈالا۔ اس واقعہ کے بعد پورا ایران عربوں کی تاخت و تاز کا میدان بن گیا۔ ایران کی سلطنت خلافت کی تابع ہوگئی اور دو سو سال تک عرب ایران پر حکومت کرتے رہے۔ اب ایران میں فوجی اور کشوری امور کی باگ ڈور ان کے یا ان کے مقرر کئے ہوئے لوگوں کے ہاتھ میں رہی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایران کے علمی اور ادبی آثار عربی زبان سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کے تحت ہو گئے۔

عربوں پر ایرانیوں کا اثر

اگرچہ دین اسلام کی اشاعت کی وجہ سے ایران میں عربوں کا سیاسی غلبہ معنوی غلبہ میں مبدل ہوگیا تھا اور عربوں کا اثر ایرانیوں کی روح کی گہرائیوں تک پہونچ چکا تھا، پھر بھی عربوں کے تسلط کے اس دور میں معنوی حیثیت سے بھی مغلوب ایران نے مقاومت کی کوشش کی اور عربی اثر کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے عربوں کی تعلیم کو اپنے مزاج اور اپنے ذوق کے مطابق ڈھال لیا اور اپنے تمدن اور اپنے افکار سے عربوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ خاص کر جب حکومت اموی خلفاء کے ہاتھ میں آئی اور انھوں نے ظلم وستم کرنا شروع کیا تو ایرانیوں نے عربوں کے خلاف ایک تحریک کو جو اس وقت شعوبیہ تحریک کہلاتی تھی اور تقویت دی۔ اس وقت آل علی جو اپنے آپ کو حکومت کا حق دار سمجھتے تھے اور بنی امیہ کے ہاتھوں ستائے ہوئے تھے، بنی امیہ کی مخالفت کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی آل علی کے طرف دار ہو گئے۔ جب مختار ثقفی نے ۶۵ھ میں بمقام کوفہ انتقام حسین بن علی کے نام سے بنی امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو ایرانیوں

نے اس کا ساتھ دیا اور عربوں سے ان کی زیادتیوں کا انتقام لے لیا۔

۱۲۹ سنہ میں ابو مسلم خراسانی نے ایرانیوں کے جذبۂ انتقام کو نئے سرے سے بھڑکایا۔ بنی امیہ کے خلاف بغاوت کی اور امویوں کی خلافت کا تختہ الٹ کر عباسیوں کو جو خاندان نبوت سے قریب تر تھے، تخت خلافت پر بٹھا دیا۔ اگرچہ عباسیوں نے ایرانیوں کی امیدوں کے مطابق ان کے ساتھ ویسا سلوک نہ کیا، بلکہ ابو مسلم خراسانی کو جس نے انھیں تخت خلافت دلایا تھا، دھوکے سے قتل کر دیا۔ اسی طرح برمکیوں کی طرح اپنے لایق ایرانی وزیروں کو قتل کیا، انھیں تباہ و برباد کیا، اس کے باوجود ان کے دور خلافت میں ایرانی عقائد، افکار اور عادات کا اثر بڑھتا گیا اور ایرانیوں کا دیوانی قانون جو اسلام کی ابتدا میں عربوں نے ان سے سیکھا تھا، دائمی بنا اور اسے وسعت حاصل ہوئی حتیٰ کہ ایران کی قومی عیدیں جیسے نوروز، سدہ، مہرگان وغیرہ پھر منائی جانے لگیں۔ بعض خلفاء جیسے متوکل وغیرہ نے ایرانی لباس پہننا شروع کیا۔ اسی اثر کا ایک بڑا مظاہرہ برمکیوں کا وزارت پر فائز ہونا تھا جو بڑے عقل مند اور کارآزمودہ ایرانی تھے۔

اسی طرح ایران نے عرب کو علمی طور پر بھی متاثر کیا اور عربی زبان نے فارسی زبان کا اثر قبول کیا اور بہت سے فارسی الفاظ معرب بن کر عربی میں داخل ہوئے۔ مثلاً: اسطوانہ (ستون) بُرق (برّہ)، بلاس (پلاس)، جوہر (گوہر)، دست (دشت)، فنجان (پنجگان)، الکرد (گردن)، قمنجر (کمان گر)۔ طست (طشت) قیروان (کاروان)

بہت سے عرب شاعروں نے ایسے الفاظ کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔ دوسری طرف کوفہ اور بصرہ (جو ایران کی حدود میں تھے) میں رہنے والے عربوں نے ایرانیوں سے میل جول بڑھایا، انھوں نے فارسی زبان اختیار کر لی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ زبان سرکاری دفاتر کی زبان بن گئی اور حجاج بن یوسف کے عہد تک مالی دفاتر فارسی زبان ہی میں لکھے جاتے رہے۔

لیکن عربی زبان پر فارسی زبان نے جو کچھ اثر ڈالا ہے وہ فارسی پر عربی اثر کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ عرب پر ایرانیوں کا اثر لفظی نہیں بلکہ علمی اور معنوی اثر تھا۔ عربوں نے نہ صرف

ایرانیوں کے رسم و رواج اور قانون حکومت کو اختیار کیا بلکہ سوانح، تاریخ، حکایات، علوم، اخلاق اور آداب میں ایرانی کتابوں سے زبردست استفادہ کیا۔ ایران کے بہت سے عالموں نے بعض پہلوی کتابوں کو عربی میں منتقل کر کے عربوں پر نئے علوم کا دروازہ کھولا، اور وہ قوم جس میں اسلام کی ابتدا کے وقت گنتی کے چند لوگوں کے سوا پڑھنا لکھنا تک کسی کو نہ آتا تھا، اسی قوم نے ایران اور دوسری قدیم قوموں سے ادبیات، تاریخ، اور دوسرے علوم میں استفادہ کر کے جاحظ بصری اور ابوالفرج جیسے مصنفوں کو پیدا کیا۔

ایران پر عربی زبان کے اثرات

عرب پر ایران کے علمی، ادبی اور اجتماعی اثر کے مقابلہ میں خود عربی زبان نے ایران پر اپنا اثر ڈالا اور دو سو سال کی مدت میں عربی زبان نے ایران میں ایسا رواج پایا کہ تاریخ عالم میں اس کی نظیر شاید ہی کہیں ملے۔ اس زبان نے اتنا گہرا اور اتنا پائدار، اور اتنا ہمہ گیر اثر ڈالا کہ بہت سے ایرانی عالموں نے اس زبان میں شعر کہے، اس زبان میں خط و کتابت کی، اور اس زبان کی ترویج اور تعلیم میں کوشاں رہے، عربوں کے قبضہ بلکہ اس کے بعد کی کئی صدیوں تک عربی زبان میں دینی کتابیں لکھتے رہے اور عربی زبان ایران کی ادبی زبان بن گئی اور کسی نے فارسی لکھنے کی طرف توجہ نہ کی عربی زبان کے تسلط کا سب سے بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ ایرانیوں نے دین اسلام کو قبول کر لیا، اور چونکہ اس زمانے کے مسلمان قرآن کے سوا ہر کتاب کو اور عربی زبان کے سوا ہر زبان کو ناقابل اعتنا سمجھتے تھے اس لئے بتدریج پارسی زبان اور پارسی زبان میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھنے کا رواج کم سے کم ہوتا گیا لوگ عربی سیکھنے کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔ عربی زبان کے رواج اور اس کے اثر کی ایک اور وجہ اس زبان کی وسعت بھی ہے۔ کیونکہ پہلوی زبان کے مقابلہ میں اس میں الفاظ زیادہ ہیں۔ اور علوم و فنون کی شرح و بسط کی یہ زبان صلاحیت زیادہ رکھتی ہے۔ اس اثر کے مقابلہ میں شعوبی ایرانیوں نے پارسی زبان کی ترویج اور اس کی حفاظت کی جو کوششیں کیں وہ کامیاب نہ ہو سکیں بلکہ عربی میں لکھنے والے عالموں اور عرب دوست ایرانی امرا جیسے صاحب بن عباد وغیرہ نے اس کی مخالفت کی۔ حد یہ کہ عربی میں لکھنے والے فقہ، نحو، تاریخ اور سوانح پر بہترین کتابیں لکھنے

والے علماء خود ایرانی تھے۔ یہاں ہم مثال کے طور پر ان میں سے بعض کے نام پیش کرتے ہیں۔

عربوں کے عہد کے بعض عربی نویس علماء

عربوں کے دور حکومت کے ایرانی عربی نویس مشہور علماء میں ایک شخص عبداللہ بن مقفع ہے۔ یہ دوسری صدی ہجری کی ابتداء میں فارس میں پیدا ہوا۔ اس کا ایرانی نام روزبہ پسر داذُویہ تھا۔

ابن مقفع نے بہت سی پہلوی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا اور خود علم و ادب پر کئی کتابیں لکھیں۔ پہلوی زبان سے اس کے اہم ترین ترجموں میں کلیلہ و دمنہ ہے جو ابھی تک باقی ہے اور عربی ادب کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کا دوسرا ترجمہ ایران کے بادشاہوں کی ایک پہلوی تاریخ خدای‌نامک کا ترجمہ تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ ترجمہ اصل پہلوی کی طرح ناپید ہو گیا ہے اور سوانح اور تاریخ کی کتابوں میں اس کے اقتباسات باقی رہ گئے ہیں۔ ابن مقفع یونانی فلسفہ سے بھی واقف تھا اور اس فلسفہ کی اصطلاحیں وضع کرنے اور فلسفہ کے معانی کو سمجھانے کی کوشش کی ہے ؛

اس دور میں ایرانی علماء نے نہ صرف حکمت اور سیرت پر کتابیں لکھیں بلکہ علوم کے دوسرے شعبوں میں بھی تحقیقاتیں کیں، ان میں فقہ بھی شامل ہے۔ اس علم کے معروف ترین علماء میں سے ایک امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت ہیں جو حنفی مذہب کے بانی اور فقہ کے زبردست علماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کے والد ثابت کو دوسرے ایرانی قیدیوں کے ساتھ کوفے گئے ابو حنیفہ ۸۰ھ میں اسی شہر میں پیدا ہوئے اور یہیں ۱۵۰ھ میں انتقال کیا۔ آپ کی املا کرائی ہوئی کتابوں میں ایک کتاب الفقہ الاکبر ہے اس میں اسلامی فقہ کے مسائل بیان کئے گئے ہیں[1]۔

ایرانی استادوں نے بھی عربی زبان سیکھ کر اس زبان میں کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک سیبویہ نحوی ہے۔ یہ ۱۵۶ھ ہجری میں صوبہ فارس میں پیدا ہوا ۱۷۰ھ سے لے کر ۱۹۴ھ تک کے کسی درمیانی سال میں بمقام ساوہ وفات پائی۔ اس نے عربی زبان کے اصول اور قواعد پر ایک کتاب الکتاب کے نام سے لکھی ہے۔ یہ کتاب صرف و نحو کے مسائل پر نہایت اہم کتاب

---

[1] یہ دراصل شیخ ابو مطیع بلخی کی تصنیف ہے اور اس میں اسلام کے بنیادی عقاید کا بیان ہے۔

سمجھی جاتی ہے۔

اسی طرح عربی زبان سیکھ کر ایران نے بڑے بڑے عربی گو شاعر پیدا کئے۔ ان شاعروں میں مشہور ترین شاعر بشار بن برد اور ابو نواس ہیں۔ بشار تخارستان کا رہنے والا، مادرزاد اندھا اور عباسیوں کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے ۱۶۷ھ ہجری میں وفات پائی اس کے اشعار اور مدحیہ قصیدے مشہور ہیں۔ اس کے بعض اشعار زرتشتی مذہب کی طرف اس کے میلان کو ظاہر کرتے ہیں۔ ابو نواس مشہور شاعر ہے۔ اس کے اشعار اور دلکش کلام کا دیوان باقی ہے۔ یہ بھی عباسیوں کے دربار کا شاعر تھا یہ ۱۲۰ھ میں بمقام اہواز پیدا ہوا اور ۱۹۰ھ یا ۱۹۵ھ میں وفات پائی۔

اسلامی عہد کی ابتدائی صدیوں کی عربی دنیا کے مشہور ایرانی عالموں میں بنی موسیٰ بھی تھے موسیٰ بن شاکر خوارزمی کا شمار عہد مامون کے مشاہیر منجموں میں ہوتا تھا یہ علم ہندسہ کا ماہر تھا اس کے بیٹے محمد اور احمد اور حسن جو بنی موسیٰ کے نام سے مشہور ہیں تیسری صدی کے ان بزرگ ترین علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ جنھوں نے یونان کی علمی کتابوں کے جمع کرنے اور ان کو عربی میں منتقل کرنے میں بڑی محنت اور زحمت اٹھائی ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک علم میں شہرت پائی۔ محمد علم نجوم، حساب اور ہندسہ کا ماہر اور اصول اقلیدس اور مجسطی کا استاد تھا فن حیل میں احمد کا مرتبہ سب سے اونچا تھا اور اس نے بہت سے مسائل استخراج کئے تھے۔ حسن کو ہندسہ میں خداداد ملکہ حاصل تھا اور وہ تعلیم سے پہلے ہی ہندسی مسائل کو اپنی خداداد ذہانت کی مدد سے حل کر لیتا تھا۔ کہتے ہیں بنی موسیٰ نے مامون کے حکم پر محیط زمین کی مساحت کی تھی۔ اس کی اہم ترین تصانیف میں ایک کتاب الحیل ہے یہ کتاب طبعی علوم اور صنائع پر ہے اور اس کے ایک حصہ کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا اس سے ظاہر ہے کہ دو سو سال کی مدت کے اندر عربی زبان ایران کی علمی اور ادبی زبان بن گئی اور ایرانی جو عربی زبان سے بالکل بےگانہ تھے، انھوں نے عربی سیکھکر

تمام علوم میں کتابیں تالیف کیں، شعر لکھے، حد یہ کہ اس زبان کی قواعد اور لغت لکھے۔

ایران کی آزادی اور فارسی زبان کا احیاء

عربوں کا سیاسی اثر ایران کے دور دست علاقوں میں اور خاص کر شمال مغربی ایران پر قائم ہو چکا تھا لیکن ان علاقوں میں جب کبھی ایرانیوں کو موقع ملتا وہ برابر اپنی آزادی کے لئے کوشش کرتے تھے۔ سب سے پہلے تو ایرانیوں نے بنی امیہ کے خلاف بغاوت کی اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے پہلی صدی ہجری کے آخر میں امویوں کی سلطنت کے مخالفوں نے اس مخالفت کی ابتدا عباسیوں کی دعوت خلافت کے ساتھ شروع کی۔ اس دعوت میں ایرانیوں نے زبردست حصہ لیا۔ تمدن کے لحاظ سے عباسیوں کا دور عربوں کی سلطنت کا درخشاں ترین دور ہے۔ اس دور میں ایرانی اداروں اور ایرانی عادات و رسوم اور علوم و عقائد نے رواج عام حاصل کیا اور مختلف مذاہب اور اسلامی اصول عقاید پر علمی مباحث کے لئے آزادانہ مجلسیں منعقد کی جانے لگیں ؛

اس دور کے مشہور ترین مذہبی فرقوں میں ایک فرقہ معتزلہ تھا۔ اس فرقہ کا بانی واصل بن عطا ایرانی تھا اور اس کے طرف دار بیشتر ایرانی تھے۔

ہارون رشید کے بیٹے مامون کی ماں ایرانی تھی۔ اس لئے مامون کو ایران سے بڑی محبت تھی۔ مامون کے بھائی امین اور مامون میں جو جنگ ہوئی وہ دراصل ایران اور عرب کی جنگ تھی اس جنگ میں طاہر ذوالیمینین جو اصلاً ایرانی تھا، مامون کی طرف سے سپہ سالار تھا۔ اس نے مامون کے بھائی امین کی فوجوں کے ساتھ جنگ کی ان پر فتح پائی اور اس خدمت کے صلہ میں اسے ۲۰۵ھ میں خراسان کی امارت ملی۔ یہاں وہ بڑی حد تک آزادانہ حکومت کرتا رہا اور خاندان طاہریہ کا بانی ہوا۔ اس لحاظ سے تیسری صدی ہجری کو ایران کی آزادی کی ابتدا سمجھنا چاہیے۔ اس آزادی نے بتدریج قوت حاصل کی اور آخر کار صفاریوں، سامانیوں، آل بویہ اور غزنویوں کے ہاتھوں کمال کو

پہنچی اور عربوں کے ہاتھوں سے ایران پوری طرح نکل گیا۔

اسی زمانے میں پارسی زبان دو سو سال کی گمنامی کے بعد موجودہ فارسی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ شاعروں نے اس زبان میں شعر کہنے شروع کئے اور لکھنے والوں نے فارسی نثر کا آغاز کیا، چنانچہ اس دور کے مشہور لکھنے والوں کے نام تذکروں میں محفوظ ہیں۔

عربوں کے دورِ حکومت میں پہلوی زبان کی فارسی میں تحویل

عربوں کے دورِ حکومت سے ساسانی دور تک فارسی زبان کی تاریخ کی تفصیلات نہیں ملتیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عبوری دور میں ایران کی عام زبان پہلوی ہی تھی۔ لیکن اس دوران میں خود پہلوی زبان کے اندر تغیرات ہونے لگے اور اس نے بتدریج موجودہ فارسی کا روپ اختیار کر لیا۔ پھر بعد اسلام کی فارسی وجود میں آئی۔ پہلوی زبان اور موجودہ فارسی میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اس زبان کا رسم خط عربی رسم خط ہے۔ دوسرے اس زبان میں بہت سے عربی الفاظ داخل ہوئے ہیں اور یہ ابتدائی زمانے ہی سے بڑی تیزی سے داخل ہوئے ہیں اور یہ بات فارسی کے قدیم ترین آثار نظم و نثر سے ثابت ہے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں عربی الفاظ کا استعمال نہ صرف ضرورت کے لحاظ سے کیا جاتا تھا بلکہ ان کا استعمال علم و ادب کی شان سمجھی جاتی تھی۔ عربی کلمات کا اثر اتنا بڑھ گیا تھا کہ فردوسی جیسے لوگ جو خالص فارسی لکھنے کے حامی تھے، عربی الفاظ کے استعمال پر ناگزیر طور پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ جیسا کہ مشہور ہے اس کے برخلاف شاہنامہ میں بہت سے عربی الفاظ موجود ہیں۔

عربی الفاظ کے سوا دوسری اور زبانوں جیسے یونانی، آرامی اور لاطینی کے الفاظ اسی زمانے سے عربی زبان کے واسطے سے راست فارسی میں داخل ہو گئے۔ زبان کے ماہروں نے ایسے الفاظ کی تحقیق کی ہے۔ ان میں سے چند ذیل میں نمونے کے طور پر درج کئے جاتے ہیں:

یونانی: دیہیم۔ دینار۔ فنجان۔ پیالہ۔ سندل۔ الماس۔

آرامی : جزیہ (گزیت)، مسجد (مزگت)، چلیپا (صلیبا)، کنشت (کنیسہ)، تابوت۔

یونانی اور دوسری زبانوں کے جو الفاظ عربی زبان کے ذریعہ فارسی میں داخل ہوئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں :

آبنوس۔ جاثلیق (کاتولیک)، بطریق۔ قیصر۔ طلسم۔ کیمیا۔ تعلیم۔ قانون۔

ذیل میں پہلوی زبان کی موجودہ فارسی میں تدریجی تحویل کے صوتی قواعد بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں :

۱۔ پہلوی زبان میں مفتوح حمزہ جو غیر متحرک حرف ماقبل اول الفاظ میں استعمال ہوتا تھا فارسی میں اس کا استعمال ترک کر دیا گیا :

پہلوی: اپاک، اواک، اباک، فارسی = با

پہلوی: اَپَر و اَبَر ، فارسی = بر

۲۔ اکثر پہلوی الفاظ میں ادغام سے کام لیا گیا اور انھیں مختصر اور سادہ تر بنایا گیا :

پہلوی: اَپوُرناک : فارسی = برنا

پہلوی: اَروُمیک ، فارسی = رومی

پہلوی: زَیْوندک ، فارسی = زندہ

۳۔ پہلوی زبان کے گ، و، ت ، فارسی میں ی سے بدل دئے گئے :

ہماگون : ہمایون

آذرگوں، آذریوں ، زرگون (معرب : زرجون) = زریون

گ = ای

پتکر = پیکر

پتغام = پیغام

پتوستن = پیوستن

---

[۱] اس کو غیر عربی الاصل ماننا قابلِ غور ہے۔

۴۔ دو متحرک حرفوں کے درمیان ک، گ سے اور آخری س، ہ میں بدل گیا، مثلاً،

پہلوی اکاس = فارسی آگاہ

پہلوی، یکر = فارسی جگر

پہلوی نکاس = فارسی نگاہ

۵۔ کہیں کہیں (و)، (گ) سے بدل دیا گیا، جیسے :

پہلوی وِترذ = فارسی گذرد

پہلوی وناس = فارسی گناہ

پہلوی ویشتاسب = فارسی گشتاسب

۶۔ اکثر پہلوی الفاظ کے آخر کا گ گرا دیا گیا، مثلاً

پہلوی گرتک = فارسی گردہ

پہلوی نامک = فارسی نامہ

پہلوی ورتہ، ورتک (ورد) = فارسی گل

فارسی کے اوّلین شاعر

اکثر قدیم اور جدید ایرانی تذکروں میں بعد اسلام فارسی کے اولین شعر اور شاعر پر بحث کی گئی ہے اور بعض شاعروں کا نام لیا گیا ہے ان میں سے بعض نے اولین پارسی شعر کو بہرام گور ساسانی سے منسوب کیا ہے پہلی صدی ہجری کے وسط سے ادہر عربی کتابوں میں موزوں اور مقفی فارسی جملے ملنے لگتے ہیں۔ درحقیقت ایران جیسے ملک میں جو شعر و موسیقی کا گہوارہ ہے اور جہاں بادشاہوں کے دربار میں شعر و موسیقی کا چرچا ابتدا ہی سے رہا ہے، بعد اسلام اولین شاعر کا تعین کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ عربوں کے قبضہ اور عربی زبان کو ادبی زبان کے طور پر قبول کر لینے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی گمنام لوگوں نے پارسی میں کلام موزوں کیا ہے۔ چنانچہ قدیم ترین کتابوں

یں کہیں کہیں اس کے آثار اور اخبار نظر آجاتے ہیں۔ اس لئے کسی ایک شخص کو فارسی شعر کا موجد اور واضع نہیں سمجھا چاہئے اس بارے میں تذکرہ نویسوں کی روایتیں اتنی بے سروپا اور بے تحقیق ہیں کہ جن لوگوں کے نام بتلائے گئے ہیں ان میں سے کسی ایک کو بے تامل اولین فارسی شاعر مان لینا ممکن نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان قدیم پارسی گو شاعروں کا ذکر کر دیا جائے جو تذکرہ نویسوں کے قول کے مطابق فارسی کے اوّلین شاعر ہیں اور ان کے اشعار کے نمونے اور ان کے ماخذوں کا ذکر کر دیا جائے۔

تذکرہ نویسوں نے دو شاعروں کا نام لیا ہے اور ان کی روایت کے مطابق ان دونوں شاعروں کا زمانہ ایران کی آزادی سے پہلے کا زمانہ ہے۔ یہ ابو حفص سغدی اور عباس مروی ہیں۔

حکیم ابو حفص سغدی جو نحوی اور لغوی بھی تھا، تذکرہ نویسوں کے قول کے مطابق پہلی صدی ہجری میں بقید حیات تھا۔ بقول صاحب کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم سغدی موسیقی بھی جانتا تھا اور آلۂ موسیقی شہرود کے بجانے میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ لیکن اس کتاب کی ایک عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابو حفص تیسری صدی ہجری میں گذرا ہے اور اگر یہ قول صحیح ہے اور ایک ہی شخص مراد ہے، تو ایسی صورت میں اسے ایران کی آزادی سے پہلے کا شاعر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس کا ایک شعر جو مختلف صورتوں میں نقل ہوا ہے، یہ ہے:

آہوئ کوہی در دشت چگونہ دوذا — دو ندارد یار بی یار چگونہ بوذا

ایران کی آزادی سے پہلے کے ایک اور شاعر عباس مروی کا نام لکھا ہے۔ اور اس کے مشہور ترین اشعار جو اس سے منسوب ہیں وہ ہیں جو مرو میں مامون کے ورود یعنی ۱۹۳ھ میں اس کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عباس کو عربی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔

عباس مروی کے قصیدے کے بعض اشعار یہ ہیں:

ای رسانیدہ بدولت فرق خود بر فرقدین — گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین

مر خلافت را تو شایستہ چو مردم دیدہ را — دین یزداں را تو بایستہ چو رخ را ہر دو عین

اسی قصیدے کے دوران میں کہتا ہے :

کس برایں منوال پیش از من چنیں شعری نگفت　　　مرزبان فارسی را ہست تا ایں نوع بین

لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت　　　گیرد از مدح و ثنای حضرت توزیب و زین

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عباس سے پہلے بھی فارسی میں شعر کہنے والے موجود تھے ، لیکن اس سے پہلے ایسی طرز میں کسی نے شعر نہ لکھا تھا۔

تذکروں کی رو سے عباس نے ۲۰۰ھ میں وفات پائی ، لیکن اس شاعر کے قطعی تاریخی حالات معلوم نہیں ہیں ، اور مندرجہ بالا اشعار جو اس کے نام سے منسوب کر کے لکھے گئے ہیں ، اس زمانے کی طرز سخن سے بالکل مختلف ہیں۔

طاہری دور (۲۰۵ - ۲۵۹) کے مشہور شاعر

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے طاہر ذوالیمینین نے مامون کے حکم سے اس کے بھائی امین کے ساتھ جنگ کی ، اسے زیر کیا اور مامون کو خلافت دلائی جو اپنی ماں کی طرف سے ایرانی تھا۔ اس کے بعد طاہر نے خراسان کی امارت پائی اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ، عربوں کے خلاف ایرانیوں کی قومی تحریک بیشتر خراسان ہی سے اٹھی اور یہ صوبہ حقیقت میں قومی جوش و خروش کا مرکز بن گیا۔ اسی طرح یہ صوبہ کئی صدیوں تک فارسی زبان اور فارسی ادبیات کی ترقی کا گہوارہ بنا رہا اور اس صوبہ کے شہر اور اس کے نواحی علاقے جیسے بخارا ، غزنہ ، نیشاپور وغیرہ علم و ادب کے مرکز بن گئے۔

طاہریوں کے دور کا مشہور ترین شاعر حنظلہ بادغیسی تھا ، اور عبداللہ بن طاہر کے دور حکومت میں نیشاپور میں رہتا تھا۔ حنظلہ صاحب دیوان تھا اور احمد بن عبداللہ خجستانی نے اس کا یہ دیوان دیکھا تھا۔ اس کے ایک قطعہ نے اس کو اتنا متاثر کیا ، اس کی اتنی ہمت بندھائی اور اس کے عزائم میں اتنی وسعت پیدا کی کہ وہ خر بندگی سے امارت کے درجہ تک پہنچا ، وہ قطعہ ہے :

مہتری گر بکام شیر در است ‏ ‏ ‏ شو خطر کن ز کام شیر بجوی!
یا بزرگی و عز و نعمت و جاہ! ‏ ‏ ‏ یا چو مردانت مرگ رویا روی!

حنظلہ نے ۲۲۰ھ میں وفات پائی۔

صفاری دور (۲۴۵ - ۲۹۰) کے شاعر

یعقوب بن لیث صفار جس کا نسب بعض اقوال کی رو سے ساسانیوں تک پہنچتا ہے ادنیٰ درجہ سے ترقی کرتے کرتے سیستان پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے کرمان، ہرات بلخ، خراسان اور فارس کو فتح کر کے بغداد کا رخ کیا اور یہاں بھی قریب تھا کہ اس کے لئے راستہ صاف ہو جاتا۔ یعقوب پہلا ایرانی ہے جس نے بالکل آزاد پہلے ایرانی خاندان کی بنا ڈالی۔ اس کے بعد اس کے بھائی عمر بن لیث اور اس کے بیٹے طاہر نے حکومت کی۔

صفاریوں کو طاہریوں سے زیادہ ایرانی ادبیات سے لگاؤ تھا۔ طاہر فارسی ادبیات سے کچھ ایسا واقف نہ تھا، لیکن اس کے برخلاف یعقوب سیستان یعنی ایرانی داستان سرائی کے مرکز اور عرب خلافت کے دور دست علاقہ میں پیدا ہوا تھا اور عربی سے واقف نہ تھا۔ چنانچہ تاریخ سیستان کی روایت کے مطابق اس کی مدح میں جو عربی قصیدے لکھ کر اس کے سامنے پڑھے گئے تھے، انھیں یعقوب سمجھ نہ سکا اور کہا کہ جس چیز کا مطلب میں نہ سمجھ سکوں اس کے پڑھنے سے کیا فائدہ۔ اسی لئے شاعروں نے اور مصنفوں نے اپنی قومی زبان کی طرف توجہ کی۔ اس کے دبیر محمد بن وصیف نے پارسی میں شعر کہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ یعقوب کا علاقہ اور اس کا خاندان فارسی ادبیات کی ترقی کا گہوارہ بن گیا۔ چنانچہ اسی زمانے سے دوسرے شاعروں نے بھی پارسی میں شعر کہنا شروع کیا۔

صفاریوں کے دربار کے مشہور ترین شاعروں میں فیروز مشرقی کا نام لکھا ہے۔ یہ عمر بن لیث (۲۶۵ھ - ۲۸۷ھ) کا ہم عصر تھا۔ اس شاعر کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں قابل ذکر

بات یہ ہے کہ اس نے پارسی شاعری سے فساد دور کیا۔

اس شاعر نے ۲۸۲ھ میں وفات پائی۔ یتر کی تعریف میں اس کا ایک قطعہ نقل ہوا ہے:

مرغیست خدنگ ای عجب دیدی — مرغی کہ بود شکار او جانا

دادہ پر خویش کرگسش ہدیہ — تا نہ بچہ اش برد بہسم مانا

اس دور کا ایک اور شاعر ابو سلیک گرگانی ہے۔ یہ بھی عمرو لیث کا ہم عصر تھا۔ ذیل کا قطعہ اس شاعر سے منسوب ہے اور اس کی متانت فکر اور اس کے بڑے شاعر ہونے پر دلالت کرتا ہے:

خون خود را اگر بریزی بر زمین — بہ کہ آب روی ریزی در کنار

بت پرستیدن بہ از مردم پرست — پند گیر و کار بند و گوش دار

صفاری دور کا ایک اور شاعر محمد بن وصیف ہے۔ حال حال تک یعنی تاریخ سیستان کے دستیاب ہونے تک اس شاعر کا نام معلوم نہ تھا۔ اسی کتاب کی روایت کی رو سے یہ شاعر یعقوب کا دبیر تھا اور اس کی مدح میں پارسی شعر کہے تھے۔

تاریخ سیستان میں اس شاعر کا ایک قصیدہ جو یعقوب کی مدح میں ہے، نقل ہوا ہے۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے:

ای امیری کہ امیران جہاں خاص و عام — بندہ و چاکر و مولای و سگ بندہ و غلام

سامانی دور (۲۶۱ - ۳۸۹) اور فارسی ادبیات کا عروج

سامانی خاندان ایرانی علم و ادب کو زندہ کرنے والا خاندان تھا۔ اس خاندان کے جد کا نام سامان (یا سامان خداۃ) تھا اور یہ اشراف بلخ سے تھا۔ نوح، احمد، یحیی اور الیاس اس کے چار بیٹے تھے اور چاروں کے چاروں خلیفہ مامون کی خدمت میں منسلک تھے۔ خلیفہ کی ان پر خاص نظر عنایت تھی اور یہ روز بروز ترقی کرتے گئے۔ ان چاروں کو مختلف علاقوں کی حکومت ملی۔ نوح کو سمرقند کی، احمد کو فرغانہ کی، یحیی کو چاچ کی اور الیاس کو ہرات کی حکومت عطا ہوئی،

ان بھائیوں میں احمد سب سے زیادہ ہوشیار اور لائق تھا۔ نوح کے مرنے کے بعد اس نے سمرقند اور کاشغر کو اپنے علاقہ میں شامل کر لیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں میں نصر اور خاص کر اسماعیل نے سامانی سلطنت کو کافی ترقی دی۔

سامانی دورِ حکومت کو فارسی زبان اور فارسی ادبیات کی ترقی کا دور شمار کرنا چاہیئے کیونکہ اسی دور میں ایران میں شاعروں کی کثرت ہوئی۔ صاحب تذکرہ لباب الالباب نے ایسے ۲۷ شاعروں کے نام لئے ہیں جو اس دور میں گذرے ہیں۔ سامانیوں کا پائے تخت بخارا بڑے بڑے فقیہوں، ادیبوں اور مصنفوں کا مرکز تھا۔ اسی طرح سامانیوں کے دور میں سمرقند کو بھی علم وادب کے لئے خاص شہرت حاصل ہوئی۔ کہنا چاہیئے کہ بعد اسلام فارسی نظم و نثر کی بنیاد اسی دور میں رکھی گئی۔ اس دور کی شاعری کا بہترین نمونہ رودکی کے اشعار اور اس دور کی نثر کا سب سے اچھا نمونہ تاریخ بلعمی ہے۔ یہ دونوں نمونے نہایت جان دار اور سہل و سادہ ہیں۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ نظم شاہنامہ کی بنیاد بھی سامانیوں کے دور میں رکھی جا چکی تھی۔ معارف پرور سامانی بادشاہوں ــــــ جیسے نوح بن منصور جس سے شاعری بھی منسوب کی گئی ہے ـــــــ کے سوا اس دور میں دانش مند اور دانش دوست وزیر جیسے جیہانی، ابوالفضل بلعمی اور ابو علی بلعمی موجود تھے اور انھوں نے علوم و ادبیات کی ترویج میں بڑی کوشش کی۔ اس دور کے مشہور شاعروں میں ایک شاعر ابو شکور بلخی کا نام لکھا ہے یہ شاعر سامانی دور کے وسط میں گذرا ہے اور نوح بن نصر کے دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ ابو شکور بلخی پہلا مثنوی گو شاعر ہے جو اشعار اس سے منسوب ہیں ان میں ایک شعر ہے جس کے مضمون کو یونانی حکیموں نے بھی بیان کیا ہے اور یونان کے نامی حکیم سقراط نے اس کا ذکر کیا ہے، شعر ہے:

تا بدانجا رسید دانش من   کہ بدانم ہمی کہ نادانم!

اس پر معنی اور مترنم شعر میں خردمند شاعر نے انسانی فکر کی کوتاہی اور دانش و حکمت کی بے کرانی اور خود شناسی کے لازمات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ابو شکور کے کچھ اور شعر ہیں:

درختی کہ تلخش بود گوہرا   اگر چرب و شیریں دھی مرورا
ہمان میوۂ تلخت آرد پدید   ازو چرب و شیریں نخواہی مزید

اس قطعہ میں شاعر نے تعلیم و تربیت میں موروثی صفات کے اثرات کے علمی مسئلہ کو بیان کیا ہے، اسی مضمون کو فردوسی نے ذیل کے قطعہ میں اس سے بہتر اور خوشتر انداز میں پیش کیا ہے :

درختی کہ تلخست ویرا سرشت   گرش برنشانی بباغ بہشت
ور از جوی خلدش بہنگام آب   بہ بیخ انگبین ریزی و شہد ناب
سرانجام گوہر بکار آورد   ہماں میوہ تلخ بار آورد!

ابو شکور بلخی سے ایک اور نظم منسوب کی گئی ہے اور اس کا نام آفرین نامہ لکھا ہے۔ یہ نظم ۳۳۶ھ میں لکھی گئی۔ اس نظم کے متفرق اشعار باقی رہ گئے ہیں اور ان میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں ابو شکور کا خیال ہے کہ آدمی کو اپنی نیک و بدخو کو عقل و دانش کے ذریعہ جاننا چاہیے اس لئے اخلاق کے بنانے میں علم سب سے بڑا عامل ہے :

خردمند داند کہ پاکی و شرم   درستی و راستی و گفتار نرم
بود خوی پاکان چو خوی ملک   چہ اندر زمینی چہ اندر فلک

خردمند وہ ہے جس کا ارادہ اٹل ہے۔ خردمند گویا سردار ہے، اور بے جا خواہشیں اور تمنائیں سپاہی ہیں اور یہ سپاہی اپنے سردار کے حکم کے آگے اپنا سر جھکانے پر مجبور ہیں۔

خردمند گوید خرد پادشاست   کہ بر خاص و بر عام فرماں رواست
خرد را تن آدمی لشکراست   ہمہ شہوت و آرزو چاکراست

دنیا کی دشواریاں اور عمر کی گتھیاں دانش ہی کے ذریعہ دور کی جا سکتی اور کھولی جا سکتی ہیں

کسی کو بدانش برد روزگار   نہ او بازماند نہ آموزگار
جہاں را بدانش تواں رشتن و یافتن   بدانش تواں رشتن و یافتن

اس لئے انسان کی عمر کا سب سے گراں بہا گوہر خرد اور ہنر ہے اور یہ صرف دانش ہی کے ذریعہ ہاتھ آ سکتا ہے :

گہر گر شماری تو بیش از ہنر   نہ بہر ہنر شد گرامی گہر

ابو شکور کے جتنے شعر باقی رہ گئے ہیں ان میں سے بیشتر مثنوی کی طرز پر ہیں۔ غالباً شاعر کو اس صنف سے خاص دلبستگی تھی۔ اس نے آفرین نامہ کے سوا اور بھی مثنویاں لکھی تھیں۔

اس دور کا ایک اور مشہور شاعر ابو المؤید بلخی ہے۔ اس کے اشعار تذکرہ لباب الالباب میں درج ہیں۔

ابو المؤید کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے فردوسی سے پہلے شاہنامہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ قابوس نامہ جیسی قدیم کتابوں میں اس کا ذکر آیا ہے اور لکھا ہے کہ موید کا شاہنامہ نثر میں تھا اس کے سوا ابو المؤید نے یوسف زلیخا کے قصہ کو فارسی میں نظم کیا تھا۔ چنانچہ شاہنامۂ فردوسی کے ایک قلمی نسخہ کے آخر میں لکھا ہے :

مر این قصہ را پارسی کردہ اند   بدو در معانی بگستردہ اند

یکی بو المؤید کہ از بلخ بود!   بدانش ہمی خویشتن را ستود

سامانی دور کا ایک اور شاعر ابو الحسن شہید بلخی ہے یہ اپنے ہم عصر شاعروں میں سب سے زیادہ مشہور ہے اور اکثر تذکروں میں اس کا نام نظر آتا ہے۔ یہ شخص اپنے زمانے کے عالموں میں شمار ہوتا تھا اور اس نے شاعری کی تمام اصناف میں شعر کہے ہیں۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر اسے یکساں قدرت حاصل تھی۔ اس کی عربی منظومات میں سے ایک نظم کا نام لباب الالباب میں نقل ہوا ہے۔ شاعری کے سوا شہید کو فلسفہ میں بھی مہارت حاصل تھی۔ کہتے ہیں کہ اس نے محمد زکریا رازی سے مباحثے کئے تھے۔ اس شاعر کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دانشمندوں کی قدر و منزلت کے کم ہونے اور بے عقلوں کے نصیب میں ناز و نعمت لکھے جانے پر رنجیدہ ہوتا تھا چنانچہ اس نے اپنی دلی آزردگی کا اظہار ان اشعار میں یوں کیا ہے :

دانشا چوں در نعیم آئی از آنک | بی بہائی ولیکن از تو بہاست
بیتو از خواستہ مبادم گنج ! | ہم چنیں زار وار با تو رواست
با ادب را ادب سپاہ بس است | بی ادب با ہزار کس تنہاست

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاعر بلند ہمت تھا۔ علم و ادب کی اس بے قدری پر تاسف کے باوجود وہ علم و دانش کو مال و دولت پر ترجیح دیتا ہے۔ شہید کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی حساس طبیعت رکھتا تھا، اسے دنیا کی برائیوں سے اور دانش وبنیش کی خواری سے بڑا دکھ ہوتا تھا اس لئے اس نے دنیا کو غم کا کاشانہ دیکھا ہے، کہتا ہے :

اگر غم را چو آتش دود بودی | جہاں تاریک بودی جاودانہ
دریں گیتی سراسر گر بگردی | خردمندی نیابی شادمانہ

پھر ایک جگہ کہتا ہے :

دانش و خواستہ است نرگس و گل | کہ بیک جای نشگفند بہم
ہر کرا دانش است خواستہ نیست | ہر کرا خواستہ است دانش کم

یہ قطعہ اس کی اندوہ گینی کا نمونہ ہے :

ابر ہمی گرید چوں عاشقان | باغ ہمی خندد معشوق وار
رعد ہمی نالد مانند من !! | چوں کہ بنالم سحرگاہ زار

بعض بڑے بڑے شاعروں نے شہید کی بڑائی اور اس کے فضل کو تسلیم کیا ہے۔ رودکی نے اس کی وفات پر، جو کہتے ہیں ۳۲۵ھ میں واقع ہوئی، حسب ذیل پر اثر قطعہ لکھا ہے :

کاروان شہید رفت از پیش | وان ما رفتہ گیر و می اندیش !
از شمار دو چشم یک تن کم | وز شمار خرد ہزاران بیش

صاحب لباب الالباب نے شہید کا ایک قطعہ اپنی کتاب میں نقل کیا ہے اور اس قطعہ کو نصر بن احمد بن اسمٰعیل سامانی (۳۰۱ - ۳۳۱) کی مدح میں بتایا ہے۔ اس لحاظ سے شاعر کا زمانہ

متعین ہو جاتا ہے۔

سامانی عہد کے دوسرے مشہور شاعروں میں ایک عمارۂ مروزی ہے۔ اس شاعر کا زمانہ سامانی دور کا آخری زمانہ ہے۔ کیونکہ اس نے آخری سامانی شاہزادے ابو ابراہیم منتصر کا مرثیہ لکھا ہے اور اس نے سلطان محمود کی مدح کی ہے۔

اس خوش کلام شاعر کے جو تھوڑے بہت اشعار اب باقی رہ گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن کا متوالا تھا اور زمین کے رنگ برنگی نقوش، سیمیں برف شاخ بید، اور برگ لالہ سے بڑا لطف اندوز ہوتا تھا۔ ایک قطعہ میں اس نے خزاں کے اختتام اور بہار کی آمد پر نغمہ سرائی کی ہے:

جہاں ز برف اگر چند گاہ سیمیں بود　　　زمرد آمد و بگرفت جای تودۂ سیم
بہار خانۂ کشمیریاں بوقت بہار　　　بباغ کرد ہمہ نقش خویشتن تسلیم
بدور باد ہمہ روی آبگیر نگر　　　پشیزہ ساختہ بر شکل پشت ماہی شیم

ایک قطعہ میں ایک باغ کا نظارہ کھینچا ہے، اس میں ایک طرف پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں تو دوسری طرف ہرے بھرے بید مجنون کے درخت دعوت نظارہ دے رہے ہیں، کہتا ہے:

شاخ بید سبز گشتہ روز باد　　　چوں یکے مست لوان سرنگون
لالہ برگ لعل سنگر بامداد　　　چون سر شمشیر آلودہ بخون!

عمارۂ مروزی نے پند گوئی اور نصیحت سے بھی کام لیا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں جو دنیا کے ظاہر پر فریفتہ اور اپنے مرتبہ پر مغرور ہیں، کہتا ہے:

غرہ مشو بدانکہ جہانت عزیز کرد　　　ای بس عزیز را کہ جہانش کرد زود خوار
مار است این جہان و جہانجوی مار گیر　　　وز مار گیر مار بر آرد شبی دمار

ہمیں معلوم ہے کہ نوح بن نصر کا بیٹا ابو ابراہیم اسماعیل منتصر ایک غیرت مند، مرد میدان اور بہادر سامانی شہزادہ تھا، اس کا شمار ایران کی تاریخ کے گرامی پایہ ہستیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے

ملک کی حفاظت، شاہی خاندان کی نگہ بانی اور اس کا نام ونسل باقی رکھنے کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں اور برسوں میدان کارزار میں داد شجاعت دی ہے۔ عربوں کے ہاتھوں ایسے عظیم المرتبت شہزادے کے قتل (۳۹۵ھ) سے عمارہ بہت زیادہ متاثر ہوا ہے، چنانچہ اس کے مرثیہ میں کہتا ہے :

از خون او چو روی زمین لعل فام شد روی وفا سیہ شد وچشم امید زرد
تیغش بخواست خورد ہمی خون مرگ را مرگ از نہیب خویش مر انشا ہرا بخورد

حکیم کسائی مروزی :۔ ابوالحسن مجدالدین اسحاق کسائی مروزی چوتھی صدی کے آخر کا مشہور شاعر ہے اور اپنے زمانے کے دانش مندوں اور شاعروں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ خراسان کے ایک بڑے شاعر ناصر خسرو نے اپنے اشعار میں اس کا نام لیا ہے اور بعض قلمی نسخوں کی رو سے اس قصیدے کے آخر میں جو کسائی کے جواب میں لکھا گیا ہے، یہ شعر لکھا ہے :

من چاکر وغلام کسائی کہ او بگفت جان وخرد رونده بر این چرخ اخضر ند

عمارۂ مروزی اس کے بارے میں کہتا ہے :

زیبا بود اہ مرو بنازد بکسائی چونانکہ جہاں جملہ باستاد سمرقند

اس شعر میں عمارہ نے ضمناً استاد سمرقند رودکی کو بھی خراج تحسین ادا کیا ہے۔

ایک قصیدے کی رو سے جس کے چند شعر ذیل میں درج کئے گئے ہیں، کسائی ۳۴۱ھ میں پیدا ہوا اور تذکروں اور خود اس کے اشعار کی رو سے اس نے بڑی لمبی عمر پائی جس کا شمار سو سال تک ہوتا ہے یہ شاعر شیعہ تھا اور اس نے حضرت علی کی مدح میں اشعار لکھے ہیں۔

کسائی پہلا فارسی شاعر ہے جس نے دینی قصائد اور حکیمانہ اشعار لکھے اور اخلاقی پند و نصائح کو نظم کا جامہ پہنایا۔ اس لحاظ سے اس کی شاعری نے ناصر خسرو کے لئے نمونہ اور سانچے کا کام دیا۔ چنانچہ ناصر خسرو نے اس سبک میں یعنی مذہبی شاعری، علم و دانش کی تحریص اور حصول

تقویٰ میں طول طویل قصیدے لکھے ہیں۔ ناصر خسرو نے ان قصائد میں کسائی کا نام بھی لیا ہے۔
بعض تذکروں میں قصیدۂ جان وخرد کو جو مطلع ذیل سے شروع ہوتا ہے:

جان وخرد رونده برین چرخ اخضرند | یا هر دوان نهفته درین گوی اغبرند

کسائی سے منسوب کیا گیا ہے۔ ناصر خسرو نے اس قصیدے کا جواب لکھا ہے۔ اس کا مطلع ہے:

بالای هفت چرخ مدور دو گوهرند | کز نور هر دو عالم و آدم منورند

کسائی نے اخلاقی اور معنوی مطالب کی طرف توجہ کرنے کے باوجود عالم حسن کو بالکل فراموش نہیں کیا۔ فطری مناظر نے ہمیشہ اس کے دل پر اثر کیا ہے۔ کبھی آبی نیلوفر کو دیکھا ہے اور اسے تیغ آب دار اور یاقوت تابکار سے تشبیہ دی ہے۔ کبھی پھولوں کو دیکھ کر مست ہوا ہے اور گل فروش کو اس بات پر سرزنش کی ہے کہ وہ ایسی لطیف چیز کو روپیہ کی خاطر بیچتا ہے۔ بارش کے قطروں کو پیل گوش کے پتوں پر دیکھ کر اسے چشم عاشق کے آنسو یاد آئے ہیں، اس کے پتے اسے ایسے معلوم ہوئے ہیں جیسے ایک سفید باز ایک ناسفتہ موتی اپنی چونچ میں لئے جا رہا ہو۔ ایسے میں مے اور معشوق کی یاد بھلا کیسے نہ آتی، اس کے ایسے ہی چند شعر ملاحظہ ہوں:-

نیلوفر کبود نگه کن میان آب | چون تیغ آب داده و یاقوت آبدار
همرنگ آسمان و بکردار آسمان | زردیش در میانه چو ماه ده و چهار
چون راهبی که دو رخ او سال ماه زرد | وز مطرف کبود ردا کرده و ازار

گل نعمتی است هدیه فرستاده از بهشت | مردم کریم تر شود اندر نعیم گل!
ای گل فروش گل چه فروشی برای سیم | وز گل عزیز تر چه ستانی بسیم گل

سرود گوی شد آن مرغک سر دو سرای | چو عاشقی که به معشوق خود دهد پیغام
همی چه گوید گوید که عاشق شبگیر | بگیر دست دلارام و سوی باغ خرام

بر پیل گوش قطرۂ باراں نگاہ کن | چوں اشک چشم عاشق گریاں نمی شدہ
گوئی کہ پر باز سپید است برگ او | منقار باز لؤلؤ ناسفتہ برچدہ

کسائی کے باثر اشعار میں ایک وہ قصیدہ بھی ہے جو کسائی نے خود اپنے حال پر لکھا ہے اور اس جہان کی فنا پذیری، دنیا کی ناپائداری اور ایام جوانی کی برق رفتاری پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اس قصیدے کے بعض اشعار ہیں:

بہ سی صد وچہل ویک رسید نوبت سال | چہار شنبہ وسہ روز باقی از شوال
بیامدم بجہاں تاچہ گویم وچکنم | سرود گویم وشادی کنم بنعمت و مال
ستور وار بدینسان گذاشتم ہمہ عمر | کہ بردہ گشتہ فرزندم واسیر عیال
بکف چہ دارم ازیں پنجہ شمردہ تمام | شمار نامۂ با صد ہزار گونہ وبال
من ایں شمار بآخر چگونہ وصل کنم | کہ ابتداش دروغست و انتہاش خجال
درم خریدہ آزم ستم رسیدۂ حرص | نشانۂ حدثانم شکار ذل سوال
دریغ فر جوانی دریغ عمر لطیف | دریغ صورت نیکو دریغ حسن وجمال
کجا شد آن ہمہ خوبی کجا شد آن ہمہ عشق | کجا شد آن ہمہ نیرو کجا شد آن ہمہ حال
سرم بگونۂ شیر است ودل بگونۂ قیر | رخم بگونۂ نیلست وتن بگونۂ نال
نہیب مرگ بلرزاندم ہمی شب وروز | چو کودکان بدآموز را نہیب دوال
گذاشتیم وگذشتیم وبودنی ہمہ بود | شدیم وشد سخن ما فسانۂ اطفال
ایا کسائی پنجاہ بر تو پنجہ گزارد | بکند بال ترا زخم پنجہ وچنگال!
تو گر بمال واہل بیش ازایں نداری میل | جدا شو از اہل وگوش وقت خویش بمال

رودکی سمرقندی

ابوعبداللہ جعفر بن محمد رودکی سمرقند کے قریب قصبۂ رودک میں پیدا ہوا رودکی کو ایران کا سب سے پہلا بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ کیونکہ اس شاعر کے نہ صرف ایسے اشعار جو اس کی فضیلت اور اس کی بلند خیالی کو ثابت کرتے ہیں، گذشتہ

اور اس کے ہم عصر شاعروں سے زیادہ باقی ہیں، بلکہ تمام تذکرہ نویسوں نے اس کا اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اس کے سوا بہت سے شاعروں نے اور خاص کر اس کے ہم عصر شعرا، جیسے شہید بلخی، اور معروف بلخی وغیرہ نے اس کی بڑی تعریف کی ہے اور ان لوگوں نے جو اپنے آپ کو بہت بڑا شاعر گردانتے تھے، رودکی کے ساتھ رقابت کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ معمری گرگانی جو اپنے آپ کو بہت بڑا اور کامل شاعر سمجھتا تھا اور اس کے اشعار سے بھی اس کی قوت سخن آزادگی اور بے نیازی آشکار ہے رودکی کے ساتھ اپنا مقابلہ کرتا ہے اور کہتا ہے:

اگر بدولت با رودکی نہ ہمسانم　　عجب مکن سخن از رودکی نہ کم دانم

عنصری جو قصیدہ کا استاد تھا، غزل میں رودکی کی ہنرمندی اور استادی کی تصدیق کرتا ہے اور اس طرح اس کی تعریف کرتا ہے:

غزل رودکی وار نیکو بود　　غزل ہائے من رودکی وار نیست
اگرچہ بکوشم بباریک وہم!　　بدیں پردہ اندر مرا بار نیست

کسائی مروزی اس کے بارے میں کہتا ہے:

رودکی استاد شاعران جہاں بود　　صد یک از او توئی کسائی برگست[۵]

مسعود سعد فخریہ کہتا ہے:

سجود آرد بہ پیش خاطر من　　روان رودکی و ابن ہانی

خاقانی اپنے شعر کی تعریف میں کہتا ہے:

رودکی آنکہ دُر ہمی سفتی　　مدح سامانیان ہمی گفتی

عالموں اور فاضلوں نے بھی رودکی کی تعریف کی ہے۔ اسمٰعیل بن احمد سامانی کے مشہور وزیر ابوالفضل بلعمی کا قول ہے کہ عرب اور عجم میں رودکی کا جواب نہیں۔ بلعمی نے رودکی کی نہ صرف تعریف کی ہے بلکہ اس کی قدردانی کی ہے اور سے صلہ اور انعام دیا ہے۔ چنانچہ چھٹی صدی کے شاعر سوزنی نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

۵۔ "برگست" یعنی ہرگز، حاشا

صد یک از آنچه تو بکبین شاعری دہی	از بلعمی بعبری نگرفت رودکی!!

رودکی کا سبک اور شاعری

رودکی کو قصیدہ رباعی، مثنوی، قطعہ، غزل، غرض تمام فنون سخن اور انواع شعر میں مہارت حاصل تھی اور وہ ہر طرز میں کامیاب رہا ہے۔ خاص کر قصیدہ سرائی میں وہ سب کا پیش رو ہے اس لحاظ سے کہنا چاہیے کہ رودکی بعد اسلام ایران کا پہلا بڑا شاعر ہے جس نے نہایت بلند پایہ اور محکم قصیدے لکھے ہیں

رودکی نہ صرف سخن پردازی اور الفاظ کے تناسب کا استاد تھا، بلکہ اس نے نہایت دقیق معانی سے بھی کام لیا ہے اور عبرت آمیز قطعات اور حکیمانہ اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں مثلاً اس کے پند آمیز قطعات میں سے ایک قطعہ ہے :

زمانہ پندی آزادہ وار داد مرا!	زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پند است

بروز نیک کساں گفت غم مخور زنہار	بسا کسا کہ بروز تو آرزومند است

اس موضوع پر اس نے بہت سے شعر کہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر دنیا کے غم و اندوہ کے مقابلہ میں قوی دل اور توانا فکر تھا اور ہر موقع پر بردباری کی دعوت دیتا تھا۔ کیونکہ اس کے نزدیک مرد وہی ہے جو پہاڑ کی طرح اپنی جگہ سے نہ ہلے، حوادث کی بڑی سے بڑی موجیں اس کو ڈرا نہ سکیں، اس مضمون کو رودکی نے ایک قصیدہ میں خوب بیان کیا ہے۔ یہ قصیدہ مشاہیر میں سے کسی کی وفات پر لکھا گیا ہے اور اس کے آخر میں آسیب روزگار اور تشویش افکار کا ذکر کر کے دلداری کی کوشش کی ہے۔ اس قصیدے کے چند شعر ہیں :

ای آنکہ غمگنی و سزا داری	وندر نہاں سرشک ہمی باری

رفت آنکہ رفت و آمد آنک آمد	بود آنکہ بود خیرہ چہ غم داری

ہموار کرد خواہی گیتی را	گیتی است کی پذیرد ہمواری

رو تا قیامت آید زاری کن ! کی رفتہ را بزاری باز آری
مستی مکن کہ نشنود او مستی زاری مکن کہ نشنود او زاری
اندر بلای سخت پدید آید ! فضل و بزرگ مردی و سالاری

اس شاعر نے بڑی طویل عمر پائی تھی اور اس نے جو فرحت بخش اشعار لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اپنے اقوال پر کاربند تھا۔ اس نے تندرست اور شادمان زندگی بسر کی تھی اور اگر اس کے اندھے ہونے کی روایت صحیح ہے تو اس کی بردباری اور سبک روحی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اس کی اندرونی روشنی نے بیرونی تاریکی پر غلبہ حاصل کر لیا تھا ایسی توانائی اور ایسی سعادت حاصل کرنے کے لئے شاعر نے چار وسائل دریافت کئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان چار وسائل کو زندگی کے چار رکن کہنا چاہیئے یہ چار رکن کیا ہیں، خرد، تندرستی، نیک خوئی اور نیک نامی، چنانچہ کہتا ہے :

چہار چیز مر آزادہ را ز غم بخرد تن درست و خوی نیک و نام نیک و خرد
ہر آنکہ ایزدش این ہر چہار روزی کرد سزد کہ شاد زید جاودان و غم نخورد

باوجود اس کے کہ رودکی ہمیں زندہ دلی، شادمانی اور اس دنیا کی نعمتوں سے استفادے کی دعوت دیتا ہے، دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ شان و شکوہ اور اس کے جلوہ کے فریب میں نہ آنا چاہیئے اور نعمت و جاہ پر مغرور نہ ہونا چاہیئے :

مہتران جہان ہمہ مردند ! مرگ را سر ہمہ فرو کردند
زیر خاک اندرون شدند آنان کہ ہمہ کوشکہا بر آوردند !
از ہزاران ہزار نعمت و ناز نہ با آخر بجز کفن بردند

اگر انسان نیکی، خدمت اور مردانگی کو فراموش کر دے اور دنیا گیر اور خود پرست بن جائے تو آخر کار یہی دنیا اسے پچھاڑ دیتی ہے۔ اس لئے زندگی کے تھوڑے سے دن ہنسی خوشی کے ساتھ کاٹ دینے چاہیئے۔ لیکن غفلت کے ساتھ نہیں، بلکہ بیداری کے عالم میں۔

ریاکاری، ظاہرداری، خوش ظاہری، اور بدباطنی خردمندوں کے مذہب میں حرام ہیں۔
کیا فائدہ اگر کوئی نماز میں کھڑا ہوا ہو اور اس کا دل کسی اور جگہ پھنسا ہوا ہو :

روی بمحراب نہادن چہ سود   دل بہ بخارا و بتان طراز
ایزد ما وسوسۂ عاشقی   از تو پذیرد نپذیرد نماز

جیساکہ اوپر کہا جا چکا ہے، رودکی قصیدہ کا استاد تھا، اور ایک خاص سبک میں جسے اب خراسانی سبک یا ترکستانی سبک کہا جاتا ہے، شعر کہتا تھا۔ اس سبک کی ایک خصوصیت سادگی اور ہر حال میں متانت و سنجیدگی ہے۔ رودکی کے جو قصائد باقی رہ گئے ہیں ان میں سے ایک قصیدہ وہ ہے جو حسب ذیل مطلع سے شروع ہوتا ہے :

مادر می را بکرد باید قربان   بچۂ او را گرفت و کرد بزندان

رودکی نے یہ قصیدہ امیر ابوجعفر احمد صفاری کی مدح میں لکھا ہے۔ یہ امیر یعقوب صفاری کے خاندان سے تھا اور نصر بن احمد سامانی کے دربار میں بڑا رتبہ رکھتا تھا۔ نصر بن احمد سامانی نے اسے سیستان کی امارت عطا کی تھی۔ رودکی نے یہ قصیدہ اس وقت لکھا ہے جب کہ بادشاہ نے اپنے اس امیر کو اپنی مجلس میں یاد کیا تھا۔ یہ قصیدہ خراسانی سبک کی طرح سادہ اور محکم ہے اور ایسی پرتکلف مدح سرائی جو رودکی کے بعد کی صدی میں رائج ہو گئی تھی، اس قصیدہ میں ناپید ہے۔ لڑائی کے روز امیر گویا "پیل دمان" "اسفندیار زماں" اور سارا عالم اس کے تیروں سے ترسان و لرزان ہے۔ یہ امیر سخاوت سے کام لیتا ہے، شاعروں اور سخندانوں کو نوازتا ہے۔ انصاف کے وقت قوی اور ضعیف دونوں اس کے سامنے برابر ہیں۔ اس کی نعمت کا دسترخوان سب کے لئے ہے اور اس کی بخشش کی بارش سب پر ہوتی ہے۔

رودکی کے قصیدوں میں ایک اور قصیدہ ہے جو اس نے اپنے بڑھاپے کے زمانے میں اپنی حالت پر لکھا ہے۔ اس قصیدے میں اس نے جوانی کے دنوں کے مزوں اور بڑھاپے کے دنوں کے ضعف کا نقشہ کھینچا ہے۔ اسی قصیدے کے سلسلہ میں اس نے اپنی شاعری، اپنی

شاعری کی شہرت اور اس کے اثر و نفوذ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس قصیدے کے چند شعر ہیں :

مرا بسود و فرو ریخت ہرچہ دندان بود　　نبود دندان لا بل چراغ تابان بود
سپید سیم رده بود و دُرّ و مرجان بود　　ستارهٔ سحری بود و قطرہ باران بود
دلم خزانہ پر گنج بود گنج سخن !　　نشان نامہ ما مہر و شعر عنوان بود
ہمیشہ شاد و ندانستمی کہ غم چہ بود　　دلم نشاط و طرب را ہمیشہ میدان بود
بسا دلا کہ بسان حریر کردہ بشعر　　از آن سپس کہ بکردار سنگ و سندان بود
عیال نہ زن و فرزند نہ مؤنت نہ　　ازین ستم دلم آسودہ بود و آسان بود
تو رودکی را ای ماہ رو ہمی بینی!　　بدان زمانہ ندیدی کہ این چنینان بود
بدان زمانہ ندیدی کہ در جہان رفتی　　سرود گویان گوئی ہزار دستان بود
ہمیشہ شعر ورا زی ملوک دیوانست　　ہمیشہ شعر ورا زی ملوک دیوان بود
شد آن زمانہ کہ شعرش ہمہ جہان بنوشت　　شد آن زمانہ کہ او شاعر خراسان بود
کرا بزرگی و نعمت زاین و آن بودی　　ورا بزرگی و نعمت ز آل سامان بود
کنوں زمانہ دگر گشت و من دگر گشتم　　عصا بیار کہ وقت عصا و انبان بود

رودکی کے اور کمالات میں سے ایک کمال جس کا تمام تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے، موسیقی میں اس کی مہارت اور نغمہ سرائی کا کمال ہے۔ چنانچہ خود کہتا ہے :

رودکی چنگ برگرفت و نواخت　　بادہ انداز کو سرود انداخت

سامانی بادشاہوں کی خدمت میں رودکی اپنے شعر گا کر سناتا تھا اور اس کے ساتھ چنگ بجاتا تھا، اس کی خوش نوائی کے اثر کا اندازہ کرنے کے لئے یہ واقعہ کافی ہے کہ نصر بن احمد سامانی اپنے ایک سفر میں بخارا کو بالکل بھلا بیٹھا تھا۔ درباریوں کو اپنے وطن اور اپنے گھروں کی یاد ستا رہی تھی، لیکن اتنی جرأت ان میں نہ تھی کہ خود نصر بن احمد سامانی سے وطن چلنے کے لئے کہتے۔ ان درباریوں نے رودکی کا وسیلہ ڈھونڈا اور اس سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح

امیر کو بخارا واپس چلنے پر آمادہ کرے۔ رودکی نے کچھ شعر کہے، صبح امیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور چنگ اٹھا کر وہ مشہور قصیدہ گانا شروع کر دیا جس کا مطلع یہاں نقل کیا جاتا ہے:

بوی جوی مولیاں آید ہمی یاد یار مہربان آید ہمی!

رودکی نے یہ قصیدہ کچھ اس طرح گایا کہ امیر کے دل میں اتر گیا اور اسے کچھ ایسا مست و بے خود کیا کہ وہ موزے تک پہنے بغیر بخارا کی طرف چل پڑا۔

رودکی کی ایک اہم تصنیف منظوم کلیلہ و دمنہ تھی۔ اس کی اصل کو ایک ایرانی عالم ابن مقفع نے پہلوی سے عربی میں منتقل کیا تھا۔ رودکی کی یہ منظوم تصنیف اب ناپید ہو گئی ہے اور اس کے کچھ شعر فرہنگ اسدی طوسی اور تحفتہ الملوک نامی ایک اور کتاب میں ہم تک پہنچے ہیں اس خدمت کے صلہ میں اسے بادشاہ کی طرف سے انعام ملا تھا اور جیسا کہ عنصری سے منسوب شعر میں کہا گیا ہے اسے انعام میں چالیس ہزار درم ملے تھے۔

کیا الفاظ کے لحاظ سے اور کیا معنی کے لحاظ سے رودکی کے کلام میں بڑی تازگی پائی جاتی ہے اس کے اکثر شعر عربی زبان کے اثر سے آزاد نظر آتے ہیں۔ رودکی کے اشعار کی تعداد میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ صاحب لباب الالباب کہتا ہے کہ اس کے اشعار کے سو دفتر ہیں اور اسی سلسلہ میں رشید سمرقندی کا شعر پیش کیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ:

شعر او را برشمردم سیزدہ رہ صد ہزار ہم فزون آید اگر چونانکہ باید بشمری!

بہرحال اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ استاد رودکی نے شعر بہت کہے تھے۔ افسوس ہے کہ ان اشعار میں سے ایک دیوان کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا۔ ان میں سے بھی بہت سے شعر قطران تبریزی سے منسوب ہیں۔ ان دو شاعروں کے ممدوحوں میں متاخرین کو جو اشتباہ ہوا ہے اس کی وجہ سے قطران کے اشعار رودکی کے اشعار میں مخلوط ہو گئے ہیں۔ رودکی نے ۳۲۹ھ میں وفات پائی یعنی وہ اپنے ممدوح اور سرپرست نصر بن احمد سامان سے دو سال پہلے فوت ہو گیا۔

دقیقی طوسی | ابو منصور محمد بن احمد دقیقی سامانی دور کا آخری بڑا شاعر ہے اور کہنا چاہیئے کہ سامانی

دور کے شاعروں میں اس شاعر کو رودکی کے بعد دوسرا درجہ حاصل ہے۔ اس شاعر کو منصور بن نوح (۳۵۰ھ ۔ ۳۶۶ھ) اور نوح بن منصور (۳۶۶ھ ۔ ۳۸۷ھ) کے دور حکومت میں شہرت حاصل ہوئی۔ دقیقی کے وطن کے بارے میں تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے۔ بعضوں نے بلخ بتایا ہے بعضوں نے بخارا اور بعضوں نے سمرقند۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ بلخ کا رہنے والا تھا۔

دقیقی پہلے چغانی یا آل محتاج کے امیر فخرالدولہ ابوسعید منصور چغان کا مداح تھا۔ چغانیوں کی حکومت ماوراءالنہر میں تھی، اور یہ سامانیوں کے ماتحت تھے۔ چھٹی صدی ہجری کے شاعر معزی کا یہ شعر چغانیوں کے دربار سے دقیقی کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے:

فرخندہ بود بر متنبی بساط سیف　　　چونانکہ بر جلیم دقیقی چغانیاں

اسی طرح چھٹی صدی کی تالیف کتاب چہار مقالۂ عروضی سمرقندی میں بیان کیا گیا ہے کہ جب عمید اسعد چغانیوں کے امیر کے پاس فرخی کو لے گیا تو اس سے کہا "ترا ای خداوند شاعری آوردہ ام کہ تا دقیقی روی در نقاب خاک کشیدہ است کس مثل او ندیدہ"

یہ وہی امیر ہے جس کی فرخی نے مدح کی ہے اور داغ گاہ کا مشہور قصیدہ اسی کی مدح میں لکھا ہے اس قصیدے میں فرخی کہتا ہے:

تا ترا زندہ مدیح تو دقیقی درگذشت　　　ز آفرین تو دل آگندہ چناں کز دانہ نار

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرخی نے یہ قصیدہ اس وقت لکھا ہے جب کہ دقیقی انتقال کر چکا تھا۔ دقیقی نے قصیدوں اور مدائح کے سوا غزل بھی لکھی ہے اور عنصری جیسے بڑے شاعروں نے اس کے سبک کو پسند کیا اور اس کی پیروی کی ہے۔

اس شاعر کی شہرت کا بڑا سبب اس کا شاہنامہ ہے۔ یہ شاہنامہ اس نے ساتویں سامانی امیر نوح بن منصور کے حکم سے نظم کرنا شروع کیا۔ اس طرح اس کام میں وہ حکیم فردوسی کا پیش رو ہے۔ ابھی دقیقی نے شاہنامہ کا ایک حصہ بھی پورا نہیں کیا تھا کہ جوانی میں ایک غلام کے ہاتھ سے مارا گیا۔ غالباً شاعر کی اس ناگہانی موت کا یہ حادثہ امیر نوح بن منصور کے دور حکومت

کی ابتداء (یعنی ۳۶۷ ؁ ۔ ۳۷۰ ؁) کے اندر پیش آیا ہوگا۔ کیونکہ فردوسی (جس نے ان ہی سنوں میں مکمل شاہنامہ کو نظم کرنا شروع کیا) کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام اس نے دقیقی کی موت سے چند سال بعد ہی شروع کیا ہے۔ لیکن دوسری روایتوں کی رو سے دقیقی نے اس کے بعد وفات پائی ہے۔ دقیقی کے اشعار کی تعداد کے بارے میں روایتیں مختلف ہیں لیکن حقیقت میں اس کی وفات کے بعد جو اشعار ملے ان کی گنتی ایک ہزار تھی۔ اور فردوسی نے ان اشعار کو من وعن اپنے شاہنامہ میں نقل کر لیا ہے اس نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دقیقی کا کلام بس اتنا ہی ہے۔ ان ہزار شعروں میں دقیقی نے گشتاسب اور ظہور زرتشت کا بیان نظم کیا ہے اور زردشت کی اتنی تعریف کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ایران باستان کے دین کا خاص احترام اور بڑی محبت موجود تھی۔

دقیقی کے جو تھوڑے بہت قصیدے باقی رہ گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص سبک اور روش کا مالک تھا۔ اس کے کلام میں پختگی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ قصیدے کے ضمن میں وہ پند و نصیحت، رہنمائی اور مردانہ صفات کے حاصل کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے ذیل کے قصیدے میں وہ اپنے ممدوح کو دلیری، سخاوت اور خرد یعنی ان تین بڑی صفتوں کے حاصل کرنے کی تحریص دلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بزدل خردمند سے بے عقل دلیر و شجیع اور بھی بدتر ہے کسی میں عقل بھی ہے اور دلاوری بھی، لیکن اگر وہ سخاوت، دلداری، زربخشی اور دستگیری کی صفت سے محروم ہو تو اس کی شجاعت قساوت کی صورت میں اور اس کی عقل خست اور خود پرستی کی صورت میں جلوہ گر ہوگی۔ اگر دل میں کبھی کسی کی طرف سے کینہ اور انتقام کے جذبات موجزن ہوں تو کبھی اس میں مہر و محبت اور لطف و کرم کا بھی طوفان اٹھنا چاہیئے۔

زو دو چیز گزیند مر مملکت را یکی پرنیانی یکی زعفرانی
یکی زر نام ملک بر نوشتہ دگر آہن آب دادۂ یمانی
کرا بویۂ وصلت ملک خیزد یکی جنبشی باید ش آسمانی!

زبانی سخن گوئی و دستی گشاده	دلی همش کینه همش مهربانی
که ملکت شکاریست کو را نگیرد	عقاب پرنده نه شیر ژیانی
دو چیز است کو را به بند اندر آرد	یکی تیغ هندی دگر زر کانی !
بشمشیر باید گرفتن مر او را	بدینار بستنش پای ار توانی
کرا بخت و شمشیر و دینار باشد	و بالا تن تهم و نسبت کیانی
خرد باید آنجا و جود و شجاعت	فلک کے دهد مملکت را یگانی

دقیقی کے بعض قصیدے اور قطعے غزل کی طرح پر لطف ہیں۔ مثلاً ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو۔ اس میں مئے و معشوق اور رعنائی فطرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی تشبیہیں نہایت رنگین اور خیالات نہایت لطیف ہیں۔ سبزہ نے اپنا بہشتی خلعت زمین پر پھیلا دیا ہے اور سرخ پھولوں نے چمن کو خون آلود دیبا کا لباس پہنا دیا ہے دنیا مور کی طرح اور چمن رنگا رنگی تماشے دکھا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان پر دوست کی تصویر اتر آئی ہے۔ پھول کھلے ہوئے ہیں، پھولوں میں گلاب کی بو مہک اٹھی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مٹی کے اندر پھولوں کو گوندھ دیا گیا ہے:

برافگند ای صنم ابر بهشتی !!	زمین را خلعت اردی بهشتی
بهشت عدن را گلزار ماند !!	درخت آراسته حور بهشتی
زمین بر سان خون آلوده دیبا	هوا بر سان نیل اندوده وشتی
چنان گردد جهان هزمان که گوئی	پلنگ آهو نگیرد جز بکشتی
بطعم نوش گشته چشمهٔ آب	برنگ دیدهٔ آهوی دشتی
بتی باید کنون خورشید چهره	مهی کو دارد از خورشید پشتی
جهان طاؤس گونه گشت دیدا	بجائی نرمی و جائے درشتی
بدان ماند که گوئی از می و مشک	مثال دوست بر صحرای نوشتی
زگل بوی گلاب آید بدانسان	که پنداری گل اندر گل سرشتی

دقیقی چہار خصلت برگزیدست ۔۔۔ بگیتی از ہمہ خوبی و زشتی
لب یاقوت رنگ و نالۂ چنگ ۔۔۔ می خوش رنگ و دین زردہشتی

سامانی دور کی نثر

سامانیوں کے عہد میں نظم کی طرح فارسی نثر کو بھی ترقی حاصل ہوئی۔ اس دور میں مصنفوں نے کتابیں لکھیں، ان میں سے کچھ انقلاب زمانہ سے ناپید ہوگئیں اور کچھ محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان میں سے ایک شاہنامہ کا مقدمہ ہے۔ شاہنامہ کا یہ مقدمہ طوس کے حاکم ابو منصور بن عبدالرزاق کے حکم سے ۳۴۶ھ میں لکھا گیا ہے۔ دوسری اہم کتاب تاریخ طبری کا ترجمہ ہے۔ اس کا مترجم عبدالملک بن نوح (۳۴۳ھ۔ ۳۵۰ھ) اور منصور بن نوح (۳۵۰ھ۔ ۳۶۶ھ) کا وزیر ابو علی محمد بلعمی ہے۔ اس نے یہ عربی تاریخ امیر منصور کے حکم سے فارسی میں منتقل کی ہے۔ یہ کتاب نہایت سادہ اور رواں نثر میں لکھی گئی ہے اور اس عہد کی طرز تحریر کی ایک اچھی مثال ہے۔

سامانی عہد کی نثر کی ایک اور کتاب تفسیر طبری کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بھی منصور بن نوح کے حکم سے ماوراءالنہر کے کسی عالم نے کیا ہے۔ ان کتابوں کے سوا قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے جس کے بارے میں بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ یہ بھی سامانی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کتابوں کے سوا اور بھی تالیفیں ہیں جو یا تو ابھی دریافت نہیں ہوئی ہیں، یا ان کی نشر و اشاعت کی نوبت نہیں آئی ہے۔

اب یہاں نمونہ کے طور پر ہر کتاب میں سے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں:

مقدمۂ شاہنامۂ ابومنصوری سے:

"سپاس و آفرین خدای را کہ این جہان و آن جہان را آفریدہ و ما بندگان را اندر جہان پدیدار کرد و نیک اندیشان را و بدکرداران را پاداش و بادافراہ برابر داشت و درود بر برگزیدگان و پاکان و دین داران باد خاصہ بر بہترین خلق خدا محمد مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم و بر اہل بیت و فرزندان او باد۔

آغاز کار شاہنامہ از گرد آوریدہ ابو منصور المعمری دستور ابو منصور عبد الرزاق عبد اللہ فرخ اول ایدون گوید دریں نامہ کہ تا جہاں بود مردم گرد دانش گشتہ اند و سخن را بزرگ داشتہ و نیکوترین یادگاری سخن دانستہ اند . . . . "

تاریخ طبری کے ترجمہ سے :

"سپاس و آفرین مر خدای کامگار و کامران و آفریدہ زمین و آسمان و آنکس کہ نہ ہمتا (دارد) و نہ انباز و نہ دستور و نہ یار و نہ زن و نہ فرزند ہمیشہ بود و ہمیشہ باشد و بر ہستی او نشانہای آفرینش پیداست و آسمان و زمین و روز و انچہ بدو اندراست و چون بخود نگاہ کنی بدانی کہ آفرینش او بر ہستی او گواست و عبادت وی بر بندگان وی واجب و ہویداست "

تفسیر طبری کے ترجمہ سے :

"و ایں کتاب تفسیر بزرگست از روایت محمد بن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ کردہ بزبان پارسی دری راہ راست و ایں کتاب را بیاوردند از بغداد چہل مصحف بود ایں کتاب نبشتہ بزبان تازی و باسنادہای دراز بود و بیاوردند سوی امیر سید مظفر ابو صالح منصور بن نوح بن نصر بن احمد بن اسمٰعیل چنان خواست کی مر ایں ترجمہ کند بزبان پارسی و علماء ماوراء النہر را گرد کرد کی روا باشد . کما ایں کتاب را بزبان پارسی گردانیم ۔"

ان مختصر سے نمونوں ہی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں فارسی نثر کتنی سادہ اور روان تھی ۔ اس میں پیچیدہ عبارتیں بہت کم تھیں ، اور جملے چھوٹے چھوٹے لکھے جاتے تھے اور رسم خط اور الفاظ کا تلفظ بھی آج کل کے رسم خط اور تلفظ سے مختلف تھا

سامانی دور کے عربی نویس علماء سامانیوں نے جو طاہریوں اور صفاریوں کی طرح عباسیوں کے ہم عصر تھے ، نہ صرف فارسی ادبیات کو رونق دی بلکہ عربی اشعار اور ادبیات کی بھی سرپرستی کی ۔ سامانی دربار اور دربار سے باہر ہر جگہ اس زمانے کے ایرانی عالموں نے علوم کے ہر شعبہ میں اپنے زبردست آثار چھوڑے ہیں جیسا

اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے، خاص طور پر سامانی دربار شاعروں کا مجمع تھا اور ان میں سے بہت سے شاعر عربی میں شعر کہتے تھے۔ بلکہ انھوں نے بعض کتابیں بھی اسی زبان میں لکھی ہیں۔

اس عہد کے ایسے ایرانی علماء جنھوں نے عربی میں تصنیف وتالیف کا کام انجام دیا ہے بہت ہیں۔ یہاں تاریخ وادب میں ابن قتبہ، دینوری، حمزہ اصفہانی اور طبری، جغرافیہ میں ابن فقیہ ہمدانی حدیث میں محمد بن یعقوب کلینی، ابن بابویہ، طب میں ذکریا رازی موسیقی میں اسحاق موصلی اور ریاضی ونجوم میں ابو معشر بلخی کا نام لینا کافی ہے۔

ابن قتبہ کی تصانیف ادب اور تاریخ میں مشہور ہیں۔ مثلاً کتاب الشعر والشعراء، عیون الاخبار، ادب الکاتب وغیرہ۔ ابن قتبہ کا سنہ وفات ۲۷۶ لکھا ہے۔

دینوری، ابن قتبہ کا ہم عصر اور ہم وطن تھا۔ اس کی کتاب اخبار الطّوال مشہور ہے اس نے تاریخ، سیاست اور ادب پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ کسی نے ۲۸۱ سنہ اور کسی نے ۲۹۰ سنہ لکھا ہے۔

حمزہ اصفہانی لغت اور تاریخ میں استاد تھا اس نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ تاریخ میں اس کی کتاب سنی ملوک التجم مشہور ہے۔ اس کے سوا تصحیف میں بھی اس کی ایک کتاب باقی ہے۔ حمزہ اصفہانی نے ۳۵۰ سنہ یا ۳۶۰ سنہ میں وفات پائی۔

محمد جریر طبری طبرستان کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنی مشہور مفصل عام تاریخ کے علاوہ قرآن کی تفسیر بھی لکھی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے منصور بن نوح سامانی کے حکم سے ان دونوں کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ طبری نے ۳۱۰ سنہ میں وفات پائی

ابن فقیہ ہمدانی مشہور جغرافیہ دان تھا۔ اس نے ۲۹۰ سنہ میں جغرافیہ کی اپنی مشہور کتاب کتاب البلدان تالیف کی۔

محمد بن یعقوب کلینی مشہور شیعہ محدث ہیں۔ حدیث میں ان کی اہم تالیف کتاب کافی ہے۔ کلینی نے ۳۲۹ سنہ میں وفات پائی۔

محمد بن علی معروف بہ ابن بابویہ ملقب بہ صدوق قم کے رہنے والے تھے ان کا شمار شیعوں کے چوٹی کے فقیہوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کتاب من لا یحضرہ الفقیہ شیعہ فقہ کا ماخذ و منبع سمجھی جاتی ہے۔

ابو بکر محمد بن زکریا رازی رے کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار اسلام کے مشاہیر علما اور حکماء میں کیا جاتا ہے آپ ۲۴۰ھ میں بمقام رے پیدا ہوئے اس دانش مند، بزرگ اور بلند پایہ حکیم نے نہ صرف ادب و حکمت میں بڑا کمال پیدا کیا بلکہ بہت سی کتابیں بھی لکھیں اور حکمت کی دنیا میں بڑا اونچا مقام حاصل کیا۔ آپ رے اور بغداد میں طبابت کرتے تھے اور ان دونوں شہروں کے "بیمارستانوں" میں تجربے کرتے تھے۔ رازی نے اپنی تحقیقات اور تجربے زیادہ تر بغداد میں کئے جہاں وہ ایک "بیمارستان" کے صدر تھے۔ اسلامی علوم کے اس مشہور مرکز یعنی شہر بغداد میں آپ کا قیام ۲۷۵ھ سے ۲۸۹ھ تک رہا۔

طب میں آپ کی مشہور کتابوں میں ایک کتاب حاوی ہے۔ اس کتاب کو اس زمانے کی طبی معلومات کی جامع سمجھنا چاہئے۔ ان کی دوسری کتاب کتاب الطب المنصوری ہے۔ اسے آپ نے رے کے حاکم منصور بن اسحاق سامانی کے حکم پر تالیف کیا ہے۔ رازی دواؤں اور عناصر کی ترکیب، تجزیہ اور علم کیمیا میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے چوٹی کے کیمیادانوں میں شمار ہوتے تھے۔ اسی لئے انھیں علم کیمیا کی تاریخ میں بڑا اونچا مقام حاصل ہے گمان غالب یہ ہے کہ رازی نے ۳۲۰ھ یا ۳۰۲ھ میں وفات پائی۔

اسحاق موصلی ابو محمد اسحاق بن ابراہیم موصلی اصلاً ایرانی تھا اور ایران کے ایک محترم خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ اپنے مولد موصل کی نسبت سے موصلی مشہور ہوا ابراہیم کا شمار اپنے زمانے کے موسیقی کے زبردست استادوں میں ہوتا تھا لیکن اس فن میں اسحق نے اپنے باپ سے بھی زیادہ نام پیدا کیا۔ علم موسیقی کی تحصیل اور ریاضی سے واقف ہوئے

بغیر اس نے اپنی فطری صلاحیت اور جودت طبع سے موسیقی کے ایسے اصول و قواعد وضع کئے کہ یونانی علم موسیقی کا جو دفتر اسی زمانے میں ترجمہ ہوا تھا اس کے آگے گاؤ خورد ہو گیا۔ موسیقی کے سوا اسحاق فن حدیث اور لغت و نحو میں بھی استاد تھا اور شعر بھی خوب کہتا تھا اس زمانے کے اہل ذوق اس کے اشعار کو بہت پسند کرتے تھے۔ اپنے علم و فضل کی وجہ سے وہ علم موسیقی کے ماہر کی حیثیت سے مشہور ہونا نہیں چاہتا تھا اور فقیہوں اور ادیبوں کے ساتھ خلفاء کی مجالس میں بار پانا چاہتا تھا۔ آخر کار مامون نے ارباب فقہ و ادب کے ساتھ اسے اپنے دربار میں بار دیا اسحاق ۱۵۰ھ میں پیدا ہوا اور ۲۳۵ھ میں انتقال کر گیا۔

ابو معشر بلخی جعفر بن محمد بن عمر منجم جو ابو معشر کے نام سے مشہور ہے، تیسری صدی ہجری کے مشاہیر منجموں اور عالموں میں شمار ہوتا ہے۔ پہلے تو اس نے حدیث کی تحصیل کی اور مشہور عرب فلسفی یعقوب بن اسحاق کندی پر اعتراضات کئے اور اس کی تعلیم اور اس کے فلسفہ پر کڑی نکتہ چینی کی۔ اس پر بغداد کے باشندے یعقوب سے بگڑ گئے۔ یعقوب نے خفیہ طور پر بعض لوگوں کو اس بات پر مقرر کیا کہ وہ ابو معشر کو حساب اور ہندسہ کی تحصیل پر لگا دیں۔ ابو معشر نے ان دونوں علوم کی تحصیل پر کمر ہمت باندھی اور ان میں بڑا کمال حاصل کیا۔ اس کے بعد اس نے علم نجوم سیکھا اور اس میں بھی بڑی مہارت پیدا کی۔ چنانچہ اس موضوع پر اس کی تصانیف بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ علم نجوم کے ماہروں اور علماء و فضلاء کے پاس اس کے اقوال سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ علم نجوم میں ابو معشر نے تقریباً چالیس کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اس نے ۲۷۲ھ میں تقریباً ایک سو سال کی عمر میں وفات پائی۔

ماخذ:

فارسی تذکرے (کتاب کے آخر میں ان کی فہرست ملاحظہ ہو)

ایران پر عرب کے اثر کے لئے ملاحظہ ہو:

اناستراانتف (INASTRANTSEF) کی کتاب، انگریزی ترجمہ آقای نریان کے قلم سے۔
گولڈ ہیر (Goldziehen) کی کتاب تتبعات اسلامی Islamic Studies) باب عرب و عجم
آقای وہخدا کی کتاب امثال و حکم، ج ۳، ص ۱۵۳، سے آگے تک
فان کریمر (Von Kremer) کی کتاب تاریخ تمدن اسلام، ج ۱
ڈاکٹر رضا زادہ شفق: مقالہ، مجلۂ شرق، طہران ۱۳۰۹ھ، شمارہ ۱۱۳ احمد امین اور ساتھی: فجر الاسلام و ضحی الاسلام، طبع مصر
ڈاکٹر رضا زادہ شفق: مقالہ ابن خلدون، مجلۂ ارمغان، جلد ۱۵، شمارہ ۶
آقای ہمائی: مقالات، مجلۂ مہر، طہران
کریستنسن (Christensen): مقالات، مجلۂ مہر، جلد ۱، شمارہ ۴، ۵
آقای اقبال: مقالہ، مجلۂ مہر، جلد ۲، شمارہ ۲
تاریخ سیستان، تصحیح آقای بہار، کتاب خانہ خاور، طہران جیاکسن (Jackson): اوایل شعر فارسی (انگریزی)
آقای سعید نفیسی: احوال و اشعار رودکی، ج ۱-۳ طہران ۱۳۱۰ تا ۱۳۱۹ھ
اِتہ (Ethe) آلمانی: فقہ اللغہ ایران میں مقالہ شعرای قبل از رودکی، یہ مقالہ الگ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا ہے۔
براؤن: تاریخ ادبیات ایران، ج ۱، خصوصاً چودھویں فصل تحفۃ الملوک، طبع طہران
چہار مقالہ، طبع لیڈن، ۱۹۰۹ء، مع حواشی از آقای محمد قزوینی عربی نویس عالموں اور مصنفوں کے لئے مذکورہ ماخذوں کے علاوہ ملاحظہ ہوں:

ثعالبی : یتیمۃ الدھر
بروکلمان (جرمنی) : تاریخ ادبیات عرب نکلسن (انگریزی) : تاریخ ادبیات عرب ڈاکٹر محمود نجم آبادی : محمد زکریا رازی
اقبال آشتیانی : شرح حال ابن المقفع
جرجی زیدان : آداب اللغۃ الاسلامیہ
ابن ندیم : الفہرست
ابن خلکان : وفیات الاعیان
ابن قتبہ : طبقات الشعراء

۲۔ غزنوی دَور

فردوسی کا عہد

غزنویوں کی عظمت کا زمانہ فردوسی کی شہرت کا عہد ہے۔ اس دور نے علوم وادبیات میں بڑے بڑے عالم پیدا کئے ہیں۔ لیکن قومی ادبیات کے لحاظ سے فردوسی اس عہد کا محور قرار پاتا ہے۔ کیونکہ فردوسی نہ صرف ایران کا اولین بڑا شاعر ہے بلکہ اس نے ایران پر عربوں کے حملہ اور قومی آثار وافکار کے بھلادئے جانے کے بعد شاہ نامہ کو جسے دقیقی اور دوسرے شاعروں نے لکھنا شروع کیا تھا لیکن تمام نہ کرسکے تھے، از سر نو لکھنا شروع کیا۔ یہ فردوسی ہی کی ہمت تھی کہ اس نے شاہنامہ کو نظم کرنا شروع کیا اور اسے ختم بھی کیا۔ اس نے اپنے شاہنامہ کے ذریعہ داستان باستان کی یاد تازہ کردی اور پچھلے زمانے کی تاریخ کو زندہ کردیا، چنانچہ خود کہتا ہے:

بسے رنج بردم دریں سال سی عجم زندہ کردم بدیں پارسی

غزنویوں کے عہد میں علم وادب کا عام رواج ہوا، اور امیروں اور وزیروں نے عالموں کی سرپرستی شروع کی۔ ان میں سے بعض جیسے قابوس وشمگیر اور صاحب بن عباد خود بھی عالموں اور دانش مندوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے دربار اور ان کے پائے تخت جیسے بخارا، سمرقند، طبرستان، رے، اصفہان وغیرہ علم وادب کے مرکز اور عالموں اور ادیبوں کے مستقر بنے ہوئے تھے۔ اسی عہد میں سلطان محمود کی کوششوں سے غزنویوں کا خاندان اوج کمال کو پہنچا اور شہر غزنہ علوم وادبیات کا ایک نیا مرکز بن گیا۔ دور دور سے شاعر کھنچ کھنچ کر یہاں چلے آنے لگے۔
غزنویوں کی شہرت کی ابتداء البتگین کی ترقی سے ہوتی ہے۔ البتگین سامانیوں کا غلام تھا،

اس کے بعد ترقی کرتے کرتے وہ سبکتگین کا خسر بنا اور ۳۸۴ھ میں نوح بن منصور سامانی کی طرف سے خراسان کی امارت پر فائز ہوا۔ غزنویوں کو سبکتگین کے بیٹے محمود کے زمانے میں انتہائی عروج حاصل ہوا۔ سلطان محمود نے ۳۸۹ھ میں بمقام بلخ تخت سلطنت پر جلوس کیا اور ۴۲۱ھ میں وفات پائی۔ محمود کو انتظام مملکت میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس لئے وہ تھوڑی سی مدت میں ایران کا سب سے قوی ترین حکمران بن گیا۔ اس نے ہندوستان پر کئی حملے کئے اور ہر حملہ میں فتح مند رہا۔ اس نے ہندوستان کے مندروں سے خزانے حاصل کئے اور سومناتھ کے مندر سے سب سے بڑا خزانہ حاصل کیا۔ محمود نے مذہب سنت کی بڑی سرپرستی کی اور اس بارے میں اس نے غلو سے کام لیا۔ دین اسلام کے دوسرے فرقوں اور خاص کر اسماعیلیہ فرقہ کے پیرؤں کو اس نے سخت سزائیں دیں۔

دوسرے غزنوی بادشاہوں کی طرح محمود نے بھی فارسی زبان اور ادبیات کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس نے اپنے دربار میں شاعروں اور ادیبوں کی عزت بڑھائی۔ یہی وجہ ہے کہ عنصری، فرخی اور فردوسی جیسے بڑے بڑے شاعروں نے اس کی مدح کی ہے۔ کہتے ہیں اس کے دربار میں چارسو سے زیادہ شاعر جمع ہو گئے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محمود نے خود بھی فارسی میں شعر کہے ہیں اور وہ فارسی نثر پر بھی بڑا عبور رکھتا تھا۔ سلطان محمود کے جانشینوں میں سے بعض جیسے سلطان مسعود، ابراہیم اور بہرام شاہ نے بھی شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی ہے، لیکن اس خصوص میں ان کا پایہ سلطان محمود کے پایے کو نہیں پہنچتا۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ محمود کے بعد غزنویوں کی سلجوقیوں سے کش مکش شروع ہو گئی تھی اور اس کش مکش کی وجہ سے وہ علم و ادب کی ترویج میں کچھ زیادہ کوشش نہ کر سکے۔

اب یہاں ہم غزنوی دور کے چند بڑے شاعروں کا حال مختصر طور پر بیان کرتے ہیں اور آخر میں اس دور کے سب سے بڑے شاعر فردوسی کا حال بیان کریں گے۔

عنصری | ابوالقاسم حسن بن احمد عنصری ۳۵۰ھ میں پیدا ہوا۔ بلخ اس کا وطن تھا۔ کہتے ہیں

کہ اس کا باپ تجارت کا پیشہ کرتا تھا۔ اس نے بھی باپ کا ہی پیشہ اختیار کیا۔ لیکن ایک سفر میں چوروں نے اس کا سارا سرمایہ لوٹ لیا۔ اس واقعہ کے بعد اس نے علم و ادب سیکھنا شروع کیا اور اس میں شہرت پائی۔ پھر سلطان محمود کے چھوٹے بھائی اور اپنے ممدوح امیر نصر کے توسط سے سلطان محمود کے دربار میں رسائی حاصل کی۔

سلطان محمود کے دربار میں پیش ہونے کے بعد سے روز بروز عنصری کو سلطان کا زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل ہوتا گیا، یہاں تک کہ ملک الشعرائی کا لقب پایا اور سلطان نے لطف و کرم کے ساتھ اسے خوب نوازا۔ دربار کے تمام شاعر اس کا احترام اپنے آپ پر لازم سمجھتے تھے۔ دربار میں اس کا مرتبہ روز بروز بڑھتا گیا اور رودکی کی طرح وہ بڑے جاہ و جلال کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا چنانچہ خاقانی نے کہا ہے:

شنیدم کہ از نقرہ زد دیگدان !! ز زر ساخت آلات خوان عنصری

عنصری کے اشعار کا بہترین حصہ اس کے قصائد ہیں۔ یہ قصیدے زیادہ تر سلطان محمود غزنوی، اس کے بھائی امیر نصر، سلطان کے بیٹے سلطان مسعود، اور اس کے بھائی امیر یوسف کی مدح میں لکھے ہیں اور ان میں اپنے ممدوحین کے اوصاف، ان کی فتوحات اور ان کے کارناموں کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اکثر قصیدوں میں عنصری نے داد سخن دی ہے اور نہایت دقیق معانی کو بہترین، رواں، مترنم اور محکم بندش میں ادا کیا ہے۔ اس کی طرز ادا نہایت دلکش ہے اور قطعی طور پر وہ چوٹی کے قصیدہ گو شاعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ہم عصر ایک شاعر منوچہری نے جو خود بھی استادوں میں شمار ہوتا تھا اس کی مدح کی ہے اور "خطاب بہ شمع" میں کہا ہے:

تو همی تابی و من بر تو همی خوانم بمهر ! هر شبی تا روز دیوان ابوالقاسم حسن
اوستاد اوستادان زمانہ عنصری عنصرش بی عیب و دل بی غش و دینش بی فتن
شعر او چون طبع او هم بی تکلف هم بدیع طبع او چون شعر او هم با ملاحت هم حسن

نعمت فردوس یک لفظ متینش را شمر　　گنج بادآورد یک بیت مدیحش را ثمن
تا ہمی خوانی تو ابیاتش ہمی خائی شکر　　تا ہمی گوئی تو ابیاتش ہمی بوئی سمن!

عنصری سے پہلے قصیدہ گو شاعروں میں رودکی کے سوا اس کی ٹکر کا کوئی مشہور شاعر پیدا ہی نہیں ہوا تھا، رودکی فضل وکمال میں عنصری سے بڑھا ہوا تھا اور اس کے فضل اور اس کی برتری کا خود عنصری نے اعتراف کیا ہے۔

عنصری کا سبک عنصری اپنے اکثر قصیدے غزل یا تشبیب سے شروع کرتا ہے اور اس کے بعد ممدوح کی مدح شروع کرتا ہے۔ عنصری کی اس طرز کی اس کے بعض ہم عصروں نے بھی پیروی کی ہے۔ عنصری نے غزلیں بھی لکھی ہیں، لیکن اس فن میں اس نے رودکی کی برتری تسلیم کی ہے، چنانچہ کہتا ہے:

غزل رودکی وار نیکو بود!　　غزل ہائے من رودکی وار نیست

عنصری کے قصائد کا دیوان باقی ہے اور اس میں دو ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ کہتے ہیں اصل میں اس کے دیوان میں تیس ہزار شعر تھے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، عنصری کا اصل کمال اس کی قصیدہ گوئی ہے اور اس کے بہترین قصائد کا بڑا حصہ سلطان محمود کی مدح، اس کی جنگوں اور اس کی شجاعت کے ذکر سے بھرا ہوا ہے۔ سلطان محمود کے سفروں میں یہ شاعر بھی لازمی طور پر اس کے ہم رکاب رہتا تھا، واقعات کا خود مشاہدہ کرتا تھا، پھر اپنے ممدوح کے عالی صفات اور اس کی عظمت و بزرگی کو اپنے دلکش انداز میں پیش کرتا تھا۔ چنانچہ جو کچھ اس نے اپنے قصیدوں میں کہا ہے اس کا خلاصہ یوں کیا جا سکتا ہے:

میرے ممدوح سلطان محمود کا ضمیر آفتاب کی طرح روشن ہے۔ اس کی ہمت ابدالوں کی دعاؤں سے بڑھ کر ہے۔ اس کا مال اور اس کی دولت ریگستان کی ریت سے زیادہ ہے۔ اس کی سخاوت سمندر کی طرح بے کنار ہے۔ اس کا کرم عین وجود اور اس کا غضب عدم کی اصل ہے اسکی

رائے دل میں فرزانگی بڑھاتی ہے۔ اس کا چہرہ جسم میں جان ڈالتا ہے۔ وہ زمین کا مرکز اور آسمان کا مدار ہے۔ وہ سخاوت کا دریا اور وفا کا بوستان ہے وہ ادب کا سفینہ، علم کا قطب اور ہنر کا خزانہ ہے اس کی تلوار کے آگے شیر خزاں کے پتے کی طرح لرزاں۔ وہ سرکشوں کو اپنے گرز سے مارتا ہے، اور بد اندیشوں کے مغز کو ان کی قبروں میں کوٹتا ہے.....

اس شاعر نے قصیدے کے سوا دوسرے اصناف سخن میں کوئی خاص کمال پیدا نہیں کیا، لیکن حق یہ ہے کہ اس فن کا وہ بہت بڑا ماہر تھا۔ اس نے نہایت اچھی بندش کے ساتھ موزوں الفاظ کا انتخاب کیا ہے، اور ان کو بڑی مہارت اور بڑی خوبی کے ساتھ نظم میں مربوط کیا ہے۔ اس نے اپنے کلام میں نازک اور دقیق مضامین پیدا کیے ہیں، اس کے اشعار نہ تو فرخی کی طرح سادہ ہیں اور نہ منوچہری کے بعض اشعار کی طرح مشکل الفاظ سے بھرے ہوئے ہیں، بلکہ نہایت استوار و متین ہیں اور اس حالت میں بھی بہتے پانی کی طرح نہایت صاف اور رواں ہیں، مثلاً اس کا یہ قصیدہ

چہ چیز است رخسارہ و زلف دلبر

یا

چنیں بماند شمشیر خسروان آثار

اور دوسرے قصیدے ہمارے اس دعویٰ کا بین ثبوت ہیں۔

ذیل میں عنصری کے ایک قصیدے کے چند شعر نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں ان اشعار میں شاعر نے کلام کی بندش، الفاظ کی ہم آہنگی اور صنعت انتساق صفات کا کمال دکھایا ہے۔ اس قصیدے میں پہلے سلطان کی تلوار کی تعریف کی گئی ہے اور خود اس کی مدح پر گریز کیا ہے:

چیست آں آبی چو آتش و آہنی چوں پرنیاں
بے رواں تن پیکری پاکیزہ خون در تن رواں!

از بجنبانیش آب است از بلرزانی درخش

از ببینی از نیش تیر است از بجنبانی کمان

آئینه دیدی بر و گسترده مروارید خرد !!

ریزهٔ الماس دیدی بافته بر پرنیان

بوستان دیدار آتش کار نشناسد خرد

کآتش افروخته است آن یا شگفته بوستان

تا بدست شاه باشد راز باشد بی فسون !

کشتن بدخواه او را تیز باشد بی فسان

شاه گیتی خسرو لشکرکش لشکرشکن !

سایهٔ یزدان شه کشور ده کشورستان

زیر کردارش بزرگی زیر گفتارش خرد

زیر پیمانش سپهر و زیر فرمانش جهان

پست گشته راستی از نام او گردد بلند

پیر گشته مردمی از یاد او گردد جوان !!!

ای خرد را جان و جان را دانش و دل را امید

پادشاهی را چراغ و نیک نامی را روان

بر سپهر مهر مهری به نگین داد مهر !

در سر گفتار چشمی در تن کردار جان

کوه کان باد و زان گردد بجنبش اسپ تست

کوه گردد زیر زین و باد گردد زیر ران

کار خواهی کار بخشی کار بندی کار ده !

کار بینی کار جوئی کار ساز کار روان

شادی و شاہی تو داری شاد باش و شاہ باش

جامۂ شادی تو پوش و نامہ شاہی تو خوان

ان اشعار کے مطالعہ سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ ان اشعار کے گوش نواز الفاظ ان کی دلکش طرز ادا، اور ان کے معنی کسی طرح بھی سہل اور سادہ نہیں، یعنی ان کے معنی کو آسانی کے ساتھ سمجھ لینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ دوسری طرف یہ مغلق، سنگین، اور اگران بھی نہیں عنصری نے مدح گوئی کو اعلیٰ درجے پر پہنچایا اور اس میں بڑی خوبیاں پیدا کی ہیں اور یہ فن اس کے زمانے میں شاعروں کا سب سے بڑا ہنر سمجھا جاتا تھا۔

عنصری نے اپنے قصیدے میں مدح کی شرطوں کو بڑی ہنرمندی کے ساتھ پورا کیا ہے اور ان قصیدوں میں شاعر کا مقصد بھی یہی ہے اور ان کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ لیکن ان میں معنی آفرینی اور لفظی مناسبت کی خوبی کے ساتھ ساتھ بعض جگہ اخلاقی خوبیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ یعنی مدح کے ضمن میں اس نے ممدوح کو شجاعت، مردانگی، اور عدل و دانش کی دعوت دی ہے اور بتایا ہے کہ اس سے بہت سے اجتماعی فائدے حاصل کئے جا سکتے ہیں، ایک قصیدے میں کہتا ہے:

چہار و قتش پیشہ چہار کار بود   کسی ندید و نہ بیندش ازاین چہار جدا

بوقت قدرت عفو و بوقت زلت رحم   بوقت تنگی رادی بوقت عہد وفا

حقیقت میں یہی وہ زبردست صفات ہیں جو کسی ممدوح کو مدح کا مستحق بنا سکتی ہیں۔ اور قصیدوں میں بھی ایسے پند آمیز اشعار ملیں گے جیسے یہ شعر ہیں:

چو مرد پرہنر از خویش ایمنی دارد!   رود بدیدۂ دشمن بجستن پیکار

نہ رہنمای بکار آیدش نہ اخترگر   نہ فال گوی بکار آیدش نہ خواب گزار

کسیکه بر تو مزور کند حدیث کساں — دهان آنکس پر خاک باد و خاکستر
کسیکه مایه ندارد سخن چه خواهد گفت — چگونه پرّد مرغی که بسته دارد پر!

بیانه گفت همی زاغ همچو یارانیم — که هر دو مرغیم از جنس واصل یکدیگر
جواب داد که مرغیم جز بجائی هنر — میان طبع من و تو میانه هست نگر

خورد از آنکه بماند ز من ملوک زمین — تو از پلیدی و مردار پر کنی ژاغ

نه هر که قصد بزرگی کند چنو باشد — نه هر که کان کند او را بگوهر آید کار

عجب مدار که نامرد مردی آموزد — ازآں خجسته رسوم ازآں خجسته سیر
بخندگاه دهد بوی عنبر آں جامه — که چند روز بماند نهاده با عنبر
دلی که رامش جوید نیابد ان دانش — سری که بالش جوید نیابد او افسر
ز زود خفتن و از دیر خاستن هرگز — نه ملک یابد مرد و نه بر ملوک ظفر

ان چند اشعار ہی سے ظاہر ہے کہ وہ انسانی اخلاق کی بلندیوں اور لطافتوں سے خوب واقف تھا۔

قصیدہ، غزل اور رباعی کے سوا عنصری مثنوی کہنے میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ کہتے ہیں اسی نے پہلی بار وامق وعذرا کے قصہ کو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ اسی طرح بعض اور مثنویاں یعنی "سرخ بت"، "خنک بت"، "شاد بہر"، اور "عین الحیات" بھی اسی سے منسوب کی گئی ہیں۔ عنصری نے ۴۳۱ھ میں انتقال کیا۔

عسجدی عنصری کے ہم عصروں اور سلطان محمود کے دربار کے مشہور شاعروں میں ایک ابونظر عبدالعزیز بن منصور مروزی متخلص بہ عسجدی بھی تھا۔ اس شاعر نے بھی سلطان محمود کی مدح میں قصیدے لکھے تھے، لیکن افسوس ہے کہ اس کا کچھ زیادہ کلام ہم تک نہیں پہنچا۔ اگرچہ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ یہ سلطانی عطایا سے سرفراز ہوتا تھا، لیکن خود اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے عنصری جیسا جاہ و جلال حاصل نہ تھا اور وہ اس منصب کے لئے ترستا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے:

فغاں ز دست ستم ہای گنبد دوار	فغاں ز سفلی و علوی و ثابت و سیار
چہ اعتبار برایں اختران نامسعود	چہ اعتماد برایں روزگار ناہموار!
جفای چرخ بسی دیدہ اند اہل ہنر	ازآن بہرزہ شکایت ہمی کنند احرار

عسجدی نے مدحیہ قصیدوں کے سوا اور بھی شعر لکھے تھے اور جو تھوڑے سے قطعات اس کی یادگار باقی رہ گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کلام پر بڑا قابو حاصل تھا، اور وہ وصف اور تشبیہ میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ بعض تذکروں میں اس کا ایک بہترین قصیدہ جو فتح سومناتھ کی مدح میں لکھا گیا ہے، نقل ہوا ہے۔ ذیل کے چند شعر اسی قصیدے سے لئے گئے ہیں:

تا شاہ خسروان سفر سومنات کرد	کردار خویش را علم معجزات کرد
آثار روشن ملکان گذشتہ را	نزدیک بخردان ہمہ از مشکلات کرد
بزدود ز اہل کفر جہاں را بہ اہل دین	شکر دعار خویشتن از واجبات کرد
محمود شہریار کریم آنکہ ملک را	بنیاد بر محامد و بر مکرمات کرد!
شطرنج ملک باخت ملک با ہزار شاہ	ہر شاہ را بلعب دگر شاہمات کرد
شاہا تو از سکندر بیشی ازاں جہت	کاو ہر سفر کہ کرد بدیگر جہات کرد
عین الرضا ایزد جوئی تو در سفر	بازاو سفر بجستن عین الحیات کرد

تذکروں میں عسجدی کا سنہ وفات ۴۳۰ھ لکھا ہے اور یہی سال سلطان مسعود غزنوی کی وفات کا ہے۔ کہتے ہیں اس کے دیوان میں تیس ہزار شعر تھے، اب بعض قصیدوں، قطعوں اور ایک مثنوی کے چند اشعار کے سوا جو اس کے نام سے تذکروں میں محفوظ رہ گئے ہیں، اس کے اشعار کا کچھ پتہ نہیں۔

عضائری رازی عنصری کے ہم عصروں میں غضائری رازی نامی ایک شاعر تھا۔ اس کا وطن ارک (عراق) تھا۔ یہ بہاء الدولہ دیلمی کے دربار سے وابستہ تھا اور اس کا مداح تھا۔ غضائری قصیدے کا استاد تھا اور اس نے مدح میں بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے اس کی شہرت کی بنیاد سلطان محمود کی مدح میں اس کا وہ قصیدہ ہے جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

اگر کمال بجاہ اندر است و جاہ بمال ... مرا ببین کہ ببینی کمال را بکمال!

شاعر نے اس قصیدے میں اپنی لیاقت، سلطان کی سخاوت اور حاسدوں کے حسد کا حال بیان کیا ہے۔ عنصری نے اس کے اس قصیدے کا جواب اسی وزن میں دیا ہے۔ پھر غضائری نے اس جواب کا جواب دیا ہے۔ اس زمانے کے سبک کا اندازہ لگانے کے لئے غضائری کے قصیدے مطالعہ کے قابل ہیں۔

فرخی محمود کے دربار کے بڑے شاعروں میں ایک ابوالحسن علی بن جولوغ متخلص بہ فرخی بھی ہے۔ یہ سیستان کا رہنے والا تھا، چنانچہ اس شعر میں اس نے اپنے وطن کی طرف اشارہ کیا ہے:

من قیاس از سیستان دارم کہ آں شہر من است ... وز پیٔ خویشان ز شہر خویشتن دارم خبر

فرخی کے باپ جولوغ نے صاحب سیستان امیر خلف بانو کی خدمت میں عمر بسر کی۔[۹۱]

---

۹۱ امیر ابواحمد خلف بن احمد بن محمد بن لیث صفاری سیستان کا حاکم تھا اور علم و ادب کا بڑا سرپرست ۳۹۳ھ میں محمود غزنوی نے سے مغلوب کیا، اس نے ۳۹۹ھ میں وفات پائی اسے اس کی ماں بانو کی نسبت سے خلف بانو بھی کہتے تھے۔

فرخی کو قدرت نے ذوق لطیف، فطری صلاحیت اور دلکش آواز سے خوب نوازا تھا یہ چنگ بھی خوب بجاتا تھا۔ شعر اور خاص کر قصیدہ خوب کہتا تھا اور اس فن میں اس نے ایک خاص طرز ایجاد کی ہے۔

محمود کے دربار میں حاضر ہونے سے پہلے فرخی سیستان میں کھیتی باڑی کیا کرتا تھا۔ پھر ابوالمظفر احمد بن محمد امیر چغانیان[1] کے انعام و اکرام کی شہرت سنی تو اس کے دربار کے ارادے سے ایک کاروان کے ساتھ ہو گیا۔ امیر کی مدح میں اس نے ایک قصیدہ لکھا۔ اس قصیدے کے چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار میں اپنے شعر کی تعریف اور امیر کی مدح کی ہے کہتا ہے :-

با کاروان حلّہ برفتم ز سیستان :	با حلّہ تنیدہ ز دل بافتہ ز جان
با حلّہ فریشم ترکیب او سخن	با حلّہ نگارگر نقش او زفان
ہر تار او برنج برآوردہ از ضمیر	ہر پود او بجہد جدا کردہ از روان
از ہر صنایعی کہ بخواہی برو اثر	وز ہر بدایعی کہ بخواہی برو نشان
نہ حلّہ کز آب مر او را رسد گزند	نہ حلّہ کز آتش او را بود زیان ...
تا نقش کرد بر سر ہر نقش بر نوشت	مدح ابوالمظفر شاہ چغانیان

چغانیان پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر اپنے گھوڑوں کو داغ دینے کے لئے داغ گاہ گیا ہوا ہے فرخی نے اپنے قصیدے کو امیر ابوالمظفر کے پیش کار خواجہ عمید اسعد کے سامنے پیش کیا۔ خواجہ عمید اسعد اسے اپنے ساتھ داغ گاہ لے گیا اور ضمناً اس سے خواہش کی کہ وہ داغ گاہ کی تعریف میں کچھ شعر کہے۔ فرخی نے اسی رات داغ گاہ کا وہ مشہور قصیدہ لکھا جو ذیل کے مطلع سے شروع ہوتا ہے :

---

[1] چغانیان ایک ولایت ہے ماوراءالنہر میں۔ یہ ولایت ابوالمظفر آل محتاج یا ملوک چغانیان کے زیر حکومت تھا۔ چوتھی صدی ہجری میں اس خاندان نے اس ولایت پر حکومت کی ہے ⁂

تا پرند نیلگوں بر روی پوشد مرغزار　　پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار

دوسرے روز اس نے امیر کے سامنے قصیدہ پڑھا۔ امیر شعر شناس تھا۔ اس قصیدے پر اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے شاعر کو نوازا اور کافی صلہ اور انعام سے سرفراز کیا۔

اس کے بعد فرخی غزنوی دربار میں پہنچا اور یہاں بھی سلطان محمود نے اس کی بڑی عزت افزائی کی۔ سلطان محمود کے دربار میں اسے بہت جلد اونچا مقام مل گیا اور اس نے بہت مال و دولت حاصل کر لی۔ چنانچہ خود ایک قصیدے میں کہتا ہے:

باصنعت آبادم و با خانہ آباد　　با نعمت بسیارم و با آلت بسیار

ہم بارمہ اسپم و ہم بارگہ میش　　ہم صنم چینم و ہم بابت فرخار

ساز سفرم ہست و نوای حضرم ہست　　اسپان سبکسار و ستوران گرانبار

از ساز مرا خیمہ چو کاشانہ مانی　　وز فرش مرا خانہ چو بتخانۂ فرخار

چونکہ شاعر بادشاہ کا بڑا مقرب بارگاہ تھا اور بے حساب انعام و اکرام سے سرفراز ہوتا تھا اس کے باوجود اس پر عتاب بھی ہوا ہے۔ چنانچہ ایک قصیدہ جو حسب ذیل مطلع سے شروع ہوتا ہے:۔

ای ندیمان شہریار جہاں!　　ای بزرگان درگہ سلطان

ایسے ہی کسی موقع پر کہا ہے اور دربار کے بزرگوں سے شفاعت چاہی ہے۔ اس قصیدے میں اپنے شاہی تقرب کے زمانہ کو اس طرح یاد کرتا ہے:

شاہ گیتی مرا گرامی داشت　　نام من داشت روز و شب بزبان

باز خواندی مرا ز وقت بوقت　　باز جستی مرا زمان بزمان

گاہ گفتی بیا و رود بزن　　گاہ گفتی بیا و شعر بخوان

شاعر کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عتاب اس پر اس کے سب سے بڑے مربی اور منعم سلطان محمود کے بیٹے ابو احمد کی طرف سے تھا لیکن ایسے ایک دو قصیدوں کے سوا

اس کے کلام میں کہیں درد و اندوہ نہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعتاً شاعر نہایت فراغت اور آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا اور اس نے اپنی زندگی ساز، چنگ ونغمہ، شعرگوئی اور عشق بازی میں بسر کی تھی۔ اس کا دل حسینوں کا گرویدہ اور ان کے پاس گرو تھا، چنانچہ کہتا ہے:

عجب تر از دل من دل نیافریدہ خدای
مرا دلیست گرو کان عشق چندیں جای

تو در جہان چو دل من دلی دگر بنمائی
دلم یکی و در او عاشقی گروہ گروہ!

فرخی نے اپنے قصائد کا بڑا حصہ دربار غزنہ کی مدح میں لکھا ہے۔ اس نے سلطان محمود اور اس کے بیٹے ابو احمد محمد اور مسعود، اس کے بھائی امیر یوسف اور ان کے وزیروں اور ندیموں کی مدح کی ہے۔ ایک قصیدے میں جو ابو محمد کی مدح میں لکھا ہے، کہتا ہے:

نشاط کردن چوگان و بزم و رزم و شکار
چہار چیز گزین بود خسروان را کار

بر آن چہار بتوفیق کردگار چہار
ملک محمد محمود آمد و بفزود!

بزرگ داشتن دین و راستی گفتار
نگاہداشتن عہد و بر کشیدن حق!

فرخی کے دیوان میں نو ہزار سے زیادہ شعر ہیں اور اس میں قصائد کے سوا غزلیں، قطعے ترجیع بند اور رباعیاں بھی ہیں۔ فرخی کے ہم عصروں اور اس کے بعد کے شاعروں نے جیسے عنصری اور رشید وطواط وغیرہ نے اس کی مدح کی ہے۔ شاعروں کے سوا فرخی عروض اور تنقید شعر میں بھی استاد تھا۔ چنانچہ اس فن پر اس نے ترجمان البلاغہ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی یہ کتاب اب امتداد زمانہ سے ناپید ہو گئی ہے، لیکن رشید الدین وطواط نے یہ کتاب دیکھی ہے اور اپنی تالیف حدائق السحر میں اس سے استفادہ بھی کیا ہے۔

فرخی کا سبک عنصری کی طرح فرخی نے بھی زیادہ تر قصیدہ کہے ہیں اور ان کو اس نے قدرتی مناظر سے شروع کیا ہے اسے غزل میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ الفاظ اور مطالعہ پر اس کی قدرت مسلم ہے۔ لطیف اور فطری تشبیہیں اس کے پاس بہت ملتی ہیں۔ اس کے پاس تعقید اور تکلف نہیں، اس کے بیشتر اشعار سادہ اور شیریں ہیں۔ مثال کے طور پر اس

قصیدے کو پیش کیا جا سکتا ہے جس میں اس نے ابر کی تعریف کی ہے۔ اس قصیدے سے شاعر کی قادرالکلامی، نکتہ آفرینی، خیال کی نزاکت اور تشبیہوں کی ندرت ظاہر ہے۔ اس قصیدے کا مطلع ہے:

برآمد نیلگوں ابرے ز روی نیلگوں دریا　　　چو رائے عاشقاں گردان چو طبع بے دلاں شیدا

فرخی نے اپنے زمانہ کے سبک مدح میں اپنے ممدوح کو بلند اوصاف اور پاکیزہ اخلاق بخشے۔ اس کا ممدوح سخن فہم، سخن ور، اور انسانیت نواز ہے۔ اس کا مذہب جود و سخا ہے۔ اس کی نظر میں سونا گھاس پھونس کے برابر ہے۔ اس کا دل دریا کی طرح وسیع اور بے کراں ہے۔ اس کے ہاتھ سمندر کی طرح موتی رولنے والے ہیں وہ دنیا کو اپنی تدبیر سے مسخر کرتا ہے۔ اس کے چہرے سے زمانے کی نیک بختی ہویدا ہے وہ داد دیتا ہے اور دانش مندوں کو نوازتا ہے۔ اپنی بادشاہت کے باوجود بڑی بڑی بادشاہوں کو اس کی بندگی کی تمنا ہے۔ میدان جنگ میں جب اس کی تلوار نکلتی ہے تو آفتاب اس کے ڈر سے اپنا راستہ بھول جاتا ہے اور برج حمل اور برج عقرب میں اسے تمیز نہیں رہتی۔ سب کے دلوں پر اس کی دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے ستارے سعید اور اس کا بخت بلند ہے۔ وہ اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے۔ وہ حق پرست، دین دار اور سچ بولنے والا ہے۔

یہی مضامین اکثر فرخی کے قصیدوں میں آئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے دلکش اور بلند اشعار میں نیک صفات حاصل کرنے کی کتنی تبلیغ کی ہے۔ اگر لوگوں میں یہ صفات موجود نہ بھی ہوں تو ان اشعار کے سننے سے ان کے حصول کا ان میں شوق پیدا کیا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے فرخی کی ایک خصوصیت تغزل ہے وہ قصیدوں کی ابتداء شورانگیز اشعار سے کرتا ہے اور فطری مناظر اور بہار کی زیبائی، نوروز کی طراوت اور مے و معشوق کی تعریف سے ان اشعار میں جان ڈال دیتا ہے۔ ایسے ہی تغزل کا نمونہ سلطان محمود کی مدح میں اس کا وہ مشہور قصیدہ ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ اس قصیدے کی ابتدا میں اس نے

ابر کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے، اور اس میں بڑی لطیف تشبیہوں سے کام لیا ہے:

برآمد نیلگوں ابری ز روی نیلگوں دریا | چو رای عاشقاں گردان چو طبع بیدلاں شیدا
چو گردان گشتہ سیلابی میان آب آسودہ | چو گردان گرد بادی تند گردی تیرہ اندر وا
ببارید و زھم بگست و گرداں گشت بر گردوں | چو پیلان پراگندہ میان آبگوں صحرا
تو گفتی گرد زنگارست بر آئینہ چینی | تو گوئی موی سنجابست بر پیروزہ گون دیبا
بساں مرغزار سبز رنگ اندر شدہ گردش | بیک ساعت ملون کردہ روی گنبد خضرا
تو گفتی آسماں دریاست از سبزی و بر پوشش | بپروانہ اندر آوردہ است ناگہ بچگان عنقا

دیکھئے استاد نے ان چند شعروں میں کیسا موثر نقشہ فطرت کا کھینچا ہے۔ ابر کے ٹکڑے گویا عاشقوں اور دل سوختوں کی طرح سرگرداں پڑے پھر رہے ہیں۔ پھر انھیں پانی میں اٹھنے والی موجوں سے، ہوا میں اٹھنے والے بگولوں سے، دریا کے مرغزار ساحل پر پرواز کرنے والے بچگان عنقا سے تشبیہ دی ہے ایک اور قصیدے میں جو سلطان محمود ہی کی مدح میں لکھا ہے، بہار کے نشئہ، گلزار کے نقشے، نسیم گل، نغمۂ قمری و بلبل کو ان لطیف نشاط انگیز اور دلنشین الفاظ میں ادا کیا ہے:

بدین خرمی جہاں بدین تازگی بہار | بدین روشنی شراب بدین نیکوئی نگار
یکی چوں بہشت عدن یکی چوں ہوای دوست | یکی چوں گلاب بلخ یکی چون بت بہار
زمیں از سرشک ابر ھوا از نسیم گل! | درخت از جمال برگ سر کہ ز لالہ زار
یکی چوں پرند سبز یکی چوں عبیر خوش | یکی چوں عروس خوب یکی چوں رخان یار
تذرو عقیق روی کلنگ سپید رخ! | گوزن سیاہ چشم پلنگ ستیزہ کار
یکی خفتہ بر پرند یکی خفتہ بر حریر | یکی رستہ از نہفت یکی جستہ از حصار
ز بلبل سرود خوش ز صلصل نوای نغز | ز ساری حدیث خوب ز قمری خروش زار
یکی بر کنار گل یکے درمیان بید | یکی زیر شاخ سرو یکے بر سر چنار

ہوا خرم از نسیم زمیں خرم از لباس جہان خرم از جمال ملک خرم از شکار

ان دلکش فطری مناظر کی عکاسی کے ساتھ ساتھ فرخی کے اشعار خیالی تشبیہوں استعاروں اور کنایوں سے خالی نہیں۔ اس نے رات کو زنگی سے، صبح کو چاند سے، شراب کو عقیق سے، صبح کے تڑکے اور اجالے کو چادر سے، قد کو سرو سے، بید کو طوطی کے پر سے، ارغوان کو لعل بدخشانی سے اور باغ کو بوقلموں سے تشبیہ دی ہے۔ ایسی تشبیہیں ہمارے ادب میں بڑی کثرت سے ملتی ہیں۔ ایک طرف یہ تشبیہیں فطرت کی پوری پوری عکاسی نہ بھی کرتی ہوں تو یہ دقیقہ سنجی باریکی فکر، وسعت خیال اور لطافت سخن پہ دال ہیں۔ بہرحال استاد فرخی نے تغزل میں عجیب رنگا رنگی پھول کھلائے ہیں، ان میں نادر رنگ آمیزی کی ہے اور فطرت کی مستی کو اپنے کلام میں سمو دیا ہے۔ یہاں کچھ اور شعر پیش کیے جاتے ہیں:

گل بخندید و باغ شد پدرام اے خوشا ایں جہاں بدیں ہنگام
چوں بناگوش نیکوان شد باغ از گل سیب دار گل بادام
ہمچو لوح زمردیں گشتہ است دشت ہمچون صحیفۂ زرخام
باغ پر خیمہ ہائے دیبا گشت زند وافان درون شدہ بخیام
گل سوری بدست باد بہار سوی بادہ ہمی دھد پیغام
کہ ترا با من ارمناظرہ ایست من بہ بلاغ آمدم بباغ خرام

فرخی خوشی اور غم، شوق وصال اور درد جدائی اور دوسرے انسانی جذبات کی مصوری میں بڑی مہارت رکھتا ہے۔ اس کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صاحب دل تھا۔ دنیا کے انداز اور لوگوں کی حالت اس کے دل کے آئینہ میں نقش ہو کر اس کو متاثر کر دیتی ہے۔ اس کا ایک قصیدہ سلطان محمود غزنوی کی مدح میں ہے اور اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

شہر غزنین نہ ہمانست کہ من دیدم پار چہ فتادہ است کہ امسال دگرگوں شدہ کار

اس قصیدے میں اس نے ایسے ہی جذبات کی عکاسی کی ہے۔ ذیل کے اشعار میں درد

جدائی کا شکوہ کیا ہے، کہتا ہے :-

دل من ہمی داد گفتی گوائی ! | که باشد مرا روزی از تو جدائی
بلی ہر چہ خواہد رسیدن بمردم | بران دل دھد ہر زمانی گوائی !
من این روز را داشتم چشم زین غم | بنودہ است بار وز من روشنائی

فرخی کے بعض اشعار میں تاریخی واقعات کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ سلطان محمود کا ندیم تھا، اور ہندوستان کے کئی سفروں میں اس کے ساتھ رہا تھا۔ سلطان کے محاربوں اور فتوحات کے بعد اس نے جو قصیدے لکھے ہیں ان میں ایسے واقعات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس لئے یہ قصائد تاریخی واقعات، تاریخی ناموں اور تاریخی مقامات کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور تاریخ نگاری میں ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں اس قسم کے بعض تاریخی قصیدوں کے مطلع درج کئے جاتے ہیں :

بہار تازہ دمید ای بروی رشک بہار | بیا و روز مرا خوش کن و نبید بیار

فسانہ گشت و کہن شد حدیث اسکندر | سخن نو آر که نو را حلاوتیست دگر

بخندد ہمی باغ چون روی دلبر | ببوید ہمی خاک چون مشک اذفر

ترکش ای ترک بیک سو فگن و جامہ جنگ | چنگ بر گیر و بند درقہ و شمشیر از چنگ

ان تاریخی قصیدوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں اس زمانے کے رسوم و آئین کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ مثلاً ان میں سلطان کی مجلسوں کا ذکر ہے، نوروز اور مہرگان کے جشنوں کا حال ہے، یا ابوالمظفر چغانی کی داغ گاہ کی تفصیل موجود ہے۔

مختصر یہ کہ فرخی ایران کے قصیدہ گو شاعروں میں درجہ اول کا شاعر ہے۔ اس کا کلام پختہ اس کی طبیعت رواں، اس کے قصیدے سادہ اور سلیس ہیں۔ اس کے کلام میں الجھاؤ، دقیق فلسفیانہ مضامین اور علمی مطالب نہیں پائے جاتے۔ اس کے اشعار ذوق صحیح اور ندرت سخن پر دال ہیں۔ اس کے کلام میں حسن وزن، ترنم، ہم آہنگی اور بندش کی چستی خوب ہے اس کے اشعار ہر قسم کی تعقید اور برائی سے پاک ہیں۔

فرخی نے سنہ ۴۲۹ھ میں وفات پائی۔

منوچہری

ابوالنجم احمد منوچہری دامغان کا باشندہ تھا۔ اس نے اپنے پہلے ممدوح اور زیاری[1] خاندان کے پانچویں حکمران فلک المعالی منوچہر بن قابوس وشمگیر کے نام پر منوچہری تخلص اختیار کیا تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے اس کا نام شصت گلہ لکھا ہے، لیکن یہ اشتباہ احمد بن منوچہر شصت گلہ کے نام اور اس کے تخلص کو خلط ملط کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ احمد بن منوچہر چھٹی صدی ہجری کے ایک شاعر کا نام ہے اور راحت الصدور کے مصنف راوندی نے اپنے ہم عصروں میں اس کا نام لیا ہے اور اسے شصت گلہ کے لقب سے یاد کیا ہے۔

اگرچہ منوچہری کی ترقی کی ابتدا سلطان محمود کے زمانے ہی میں ہوئی، لیکن اسے مشکل ہی سے سلطان محمود کے دربار کے شاعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے اشعار میں سلطان محمود کا نام نظر نہیں آتا۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ یہ ہے کہ سنہ ۴۲۶ھ مسعود گرگان گیا۔ اس سے پہلے منوچہری غزنہ میں موجود تھا، اور یہیں وہ سلطان مسعود کے دربار سے وابستہ ہوا۔ بہرحال منوچہری کو مسعود کے دربار کا شاعر سمجھنا چاہیئے کیونکہ اس نے اپنے زیادہ قصیدے اسی بادشاہ اور اس کے وزراء اور امراء کی تعریف میں لکھے ہیں۔

منوچہری کا سبک

منوچہری کے کلام سے واضح ہے کہ اس نے متقدمین کے اشعار اور خاص کر عرب شاعروں کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کے کلام سے اسے بڑا انس ہے، چنانچہ خود کہتا ہے:

---

[1] آل زیار (۳۰۲ھ — ۴۳۰ھ) طبرستان اور جرجان کے علاقوں پر حکومت کرتے تھے۔

من بسی دیوان شعر تازیان دارم زبر

اور یہ محض اتفاقی بات نہیں کہ اس نے اپنے کلام میں ایران اور عرب کے پچھلے اور ہم عصر شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ اس نے خالص عربی مضامین ــــــ جیسے اطلال ودمن، دیار مندرس کی یاد، قافلہ اور محبوب کی جدائی، اونٹ کا سفر، بیاباں کی حالت، خار مغیلاں کی صحبت سہیل وسماک ستاروں کی تصویر ــــــ بھی اپنے کلام میں پیش کئے ہیں۔

نہ صرف یہ کہ منوچہری کو عربی مضامین اور عربی شاعری سے خاص لگاؤ تھا، بلکہ وہ عربی زبان اور عربی لغت پر بھی خوب حاوی تھا۔ اس نے اپنے بعض ہم عصر شاعروں کی طرح نہ صرف عربی مضامین اور عربی اسلوب کی تقلید کی ہے بلکہ موٹے عربی الفاظ اور ثقیل عربی ترکیبیں بھی کثرت سے فارسی شاعری میں داخل کر دی ہیں۔ مثلاً "معنبر ذوائب" "معقد عقایص" "مسلسل غدائر" "سنجل ترائب" وغیرہ۔ اس نے بعض عجیب وغریب نامانوس عربی قافیے بھی استعمال کئے ہیں۔ جیسے کواعب، نجائب، مراجب، مجن، معکن وغیرہ۔ اس کے بعض قصیدے پڑھنے والے کے ذہن میں فوراً عربی قصائد کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ قصیدہ جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

سلام علی دار ام الکواعب　　　بتاں سیہ چشم عنبر ذوائب

مشہور عرب شاعر امرا القیس کا ایک قصیدہ یاد دلاتا ہے نہ صرف یہ بلکہ اس کے بعض ایسے قصیدوں میں جو نہایت رواں اور شیریں فارسی میں لکھے گئے ہیں، اس کا روئے سخن عرب شاعروں کی محبوباؤں کیطرف ہی ہے۔ مثلاً اپنے اس پیارے قصیدے میں، جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

روزی بس خرم است می گیر از بامداد　　　ہیچ بہانہ نماند ایزد کام تو داد!!

ایک جگہ کہتا ہے:

قوس قزح قوس وار عالم فردوس وار　　　کبک دری کوس وار کرد قِفَا نَبْكِ یاد

یہ "قِفَا نَبْكِ" امرا القیس کے مشہور قصیدے کا مطلع یاد دلاتا ہے:

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَى حَبِيبٍ وَمَنْزِلِ　　　بِسِقْطِ اللِّوَى بَيْنَ الدَّخُولِ فَحَوْمَلِ

اسی طرح اپنے ایک شکایتی قصیدے میں جس کا مطلع ہے :

حاسداں بر من حسد کردند و من فردم چنیں

کہتا ہے :

من بسے دیوانِ شعرِ تازیاں دارم بیاد تو ندانی خواند الا ھُبی بصحنک فاصبحین

اس شعر میں عمرو بن کلثوم کے اس قصیدے کی طرف اشارہ ہے :

الا ھُبی بصحنک فاصبحینا ولا تبقی خمور الاندرینا

اور یہ دونوں عربی قصیدے سبع معلقات کے مشہور قصیدے ہیں۔

لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ منوچہری کے تمام قصیدے اسی طرح کی تضمینوں اور عربی الفاظ سے گراں بار ہیں۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ اوّل تو شاعر نے عربی زبان پر اپنی قدرت سے کام لے کر عربی ترکیبوں کو فارسی کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ وہ فارسی زبان کا حصّہ بن گئی ہیں۔ دُوسرے اس کے بیشتر اشعار رواں اور شیریں ترین فارسی کا نمونہ ہیں۔ اس کے اکثر قصیدے مدح میں ہیں، ان قصیدوں کو وہ نہایت شیریں تغزّل کے ساتھ شروع کرتا ہے اور تشبیب کے بعد ممدوح کی مدح پر آتا ہے لیکن شاعر کا سارا شاعرانہ کمال اسی تشبیب کے تغزل میں نمایاں ہے اس میں کبھی وہ فطرت کی زیبائی، کبھی محبوب کے حُسن اور کبھی احساساتِ درون کی تصویر پیش کرتا ہے، اور کبھی شمع کی، کبھی گھوڑے کی اور کبھی کارواں اور ایسی ہی دُوسری چیزوں سے ان تصویروں کو اُجاگر کیا ہے۔ منوچہری کی بہت سی خوبیوں میں ایک خوبی فطری اور دلنشیں تشبیہوں کا استعمال ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ خیالی تشبیہوں کا بھی ماہر ہے، اگر ایک طرف فطری تشبیہیں دل کو لبھاتی ہیں تو تخیُّلی تشبیہیں ذہن و دماغ سے خراجِ تحسین وصول کرتی ہیں، اور منوچہری کو ان دونوں میں کمال حاصل ہے۔ اس کے نزدیک گل و سبزہ کیا ہے گویا صحرا میں بستر در تکیہ لگ گیا ہے، ہرے بھرے درخت ہوا کے دباؤ سے جھک گئے ہیں اور ان کی یاقوتی کمانوں میں بلبلیں بازیگروں کی طرح اِدھر سے اُدھر پھدک رہی ہیں۔ محبوب کے بال جیسے سنبل اور حسینوں کی آنکھ جیسی نرگس نے دامن کوہسار کو ڈھانک لیا ہے۔ سُرخ سُرخ لالے کیا ہیں گویا حسین رخسار والے ہیں

جنھوں نے اپنے دل کو مشک سے اور سر کو اپنے خون میں رنگ دیا ہے۔ نرگس کیا ہے جنّت کی حُور ہے جو اپنے سر پر چاندی کا تھال لئے کھڑی ہے اور تھال میں زرّیں پیالے چُنے ہوئے ہیں۔ یہ سب چیزیں کیسی دلکش، کیسی پیاری اور کیسی زیبا ہیں، لیکن انھیں بقا کہاں۔ اگر بقا ہے تو بس اسی کے جمال کو، اسی کے شکوہ کو، جو اُن کا پیدا کرنے والا، ان کا مالک اور ہم سب کا آقا ہے....

منوچہری کی اور خوبیوں میں اس کی فطرت پرستی بھی ہے بعض وقت اس پر فطرت کی دلکشی کا نقش ایسا اثر کرتا ہے کہ اس کے قلم سے فطرت کی عکاسی کے نہایت ہی حسین و جمیل شعر نکل پڑتے ہیں۔ یہ اشعار لکھنے والے کے لطیف احساسات کے آئینہ دار ہیں۔ جس کسی صاحبِ ذوق نے اس کا یہ قصیدہ ع "شبے گیسو فروہشتہ بدامن" پڑھا ہے اور اس میں جو دلفریب مناظر پیش کئے گئے ہیں اُن سے لُطف اندوز ہوا ہے، وہ شاعر کی قدرتِ سخن کی بے اختیار داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا اس قصیدے میں شاعر نے رنگا رنگی پردوں پر رات کی تاریکی، ستاروں کی دمک، گھنگھور گھٹا کا چھا جانا پانی کا رِم جھم برسنا، پھر طوفانِ باد و باراں اور پھر آفتاب کا طلوع ہونا مصوّر کرکے دکھایا ہے۔ یہ سب تصویریں اپنی جگہ اتنی مکمّل اور اتنی ماہرانہ ہیں کہ پڑھنے والا بے اختیار منوچہری دامغانی پر آفرین بھیجنے لگتا ہے۔ ذیل میں اس قصیدے کے کچھ شعر نمونے کے طور پر پیش کئے گئے ہیں:

رات کی تاریکی:

شبی گیسو فروہشتہ بدامن — پلاسش معجر و قیریش گرزن
بہ کردارِ زنِ زنگی کہ ہر شب — بزاید کودک بلغاری آں زن
شبے چوں چاہ بیژن تنگ و تاریک — چوں بیژن درمیانِ چاہ زو من

ستاروں کی محفل:

ثریا چوں منیژہ بر سرِ چاہ — دو چشمِ من براو چوں چشم بیژن
ہمی برگشت گردِ قطب جدی — چو گرد بابزن مرغ مسمّن
بنات النعش گردِ او ہمی گشت — چوں اندر دست مرد چپ فلاخن

دُمِ عقرب بتابید از سرِ کوہ — چناں دو چشمِ شاہیں از نشیمن
یکے پلہ است ایں منبر مجرّہ — زدہ گردش نقطہ از آب روین

شاعر کا گھوڑا :

مرا در زیر ران اندر کمیتی — کشندہ نے و سرکش نے و توسن
عناں بر گردنِ سرخش فگندہ — چو دو مارِ سیہ بر شاخ چندن
دُمش چوں تافتہ دُم بریشم — سمش چوں زآہن و فولاد ہاون
ہمی راندم فرس را من بتقریب — چو انگشتان مرد ارغنوں زن

طلوعِ آفتاب :

سر از البرز بر زد قرص خورشید — چو خُون آلودہ دزدے سر ز مکمن
بکردارِ چراغ نیم مُردہ — کہ ہر ساعت فزوں گردوش روغن

بارش اور طوفان کی ابتداء :

برآمد بادے از اقصائے بابل — ہبوبش خارہ در و بارہ افکن
تو گفتی کز ستیغ کوہ سیلی — فرود آرد ہمی احجار صد من
ز روئے بادیہ برخاست گردی — کہ گیتی کرد ہمچون خز ادکن
چناں کز روئے دریا بامداداں — بخارِ آب خیزد ماہِ بہمن
برآمد زاغ رنگ و ماغ پیکر — یکے میغ از ستیغ کوہ قارن
چناں چوں صد ہزاراں خرمنِ تر — کہ عمداً برزنی آتش بہ خرمن
بجستی ہر زماں از میغ برقی — کہ کردی گیتی تاریک روشن
چناں آہنگرے کز کورۂ تنگ — بشب بیروں کشد رخشندہ آہن
خروشے برکشیدی تند تندر — کہ موئے مردماں کردی چو سوزن
تو گفتی نای رویین ہر زمانے — بگوش اندر دمیدی یک دمیدن

بلرزیدی زمیں از زلزلہ سخت | کہ کوہ اندر فتادی زو بگردن
فرو بارید بارانے ز گردوں | چناں چوں برگِ گل بارد بگلشن
ویا اندر تموزی مہ بببارد | جراد منتشر بر بام و برزن
ز صحرا سیلہا برخاست ہرسو | دراز آہنگ و پیچان و زمیں کن

دیکھیے، آج سے تقریباً ہزار سال پہلے ایران کے اس قادر الکلام شاعر نے کیسی مہارت سے فطری مناظر کی عکاسی کی ہے، فطرت کی یہ عکاسی اور یہ نقاشی ہمارے دَور کی فطرت پرستی سے کسی طرح کم نہیں طوفان کی تعریف اس سے بہتر دشوار ہے، شاید ہی کسی شاعر نے کسی زبان میں سیلاب کی تصویر ایک مصرع میں یوں کھینچ کر رکھ دی ہو ع " دراز آہنگ و پیچان و زمیں کن "

لیکن اس کے باوجود منوچہری کی سب سے بڑی خصوصیت فطرت پرستی نہیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت جیساکہ اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، یہ ہے کہ اس نے مناظر میں اپنے ذوق خیال اور اپنی فکر رسا سے بڑے دلکش رنگ بھرے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں منوچہری کے قصیدوں میں ایسے بھی اشعار ملتے ہیں جن میں وقتی طور پر حزن وملال کا اثر پایا جاتا ہے اور اس کی مثال قصیدۂ شمع ہے لیکن اس کے بیشتر اشعار نشاط انگیز اور مسرت خیز ہیں۔ فارسی شاعری میں ایسے شعر بہت کم ملتے ہیں جن میں ایسی زندگی، ایسا رقص، ایسی شادمانی اور ایسی خوشی او مسرت ٹپکی پڑتی ہو جیسی کہ استاد منوچہری کے بیشتر اشعار سے ہویدا ہے۔

نو بہار کی آمد ہے، نئے پھول کھلے ہیں، اُٹھ اور بربط بجا۔ کب تک آسمان کے ستم سہے گا، کب تک دُنیا کا غم کھائے گا، باغ میں چل، ساز اور بلبل کے نغمہ سے دل کا سرور بڑھا اور بہار کے گریزاں دنوں کو خوشی کے ساتھ گذار دے۔

روزی بس خرم است می گیر از بامداد | ہیچ بہانہ نماند ایزدِ کامِ تو داد
خواستہ داری و ساز بے غمیت ہست باز | ایمنی و عزّ و ناز فرخی و دین داد
نیز چہ خواہی دگر خوش بخور و خوش بزی | اندہ فردا مبر کہ گیتی خوابست و باد

می خور کت باد نوش برسمن و پیلگوش	روز خوش و رام خوش روز خور و ماه باد
برجہ تا برجہیم جام بکف بر نہیم	تن بمی اندر دہیم کار صعب اوفتاد
بارد در خوشاب باز ز استین سحاب	وز دُم حوت آفتاب روئے بیالا نہاد
مرغ دل انگیز گشت باد سمن بیز گشت	بلبل شب خیز گشت کبک گلو بر گشاد

منوچہری نے خاص طور پر مسمط میں اس رنگ کو خوب نبایا ہے، اس کے مسمط بڑے زوردار ہیں اور ان میں مسرت، بہجت اور سرور کی رُوح سر تا سر سموئی ہوئی ہے۔

فطرت پرست، زندہ دل اور مست شاعر چاہتا ہے کہ لوگ شوق و ذوق کے ساتھ زندگی کا لُطف اُٹھائیں، کائنات کی حسین و جمیل چیزوں سے محظوظ ہوں، ان میں حسِ لطیف اور موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا ذوق پیدا ہو، اُن کے کان نہ صرف سازوں کے نغمہ سے لُطف اُٹھائیں بلکہ خوش گو پرندوں اور انسانی حلق کی آواز سے بھی لُطف اُٹھایا کریں۔ شاعر کے نزدیک نو بہار میں گویا باغ اور چمن میں موسیقی کی نمائش ہوتی ہے۔ کبک ناقوس بجاتا ہے، شارک سنتور، فاختہ نای اور بط طنبورہ بجاتی ہے۔ ایسے ہی جیسے انسان اپنے دل کا راز مختلف سُروں اور سازوں کے پردوں میں سُناتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فرخی نے موسیقی کے بہت سے سازوں اور سروں کا نام لیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتا ہے:

رسم بہمن گیر د از نو تازہ کن بہمنجنہ	اے درخت ملک بارت عز و بیداری تنہ

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے منوچہری کو انسانی جذبات غم اور جذبات مسرت کے بیان کرنے پر بھی بڑی قدرت حاصل ہے۔ اس حیثیت سے بھی وہ بہت بڑا شاعر ہے۔ شمع کے ساتھ راز و نیاز کرتے ہوئے ان کا حال بیان کرتا ہے جو دُوسروں کے لئے اپنے جی جان سے گذر جاتے ہیں اور انہیں اس کا بدلہ بدی اور ناسپاسی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ اس مضمون کو اس پیارے انداز میں بیان کرتا ہے:

تو مرا مانی بعینہ من ترا مانم درست	دشمنِ خویشیم ہر دو دوستدار انجمن
خویشتن سوزیم ہر دو بر مرادِ دوستاں	دوستاں در راحت انداز ما و ما اندر حزن
ہر دو گریانیم و ہر دو زرد ہر دو در گداز	ہر دو سوزانیم ہر دو فرد و ہر دو ممتحن

انچہ من بر دل نہادم بر سرت بنیم ہمی | انچہ تو بر سر نہادی در دلم دارد وطن
اشک تو چوں زر کہ بگدازی و بر ریزی بزر | اشک من چوں ریختہ بر زرد برگ یاسمن
راز دارِ من توئی ہموارہ یارِ من توئی | غم گسارِ من توئی من آنِ تو تو آنِ من

منوچہری کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر و شاعری کے سوا دوسرے علوم میں بھی مہارت رکھتا تھا اور حکمت، طب، نحو اور نجوم سے واقف تھا۔ اب اس کا جو دیوان ملتا ہے اس میں تین ہزار سے زیادہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ تذکروں میں منوچہری کی وفات کا سن ۴۳۰ھ لکھا ہے۔

فردوسی

ایران کی قومی داستان اور تاریخ کو زندہ کرنے اور فارسی زبان میں ایک نئی جان ڈالنے کے لحاظ سے ابوالقاسم فردوسی ایران کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس لحاظ سے ایران کے کسی اور شاعر کا مرتبہ اس کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔

افسوس ہے کہ ایسے بڑے اور بلند مقام شخص کی زندگی کے حالات پوری طرح معلوم نہیں۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ بہت کم ہے۔ اس کا شاعرانہ لقب یا تخلص فردوسی تھا اور کنیت ابوالقاسم لیکن اس کے اور اس کے باپ کے نام کے بارے میں روایتیں مختلف ہیں۔ عروضی سمرقندی کی کتاب چہار مقالہ کی رو سے اس کی ولادت صوبہ طوس میں طابران کے قریب باژ کے گاؤں میں ہوئی اور وہ طابران میں رہا۔ کتاب چہار مقالہ شاعر کے زمانے سے ایک سو سال بعد تالیف ہوئی۔ اور اب تک یہ کتاب اس کے عہد سے قریب ترین کتاب ہے جس میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

فردوسی کی پیدائش کی کوئی قطعی تاریخ نہ تو روایتوں کے ذریعہ اور نہ شاہنامے کے اشعار کے ذریعہ متعین کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اگرچہ شاہنامہ میں کئی جگہ اس نے اپنے سن کا ذکر کیا ہے اور ۵۸ سے لے کر ۷۶، بلکہ ۸۰ سال تک بتایا ہے، لیکن چونکہ اس نے شاہنامہ کی ابتداء کی تاریخ نہیں بتائی ہے اس لئے اس کی پیدائش کی تاریخ کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ بس قیاسات ہی قیاسات سے کام لیا جاسکتا ہے۔ مثلاً فردوسی نے اپنے مختلف سنوں کا جو ذکر کیا ہے ان میں آخری سن ۸۰ سال ہے،

یہی سنِ شاہنامے کے اختتام کا زمانہ ہوگا. لیکن شاہنامہ کے بعض قلمی نسخوں میں ــ جیسے لیڈن (ہالینڈ) اور اشترازبرگ (جرمنی) کے نسخوں میں ــ آخری سن ۷۶ سال لکھا ہے. شاہنامہ کے خاتمہ کے ایک شعر سے ہمیں شاہنامہ کے اختتام کی تاریخ معلوم ہو جاتی ہے، کہتا ہے:

زہجرت شدہ پنج ہشتاد بار　　　　که من گفتم ایں نامۂ نامدار

یعنی اس نے سنہ ۴۰۰ھ میں شاہنامہ مکمل کر لیا اور سنہ ۴۰۰ھ میں اس کی عمر ۷۶ سال تھی، ایسی صورت میں اس کی تاریخ ولادت سنہ ۳۲۴ھ ہوگی. لیکن شاہنامہ کے آخر میں ایک اور شعر بھی ملتا ہے، کہتا ہے:

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد　　　　امیدم بہ یکبارہ برباد شد

لیکن اور اشعار کی رُو سے فردوسی کی پیدائش کی تاریخ سنہ ۳۳۰ھ کے لگ بھگ بھی ہو سکتی ہے کیونکہ ان اشعار کی رُو سے فردوسی سلطان محمود کے جلوس کے وقت یعنی سنہ ۳۸۹ھ میں ۵۸ سال کا تھا. اس لحاظ سے اس کی پیدائش کی تاریخ سنہ ۳۳۱ھ ہوتی ہے. چنانچہ کہتا ہے:

بدانگہ کہ بُد سال پنجاہ و ہشت　　　　جواں بُودم و چوں جوانی گذشت

خروشے شنیدم ز گیتی بلند　　　　کہ اندیشہ شد پیر و من بے گزند

کہ اے نامدارانِ گردن کشاں　　　　کہ جست از فریدونِ فرخ نشاں

فریدونِ بیدار دل زندہ شُد　　　　زمین و زماں پیشِ اُو بندہ شد

بہ پیوستم ایں نامہ برنام اوی　　　　ہمہ بہتری باد فرجام اوی

اِن اشعار میں اشارہ ہے سُلطان محمود کی بادشاہی کی طرف. اور یہ کہ اس نے شاہنامہ محمود کے نام معنون کیا ہے اور اس وقت اس کی عمر ۵۸ سال تھی. شاہنامہ کے خاتمہ کے اشعار بھی اسی قیاس کی تائید کرتے ہیں. مثلاً شاہنامہ کے خاتمہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

چو سال اندر آمد بہ ہفتاد و یک　　　　ہمی زیر شعر اندر آمد فلک

سی و پنج سال از سرای سپنج　　　　بسے رنج بردم بہ امّیدِ گنج

چو برباد دادند گنج مرا　　　　نبد حاصلے سی و پنج مرا

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد — اُمیدم بہ یکبارہ برباد شد

سر آمد کنوں قصۂ یزد گرد — بماہ سفندارمذ روز ارد

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار — کہ گفتم من ایں نامۂ نامدار

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۴۰۰ھ میں اس کی عمر ۷۱ سال تھی اور اگر ہم سنہ ۴۰۰ھ میں سے ۷۱ سال کم کر دیں تو ۳۲۹ کا عدد حاصل ہوتا ہے۔ اس کے سوا ان اشعار سے شاہنامہ کی ابتداء کی تاریخ کا بھی تعین ہوتا ہے کیونکہ شاعر سنہ ۴۰۰ھ میں کہتا ہے کہ میرے ۳۵ سال اس نظم کے کہنے میں صرف گئے ہیں، اسلئے شاہنامہ کی ابتداء کا سن ۳۶۵ ہجری قرار پاتا ہے۔ اس قیاس کی تائید بعض اور اشعار سے بھی ہوتی ہے۔ ان اشعار میں وہ کہتا ہے کہ ۶۵ سال گذر گئے اب کہیں جا کر دیر کرنے والا ستارہ میرا موافق ہوا اور میں نے بادشاہوں کی تاریخ ختم کی۔ اصل اشعار ملاحظہ ہوں:

چو بگذشت سال از برم شصت و پنج — فزوں کردم اندیشۂ درد و رنج

بتاریخ شاہاں نیاز آمدم — بہ پیش اختر دیر ساز آمدم

ان اشعار کے بارے میں علماء کا خیال ہے کہ پہلا مصرع اصل میں یوں ہے:

چو بگذشت سال از بر شصت و پنج

اور یہ سنہ ۳۶۵ھ کی طرف اشارہ ہے جو شاہنامہ کی ابتداء کی تاریخ ہے یعنی فردوسی نے سنہ ۳۶۵ھ میں شاہنامہ شروع کیا، اس وقت اس کی عمر ۳۵ سال تھی اور ستّر سال کی عمر میں اُسے ختم کیا یعنی اس نظم پر اس نے ۳۵ سال صرف کئے۔

اِس قیاس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ فردوسی سنہ ۳۳۰ھ میں بمقام طوس پیدا ہوا۔ سنہ ۳۶۵ھ میں یعنی ۳۵ سال کی عمر میں شاہنامہ کی ابتداء کی اور ۳۵ سال کے بعد یعنی ۷۰ یا ۷۱ سال کی عمر میں سنہ ۴۰۰ھ کے لگ بھگ اسے تمام کیا۔

شاہنامہ کے بعض اشعار اور بعض مورخوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے اپنی عمر کا ابتدائی حصہ طوس کے دہقانوں میں گذارا تھا اور اس کی ابتدائی زندگی امن و آسائش میں گذری تھی۔

چنانچہ اس نے بڑھاپے اور ناداری کی شکایت کرتے ہوئے اپنی جوانی کی نازپروردگی، بڑائی اور آرام و آسائش کا ذکر کیا ہے، وہ خود بھی دہقان تھا، اس کی اپنی زمین تھی جس پر وہ کھیتی باڑی کیا کرتا تھا اور سُکھ چین کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرتا تھا۔ وہ خود طابران طوس کے ایک باغ میں رہتا تھا۔ اس باغ میں اس کے دوست احباب آتے تھے، وہ ان کے ساتھ مل بیٹھتا اور فراغت کے دن گذارتا تھا۔ اسی حالت میں اس نے شعر کہے، داستانِ بیژن و منیژہ وغیرہ کو نظم کیا۔ ان اشعار میں اس نے اپنے باغ، جوئبار اور مکان کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ یہ فراغت اس بڑے شاعر کو ہمیشہ نصیب نہیں رہی اور عمر کے دُوسرے حصّہ میں ایران کے اس عظیم الشان شاعر پر بڑھاپے کے ساتھ ساتھ افلاس اور ناداری کی مصیبتیں ٹوٹ پڑیں اور سُکھ، چین اور اطمینان کی زندگی سب یکبارگی رخصت ہوگئی۔ چنانچہ اس غم انگیز حالت کا نقشہ ان اشعار میں کھینچا ہے:

الا اے برآوردہ چرخ بلند — چہ داری بہ پیری مرا مستمند

چو بودم جوان برترم داشتی — بہ پیری مرا خوار بگذاشتی

مرا کاش ہرگز نہ پروردیا — چہ پروردہ بودی نیازردیا

بجائے عنانم عصا داد سال — پراگندہ شد مال و برگشت حال

دو گوش و دو پائے من آہو گرفت — تہی دستی و سال نیرو گرفت

ان اشعار سے اور ایسے ہی دوسرے اشعار سے ظاہر ہے کہ شاعر پر جلد ہی بڑھاپا آگیا۔ ساٹھ سال کی عمر میں وُہ بالکل ہی خستہ اور شکستہ ہوگیا تھا۔ اس کے کان سننے سے اور اس کے پیر چلنے سے معذور ہوگئے تھے۔

آخری عمر کی پریشانیوں اور تنگدستی سے مجبور ہوکر اس شاعرِ بزرگ نے صلہ اور انعام کی امید میں شاہنامہ کو سلطان محمود کے نام معنون کرنا چاہا لیکن بدخواہوں نے سلطان کے سامنے اس کی برائی کی، بادشاہ کو ایران کا نام زندہ کرنیوالے کی طرف سے بدظن اور بدگمان کردیا اور ایسی قدروقیمت رکھنے والی بے بہا کتاب اور ایسی اہمیت رکھنے والی تصنیف سُلطان کی توجہ سے محروم رہ گئی، چنانچہ کہتا ہے:

چنیں شہریاری و بخشندۂ | بگیتی ز شاہاں درخشندۂ
نکرد اندریں داستانہا نگاہ | ز بدگوی و بخت بد آمد گناہ
حسد برد بدگوے در کار من | تبہ شد بر شاہ بازار من

ایک روایت کی رو سے فردوسی نے ان خیالات کے ساتھ غزنہ کا رُخ کیا، اور سلطان کے دربار میں باریاب ہوا لیکن سلطان نے اس پر کوئی توجہ نہ کی اور اسے اپنے فضل و احسان سے نہ نوازا۔ ناچار وہ واپس لوٹ گیا اور بقول تذکرہ ہفت اقلیم یہ دلکش قطعہ اس موقع پر لکھا (اگرچہ بعض نے اس قطعہ کو عنصری سے بھی منسوب کیا ہے) :

حکیم گفت کسے را کہ بخت والا نیست | بہ ہیچ روے مراو را زمانہ جویا نیست
برو مجاورِ دریا نشیں مگر روزی | بدست افتد دُرّی کجاش ہمتا نیست
خجستہ درگہِ محمود زا ولی دریاست | چگونہ دریا کہ آں را کرانہ پیدا نیست
شدم بدریا و غوطہ زدم ندیدم دُر | گناہِ بخت من ست ایں گناہِ دریا نیست

اس مایوسی اور دل شکستگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فردوسی یہاں سے نکلا تو اس نے سلطان کی ہجو میں ایک قصیدہ لکھ مارا، اس میں سلطان کی دُون ہمتی، کم ظرفی کا رونا رویا اور شکایت کی کہ اس کی قسمت، کوتہ نظروں کی محتاج ہوگئی۔ سلطان محمود تو اپنی ساری شان و شوکت اور جاہ و جلال کے باوجود گذر گیا لیکن اس کی یہ ہجو باقی رہ گئی۔ چہار مقالہ میں عروضی سمرقندی کی روایت کے مطابق فردوسی چغلی کھانیوالے بدگو لوگوں کی سازش اور سلطان کی بے توجہی سے آزردہ ہوگیا۔ اور سلطان کے اس انعام کو جو اس کے لائق نہ تھا، واپس کر دیا اور سلطان کے غضب سے ڈر کر غزنہ سے ہرات بھاگ گیا اور وہاں طبرستان کے بادشاہ شہریار بن شردین کے پاس جو ایک شریف ایرانی امیر تھا، پناہ لی۔ یہاں اس نے وہ ہجویہ قصیدہ لکھا جس میں سو شعر تھے لیکن شہریار نے اس سے یہ ہجویہ قصیدہ خرید لیا اور اس کی تشہیر روک دی۔ عروضی نے یہ چھ شعر جو اس کے ہاتھ لگے تھے، اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں :

مرا غمز کردند کاں پر سخن | بمہر نبی و علی شد کہن

اگر چہر شاں من حکایت کنم　　　چو محمود را صد حمایت کنم

پرستار زادہ نیاید بکار　　　وگر چند باشد پدر شہر یار

ازیں در سخن چند رانم ہمی　　　چو دریا کرانہ ندانم ہمی

بہ نیکی نبد شاہ را دست گاہ　　　وگرنہ مرا برنشاندی بگاہ

چو اندر تبارش بزرگی نبود　　　نیارست نام بزرگاں شنود

شاہنامہ کے ایک قدیم نسخہ کے خاتمہ کے اشعار اور برٹش میوزیم کے نسخہ یوسف زلیخا کے مقدمہ کے اشعار کی رو سے فردوسی نے ۳۸۴ھ میں جنوبی ایران کا سفر کیا اور بغداد جاکر وہاں بہا الدولہ دیلمی کے وزیر موفق سے ملا۔ اور اس کی فرمائش پر یوسف زلیخا کا قصہ نظم کیا۔ یہاں سے واپس ہوتے ہوئے ۳۸۸ھ میں اصفہان کے قریب خان لنجان پہنچا۔ یہاں کے حاکم احمد بن محمد بن ابی بکر نے اس کے ساتھ احترام کا برتاؤ کیا۔ فردوسی نے شاہنامہ کا ایک نسخہ اس کے نام معنون کیا۔ اسی سفر سے واپس آنے کے بعد اس نے آخری بار شاہنامہ کی تدوین کی، اور اُسے سلطان محمود کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ بعض علما، اس سفر سے متعلق اشعار کو کئی اسباب کی بنا پر جعلی سمجھتے ہیں۔ ان میں سے ایک ان اشعار کا پھیپھسا پن بھی ہے۔ یہ اشعار استاد کے سبک اور استاد کی طرز سے بالکل میل نہیں کھاتے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی اور نے اس کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے۔

فردوسی کے دردناک سوانح حیات میں سے ایک اہم واقعہ اس کے بیٹے کی وفات ہے۔ اس بیٹے نے عین جوانی یعنی ۳۷ سال کی عمر میں اپنے ۶۵ سالہ بوڑھے باپ کے دل پر جدائی کا داغ لگایا۔ فردوسی اس بیٹے کے دل سوز مرثیہ میں کہتا ہے:

مگر بہرہ گیرم من از پند خویش　　　براندیشم از مرگِ فرزند خویش

جواں را چو شد سال برسی و ہفت　　　نہ بر آرزو یافت گیتی و رفت

عروضی سمرقندی کا بیان ہے کہ جب سلطان محمود ہندستان کے سفر سے واپس ہوا، تو اس کے وزیر خواجہ احمد حسن میمندی نے فردوسی کا ایک برمحل شعر پڑھا:

اگر جز بکام من آید جواب　　　من و گرز و میدان و افراسیاب

اس وقت محمود کو یہ بلند پایہ شاعر یاد آیا۔ اس کے حق میں اس نے جو ناانصافی کی تھی اس پر وہ پشیمان ہوا اور حکم دیا کہ ساٹھ ہزار دینار اس کے پاس بھیجے جائیں اور اس سے پوچھیں کہ اس کی خواہش کیا ہے لیکن جب وقت سلطان کے انعام سے لدے ہوئے اونٹ شہر طابران میں رودبار کے دروازے سے داخل ہوئے ہیں، لوگ فردوسی کا جنازہ اس شہر کے رزان دروازے سے باہر لے جا رہے تھے۔ فردوسی کی تاریخ وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۶ھ لکھی ہے۔ عروضی سمرقندی کے بیان کے مطابق اس شاعر اعظم نے اپنے پیچھے صرف ایک ہی بیٹی چھوڑی تھی۔

شاہنامہ

قدیم زمانے میں شاہنامہ نویسی۔ شاہنامہ نویسی یعنی ایران کے بادشاہوں اور پہلوانوں کی داستان لکھنے کا معمول ایران میں بہت قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ چنانچہ تورات میں لکھا ہے کہ ہخامنشیوں کے زمانے میں بادشاہوں کے حالات اور ان کے کارنامے لکھے جاتے تھے۔ اس طرح شاہناموں میں سے ایک شاہنامہ جو ہمارے زمانے تک پہنچا ہے خوتائی نامک یا خدائی نامہ (شاہنامہ) پہلوی ہے۔ یہ شاہنامہ ساسانیوں کے دورِ حکومت میں لکھا گیا اور ایک ایرانی عالم ابن مقفع نے پہلوی زبان سے اس کا ترجمہ عربی زبان میں کیا تھا۔ یہ کتاب اور اس کا عربی ترجمہ دونوں پہلی اسلامی صدیوں میں موجود تھے اور اس کے بعد ناپید ہو گئے۔ ایسی پہلوی کتابیں جو قدیم شاہناموں کی ردیف میں شمار ہو سکتی ہیں اور ہم تک پہنچی ہیں ان میں سے ایک کارنامکی ارتخشیر پاپکان (یا کارنامہ اردشیر بابکان) اور دوسری یاتکار زریران (یادگار زریران) ہے جسے شاہنامہ گستاسب بھی کہتے ہیں۔ پہلی کتاب اردشیر اور اس کے بیٹے شاپور کی زندگی کے حالات اور اس کے خاندان کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب گستاسب کے دین زردشت قبول کرنے اور ارجاسب سے جنگ کی داستان پر محتوی ہے۔

شاہنامے کے ماخذ۔ شاہنامے کے جملہ ماخذوں میں کتاب اوستا اور اوستا سے متعلق دوسری کتابیں جیسے بندہشن اور دینکرت وغیرہ شامل ہیں۔ یزدان اور اہرمن کا قصہ، زردشت سے متعلق روایتیں، آفرینش کی داستان، کیومرث اور کیانی بادشاہوں کی حکایتیں، جم اور فریدون کی کہانیاں براہ راست اوستا سے لی گئی ہیں لیکن ان کے مطالب اور ناموں کے تلفظ میں تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان داستانوں میں سے بعض

داستانیں جیسے داستانِ جم و کاوہ و کیکاؤس مشترک آریائی — ہند وایرانی — داستانوں میں شامل ہوگئی ہیں۔ ان افسانوں کی اور تحقیق کی جائے توان کا رشتہ ہند وایرانی دور سے اور آگے بڑھ کر مشترک ہند و یورپی افسانوں کے سرچشمہ سے جاملتا ہے۔ مثلاً شیر حیوان سے زال کا پرورش پانا یونانی پریاموس کے بیٹے پاریس کے قصہ سے، اسفندیار کا روئین تن ہونا یونانی اچیلیش اور جرمن زیگفریڈ کے قصہ اور رستم کے ہفتخوان کی داستان یونانی ہرکلس کے ہفت خوان کی یاد دلاتا ہے۔ شاہنامہ میں رستم اور اسفندیار جیسے قصے بھی موجود ہیں۔ جو ہخامنشی دور کے بعد ایرانی ماخذوں کے سوا دوسرے ماخذ سے جیسے مشرقی ایران یعنی زابلستان وغیرہ سے لیے گئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ یہ مطالب شاہنامہ پہلوی یعنی خوتائی نامک وغیرہ میں موجود تھے۔ یہ فارسی یا عربی میں ترجمہ ہوئے تھے اور بعد میں فردوسی نے ان سے استفادہ کیا تھا۔

ایرانی ماخذوں کے سوا شاہنامے میں بیرونی ماخذوں سے بھی کام لیا گیا ہے، ایسے بیرونی ماخذوں میں سے ایک داستان اسکندر ہے۔ یہ داستان اصل میں یونانی میں لکھی گئی تھی۔ پھر سریانی اور عربی میں منتقل ہوئی۔ فردوسی نے ان ماخذوں کا سلسلہ ایرانی داستانوں سے ملا دیا ہے۔ شاہنامہ میں اسلام اور عرب سے متعلق جو مطالب آئے ہیں وہ سب کے سب ظاہر ہے اسلامی ماخذوں سے لئے گئے ہیں۔

شاہنامہ کے فارسی ماخذ - فردوسی نے قدیم داستانوں کو راست اوستا سے یا پہلوی کتابوں سے لیا ہے۔ کبھی کبھار ہی کوئی پہلوی دفتر اس کے ہاتھ لگا ہوگا۔ کیونکہ اسلامی دور میں ایرانی بادشاہوں، امیروں اور سپہبدوں کی خواہش پر ابن مقفع جیسے عالموں نے ایران کی داستانوں کو عربی میں یا فارسی میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ پہلوی سے عربی اور فارسی میں ترجمہ کرکے اس عمل کو سامانی دور میں سامانی بادشاہوں کی خاص توجہ کی وجہ سے اور وسعت حاصل ہوئی۔ اور نظم ونثر کے بہت سے دفتر ان زبانوں میں منتقل ہوگئے۔ یہی دفتر ہمارے شاعرِ اعظم کے ماخذ بنے۔ ان میں سے ایک ماخذ مسعود مروزی کا شاہنامہ ہے۔ یہ شاہنامہ چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں نظم کیا گیا تھا۔ ایک اور ماخذ ابوالمؤید بلخی کا شاہنامہ ہے۔ یہ بھی اسی زمانے میں نثر

میں لکھا گیا تھا۔ ایک اور ماخذ ابو علی بلخی کا شاہنامہ ہے۔

لیکن شاہنامہ کا سب سے اہم ماخذ شاہنامہ ابو منصوری ہے۔ یہ شاہنامہ چوتھی صدی کے حاکمِ طوس ابو منصور محمد بن عبدالرزاق طوسی کے حکم پر لکھا گیا تھا۔ ابو منصور اپنے زمانہ کے بزرگوں میں شمار ہوتا تھا، اور اسے ایرانی قوم کا بڑا درد تھا۔ اس نے حکم دیا کہ بہت سے عالم ایک جگہ اکٹھے ہو کر قومی داستانوں کو جمع کریں اور ایک شاہنامہ تصنیف کریں۔ ظاہر ہے کہ اس شاہنامہ کے ماخذ بھی وہی اوستائی داستانیں اور پہلوی کتابیں جیسے خوتائی نامک وغیرہ ہی ہیں۔ فردوسی نے اپنے شاہنامے کے بعض اشعار میں ابو منصور کے اس بڑے اقدام کا ذکر کیا ہے۔ ان اشعار میں فردوسی کہتا ہے کہ قدیم زمانہ میں ایک شاہنامہ موجود تھا اور یہ موبدوں کے پاس منتشر حالت میں تھا۔ ممکن ہے اس سے فردوسی کا اشارہ اسی پہلوی کتاب خدائی نامہ کی طرف ہو۔ چنانچہ کہتا ہے کہ ایک دہقان نژاد پہلوان نے ملک کے ہر حصہ سے موبدوں کو جمع کیا اور ان کو شاہنامہ کی تالیف پر لگایا:

یکے نامہ بود از گہ باستاں	فراواں بدو اندروں داستاں
پراگندہ در دست ہر موبدے	ازو بہرۂ بردہ ہر بخردے
یکے پہلواں بود دہقاں نژاد	دلیر و بزرگ و خردمند و راد
پژوہندۂ روزگار نخست	گذشتہ سخنہا ہمہ باز جست
ز ہر کشورے موبدے سالخورد	بیاورد ایں نامہ گرد کرد

فردوسی سے پہلے آخری شاہنامہ گو دقیقی طوسی تھا۔ اس نے شاہنامہ نظم کرنا شروع کیا لیکن جیسا کہ اس کے بیان میں بتایا جا چکا ہے اُس کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اُسے مکمّل نہ کر سکا۔ یہ سب کے سب شاہنامے جن کے نام ہم نے لئے ہیں ناپید ہو چکے ہیں اور ہمارے زمانے تک پہنچ نہیں پائے۔ صرف دقیقی کے شاہنامے کے ہزار شعر جو ظہورِ زرتشت اور جنگ گشتاسب و ارجاسب سے متعلق ہیں باقی رہ گئے ہیں۔ اور جیسا کہ اُوپر کہا جا چکا ہے فردوسی نے

دقیقی کے ان اشعار کو اپنے شاہنامہ میں شامل کر لیا ہے اور اسی وجہ سے یہ ہزار شعر زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ ذیل میں شاہنامہ کے وہ شعر پیش کئے جاتے ہیں جن میں دقیقی اور اس کے کام کا ذکر کیا گیا ہے:

جوانی بیامد کشادہ زباں — سخن گفتنِ خوب و روشن رواں
بنظم آرم این نامہ را گفت من — ازو شادماں شد دلِ انجمن
جوانیش را خوئے بد یار بُود — ابا بد ہمیشہ بہ پیکار بود
برا و تاختن کرد ناگاہ مرگ — نہادش بسر بر یکے تیرہ ترگ
بداں خوئے درجانِ شیریں بداد — نبود از جہاں دلش یک روز شاد
یکایک از و بخت برگشتہ شد — بدست یکے بندہ برگشتہ شد
زگشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار — بگفت و سر آمد برا و روزگار
برفت او و ایں نامہ ناگفتہ ماند — چناں بختِ بیدار اُو خفتہ ماند
خدایا ببخشا گناہِ ورا — بیفزائی درحشر جاہِ ورا

جیسا کہ ہم اُوپر بتا چکے ہیں ۳۵ سال کی عمر میں ۳۶۵ھ کے لگ بھگ استاد کے دل میں شاہنامہ کو نظم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے لوگوں سے تحقیق شروع کی اور اس کے لئے مواد حاصل کرنے کے لئے لوگوں سے پوچھنا شروع کیا۔ چنانچہ کہتا ہے:

بپرسیدم از ہر کسے بے شمار — بترسیدم از گردش روزگار

اس دوران میں شاعر کا ایک ہم شہر دوست اسے اس کام کا شوق دلاتا، اسے ایک کتاب لا دیتا اور اس سے کہتا ہے کہ وہ اسی انداز پر شاہنامہ لکھے۔

بشہرم یکے مہرباں دوست بود — تو گفتی کہ با من بیک پوست بُود
مرا گفت خوب آمد ایں رائے تو — بہ نیکی خرامد مگر پائے تو
نوشتہ من ایں نامۂ پہلوی — بہ پیشِ تو آرم مگر نغنوی

گشادہ زبان و جوانیت ہست　　سخن گفتن پہلوانیت ہست

شو ایں نامۂ خسرواں بازگوی　　بدیں جوی نزد مہاں آبروی

شاعر اس محبت کو اور اس کتاب کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے اور کام شروع کر دیتا ہے اس دوران میں پہلوانوں کی نسل کا ایک جوان یعنی بزرگوں کی نسل کی ایک یادگار، اس کی دوستی کا دم بھرتا ہے:

مرا گفت کز من چہ آید ہمی　　کہ جانت سخن برگرا اید ہمی

بچیزے کہ باشد مرا دسترس　　بکوشم نیازت نیارم بکس

ان دوستوں کے سوا ادب کے اور دوسرے شیدائیوں نے بھی شعر کے ذریعہ قوم کو زندہ کرنے کے کام میں فردوسی کی مدد کی۔ ایسے لوگوں میں سے بعض کے نام فردوسی نے بتائے ہیں۔ ان میں سے ایک حسین یا حسینی قُتیبَ نامی ایک شخص بھی ہے۔ یہ طوس کا عامل تھا۔ اس نے شاعر کو مدد دی تھی۔ اور لوگوں میں علی دیلم بودلف جیسے طوس کے بزرگ تھے جنھوں نے شاعر کی ہمّت افزائی کی تھی۔ ایسوں میں فردوسی نے سلطان محمود کے پہلے وزیر ابوالعباس فضل بن احمد کا نام بھی بڑی محبّت اور احترام سے لیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:

اگر فضل را مسند و مرقد است　　نشستن گہ فضل بن احمد است

ان لوگوں کے سوا ایران کے بہت سے شرفاء اور ایران کے بہت سے بہی خواہ ایسے بھی تھے جنھوں نے شاعرِ طوس کی مدد کی تھی۔ فردوسی نے ان کے نام نہیں بتائے ہیں اور یہ ہمیں معلوم نہیں۔ فردوسی نے حسین اور بودلف کا ذکر اس طرح کیا ہے:

حُسین قُتیبَ است از آزادگاں　　کہ از من نخواہد سخن رائیگاں

نیم آگہ از اصل و فرع خراج　　ہمی غلطم اندر میان دواج

ازیں نامہ از نامداران شہر　　علی دیلم بودلف راست بہر

ازدیم خورد کوشش و سیم و زر　　ازو یافتم جنبش و پای و پر

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کئی اسباب کی بنا پر شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ ایک تو یہ کہ خود اس کی آرزو تھی۔ دوسرے یہ کہ سامانی بادشاہوں نے اس سے پہلے اس کام کا حکم دیا تھا تیسرے یہ کہ ملک کے بزرگوں کی خود یہی خواہش تھی۔ چنانچہ ابتدا میں فردوسی خوش حال زندگی بسر کرتا تھا اور کسی سے حاجت براری کا آرزومند نہ تھا وہ اپنے سرمائے سے اس کام پر لگا رہا۔ چنانچہ دقیقی کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ممکن ہے میں بھی دقیقی کی طرح جلد مر جاؤں۔ اس لئے جتنی عمر باقی ہے اور جب تک میرے دم میں دم ہے میں جتنی جلدی ہو سکے اس کتاب کو نظم کر دینا چاہتا ہوں:

مگر خود درنگم نباشد بسے　　بباید سپردن بدیگر کسے
دو دیگر که گنجم وفادار نیست　　همان رنج را کس خریدار نیست

افسوس ہے ان لوگوں کی فہرست میں ایسے بزرگ بھی شامل تھے جو ایران کے اس گرامی پایہ شاعر کی قدر و قیمت اور اس کے حال سے بے خبر تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے صرف تعریف و تحسین پر ہی اکتفا کی اور اس کے وہ شعر جو اس نے خون دل سے لکھے تھے، مفت نقل کر لے گئے، چنانچہ کہتا ہے:

بزرگان با دانش آزادگان !　　نبشتند یکسر همه رایگان !
جز احسنت از ایشان نبد بهره ام　　بگفت اندر احسنتشان زهره ام

ان سے برے وہ لوگ تھے جنھوں نے فردوسی کے ساتھ برائی بھی کی، اس سے حسد کیا، اور اس کی بدگوئی کی۔

شاہنامے کے مضامین

شاہنامہ کے مضامین اور معانی کے بارے میں کچھ کہنا بڑا مشکل ہے اس کے لئے بڑی شرح اور بڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔ یہاں اس کا صرف خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہنامہ کے اشعار کی تعداد ساٹھ ہزار ہے اور یہ تعداد مختلف نسخوں میں زمانے

کے ساتھ ساتھ مختلف لوگوں کی تحریف اور کمی بیشی کی وجہ سے گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔

۱۔ تاریخی وقائع : حمد و ثنا، دانش و خرد کی تعریف، نعت پیمبر و اصحاب اور شاہنامہ کے جمع کرنے کی تاریخ کے بعد شاہنامہ کی اصل داستان شروع ہوتی ہے۔ پہلے کیومرث کا ذکر آتا ہے یہ ایران کا اولین داستانی بادشاہ ہے۔ شاہنامہ کے آخر تک پچاس بادشاہوں کے نام آتے ہیں اور ان کے دور کے حالات وزیروں اور پہلوانوں کی رزم بزم کی تصویریں پیش کی گئی ہیں آخر میں یہ طویل نظم عربوں کے ہاتھوں ایران کے آخری بادشاہ یزدگرد ثالث کی شکست اور ایران پر عربوں کے قبضہ پر ختم ہوجاتی ہے۔ تاریخی وقائع کے لحاظ سے شاہنامہ گویا پچاس فصلوں پر مشتمل ہے اور ہر فصل ایک بادشاہ کے لئے مختص ہے کیومرث کی بادشاہی سے لے کر منوچہر کی بادشاہی تک انسانی تمدن کی ابتدا، کھیتی باڑی کے آغاز، کھانے، کپڑے پہنے، مکان بنانے اور متمدن زندگی کی دوسری ضرورتوں کے پیدا اور رواج پانے کا بیان ملتا ہے۔ اسی حصہ میں ضحاک، کاوہ اور فریدون کی داستان آئی ہے۔ یہ ایک بہت پرانی، آریائی داستان ہے۔ منوچہر کے زمانے میں سام پیدا ہوتا ہے۔ زال دنیا میں آتا ہے اور پھر اس کا بیٹا رستم پیدا ہوتا ہے۔ منوچہر کا بیٹا نوذر سات سال حکومت کرنے کے بعد تورانیوں کے بادشاہ افراسیاب کے ہاتھوں قتل ہوجاتا ہے اور یہ واقعہ ایران اور توران کے درمیان معرکہ آرائیوں کا سبب بن جاتا ہے۔ ان جنگوں میں سب سے بڑا پہلوان اور ایران کا سب سے بڑا محافظ رستم ہے اسی نے پہلی جنگ میں افراسیاب کا کمر بند پکڑ لیا اور اس کے اونچے گھوڑے پر سے اسے زمین پر گرا دیا لیکن کمر بند کے کھل جانے کی وجہ سے شاہ توران افراسیاب کو موت کے پنجے سے رہائی مل گئی۔ اس کے زندہ بچ جانے کی وجہ سے ایران اور توران کی لڑائی نے طول کھینچا اور برابر پانچ بادشاہوں کے دور حکومت تک یہ لڑائی ہوتی رہی۔

شاہنامہ کے مفصل اور سب سے اہم حصوں میں کیکاؤس کے دور حکومت کا بیان ہے۔ اسی بادشاہ کے عہد میں رستم کے ہاتھوں عظیم الشان کام انجام پائے۔ ہفت خوان رستم اور اپنے بیٹے

سہراب سے رستم کے لڑنے کا دردناک واقعہ اور سہراب کا مارا جانا، اسی دور میں پیش آیا۔ اسی دور میں کیکاؤس کے بیٹے سیاوش کے توران چلے جانے اور وہاں اس کے مارے جانے سے ایران اور توران کے درمیان دشمنی کی آگ اور تیز ہوئی۔ پھر میدان کارزار نئے سرے سے گرم ہوا، بہت سی لڑائیاں ہوئیں اور ان میں سے کئی لڑائیوں میں رستم نے حصہ لیا۔ آخر کار کیخسرو کے زمانہ میں افراسیاب گرفتار ہو کر مارا گیا۔ اس آخری دور کی اہم ترین داستان بیژن اور منیژہ کی عاشقی کی داستان ہے۔ زرتشت کے ظہور کی داستان دقیقی کے اشعار میں ملتی ہے اور اس داستان کو کیکاؤس کے قصہ سے ملا دیا گیا ہے۔ گشتاسب کے زمانے میں ایرانی باستان کا سب سے بڑا پہلوان رستم اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے۔ دارا کے ظہور کے ساتھ ہی سکندر کی داستان شروع ہو جاتی ہے اور یہ داستان غیر ایرانی ماخذوں سے لی گئی ہے۔ اشکانیوں کا حال نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پھر ساسانیوں کی داستان شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں اس عہد کے اہم تاریخی واقعات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جو حقیقی تاریخ سے مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ حصہ شاہنامہ کے ایک نہائی حصہ پر محتوی ہے۔ اس طرح سے ایران کی یہ عظیم الشان قومی داستان یزدگرد ثالث ساسانی کی بادشاہت اور اس کی شکست پر ختم ہو جاتی ہے۔"

۲۔ شاہنامہ کے مطالب اور معانی: بادی النظر میں شاہنامہ ایران کی ایک رزمیہ داستان ہے اس لئے ممکن ہے یہ خیال ہو کہ یہ کتاب شروع سے آخر تک جنگ، شجاعت، بہادری اور قتل و خون کے واقعات سے بھری ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں بہت سے باریک معانی اور فلسفیانہ، اجتماعی اور اخلاقی مطالب داستانوں کے ضمن میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور اس طرح شاہنامہ کو محض خشک واقعات کی نقل بننے سے بچا لیا گیا ہے۔

شاعر بزرگ فردوسی نے شاہنامہ کی ابتدا میں حمد خدا، نعت پیمبر و اصحاب اور وصف خرد و دانش میں جو اشعار لکھے ہیں وہ کیا الفاظ کے لحاظ سے اور کیا معنی کے لحاظ سے نہایت بلند پایہ اور لطیف ہیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر اس کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جو بے محل نہیں

سمجھے جائیں گے :

بنام خداوند جان و خرد — کزین برتر اندیشہ برنگذرد
خداوند نام و خداوند جای — خداوند روزی دہ رہنمای
خداوند کیوان و گردان سپہر — فروزندۂ ماہ و ناہید و مہر
ز نام و نشان و گمان برتر است — نگارندہ برشدہ گوہر است
نیابد بدو نیز اندیشہ راہ — کہ او برتر از نام و از جایگاہ
سخن ہر چہ زین گوہران بگذرد — نیابد بدو راہ جان و خرد
ستودن نداند کس او را چو ہست — میان بندگی را ببایدت بست

خرد افسرِ شہریاران بود — خرد زیورِ نامداران بود
خرد زندۂ جاودانی شناس — خرد مایہ زندگانی شناس
خرد رہنمای و خرد دلگشای — خرد دست گیرد بہر دو سرای
ازو شادمانی وزو مردمیست — ازویت فزونی وزویت کمیست

ان اشعار کا لکھنے والا وہ ہے جو ایک طرف وجودِ باری پہ ایمان رکھتا ہے اور دوسری طرف فلسفیانہ نقطہ نظر سے یہ جانتا ہے کہ اس کی حقیقت کا درک اور اس کا اثبات مشکل ہے اسی روحانی کشمکش کو اس نے حمد کی پیاری زبان میں ادا کیا ہے۔ اس کے بعد وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ایمان کے بعد خرد کا درجہ ہے۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ وہ اس دنیا میں کمال اور خرد حاصل کرے اور صاحبِ نظر بن کر حقایق کو سمجھے۔ ہوشنگ، تہمورث اور جمشید کی بادشاہت کے ذکر میں شاعر نے تمدن اور زبان کے ظہور کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے اور یہ انسانی تمدن کی تاریخ کا بہترین منظوم خلاصہ ہے۔

فردوسی کے شاہنامہ کے شاہکار حصے وہ ہیں جن میں شاعر نے اہم واقعات یا بڑی جنگوں

کے آخر میں یا ان کے ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان اشعار سے ظاہر ہے کہ خونیں لڑائیوں سے، جوانوں کے مارے جانے، پہلوانوں کے دنیا سے اٹھ جانے، خاندانوں کے اجڑ جانے، سروروں کے زیر دست ہو جانے اور دنیا کے انقلابوں سے خود شاعر انتہائی غمگین اور متاثر ہو جاتا ہے، گویا وہ ان واقعات میں ڈوب کر ان کی عکاسی کرتا ہے۔ آفرینش کا راز کیا ہے؟ شاعر حیران اور متفکر رہ جاتا ہے۔ اسے چپ سی لگ جاتی ہے۔ اس کا دل شک و یقین اور جبر و اختیار کے بے تاہ سمندروں میں غوطے کھانے لگتا ہے وہ اسی قسم کے دلی تاثرات کو نہایت دلکش حکیمانہ انداز میں بیان کرتا ہوا گذر جاتا ہے۔ اس حکیم شاعر نے دلچسپ داستانوں سے جو اجتماعی اور اخلاقی نتیجے نکالے ہیں اور جو عبرت انگیز باتیں اور جادو بھری نصیحتیں کی ہیں وہ نہایت دقیق اور کار آمد ہیں۔ ان سب میں بیدار دل شاعر ہمیں یہی بتاتا ہے کہ اس دنیا کی شان اور اس کا شکوہ فانی ہے، انسان کو چاہیے کہ اس دو روزہ عمر میں بہادر، سخی، خدا پرست، سچا، دستگیر اور نیکو کار رہے۔ ان باتوں کو وہ اس دلنشین انداز میں بیان کرتا ہے:

بیا تا جہاں را بہ بد نسپریم — بکوشش ہمہ دست نیکی بریم

نباشد ہمی نیک و بد پائدار — ہماں بہ کہ نیکی بود یادگار

ہماں گنج دینار و کاخ بلند — نخواہد بدن مر ترا سودمند

فریدون فرخ فرشتہ نبود — بمشک و بعنبر سرشتہ نبود!

بداد و دہش یافت آن نیکوئی — تو داد و دہش کن فریدون توئی

پہلوانوں، بادشاہوں، دانش مندوں کی زبان سے ایرانیوں کو منوچہر، نوذر اور کیخسرو کی نصیحت، کیخسرو کی گودرز، زال کی رستم اور دارا کی سکندر کو وصیت، یا کام کرنے والوں کے نام انوشیرواں کا نامہ، انوشیرواں کی ہفت بزم میں بزرگ مہر کے حکیمانہ اقوال، انوشیرواں کی ہرمزد کو نصیحتیں، وغیرہ وغیرہ ہر ایک بجائے خود نہایت حکیمانہ اور عملی حکمت سے مملو اور انسانی زندگی کے لئے ایک لائحہ عمل ہے۔ یہ نصیحتیں اور یہ حکیمانہ اقوال انفرادی اور اجتماعی طور پر لوگوں کو

نیکی، شجاعت، بزرگی، بلند ہمتی، خدا پرستی، حکمرانی، عدل گستری، مردم پروری کو بے نظیر فصاحت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ یہاں بزرگ مہر کے ان حکیمانہ اقوال کا خلاصہ مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ بزرگ مہر نے یہ اقوال ایران کے نامی گرامی بادشاہ انوشیرواں کی ہفت بزم میں بیان کئے تھے۔ ان حکیمانہ اقوال میں بعض نہایت اہم بُنیادی مسائل آگئے ہیں، یہ مسائل ایسے ہیں جو ساری متمدن دنیا کے لئے دستورِ زندگانی بن سکتے ہیں: اول یہ کہ بات مختصر لیکن مفید ہو۔ دوسرے یہ کہ ہنر حاصل کرنا چاہئے اور صرف مال جمع کرنے کے درپے نہ رہنا چاہئے۔ تیسرے یہ کہ اس دنیا میں سب سے بہترین کام انسانیت ہے۔ چوتھے یہ کہ دنیا کی روشنی سچائی اور حق سے ہے۔ پانچویں یہ کہ ہر شخص اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک خاص طبیعت رکھتا ہے، سمجھدار وہی ہے جو ہر طبیعت کے ساتھ بسر کرے۔ چھٹے یہ کہ انسانوں کو ناممکن اور حاصل نہ ہونے والی چیزوں کے پیچھے سرگرداں نہ پھرنا چاہئے۔ ساتویں یہ کہ جسمانی اور روحانی حیثیت سے قوی رہے، کیونکہ جھوٹ اور برائی ناتوانی سے پیدا ہوتی ہے۔ آٹھویں یہ کہ علم و دانش حاصل کرنا چاہئے۔ نہم یہ کہ زندگی میں نہ اسراف سے کام لینا چاہئے اور نہ بخل سے۔ دسویں یہ کہ خدا پرست ہونا چاہئے۔
ان بلند پایہ مطالب کو ادا کرنے والے اشعار کا ایک انتخاب یہاں پیش کیا جاتا ہے:

نخستین چو از بند بکشاد لب — بیزدان ستودن ہنر داد لب

دگر گفت روشن روان آنکسی — کہ کوتاہ گوید بمعنی بسے

کسی را کہ مغزش بود باشتاب — فراوان سخن باشد و دیریاب

ہنر جوی و تیمار بیشی مخور — کہ گیتی سپنجست و ما بہ گذر!

بگیتی بہ از مردمی کار نیست — بدین با تو دانش بہ پیکار نیست

ہمہ روشنی مردم از راستی است — ز تاری و کژی بباید گریست

دل ہر کسی بندۂ آرزوست — وز و ہر کسی با دگر گونہ خوست

بجو ہر کسی در جہاں دیگر است — تو را بادی آمیزش اندر خوراست

بنایافت رنجہ مکن خویشتن — کہ تیمار جان باشد و رنج تن!
زنیرو بود مرد را راستی! — زسستی دروغ آید و کاستی
زدانش چو جان ترا مایہ نیست — بہ از خامشی ہیچ پیرایہ نیست
چو داری بدست اندرون خاستہ — زر و سیم و اسپان آراستہ
ہزینہ چناں کن کہ بایدت کرد — نبایدفشاند و نبایدفشرد
ہر آنکس کہ او کردہ کردگار! — بداند گذشت از بد روزگار
پرستیدن داور افزون کند — زدل کاوش دیو بیرون کند

شاہنامہ کی رزمیہ صحبتوں کی تعریف میں اس نکتہ سے غفلت نہ کرنی چاہیئے کہ یہ شاعر اعظم جنگ اور جنگ آوری کی اس مہارت کے ساتھ تعریف کرتا ہے گویا وہ خود بھی ایک سپہ سالار کی طرح فنونِ جنگ سے اچھی طرح آشنا تھا۔ وہ ایرانی طریقۂ جنگ، ایرانی ہتھیاروں اور ایران کی جنگی اصطلاحوں سے خوب واقف تھا۔ لیکن رزم و پیکار کی تفصیل، اور اقوام و ملل کی آپس کی دشمنی کو بیان کرنے کے باوجود فردوسی کی وسیع نظر اور فراخ روح دنیا کو وحدت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ انسان کی آپس کی لڑائیوں کو اس کی نادانی پر محمول کرتا ہے اور بار بار کہتا ہے کہ اس چھوٹی سی عمر کا مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اسے نیکی میں گذارا جائے لوگوں کو اپنی بے بنیاد کوتاہ خیالیوں میں گم نہ ہو جانا چاہیئے اور حق کو جو ساری دنیا میں جلوہ گر ہے اپنے پندار کے دریچہ سے نہ دیکھنا چاہیئے۔ یہی عالم گیر خیال طوس کے اس زبردست شاعر کے دینی فلسفہ میں مختلف پیراؤں میں پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ ادیان کی حقیقت کو خود خدا کی طرح ایک جانتا ہے اور دین کی بنیاد پر ملتوں کی لڑائی کو وہ طفلانہ حرکت سمجھتا ہے۔ لوگوں کی ایسی لڑائیوں کا ذکر وہ بہت متاثر ہو کر کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ خیال کید ہندی کے خواب اور مہران کی گزارش کے قصہ میں خاص طور پر بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

۳۔ ادبی محاسن: شاہنامہ کی ادبی خوبیوں میں ادبی زیبائش اور اچھوتی لطافت

بھی شامل ہے۔ اس کی بڑی وجہ زبان پر اس کا کامل عبور ہے۔ اس کے کلام کے اور جو نمونے باقی رہ گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دوسرے شاعروں کی طرح دوسرے اصنافِ شعر غزل، قصیدہ، رباعی اور قصیدہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اسے ایران کی قومی داستان سے خاص لگاؤ تھا۔ اس نے شاہنامہ کے لیے بحر تقارب کا انتخاب کیا۔ یہ وزن رزمیہ شاعری اور حماسہ سرائی کے لئے بہترین وزن ہے۔ فردوسی نے اس طرز کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ یہ اسی کا حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ فردوسی سے پہلے کا کوئی شاعر اور نہ اس کے بعد کا کوئی شاعر اسکی برابری کر سکا ہے۔ استاد کو خود اپنے کلام کی عظمت کا اندازہ تھا، اسی لئے کہتا ہے:

برافگندم از نظم کاخ بلند　　　که از باد و باران نیابد گزند

شاہنامہ کے ساٹھ ہزار اشعار میں سست بھرتی کے شعر یا مہمل اور ادق عبارتیں شاذ ہی کہیں ملیں۔ خود ہی کہتا ہے:

کہ گر باز جویند از و بیت بد　　　همانا که باشد کم از پنج صد

ظاہر ہے ساٹھ ہزار اشعار میں پانچسو گھٹیا اشعار کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔

فردوسی نے اپنے کلام میں عربی الفاظ بہت کم استعمال کئے ہیں اور صرف سیدھی سادی فارسی میں اپنے مطالب ادا کئے ہیں۔ اس پر بھی ان میں بے جان اور بھرتی کے شعر کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

شاہنامہ کی ایک ادبی خوبی حکایتوں، ضرب الامثال اور دینی اور اخلاقی باتوں کا بیان کرنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ شاعر کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ اس نے اسلامی علوم و معارف اور خاص کر قرآنی نکات سے گہری واقفیت حاصل کی تھی۔ اس کا کلام اس کے اس دعوے کو یعنی۔

بسی رنج بردم بدین نامه خواندم　　　ز گفتار تازی و از پهلوانی

پوری طرح ثابت کر دکھاتا ہے۔

تشبیہ فردوسی کا خاص کمال ہے۔ اس کے لئے بڑی ندرت اور اچھوتے پن کی ضرورت ہے

فردوسی نے فطری مناظر، میدان جنگ کے نقشے، غم وغصہ، شادی ومسرت اور خلوص ومحبت جیسے انسانی جذبات کو بڑے واضح اور روشن انداز میں پیش کیا ہے۔

آفتاب کے طلوع وغروب کا منظر، افق کی رنگا رنگی، آسمان کی صفائی، باغ، چمن اور کوہسار کے نظارے جو اکثر داستان کے شروع میں آتے ہیں، استادی کا بین ثبوت ہیں

منیژہ اور بیژن کی داستان کی ابتدا میں رات کے آنے کی ایک تصویر ملتی ہے۔ یہ تصویر اس دعوے کو ہر طرح ثابت کر دکھاتی ہے۔ یہاں اس کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

شبی چوں شبہ روی شستہ بقیر — نہ بہرام پیدا نہ کیواں نہ تیر
دگر گونہ آرایشی کرد ماہ! — بسیج گذر کرد بر پیش گاہ
شدہ تیرہ اندر سرای درنگ — میان کردہ باریک و دل کردہ تنگ
ز تاجش سہ بہرہ شدہ لاجورد — سپردہ ہوا را بزنگار و گرد!
سپاہ شب تیرہ بر دشت وراغ — یکی فرش گسترده چون پر زاغ
چو پولاد زنگار خوردہ سپہر — تو گفتی بقیر اندر اندودہ چہر
نمودم بہر سو بچشم اہرمن — چو مار سیہ باز کردہ دہن!
چناں گشت باغ و لب جویبار — کجا موج خیزد ز دریای قار
فرو ماندہ گردوں گردان بجای — شدہ سست خورشید را دست و پای
زمین زیر آں چادر قیر گون — تو گفتی شدستی بخواب اندرون
نہ آوای مرغ و نہ ہرای دد! — زمانہ زباں بستہ از نیک و بد!

ان اشعار کے پڑھنے سے آنکھوں کے آگے تاریک اور خاموش رات کا منظر پھر جاتا ہے رات کی اس تاریکی میں باریک سا ہلال بھی چمک رہا ہے اور زندگی کے ہنگاموں کی بجائے ایک وحشتناک سکوت ہر طرف چھایا نظر آتا ہے۔

فردوسی فطرت کے دل فریب مناظر، یا انسانی احساسات کی تصویر یہ نہایت دلکش اور دل ربا

انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس کی یہ خوبی شاہنامہ کے بیشتر اشعار میں پائی جاتی ہے ۔ حد یہ کہ بعض سیدھے سادھے واقعات میں بھی جیسے رودابہ اور زال کے عشق کی ابتدا میں آئے ہیں یہی لطافت اور یہی تازگی پائی جاتی ہے۔ دریا کے کنارے جہاں زال کا لشکر پڑا ہوا تھا رودابہ کی کنیزوں کے آجانے، وہاں ان کے پھول توڑنے اور پھر آپس کی چھیڑ چھاڑ شروع ہونیکا منظر اس طرح پیش کیا ہے :

بدیبای رومی بیاراستند | سر زلف بر گل بپیراستند
برفتند هر پنج تا رود بار | بهر بوی و رنگی چو خرم بهار
مه فرودین و سر سال بود | لب رود لشکرگه زال بود
از آن سوی رود آن کنیزان بدند | ز دستان همه داستانها زدند
بسی گل چدند از لب رود بار | رخان چون گلستان و گل در کنار
بگشتند هر سو همی گل چدند | سرا پرده را چون برابر شدند
نگه کرد دستان ز تخت بلند | بپرسید کاین گل پرستان کهاند

ایران کا نامی پہلوان رستم ہمیشہ ایران کے دشمنوں کے ساتھ نبرد آزما رہا اس کی پوری زندگی ہنگاموں، فسادوں اور شورشوں کے دبانے میں گذری اس کے سامنے مسلسل اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں اور فردوسی ان حالات کو ایسے موثر اور شورانگیز انداز میں نظم کرتا ہے کہ صاحب دل اسے پڑھیں اور پڑھ کر ناممکن ہے کہ بے خود نہ ہو جائیں۔ یہاں مثال کے طور پر ہفت خوان رستم کے دوسرے خوان سے کچھ شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں ایسے ہی پر ہیجان حالات، ایسے ہی رقت انگیز واقعات اور دوستی و محبت کے گہرے احساسات پیش کئے گئے ہیں :

یکی راه پیش آمدش ناگزیر | همی رفت بایست بر خیر خیر
بیابان بی آب و گرما سخت | کزو مرغ گشتی تن لخت لخت

چناں گرم گرد ید ہامون ودشت | تو گفتی کہ آتش بر و بر گذشت
تن رخش وگویا ز بان سوار | ز گرمی واز تشنگی شد ز کار
پیادہ شد از اسپ وژوبین بدست | ہمی رفت پویان بکردار مست
نمی دید بر چارہ جستن رہی | سوی آسمان کرد روی آنگہی
چنیں گفت کای داور داد گر! | ہمہ رنج وشادی تو آری بسر
گر ایدونکہ خوشنودی از رنج من | بدیں گیتی آگندہ شد گنج من
بپویم ہمی تا مگر کردگار | دہد شاہ کاوس را زینہار
ہم ایرانیاں را ز چنگال دیو | رہاندبی آزار کیہان خدیو
رہانی تو شان پاک بردست من | کہ دادم بایشان کنون جان وتن
مدہ رنج این لشکرم را بباد | من ولشکر وکشورم شاد باد

اگر ہم شاعر کی داستان سرائی کو لے بیٹھیں اور زال ورودابہ، بیژن ومنیژہ، گشتاسب وکتایوں کی دلکش عشقیہ داستانوں کی تفصیل بیان کریں تو یہ بحث بہت طویل ہو جائے گی مختصر یہ کہ جو بھی صاحب ذوق انھیں پڑھے گا، وہ استاد کی مہارت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکیگا۔ استاد کے قلم سے جو حزنیہ داستانیں نکلی ہیں ان میں سے صرف ایک رستم اور سہراب کی داستان کا نام لینا کافی ہے۔ اس داستان میں انسان کی خونیں قسمت اور اس کے اندوہگیں طالع کو بڑے ماہرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں فردوسی کے ایک المیہ شہ پارے سے یہاں چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار میں خود فردوسی کی زندگی کے ایک المناک واقعہ کی عکاسی نظر آتی ہے۔ یہ واقعہ شاعر کے بیٹے کی جوان موت ہے۔ ان سیدھے سادے اشعار میں ایک سوگوار باپ کے احساسات کا سارا نچوڑ پیش کر دیا گیا ہے:

مرا سال بگذشت بر شصت و پنج | نہ نیکو بود گر بیازم بگنج
مگر بہر گیرم من از پند خویش | براندیشم از مرگ فرزند خویش

مرا بود نوبت برفت آن جوان ز دردش منم چوں تنی بے روان
تستابم ہمی تا مگر یابمش چو یابم بہ بیغارہ بشتابمش

فردوسی کی شاعری کی ایک اور خصوصیت اس کے قلم کی نزہت، کلام کی عفت، اور پاک گفتاری ہے۔ پورے شاہنامہ کو کہیں سے اٹھا کر دیکھئے ایک بھی خلافِ ادب یا بے شرمی کا لفظ آپ کو دکھائی نہ دے گا۔ حد یہ کہ جہاں سخت سُست کہنے کی ضرورت پیش آئی ہے وہاں بھی اس نے پردے ہی میں بات کہہ دی ہے اور اپنے شعر کو رکیک اور ذلیل ہونے نہیں دیا ہے۔

شاہنامے کی اہمیت

اوپر جو کچھ مختصر طور پر کہا گیا ہے اس سے صاحبِ نظر پڑھنے والوں پر شاہنامے کی اہمیت واضح ہو گئی ہوگی یہ دل پسند اور ارجمند دیوان ایرانیوں کی قومیت کی سند ہے کیونکہ جس زمانہ میں ایرانی زبان اور ایرانی ادبیات عربی ادبیات کے اثر سے پیچھے ڈال دی گئی تھیں اور ایران کی قومی تاریخ اور داستان کئی صدیوں سے متروک اور فراموش ہوتی جارہی تھی، شاہنامے نے ان دونوں میں نئے سرے سے جان ڈالی اور انھیں دائمی زندگی بخشی۔ فردوسی کو فارسی زبان کے الفاظ کے استعمال پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ اس نے فارسی زبان کے بہت سے خوب صورت الفاظ کو اپنے روان اشعار میں استعمال کر کے انھیں دوبارہ رائج کیا اور اس کا کلام آنے والے شاعروں کے لئے نمونہ بن گیا۔

زبان کے سوا شاہنامہ معنی کے لحاظ سے بھی بہت بڑی قدر و قیمت کا مالک تھا۔ ایران کے پہلوانوں کی شجاعت، عفت، فداکاری، وفاشعاری اور سربلندی کی داستانیں ہر ایرانی کے لئے درس ہیں اور اسے اسلاف کی یادگار ایران کی محبت اور اس کی خدمت پر ابھارتی ہیں جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے فلسفیانہ، مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی مطالب بھی اس نامۂ بزرگ میں کچھ کم نہیں اور مردِ بینا ایسے مطالب سے استفادہ کرتے ہیں۔ سبک کی دلکشی، کلام کی ہم آہنگی، پختگی، ربطِ سخن، ادبی لطائف، شعری دقائق، امثلہ، کنایات، اور بدیعی محاسن سے پورا شاہنامہ

بھرا پڑا ہے۔ شاہنامے میں جو حقائق بار بار پیش کئے گئے ہیں ان میں عزائم کی بلندی اور ایران کے نام کی بڑائی کی کوشش کی گئی ہے اور ایران کے بزرگوں اور شریفوں کی بے اختیار تعریف نکلتی ہے۔ ملک کی حفاظت، اس کے ناموس اور اس کی بڑائی کے لئے رستم کی جانفشانیاں ملک کی حفاظت کے بارے میں سرداروں اور پہلوانوں کے خیالات، اور ایسے پُر اثر اشعار جیسے نامۂ رستم میں اپنے بھائی کے نام فرخزاد کے خط میں آئے ہیں، ان سب کو پڑھئے، آپ خود ہی ایران اور ایرانیوں کی خدمت کی روح کو جو پورے شاہنامے پر چھائی ہوئی ہے، آسانی کے ساتھ محسوس کر سکیں گے ان اشعار کے پڑھنے کے بعد پڑھنے والا خود چپکے چپکے اپنے وطن کے حقوق کی حفاظت اور اس کی خدمت کا عہد کرے گا اور اس طرح وہ بے اختیار فردوسی کا ہم آہنگ اور ہم نوا ہو کر پکار اٹھے گا:

چو ایران نباشد تن من مباد — بدین بوم و بر زنده یک تن مباد

ز بہر بر و بوم و فرزند خویش — زن و کودک خرد و پیوند خویش

ہمہ سر بسر تن بکشتن دہیم — از آن بہ کہ کشور بدشمن دہیم

جہانجوی اگر کشتہ آید بنام — بہ از زندہ دشمن بدو شادکام

فردوسی کی دوسری تصانیف تذکرہ نویسوں نے ایک اور نظم فردوسی سے منسوب کی ہے یہ نظم یوسف اور زلیخا کی داستان ہے اور اس کا وزن بھی شاہنامہ کا وزن ہے۔ یوسف زلیخا کے ایک قلمی نسخے میں لکھا ہے کہ فردوسی نے آل بویہ کے بہاء الدولہ دیلمی کے عہد میں اس کے وزیر علی حسن موفق کی فرمائش پر یہ مثنوی بغداد میں ۳۸۴ھ کے قریب لکھی۔ اس مثنوی کے ماخذ قرآن مجید کی سورۂ یوسف اور یہودیوں کی کتابیں ہیں۔ یہاں یوسف زلیخا کے ایک قلمی نسخے سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں ان اشعار میں مذکورہ مطالب بیان کئے گئے ہیں:

دو شاعر کہ این قصہ را گفتہ اند — بہر جای معروف و نہفتہ اند

یکی بو المؤید که از بلخ بود بدانش همی خویشتن را ستود
پس از وی سخن یافت این داستان یکی مرد بد خوب روی و جوان
نهاده ورا بخت یاری لقب کشادی بر اشعار هر جای لب
قضا را یکی روز اخبار آن همی راند مسن بهغرض بر زبان
به نزدیک تاج زمانه اجل موفق سپهر وفا و محل
مرا گفت خواهم که اکنون تو نیز بباشی بگفتار و شغلی بنیز
هم از بهر این قصه سازآوری ز هر گوشه معنی فراز آوری

بعض عالموں کو نہ صرف فردوسی کے اس سفر کی صحت میں شبہ ہے بلکہ انھیں سرے سے مثنوی یوسف زلیخا کے فردوسی کی تصنیف ہونے سے انکار ہے۔ حال ہی میں ایک عالم نے یوسف زلیخا کے ایک قلمی نسخہ کا پتہ چلایا ہے اس کے مقدمہ کے اشعار کی رو سے اس مثنوی کا مصنف فردوسی نہیں بلکہ یہ مثنوی سلطان ملک شاہ سلجوقی (۴۶۵-۴۸۵) کے عہد میں اس کے بھائی طغان شاہ بن الب ارسلان کے نام سے لکھی گئی ہے۔

مثنوی یوسف زلیخا کے سوا اور کچھ شعر فردوسی سے منسوب کیے گئے ہیں۔ ان میں قصیدے، قطعے، رباعیات اور غزلیں بھی شامل ہیں۔ یہ اشعار ہفت اقلیم، ریاض الشعرا، اور منتخب الاشعار جیسے تذکروں میں ملتے ہیں۔ ان اشعار میں ایک قطعہ تو وہ ہے جو اوپر نقل ہو چکا ہے اور جس کا مطلع یہ ہے:

حکیم گفت کسی را که بخت والا نیست به هیچ روی مر او را زمانه جویا نیست

اسی سلسلہ میں ایک اور قطعہ کا بھی ذکر کیا گیا تھا، یہ پورا قطعہ تذکرہ لباب الالباب میں اس طرح نقل ہوا ہے:

بسی رنج دیدم بسی گفته خواندم زگفتار تازی و از پهلوانی
بچندین هنر شصت و دو سال بودم چه توشه برم ز آشکاره و نهانی

بجز حسرت و جز وبال گناہان ندارم کنوں از جوانی نشانی

بیاد جوانی کنوں مویہ دارم برآن بیت بوطاہر خسروانی

جوانی من از کودکی یاد دارم دریغا جوانی دریغا جوانی

معلوم ہوتا ہے استاد نے یہ قطعہ (۶۲) سال کی عمر میں کہا ہے اور سامانی دور کے ایک شاعر بوطاہر خسروانی کے ایک قطعہ کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔

یہاں ایک بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ شاہنامہ کے نظم کرنے میں اولیت طوس کے اس شاعر اعظم ہی کو حاصل نہیں۔ اس سے پہلے ابوشکور بلخی، رودکی، ابوالموید، بختیاری، بوعلی بلخی اور دقیقی نے اس کام کو شروع کر دیا تھا اور ان شعرا نے لازمی طور پر اس شاعر اعظم پر اپنا اثر ڈالا۔ لیکن اس کے باوجود فردوسی کا کام سب سے الگ اور سب سے ممتاز ہے اس نے نہ صرف شاہنامہ کی تکمیل کی بلکہ فارسی زبان کی فصاحت کو حدِ کمال تک پہنچایا، اور داستان سرائی کا حق ادا کر دیا۔ اسی لئے فردوسی کے پیرو اور اس کی اتباع کرنے والے بہت پیدا ہوئے اور اس کے بعد فارسی کے بہت سے شاعروں نے استاد کی طرز پر شاہنامے لکھے ان میں سے بعضوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے:۔

ظفرنامہ حمداللہ مستوفی (آٹھویں صدی)، شہنامہ احمد تبریزی (آٹھویں صدی)، شہنامہ ہاسمی (دسویں صدی)، شاہنشاہنامہ صبا (تیرھویں صدی)

اسی طرح ہندوستان کے بہت سے ایرانی شاعروں نے شاہنامے لکھے ہیں، جیسے شاہنامہ تغلق، شاہنامہ کلیم، شاہنامہ بختاور خانی، شاہنامہ قدسی، شاہنامہ نادری، شاہنامہ عمدی اور شاہنامہ شاہ عالم۔

لیکن اتنے بہت سے شاہنامہ نگاروں کے باوجود اب تک ایک بھی شاعر سخن پرداز ی بلندی و استواری کے لحاظ سے استاد فردوسی کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکا، اور نہ آج تک شاہنامے کا جواب لکھ سکا۔ سچ تو یہ ہے کہ شاہنامہ سرائی فردوسی سے شروع ہوئی اور فردوسی ہی

پر ختم ہوگئی۔

شاہنامہ نے پوری متمدن دنیا کو متاثر کیا ہے اور ادبیات عالم میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ شاہنامہ کے اشعار اور افکار کا ملاً یا جزاً دوسری زبانوں میں منتقل ہو چکے ہیں ان میں شاہنامہ کا ایک مکمل عربی ترجمہ بھی ہے یہ ترجمہ بنداری (قوام الدین فتح بن علی اصفہانی) نے ۶۲۰ھ سے لیکر ۶۲۱ھ کے عرصہ میں مکمل کیا تھا۔ یہ ترجمہ اپنی قدامت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور آگے چل کر شاہنامہ میں جو تحریفیں ہوئی ہیں ان کی اصلاح میں بہت مفید ثابت ہوا ہے یورپ کی زبانوں میں شاہنامے کے مکمل ترجموں میں ایک ترجمہ فرانسیسی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ نثر میں ہے اور مول (MOLL) نے کیا ہے مول نے اس پر ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ یہ ترجمہ بشمول متن سات جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ دوسرا ترجمہ اطالوی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ منظوم ہے اور اس کا مترجم پیزی (PIZZI) ہے۔ انگریزی میں شاہنامہ کے کئی ترجمے ہیں۔ شاہنامے کی کئی لغتیں اور فرہنگیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک عبدالقادر بغدادی کی لغت شاہنامہ ہے آخری اور سب سے اہم لغت فارسی سے جرمنی میں ولف (WOLFF) کی فرہنگ شاہنامہ ہے اس میں نہ صرف مشکل الفاظ کے معنی دئے گئے ہیں بلکہ شاہنامہ میں جتنے حروف، جتنے الفاظ اور جتنے نام آئے ہیں ان سب کو ان کے محل استعمال کے لحاظ سے جمع کر دیا گیا ہے۔ مولف نے اس کام میں عمر کے بیس سال صرف کئے ہیں فردوسی اور شاہنامہ سے متعلق مغرب میں جو سب سے اہم علمی کام ہوا ہے اس میں جرمن عالم استاد نلدکے (Noeldeke) کی تحقیقاتیں شامل ہیں۔

حکومت ایران نے ۱۳۱۳ھ میں ایران کے اس عظیم المرتبت شاعر کا ہزار سالہ جشن طہران میں منایا۔ اس جشن میں علم و ادب کی دنیا کے تمام نمائندے شریک ہوئے۔ دنیا کے سولہ بڑے ملکوں نے اس جشن میں اپنے نمائندے بھیجے اور بڑے بڑے عالم اور مستشرق طہران میں جمع ہوئے۔ خاور اور باختر کے صوبہ میں جشن منایا گیا۔ اس جشن کے موقع پر بہت سی تصانیف اور بہت سے مقالے جو اہل کمال کی تحقیقات کا نتیجہ تھے وجود میں آئے۔ اور ایران کے اس گرامی پایہ شاعر کی یاد پھر ایک بار دلوں

میں زندہ ہو گئی۔

یہاں مختصر طور پر فردوسی کے جو حالات اور کمالات بیان کئے جا سکے ہیں ان سے ایران کے اس نامی شاعر کی عظمت کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عجب نہیں خود شاعر کو اپنی عظمت کا احساس ہو، کیونکہ اپنے بارے میں خود کہہ گیا ہے:

جہاں کردہ ام از سخن چون بہشت — ازیں بیش تخم سخن کس نکشت

بناہای آباد گردد خراب — ز باران وانہ تابش آفتاب

پی افکندم از نظم کاخی بلند — کہ از باد و باران نیابد گزند

نمیرم ازیں پس کہ من زندہ ام — کہ تخم سخن را پراگندہ ام

غزنوی دور کے مشہور علماء

غزنوی دور میں شعراء کے سوا علماء، فضلاء اور ادبا کی کمی نہ تھی۔ ان میں سے ہر ایک علم و ادب میں استاد کا درجہ رکھتا تھا۔ یہاں مختصر طور پر چند منتخب علماء اور ادیبوں کا ذکر کیا جاتا ہے:-

بدیع الزمان ابو الفضل احمد بن حسن بدیع الزماں ہمدانی اس عہد کا مشہور ادیب ہے۔ یہ اپنے عہد کے بڑے بڑے علماء جیسے ابو بکر خوارزمی اور ابو علی مسکویہ سے مراسلت اور مکاتبت رکھتا تھا۔ بدیع الزماں پہلا شخص ہے جس نے ادبی روایتوں اور کہانیوں کو مسجع عربی نثر میں لکھا اور مقامہ نویسی کا سبک ایجاد کیا۔ کتاب مقامات بدیع الزماں میں (۵۱) مقامات ہیں اور اسے سیستان کے امیر خلف بن احمد کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا شمار عربی کی نہایت بلند پایہ ادبی کتابوں میں ہوتا ہے۔

بدیع الزماں فارسی زبان میں بھی شعر کہتا تھا۔ چنانچہ ۳۸۰ھ میں جب وہ صاحب بن عباد کی خدمت میں پہنچا تو اس نے وزیر کے حکم سے شاعر منطقی کے تین شعر عربی میں ترجمہ کئے۔ بدیع الزماں نے ۳۹۸ھ میں وفات پائی۔

قابوس وشمگیر

شمس المعالی قابوس بن وشمگیر خاندان زیاریہ کا عالم حکمراں گزرا ہے، اس نے عربی اور فارسی میں شعر کہے ہیں۔ انشاء اور نامہ نویسی میں اسے کمال حاصل تھا۔ اس کے رسائل عربی میں ہیں اور انہیں طبرستان کے ایک ادیب عبدالرحمٰن یزداری نے "کمال البلاغۃ" کے نام سے جمع کیا ہے۔ سنہ ۴۰۳ھ میں قابوس مارا گیا۔

ابو علی مسکویہ

ابو علی محمد مسکویہ کا شمار عربی کے بڑے عالموں اور مورخوں میں ہوا ہے کہتے ہیں یہ پہلے زرتشتی تھا، بعد میں اسلام قبول کیا۔ آل بویہ کے دربار میں خاص کر عضدالدولہ دیلمی کے پاس بڑا تقرب رکھتا تھا اور اس کا خزانچی تھا۔ اس نے تاریخ، طب اور سیر و اخلاق پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی مشہور کتابوں میں ایک کتاب "تجارب الامم وتعاقب الہمم" ہے۔ یہ کتاب اسلام اور ایران کی عام تاریخ ہے۔ اس کتاب کے مطالب سے ظاہر ہے کہ ابن مسکویہ کو تاریخ نویسی میں خاص مہارت حاصل تھی اور اس کا مقصد صرف واقعات کا نقل کر دینا نہ تھا۔ ابن مسکویہ کی ایک کتاب اخلاق پر ہے۔ اس کا نام "تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق" ہے۔ اس کا ترجمہ مشہور فلسفی نصیرالدین طوسی نے فارسی میں کیا تھا۔

ابن مسکویہ نے ۴۲۱ھ میں وفات پائی۔

شیخ ابو علی ابن سینا

شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ ابن سینا نہ صرف ایران کا زبردست فلسفی گذرا ہے بلکہ اس کا شمار دنیا کے بڑے بڑے عالموں میں ہوتا ہے۔ اس کا باپ بلخ کا رہنے والا تھا اور نوح بن منصور سامانی کے عہد میں بلخ چھوڑ کر بخارا میں آ بسا تھا۔

ابن سینا ۳۷۰ھ میں بخارا کے نواحی قریہ خرمیثن میں پیدا ہوا۔ عنوان شباب ہی میں تمام علوم کی تکمیل کر لی اور ادبی اور قرآنی علوم میں مہارت تامہ بہم پہنچائی۔ پھر فقہ، منطق، ہیئت، ریاضی اور طب کی تکمیل کی۔ اس کم سنی میں اس کا یہ علمی تبحر اس کے استادوں کے لئے حیرت ناک تھا۔ مطالعۂ کتب فارابی کے بعد بوعلی سینا نے حکمت الٰہیہ اور ماوراء طبیعیات مسائل کی طرف خاص توجہ کی۔ اس کے مسائل پر اس نے گہری نظر سے غور کیا۔ اس کے بعد فلسفہ کے دقیق مسائل

کی تحقیق اور اصول طب کی تدوین اور امراض کے علاج میں مصروف ہوگیا۔ ان دو علوم میں اس نے غیر معمولی شہرت حاصل کی اور نوح بن منصور سامانی، مجد الدولہ دیلمی اور شمس الدولہ دیلمی کے علاج میں کامیاب رہا۔

ابو علی سینا پہلے سامانیوں کے پائے تخت بخارا میں مقیم رہا۔ اس کے بعد وہ خوارزم شاہیوں کے پائے تخت کرکانج میں منتقل ہوگیا۔ یہاں وہ ماموں بن مامون خوارزمشاہی کی مجلس کے صدر نشینوں میں شمار کیا جانے لگا۔ سلطان محمود کے ظہور کے بعد وہ زیاریوں کے پائے تخت گرگان میں منتقل ہوگیا۔ پھر یہاں سے رے، ہمدان اور اصفہان گیا اور شمس الدولہ بن فخرالدولہ دیلمی کی ملازمت اختیار کرلی اور ۴۰۵ھ اور ۴۱۲ھ کے درمیان دو بار ہمدان میں اس کی وزارت پر فائز ہوا۔

ان مشکلوں، مصیبتوں، مسافرتوں اور حکومت کے فرائض و مناصب کے باوجود جو شیخ کی فراغت خاطر میں حارج تھے، شیخ کی جوان فکر کام اور فیض بخشی میں مشغول رہی۔ علم اور ہنر کے طالبوں کو وہ اپنے حلقۂ درس میں جمع کرکے درس دیتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت بلند پایہ عالمانہ کتابیں بھی تصنیف و تالیف کرتا رہا۔

شیخ کی تصانیف سو سے زیادہ تھیں۔ ان میں مشہور ترین کتاب "شفا" حکمت، منطق طبیعات، الٰہیات اور ریاضیات پر ہے۔ کتاب "قانون" طب میں ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں ۱۔ کلیات، ۲۔ ادویہ مفردہ، ۳۔ امراض مخصوصہ اعضاء، ۴۔ امراض عمومی بدن۔ ۵۔ ادویہ مرکبہ، اس کی ایک اور کتاب "اشارات" ہے۔ یہ کتاب منطق اور حکمت پر ہے اور اس میں شیخ کے آخری نظریات پیش کئے گئے ہیں۔ یہ تینوں کتابیں دنیا کی علمی امہات کتب میں شمار کی جاتی ہیں اور ایک عرصہ دراز تک مشرق اور مغرب میں بڑے بڑے علماء اس کا درس دیتے رہے ہیں۔ اگرچہ ابو علی درجہ اول کے مفکروں میں گنا جاتا ہے اور علوم و فنون ہی سے اس کا تعلق رہا ہے۔ اسے ادب میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس کی تصانیف

اس کی شاہد ہیں۔ شیخ کی تصانیف کی عربی نہایت شیریں، منظم، دلکش اور سادہ ہے۔ اس نے ملبند پایہ عربی قصائد بھی لکھے ہیں جیسے قصیدۂ نفس۔ اس نے حی بن یقظان اور سلامان و ابسال جیسے عربی قصے لکھے ہیں اور اس کے شاگرد جوزجانی کی روایت کے مطابق اس نے ایک مکمل عربی لغت بھی جمع کی تھی۔ اس وقت یہ لغت ناپید ہے۔

شیخ نے فارسی زبان میں بھی تصنیف و تالیف کی ہے۔ ان تصانیف میں سے ایک فلسفیانہ کتاب "دانشنامہ علائی" کے نام سے موسوم ہے۔ شیخ نے یہ کتاب کاکویہ کے بیٹے علاءالدولہ کے نام معنون کی ہے۔ یہ کتاب بہت مشہور ہے اور اس میں استاد نے اپنی مادری زبان پر کامل عبور کا ثبوت دیا ہے حتیٰ کہ علمی اصطلاحات تک کو فارسی کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کے سوا شیخ نے فارسی میں شعر بھی کہے ہیں۔ ذیل میں ان رباعیوں میں سے جو اس سے منسوب ہیں، ایک رباعی پیش کی جاتی ہے:

کفر چو منی گزاف و آسان نبود — محکمتر از ایمان من ایمان نبود

در دہر چو من یکی و آنہم کافر — پس در ہمہ دہر یک مسلمان نبود

شیخ نے ۴۲۸ھ میں بمقام ہمدان وفات پائی۔

ثعالبی

ابو منصور عبدالملک بن محمد ثعالبی نیشاپوری کا شمار اس دور کے مشہور ادیبوں اور عالموں میں ہوتا ہے۔ لغت، قصص اور امثال و حکم میں اس کی بہت سی مفید کتابیں ہیں۔

ثعالبی نے بہت سے عربی گو ایرانی اور عرب شاعروں کے حالات اور ان کے منتخب اشعار پر پہلے "یتیمۃ الدہر" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی اور پھر اس کے بعد "تتمۃ الیتیمہ" کے نام سے اس کی تکمیل کی۔

ثعالبی نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی۔

بیرونی

ابوریحان محمد بن احمد بیرونی دنیا کے دانشمندوں اور ایران کے زبردست عالموں اور فاضلوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ۳۶۲ھ میں نواح خوارزم بیرون میں پیدا ہوا۔ اس کی عمر

کا ابتدائی حصہ خوارزم میں بسر ہوا۔ یہاں مامون بن مامون خوارزم شاہ نے اس کی سرپرستی کی اس کے بعد گرگان کے حاکم شمس المعالی قابوس وشمگیر زیاری کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسکی سرپرستی حاصل کی یہاں سے وہ سلطان محمود کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور اس بادشاہ کے حضور میں تقرب حاصل کیا سلطان محمود نے ہندوستان کے جو سفر کیے ان میں وہ سلطان کے ساتھ رہا اور اس ملک کے حالات کا مطالعہ کیا اور ہندوستان کی زبان یعنی سنسکرت سیکھی۔

البیرونی کی اہم تالیفوں میں سے ایک تالیف "الآثار الباقیہ عن قرون الخالیہ" ہے اس کتاب میں اس نے ایرانیوں (بشمول سغدیان، خوارزمیان و پارسیان) یونانیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی تقویم، سنین اور حالات وغیرہ لکھے ہیں۔ یہ کتاب اس نے ۳۹۰ھ میں لکھی ہے اور اسے قابوس کے نام معنون کیا ہے۔ بیرونی کی ایک اور تالیف ہے "تحقیق ماللہند"۔ یہ کتاب اس نے ہندوستان کے سفروں کے بعد ہندستانیوں کے حالات اور ان کے اخلاق پر لکھی ہے۔

ہیئت، ہندسہ اور نجوم پر بھی بیرونی کی دو مشہور کتابیں ہیں۔ ایک کا نام ہے "التفہیم لاوایل صناعۃ التنجیم" یہ کتاب اس نے ۴۲۰ھ میں بمقام غزنہ لکھی اور اسے حسین خوارزمی کی بیٹی ریحانہ کے نام معنون کیا۔ اس کا ایک حصہ اس نے فارسی میں بھی لکھا ہے۔ دوسری کتاب "قانون مسعودی" ہے اس نے یہ کتاب ۴۲۱ھ سے لے کر ۴۲۷ھ کے درمیان لکھی اور سلطان مسعود غزنوی کے نام معنون کی ہے۔

بیرونی نے ۴۴۰ھ میں وفات پائی۔

ابوالفضل بیہقی جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں اس دور کے بڑے بڑے عالموں کی بیشتر اہم تصنیفیں عربی زبان میں تھیں لیکن اس دور کے عالم ابوالفضل بیہقی کا شاہکار فارسی زبان میں ہے۔ بیہقی انیس سال تک غزنوی سلاطین کے دیوان رسایل کا منشی رہا اس نے سلاطین غزنویہ کی ایک مفصل اور مبسوط تاریخ تیس جلدوں میں لکھی ہے۔ گو یہ آل ناصر کی تاریخ ہے اور نہایت بلیغ اور شیریں فارسی میں لکھی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کی چند جلدیں اور وہ بھی ناقص جلدیں اب باقی رہ گئی ہیں اور اہم اور مبسوط تاریخ ناپید ہو گئی ہے۔ جو جلدیں

باقی رہ گئی ہیں وہ سلطان مسعود کے دور سے متعلق ہیں۔ یہ جلدیں تاریخ مسعودی کے نام سے موسوم اور تاریخ بیہقی کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ بے شبہ بیہقی فارسی زبان میں بلاغت کا استاد تھا۔ اس کے جیسا دلکش سبک اور اس کی جیسی جاذب طرز ادا کسی اور فارسی کتاب میں کم ملے گی۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت جو جاذب توجہ ہے وہ مصنف کی صداقت پسندی اور حق پرستی ہے۔ جس کسی نے بھی اس کتاب کو غور سے پڑھا ہے اسے حیرت ہوتی ہے کہ بیہقی نے اس زمانے میں یعنی آج سے نو سو سال پہلے کس طرح غیر جانب دارانہ تاریخ نویسی کا حق ادا کیا ہے اور کہیں بھی راہ راست سے ہٹنے نہیں پایا ہے۔

بیہقی نے اپنی تاریخ ۴۵۱ھ میں مکمل کی اور ۴۷۰ھ میں وفات پائی۔

ایران کے دوسرے حصوں میں علم و ادب کی ترویج

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے غزنوی دربار کے سوا بخارا، گرگانج اور ایران کے دوسرے علاقے سامانیوں، خوارزم شاہوں اور دوسرے حکمرانوں کی سرپرستی میں علوم و ادبیات کے معدن اور شعراء، علماء اور عقلاء و فضلا کا مرکز بن گئے تھے۔ ان مقامات پر ابو ریحان بیرونی، شیخ ابو علی سینا، ابو الخیر خمار، ابو سہیل مسیحی اور ابو نصر عراقی جیسے علماء، حکماء اور اطباء پیدا ہوئے۔ دونوں حکمران خاندان علم دوست اور ادب پرور تھے۔ انھوں نے شعراء، ادباء اور حکماء کی سرپرستی کی۔ سب سے پہلے سامانیوں نے فارسی زبان میں تصنیف و تالیف، ترجمہ اور شاہنامہ کے نظم کرنے کا حکم دیا۔ نوح بن منصور کے پاس تو بہت بڑا کتب خانہ تھا اور اس سے ابو علی سینا نے استفادہ کیا تھا۔

خوارزمشاہیوں میں خاص طور پر مامون بن مامون بڑا علم دوست اور ہنر پرور تھا۔ ان دونوں خاندانوں کے وزراء بھی بڑے لائق اور فضل شناس تھے۔ سامانیوں کا وزیر بلعمی، اور مامون کا وزیر احمد بن محمد سہیلی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اسی طرح طبرستان، گرگان اور اس کے آس پاس کے علاقے یعنی آل زیار اور علویوں کی ریاستیں بھی شاعروں، ادیبوں اور عالموں کے

مرکز بن گئے تھے خود شمس المعالی قابوس وشمگیر اور اس کے پوتے کیکاؤس کا شمار علماء اور حکماء میں ہوتا ہے۔ دیلمیوں اور آل بویہ کے بادشاہ اور وزراء بھی ہنرمند اور ہنرپرور گذرے ہیں۔ ان میں شمس الدولہ، علاء الدولہ، عضد الدولہ، عزالدولہ، بہاء الدولہ اور صاحب عباد جیسے لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ اس دور کے مصنفوں اور خاص کر ان لوگوں نے جو صاحب بن عباد وزیر کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، عربی میں تصنیف وتالیف کی ہے۔ لیکن انھوں نے عربی کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی تصنیف وتالیف کی ہے اور دانش نامۂ علائی اور کتاب التفہیم سے یہ بات بخوبی ثابت ہے۔ آل بویہ کے دربار میں فارسی گو شاعروں کی کمی نہ تھی ان میں منطقی، خسروی، بندار اور بختیار کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس دور کے بعض شاعر ذواللسانین تھے یعنی وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے مثلاً ابوالفتح بستی (متوفی سنہ ۴۰۰ھ) نے ان دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔

ماخذ:

فارسی تذکرے (اس کتاب کے آخر میں دی ہوئی ماخذوں کی فہرست ملاحظہ ہو)
چہار مقالۂ عروضی و تعلیقات چہار مقالہ از آقای محمد قزوینی طبع لیڈن کتاب حماسہ ملی ایران۔ تالیف نلدکے (Noeldeke) ابوالموید بلخی از آقای سعید نفیسی۔ مجلۂ مشرق۔ طبع طہران سنہ ۱۳۸۱ھ سلسلہ مقالات بر فردوسی۔ مجلۂ کاوہ طبع برلین سنہ ۱۳۳۹ھ تاریخ ادبیات ایران از استاد براؤن ج ۲
فردوسی نامۂ مہر۔ طبع طہران سنہ ۱۳۱۳
فردوسی۔ مقالۂ آقای بہار، مجلۂ باختر، اصفہان، شمارہ ۱۱، ۱۲ سال اول
فرمان دہی فردوسی، از آقای بہار مست، طہران سنہ ۱۳۱۳ھ مقدمۂ دیوان فرخی طبع طہران از عبدالرسولی سنہ ۱۳۱۱ھ سخن و سخنوران، آقائی بدیع الزمان ج ۱
طہران سنہ ۱۳۰۸ھ برٹش میوزیم میں فارسی مخطوطوں کی فہرست، انگریزی، مرتبہ ریو، ج ۲
تاریخ ادبیات ایران، در ضمن فقہ اللغہ ایران (جرمنی) تالیف پروفسر اِتھے، ج ۲

دیوان منوچہری، مع حواشی و تعلیقات، از کازیمیر یسکی، طبع پیرس،
منوچہری کے لقب اور تخلص کے لئے ملاحظہ ہو راحۃ الصدور، طبع یورپ
ص ص ۵۷ و ۷۴
مقالات آقای سعید نفیسی متعلق بہ منوچہری، مجلۂ باختر (اصفہان)، سال دوم
فردوسی کی یوسف زلیخا کے لئے ملاحظہ ہو مجلۂ مہر میں ڈاکٹر رضازادہ شفق کا مضمون
طہران، ص ۵۸۷ اسی موضوع پر ملاحظہ ہو گرنباوم (Grunebaum)
کا اہم مضمون مجلۂ آسیائی جرمنی کی جلد (۳۴) کے دو شماروں میں۔
اسی موضوع پر ملاحظہ ہو آقای عبدالعظیم کے فاضلانہ مقالات، مجلۂ آموزش
و پرورش، شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲، سال نہم، ۱۳۱۵ھ
تاریخ ادبیات ایران تالیف آقای ہمائی، ج ۱، تبریز ۱۳۴۰ھ ابن سینا، رسالہ، از
آقائی دکتر غنی، طہران ۱۳۱۵ھ اس دور کے علماء اور ادیبوں کے لئے مندرجہ
بالا کتابوں کے سوا ملاحظہ ہوں:
تاریخ الحکماء، قفطی
طبقات الاطباء، ابن ابی اصیبعہ
تاریخ ادبیات عرب، تالیف بروکلمان (جرمنی)
تاریخ ادبیات عرب، تالیف ہوار، (فرانسیسی)
تاریخ ادبیات عرب تالیف نکلسن (انگریزی)
وفیات الاعیان ابن خلکان
معجم الادباء، یاقوت
تاریخ بیہق، طبع طہران، تبصیح آقای بہمنیار
آداب اللغۃ، تالیف جرجی زیدان۔

۳- سلجوقی دور

سلجوقی سلطنت کا بانی دقاق کا بیٹا سلجوق غز ترکوں کا ایک سردار تھا۔ دوسرے ترک قبیلوں کی طرح سلجوق بھی نواح ترکستان سے ایران آئے۔ پہلے یہ بخارا کے گرد و نواح میں مقیم ہوئے ۴۳۱ھ میں سلجوق کے دو پوتے یعنی چغری اور طغرل دو بھائیوں نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ انھوں نے خراسان میں اتر کر غزنویوں کو زیر کر لیا۔ چغری نے مرو کو اور طغرل نے نیشاپور کو اپنا پائے تخت بنایا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے نام کا خطبہ پڑھنے کا حکم دیا۔ کچھ عرصہ بعد طغرل کی طاقت اور بڑھی اور اس نے رے کو اپنا پائے تخت بنایا۔ اس کے بعد اس نے پے درپے کئی علاقے فتح کئے اور بغداد پہنچا۔ خلیفہ وقت نے اس کا شاندار استقبال کیا۔

اس طرح سلجوقی حکومت بتدریج ترقی کرتی گئی اور اسے استحکام حاصل ہوتا گیا۔ اب تک جتنی سلطنتوں کا ذکر ہو چکا ہے، ان سب میں سلجوقی حکومت سب سے زیادہ طاقت ور، وسیع اور با اختیار تھی۔

سلاجقۂ بزرگ کی سلطنت جس کا مرکز خراسان تھا، ۵۵۲ھ میں ختم ہو گئی۔ ان کے بعد اس سلطنت کے علاقوں پر دوسرے حکمران خاندان جیسے سوریہ (شام) کے سلجوقی چھٹی صدی کی ابتدا تک اور عراق، کرمان اور کردستان کے سلجوقی اور روم کے سلجوقی ساتویں صدی کے آخر تک حکومت کرتے رہے۔

اس خاندان کی اور اس کے ہم عصر خاندانوں کی اہمیت ایران کی ادبی تاریخ کے لحاظ سے

پچھلے حکمران خاندانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کے عہد میں ایرانی ادبیات کا احیاء ہوا، اور ان کا عام رواج ہوا۔ ان کے دور میں بڑے بڑے شاعر اور بڑے بڑے عالم جیسے ناصر خسرو، خیام، انوری، معزی، قطران، سنائی، شیخ عطار، مورخوں میں راوندی، فقہا، علماء اور مشائخین میں غزالی، قشیری، نجم الدین کبریٰ جیسے لوگ پیدا ہوئے اسی دور میں پچھلے دور سے کہیں زیادہ ادبی، تاریخی، مذہبی منظوم اور منثورہ آثار منصۂ شہود پر آئے۔ ملک شاہ اور سنجر جیسے سلجوقی بادشاہوں نے ادیبوں کی سرپرستی کی بلکہ ان میں سے بعض خود سخن شناس اور عالم و فاضل تھے۔ ان کے وزراء بھی بڑے دانشمند اور علم دوست تھے۔ مثلاً عمید الملک کندری خود بڑا عالم اور فاضل تھا نظام الملک طوسی بہت بڑا ادیب نہایت بلند پایہ مصنف تھا اور علماء کا بڑا احترام کرتا تھا۔ عمید الملک نے خاص طور پر فارسی گو اور فارسی نویس شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی نظام الملک کو عربی سے زیادہ دلبستگی تھی۔ اسی نے بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان، بغداد اور دوسرے مقامات پر نظامیہ کے نام سے بڑے بڑے مدرسے قائم کئے اور ان مدرسوں میں اس عہد کے بڑے بڑے عالموں کو درس و تدریس کے لئے مقرر کیا۔

سلجوقیوں کی حکومت کے مراکز جیسے نیشاپور وغیرہ شاعروں اور ادیبوں کے مرکز بن گئے تھے باخرزی نے جو خود بھی اس عہد کا ایک بڑا ادیب گذرا ہے، اپنے تذکرہ "دمیۃ القصر" میں سینکڑوں عربی گو شاعروں کے نام گنائے ہیں۔ ان شاعروں میں سے اکثر اس کے ہم عصر تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فارسی گو شاعروں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہوگی۔ آنے والے صفحوں میں ہم ان فارسی گو شاعروں میں سے بعض مشاہیر شعراء کا تذکرہ کریں گے۔

سلجوقی دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسی دور میں صوفیانہ عقائد کو ترقی ہوئی اور اس سلسلہ کے بہت سے مشائخ اور شاعر پیدا ہوئے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ ان علمی اور ادبی ترقیوں میں صرف سلجوقی بادشاہوں کی سرپرستی اور حمایت کو دخل نہیں ہے بلکہ سلجوقی دور سے پانچویں اور چھٹی صدی مراد ہے۔ ان صدیوں میں غوریوں

خوارزمشاہیوں، بوئیوں، غزنویوں اور اتابکوں کی حکومتیں بھی رہی ہیں اور یہ خاندان کم و بیش سلجوقیوں کے ہم عصر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر خاندان نے اپنے دورِ حکومت میں عالموں اور شاعروں کی سرپرستی کی ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض کے حالات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے اس دور کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عربی تسلط کے زوال، ایران کی حصول آزادی اور فارسی زبان کے رواج کی وجہ سے سامانی اور غزنوی دوروں میں ایرانی ذکاوت ذہانت اور طباعی کو اپنے جوہر دکھانے کے مواقع ہاتھ آئے۔ غزنوی دورِ حکومت کا جو زمانہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ غزنوی سلجوقیوں سے مغلوب ہو گئے لیکن ان کی سلطنت کا خاتمہ نہیں ہوا، بلکہ یہ ایک عرصہ دراز تک سلجوقیوں کے ہم عصر رہے اور غزنہ اور ہندوستان میں حکومت کرتے رہے۔ چنانچہ آئندہ صفحات سے معلوم ہو گا کہ سلجوقی دور کے بعض مشہور شاعر جیسے مسعود سعد اور سنائی غزنوی دربار سے تعلق رکھتے تھے۔

صوفی شعراء

تصوف ایک مخصوص طریقت ہے اور مخصوص مذہبی عقائد و افکار کا مجموعہ ہے ایران میں ان عقائد کا ظہور بہت قدیم زمانے سے ہوا اور بتدریج اس میں وسعت پیدا ہوئی، پھر منظوم اور منثور ادبیات میں ان عقائد کا بڑے زور شور سے اظہار ہوا۔

ایرانی تصوف کے عقائد کے ماخذ مختلف ہیں۔ بعض اس کی اصل کو ہندوستان کی مذہبی تعلیم قرار دیتے ہیں۔ بعض اس کا ماخذ مغرب کی اشراقی حکمت کہتے ہیں اور بعض اسے خود ایران کی پیداوار ٹھیراتے ہیں۔

ہندی مذہبی تعلیم حقیقی سعادت کو اس دنیا کو تیاگ دینے، روحانی دنیا سے وابستہ ہو جانے اور روح سے کامل اتحاد پیدا کرنے کو قرار دیتی ہے۔ اس منزل مقصود پہ پہنچنے کے لئے وہ ریاضت، سلوک، اعتکاف، سکون، سکوت، تحقیرِ جسم، تربیتِ روح، تجرد اور اعتزال

کی تعلیم دیتی ہے۔

حکمت اشراق اس فلسفیانہ مذہب کو کہتے ہیں جو تیسری صدی ہجری عیسوی میں بمقام اسکندریہ ظاہر ہوا۔ اس مذہب کے عقاید کی بنیاد یونان قدیم کی حکمت اور خاص کر حکیم افلاطون کی تعلیمات پر رکھی گئی تھی۔ حکمت اشراق کے بنیادی عقائد یہ ہیں کہ اصل وجود اور مرکز ہستی خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ آدم اور عالم اس کی تجلی اور دنیا اس کی ذات کا آئینہ ہے۔ اس کے سوا تمام اشیا ظاہری اور اعتباری ہیں۔ صرف اسی کی ذات واقعی ہے وہ نور کی طرح تمام موجودات میں سرایت کئے ہوئے ہے اور انھیں ہستی بخشتی ہے۔ ہر چیز اپنی حیثیت کے لحاظ سے نور وجود سے یا اشراق الہیٰ سے بہرہ ور ہو رہی ہے۔ جو بھی خدا کی معرفت اور اس کا وصال چاہتا ہے وہ ملاحظہ عالم، مطالعہ نفس، سلوک، ذکر، ریاضت اور کشف کے ذریعہ اس مقام پر پہنچ سکتا ہے اس گروہ کے عقیدہ کے مطابق انسان کے لئے حکمت و دلیل کی منزلیں طے کرنے کے بعد مقام کشف و شہود پر پہنچنا ممکن ہے۔ عارف حقائق کو نہ صرف عقل کی ہدایت سے بلکہ نور اشراق سے پا سکتا ہے اور ان کو آشکار دیکھ سکتا ہے اور عارف کا علم دانش مند کے علم سے سننے کے مقابلہ میں دیکھنے کے برابر ہوتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مذکورہ بالا مذاہب کے عقائد نے ایرانی افکار کو متاثر کیا اور واقعہ یہ ہے کہ روح ایرانی میں قدیم زمانے سے تصوف اور عرفان کا خاصہ مذاق رہا ہے چنانچہ قدیم زمانے میں خاص کر مذہب مانی نے لطیف عرفانی عقائد کی تعلیم دی اور اس زمانے میں وحدت، ترک اور مجاہدہ کے آئین سکھائے۔

اسلامی دور میں بھی بہت سے ایرانیوں نے عرفانی افکار اور صوفیانہ عقائد کو علم و ادب کے ذریعہ پیش کیا۔

خلاصہ یہ کہ ایرانی قدیم زمانے ہی سے اس طریقت کے اسرار و رموز سے واقف تھے اور دوسروں کے پاس اس طرح کی جو اچھی چیزیں تھیں انھیں بھی اخذ کر لیا تھا۔ پھر ان سب

پر اسلامی دور میں اپنے ذوق کا رنگ چڑھا کر اپنی منظوم و منثور تصانیف میں انھیں پیش کرنا شروع کیا۔ اس طرح خاص ایرانی اسلوب کا تصوف وجود میں آ گیا۔

ایران تصوف کے دو شعبہ ہیں۔ ایک منفی ہے اور وہ عبارت ہے ترک دنیا۔ ریاضت ترک علائق، شہوتوں کے مارنے، قناعت اختیار کرنے اور فقر اور کمبل پوشی ("صوف" کمبل کا لفظ خود اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے) سے اور یہ تمام صفات عالم ظاہر کی نفی کے ہیں۔ ظاہر ہے یہ مسلک ہندی تصوف سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ ایرانی تصوف کا دوسرا شعبہ مثبت ہے اور یہ عبارت ہے سلوک، جستجو، طلب، طے مراحل، اخلاص، عبادت، ایثار بے غرض خدمت، مطالعہ، تربیت نفس، محبت، کسب معرفت، مقام عشق الٰہی پر پہنچے، اسی کی ہستی میں فنا ہونے، اوامر حق پر مضبوطی سے جمے رہنے، بے منت کوشش اور بے ریا خدمت سے۔

مختصر یہ کہ ایرانی تصوف کی اساس خدمت، محبت اور درک وحدت پر رکھی گئی ہے۔ کامل صوفی وہ ہے جو دوسروں سے مراحل تقلید و توسل کی تعلیم حاصل کرے اور اصول کلام اور دلایل منطق کی تحصیل کرے اور طریق کشف، ذکر اور مطالعۂ نفس سے حقیقت کا راستہ پالے اور کشف و شہود کے مقام پر پہنچ جائے۔ اپنے دل کو عشق و محبت اور احدیت کی جلوہ گاہ قرار دے۔ اپنی فکر کو مرحلۂ نسبت اور عالم سفلی کی کثرت سے وحدت عالم علوی کے مقام پر پہنچائے ضمیر کے آئینہ کو صاف رکھے تاکہ اپنے اندر خدا کا جلوہ دیکھ سکے اور معرفت سے روشناس ہو۔ اپنے پندار و گفتار و رفتار میں مظہر حق و حقیقت بن جائے۔ اس نورانی نظر کے پرتو سے عالم انسانی میں بھی وحدت اصلی کو دیکھے اور یہ جان لے کہ تمام فرقے اور تمام مذہبی جھگڑے انسان کی ناسمجھی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ؂

چون ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

ایران کے عارف اور صوفی شاعروں اور ادیبوں نے عرفانی اور صوفیانہ عقائد کو بہترین اور

شیریں ترین طرز میں نظم و نثر کا لباس پہنایا ہے۔ لطیف و نازک اور احساسات عالی کو عبارت کے قالب میں ڈھالا ہے اور اس طریقت کے بزرگوں اور مشائخوں نے اپنے اپنے عقائد اور افکار کے لطائف کو زیبا ترین شعر و ادب میں پیش کیا ہے۔

یہاں ہم سلجوقی دور کے بعض صوفی شعراء کا ذکر کریں گے۔ ان میں سے باباطاہر ہمدانی، ابی سعید ابی الخیر، خواجہ عبداللہ انصاری، سنائی اور شیخ عطار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

باباطاہر

باباطاہر ہمدان کے رہنے والے تھے۔ عارفوں کا مسلک درویشی اور فروتنی ہے، اسی لئے باباطاہر گوشہ گیر رہے اور گمنام زندگی بسر کی اور اپنی زندگی کے تفصیلی حالات بھی نہ چھوڑے۔ صرف بعض صوفیہ کی کتابوں میں ان کے معنوی مقام مسلک ریاضت درویشی اور ان کے تقوی اور استغنا کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی زندگی کے حالات کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے وہ بس اتنا ہے کہ پہلے سلجوقی بادشاہ طغرل سے ۴۴۷ھ میں بمقام ہمدان انکی ملاقات ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی کے وسط میں شیخ کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔ اسی سے خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ باباطاہر صاحب دل اور دردمند شاعر تھے۔ ان کے نغمے ان کے سوز دروں کے شاہد ہیں۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں بھی چند رسالے لکھے ہیں۔

ان رسالوں میں ایک باباطاہر کے مختصر عربی اقوال کا مجموعہ ہے۔ اس میں انھوں نے علم و معرفت ذکر و عبادت وجد و محبت کے بارے میں صوفیانہ عقائد کو مختصر اور موثر جملوں میں بیان کیا ہے۔ ایران میں باباطاہر کی شہرت کی بڑی وجہ ان کی پر اثر، شیریں اور عارفانہ دوبیتی ہے۔ ان دوبیتیوں کا وزن عام رباعیوں کے وزن سے کسی قدر مختلف ہے۔ یہ رباعیاں ایک ایسی زبان میں کہی گئی ہیں جو مری زبان سے مشابہ ہے۔ اسی لئے انھیں قدیم کتابوں میں "فہلویات" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ان تمام سیدھی سادی اور پر اثر رباعیوں میں شاعر نے دنیا کی وحدت، انسان کی دور افتادگی اور اپنی پریشانی، تنہائی، بے مقداری اور بے

حیثیت کا ذکر کیا ہے۔ ہجران کی شکایت کی ہے اور اپنی طلب معنوی کے اشتیاق کا اظہار کیا ہے۔ باباطاہر نے ہمدان میں وفات پائی اور اسی شہر میں مدفون ہوئے۔ ذیل میں ان کی چند دردناک اور شیریں رباعیاں نمونے کے طور پر درج کی جاتی ہیں۔

خدا کے ساتھ آدمی کے اتحاد کی حقیقت

اگر دل دلبرو دلبر کدومہ   وگر دلبر دلو دلرا چہ نومہ
دل و دلبر بہم آمیتہ دینم   ندونم دل کہ و دلبر کدومہ

اسی موضوع پر ایک اور رباعی ملاحظہ ہو:

خرم آنان کہ ازتن جون ندونند   زجانون جون زجون جانون ندونند
بدروش خوکرن سالان و ماہان   بدر دخویشتن درمون ندونند

ہر جگہ خدا کی جلوہ گاہ ہے:

خوشا آنون کہ از پا سرندونند   میاں شعلہ خشک وتر ندونند
کنشت وکعبہ وبت خانہ ودیر   سرای خالی از دلبر ندونند

دنیا کی ناپائداری:

یکی برزیگری نالون درایندشت   بچشم خون فشاں آلالہ می گشت
ہمی گشت وہمی گفت ای دریغا   کہ باید کشتن وہشتن دریں دشت

درویشی و بے خانمائی:

موآن رندم کہ نامم بی قلندر   نہ خون دیرم نہ مون دیرم نہ لنگر
چوروزآیہ بگردم گردکویت   چوشو آیہ بخشتان وآنہم سر

نیک لوگ سیہ کاروں کے شکار ہیں :

جرہ بازی بدم رفتم بہ نخچیر — سیہ دستی زدہ بر بال مو تیر
بورہ غافل مچر در چشمہ ساراں — ہر آن غافل چرہ غافل خورہ تیر

دوستی کیمیا ہے :

دیدم آ لالہ در دامن خار — وتم آ لالیا کی چینمت بار
بگفتا باغباں معذور میدار — درخت دوستی دیر آورہ بار

محبت کا کرشمہ :

دلی دیرم خریدار محبت — کز و گرمست بازار محبت
لباسی بافتم بر قامت دل — زپود محنت و تار محبت

ان چند دلکش رباعیوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا وزن اور ان کے الفاظ کا تلفظ مخصوص ہے۔ ان الفاظ کی شکل ایران کی قدیم زبان جیسی ہے اور پہلوی زبان سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔ مثلاً ان میں "من" کی جگہ "مو" "شب" کی جگہ "شو" "ببنیم" کی جگہ "وینیم" "کنند" کی جگہ "کرن" "گویم" کی جگہ "وتم" استعمال کیا گیا ہے۔

ابوسعید ابی الخیر

شیخ ابوسعید فضل اللہ بن ابی الخیر، باباطاہر عریان کے ہم عصر تھے یہ خاوران خراسان کے نواح مہنہ میں ۳۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ اپنے وطن ہی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد فقہ کی تحصیل کے لئے مرو گئے اور یہاں ابوعبداللہ الحصری کی شاگردی اختیار کی۔ الحصری اس زمانے کے مشہور فقیہوں اور علم طریقت کے عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے زمانے کے مشہور بزرگوں جیسے ابوالفضل حسن سرخسی۔ ابوالعباس احمد قصاب اور ابوالحسن علی خرقانی سے معنوی فیوضات حاصل کئے اور مشہور صوفی بزرگ ابوعبدالرحمٰن سلمی (متوفی ۴۱۲ھ) سے خرقۂ طریقت حاصل کیا

اور مشہور صوفی بزرگ ابو عبدالرحمن سلمی (متوفی سنہ ۴۱۲ھ) سے خرقۂ طریقت حاصل کیا، ابوسعید کو فارسی شاعروں میں صوفی مذہب کا اولین شاعر سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ انھوں نے اس موضوع پر اپنے اور دوسروں کے بہت سے اقوال، اسرار کی بہت سی باتیں، بہت سے قطعے اور رباعیات لکھی ہیں۔ ان سب کو ان کے پوتے محمد نور نے اپنی کتاب اسرار التوحید میں یکجا کر دیا ہے یہ قطعے اور یہ رباعیاں بڑی پر اثر ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کہنے والا دل میں درد اور سر میں سودا رکھتا تھا۔ ذیل کی رباعی خود ان سے منسوب کی جاتی ہے، اس سے ان کے عشق اور ان کے دل کا درد آشکار ہے

جانا بزمین خاوران خاری نیست　　　　کش بامن و روزگار من کاری نیست

بالطف و نوازش جمال تو مرا　　　　در دادن صد ہزار جان عاری نیست

ایک روز مجلس سماع میں شیخ پر حال طاری ہوا اور اس جذب کے عالم میں انھوں نے تصوف کی تعریف اور واقعی ہستی یعنی خدائے تعالیٰ کا حال اس طرح بیان فرمایا:

"ہفت صد پیر از مشائخ در ماہیت تصوف سخن گفتہ اند تمامترین و بہترین ہمہ قولہا اینست کہ استعمال الوقت بما ھو اولی بہ شیخ ما گفت:

اھل الرسوم فی حیوتھم اموات واھل الحقایق فی مماتھم احیاء" شیخ ما گفت: دتیہا ہر جائی می گشتیمی در کوہ و بیابان وایں حدیث سر در پی ما نہادہ بود ما خدا یرا جستیمی در کوہ و بیابان بودی کہ باز یافتیمی و بودی کہ باز نیافتیمی اکنون چنان شدہ ایم کہ خویشتن می باز نیابیم

زیرا ہمہ اوست ما نہ ایم از آن معنی کہ او بود و ما نبودیم و او خواہد بود و ما نباشیم۔"

واقعہ یہ ہے کہ صوفیانہ عقائد ابوسعید کے اخلاق، رفتار، گفتار اور کردار میں رچ بس گئے تھے۔ وہ خوش زبان، شیریں بیان، شکستہ نفس اور مہربان تھے۔ تونگروں سے مال لیتے اور درویشوں میں لٹا دیتے تھے۔ اپنے دل میں کینہ کو کبھی جگہ نہ دی۔ سب کے دوست تھے۔ حد یہ کہ اپنے دشمنوں سے بھی لطف و مروت سے پیش آتے تھے۔ ابوسعید کی ابوالقاسم قشیری سے صفائی نہ تھی، لیکن اسرار التوحید میں ان کے بارے میں کہتے ہیں:

"روزی بر زبان استاد امام رفت کہ بوسعید حق سبحانہ تعالیٰ را دوست می دارد و حق سبحانہ
ما را دوست می دارد و فرق اینست کہ ما پیلیم و بوسعید پشہ۔ این خبر را نزدیک شیخ ما آوردند۔ شیخ آنکس
را گفت برو و نزدیک استاد امام شو بگو کہ آن پشہ ہم تو ئی ما ہیچ نیستم و ما خود دریں میان نیستم آن
درویش بیامد و آن سخن با استاد امام بگفت۔ استاد امام از آن ساعت باز قبول کرد کہ نیز بعد شیخ
ما سخن نگوید و نگفت تا آنگاہ کہ بمجلس شیخ آمد و آن داوری با موافقت والفت بدل گشت"

صوفیوں کے مشہور عقاید یہ ہیں کہ علم کے کئی مراتب ہیں۔ پہلا حسی تجربہ یا آزمائش دوسرا
استدلال علم یا معرفت۔ تیسرا شہود یا دیدار کے دیکھنے کی حکایت ابو علی سینا منطق اور حکمت کا
استاد تھا، اس نے عقلی دلائل کی بنیاد پر طریقۂ مشاء پر بحث کی۔ ابوسعید اشراق کا ذوق رکھتے
تھے، انھوں نے کہا کہ علم کو مقام شہود پر پہنچنا چاہیے۔ چنانچہ کتاب الاسرار التوحید میں لکھا ہے:

"خواجہ بوعلی با شیخ در خانہ شد و در خانہ فراز کردند و سہ شبا روز با یک دیگر بودند بخلوت و
سخن می گفتند کہ کس ندانست و نیز بہ نزدیک ایشان در نیامد مگر کسی کہ اجازت دادند و جز بنماز
جماعت بیرون نیامدند بعد از سہ شبا روز خواجہ بوعلی برفت شاگردان از خواجہ بوعلی پرسیدند
کہ شیخ را چگونہ یافتی گفت ہر چہ من می دانم او می بیند و متصوفہ و مریدان شیخ چون بنزدیک شیخ در
آمدند از شیخ سوال کردند کہ ای شیخ بوعلی را چون یافتی گفت ہر چہ ما می بینیم او می داند"

عرفاں میں جو ذوق وحدت ہے اسی کی بنا پر شیخ دوسرے مذہب والوں سے بھی مہر و
محبت کا برتاؤ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن وہ اپنے مریدوں کے ساتھ عیسائیوں کے کلیسا میں
گئے۔ اس تعصب کے زمانے میں شیخ کے اس کام سے لوگوں کو نہ صرف حیرت ہوئی بلکہ ان کا یہ
فعل مختلف مذہب والوں سے اتحاد اور الفت کا باعث بھی ہوا۔ چنانچہ ذیل کی حکایت
اس حقیقت پر خوب روشنی ڈالتی ہے:

"ہم در آن وقت کہ شیخ ما بنشاپور بود روزی بگورستان حیرہ می شد بسر تربت مشایخ
رسید جمعی را دید کہ در آں موضع خمر می خوردند و دف می زدند۔ صوفیان در اضطراب آمدند و

خواستند کہ احتساب کنند وایشان را برنجانند و بزنند۔ شیخ اجازت نداد۔ چون شیخ نزدیک ایشاں رسید گفت خداوند ہم چنانک دریں جہاں خوش دلتان می دارد۔ در آں جہاں نیز خوش دلتان دارد۔ آن جملہ برخاستند و در پائی اسپ شیخ افتادند و خمرہا بریختند و سازہا بشکستند و توبہ کردند و از نیک مردان گشتند۔"

شیخ ابوسعید نے ۴۴۰ھ میں وفات پائی۔ کہتے ہیں کہ مرض الموت میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے جنازے پر قرآن مجید سے کیا پڑھا جائے۔ فرمایا قرآن کا مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ مجھ پر پڑھا جائے، بس یہ شعر کافی ہیں:

بہتر از ایں در جہاں ہمہ چہ بود کار   دوست بر دوست رفت یار بر یار
آں ہمہ اندوہ بود و ایں ہمہ شادی   آن ہمہ گفتار بود و ایں ہمہ کردار

عبداللہ انصاری خواجہ عبداللہ بن محمد انصاری ہروی ۳۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ الپ ارسلان سلجوقی، خواجہ نظام الملک طوسی اور شیخ ابوسعید ابی الخیر کے ہم عصر تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابوایوب انصاری تک پہنچتا ہے، لیکن آپ کی ساری عمر ایران میں بسر ہوئی اور ایرانی شعراء میں آپ کا شمار ہوا۔ آپ نے فارسی نظم میں ایک مخصوص لحن اور ایک مخصوص سبک پیدا کیا اور فصیح نثر اور ملیح نظم لکھی۔ شیخ اپنے زمانے کے زبردست محدثوں اور عارفوں میں شمار ہوتے تھے ابتداء میں اپنے زمانے کے علماء اور مشائخوں کی شاگردی اختیار کی۔ فطرت سے غیر معمولی حافظہ لے کر آئے تھے اس لئے انھیں سینکڑوں اشعار اور اقوال یاد ہو گئے تھے مشائخوں میں خاص کر ابوالحسن خرقانی سے ارادت رکھتے تھے۔ پھر شیخ کی وفات کے بعد ان کے جانشیں ہوئے عربی میں ذم الکلام اور منازل السائرین اور فارسی میں زاد العارفین اور کتاب اسرار جیسی کتابیں لکھی ہیں ان کے سوا کئی ایک فارسی رسالے بھی تصنیف کئے ہیں جن کے نام یہ ہیں:

رسالۂ دل و جان۔ کنز السالکین، رسالۂ واردات، قلندر نامہ، ہفت حصار، محبت نامہ رسالۂ معقولات اور الہٰی نامہ۔ شیخ کی سب سے مشہور تصنیف ان کی مناجات ہے حقیقت یہ ہے

کہ شیخ کے زمانے تک کسی نے بھی ایسی سیدھی سادی، موثر اور شیریں فارسی میں مناجات نہیں لکھی تھی۔ ان کی یہ مناجاتیں ان کے مذکورہ رسالوں اور دوسری کتابوں میں ملتی ہیں اور پانچویں صدی کی مسجع اور دلکش نثر کا بہترین نمونہ ہیں۔

شیخ نے نہایت جاذب، روان، صوفیانہ اور عارفانہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ اس طرح شیخ اولین اور قدیم ترین اور خاص کر عرفانی اور صوفیانہ رباعی گو شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔

اپنی وعظ کی مجلسوں میں شیخ نے مشہور صوفی بزرگ عبدالرحمن سلمی کی کتاب طبقات الصوفیہ کا ہروی زبان میں ترجمہ اپنی طرف سے املا کرایا ہے۔ شیخ کے مریدوں میں سے ایک مرید نے اسے مرتب کر دیا تھا۔ نویں صدی ہجری میں مولانا عبدالرحمن جامی نے ہروی زبان سے اسے سیدھی سادی فارسی میں منتقل کیا، اس میں اپنی طرف سے اور مشائخوں اور بزرگوں کے حالات کا اضافہ کیا اور اس کا نام نفحات الانس رکھا۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے شیخ کی فارسی کی دو نمایاں خصوصیتیں اس کی سادگی اور شیرینی ہے فارسی مصنفین میں وہ اولین مصنفوں میں ہیں جنھوں نے مسجع نثر لکھی ہے اور نثر میں اشعار کا پیوند لگایا ہے۔ یہی سبک سعدی کے زمانے میں درجۂ کمال پر پہنچا جس کی بہترین مثال گلستان ہے۔

ذیل میں خواجہ عبداللہ انصاری کے کلام (رسالۂ مقولات) سے کچھ عبارتیں مثال کے طور پر نقل کی جاتی ہیں۔ ان سے خواجہ کے کلام کے اثر، سوز، مخصوص تڑپ اور ان کی معنوی نصیحتوں کی لطافت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بیزارم از آں طاعت کہ مرا العجب آرد۔ بندۂ آں معصیتم کہ مرا العذر آرد۔ از و خواہ کہ دارد می خواہد کہ از و خواہی از و مخواہ کہ ندارد و می کاہد۔ اگر بجز اہی بندہ آئی کہ در بند آنی۔ آن ارزی کہ می ورزی ہر چیز کہ بزبان آمد بزیان آمد۔ دوست را انہ در بیرون کنند اما از دل بیرون نکنند۔ خدا تعالیٰ می بیند و می پوشد ہمسایہ نمی بیند و می خروشد۔ چناں زی کہ بتنا ارزی و چنان میر کہ بدعا ارزی۔ لقمہ خوری ہر جائی طاعت کنی ریائی صحبت رانی ہوائی نہی مرد سودائی۔ اگر در آئی بار است و اگر نیائی خدا بے نیاز

است۔ اگر بہ ہوا پری مگسی باشی اگر بر روی آب روی خسی باشی دل بدست آرتا کسی باشی

در راہ خدا دو کعبہ آمد حاصل — یک کعبۂ صورتست یک کعبۂ دل
تا بتوانی زیارت دلہا کن — کافزون ز ہزار کعبہ آمد یک دل

عذر در شریعت بزبانست و در حقیقت بدل وجان آن نحو تر کہ زشت مگذاریم و نغز گیریم و پوست مگذاریم و مغز گیریم در کودکی بازی و در جوانی مستی و در پیری سستی پس خدا را کی پرستی۔
چوں پیش بزرگی در آئی ہمہ گوش باش۔ چون او سخن گوید تو خاموش باش۔
پنج چیز نشانۂ سنخیت: بی شکری در وقت نعمت، بی صبری در وقت محنت، بی رضائی در وقت قسمت، کاہلی در وقت خدمت، بی حرمتی در وقت صحبت۔ حیات ماہی در آبست و حیات بچہ از شیر، شریعت را استاد باید و طریقت را پیر۔ زاہد ہر زود بہ بہشت می نازد عارف بدست از صوفی چگویم کہ صوفی خود اوست۔

روزگاری او را می جستم . . . . . خود را می یافتم اکنوں خود را می جویم او را می یابم۔

عشق آمد و شد چو خونم اندر رگ و پوست — تا کرد مرا تہی و پر کرد ز دوست
اجزای وجودم ہمگی دوست گرفت — نامیست ز من بر من و باقی ہمہ اوست

اب چند جملے شیخ کی مناجات سے ملاحظہ ہوں:

الٰہی عبداللہ را از سہ آفت نگاہ دار، از وساوس شیطانی، دانہوا جس جسمانی دانہ غرور نادانی
الٰہی! بساز کار من و منگر بکردار من۔ دلی دہ کہ طاعت افزون کند طاعتی دہ کہ بہ بہشت رہنمون کند
الٰہی اگر بہشت چون چشم و چراغ است بی دیدار تو در دو داغ است۔
الٰہی اگر مرا در دوزخ کنی دعوی دار نیستم — و اگر در بہشت کنی بی جمال تو خریدار نیستم
الٰہی! من بہ حور و قصور نازم اگر نفسی با تو پردازم از آن ہزار بہشت می سازم
الٰہی! اگر عبداللہ را نخواہی گداخت دوزخی دیگر باید آلایش او را و اگر نخواہی نواخت بہشتی دیگر باید آسائش او را۔

الہٰی! میدانی کہ ناتوانم پس از بلا بہ ہالم
الہٰی! می پنداشتم کہ تو را شناختم، اکنوں آن پنداشت و شناخت در آب انداختم
الہٰی! ہمہ شادی ہا بی یاد تو غرور است و ہمہ غمہا با یاد تو سرور۔

شیخ کی چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:

از ہجر ہمی سوزم از شرم خیال | در وصل ہمی سوزم از بیم زوال
پروانہ شمع را چنیں باشد حال | در ہجر بسوزد و بسوزد ز وصال

دی آمد و ہیچ نامد از من کاری | وامروز ز من گرم نشد بازاری
فردا بروم بی خبر از اسراری | نا آمدہ بہ بدی از یں بسیاری

در عشق تو گہ پست و گہی مست شوم | در یاد تو گہ نیست گہی ہست شوم
در پستی و مستی از نگیری دستم | یکبارگی ای نگار از دست شوم

ان مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ تصوف و عرفان کے کن مقامات پر فائز تھے
ان سے خدا کے سچے عشق، ظاہر سے اعراض اور باطن سے رجوع کا بھی خوب اندازہ کیا جا سکتا ہے۔
شیخ نے ۴۸۱ھ میں بمقام ہرات وفات پائی۔

سنائی ابو المجد مجدود بن آدم سنائی پانچویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔ اوائل جوانی میں غزنوی دربار سے انتساب رکھتے تھے اور اس خاندان کے بعض بادشاہوں کی ——— جیسے بہرام شاہ وغیرہ ——— انھوں نے اپنے اشعار میں مدح کی ہے۔
سنائی اپنے زمانے کے سلاطین، امرا، علما اور شعراء ——— جیسے مسعود سعد وغیرہ سے تعلقات رکھتے تھے۔ چنانچہ سنائی ہی نے پہلی بار مسعود سعد کے اشعار کو جمع اور مرتب کیا ہے۔
سنائی نے بیت اللہ کا حج کیا، اور خراسان کے اکثر شہروں کی سیاحت کی۔ وہ ۵۵۵ھ (پیدائش؟) ...

کے حلقہ میں گھومے، بڑے بڑے صوفیوں سے ملاقات کی اور ان سے فیوضات حاصل کئے۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار وہ بادشاہوں کے دربار اور ان کی مدح گوئی سے کنارہ کش ہو گئے اور گوشہ گیری اختیار کر لی اسی کے بعد سے ان کی پرمغز صوفیانہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔

سنائی کا سبک اور شاعری

تذکروں میں لکھا ہے کہ سنائی کے دیوان میں اشعار کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی۔ لیکن دیوان سنائی کے اب جو نسخے ملتے ہیں ان میں بارہ ہزار یا اس سے کچھ زیادہ اشعار ملتے ہیں۔ اس میں قصائد، غزلیات اور رباعیات ہیں۔ یہ سب نہایت رواں، محکم اور پختہ کلام ہے۔ اسی طرح سنائی کی استادی اور بلاغت ان کی مثنویوں اور خاص کر حدیقہ سے ظاہر ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بالکل واضح ہے کہ اپنے اشعار میں سنائی کی توجہ الفاظ کی بہ نسبت معنی کی طرف زیادہ رہی ہے بے شبہ سنائی کو ایران کا سب سے بڑا صوفی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ان سے پہلے کسی نے بھی تصوف میں اتنی پختگی، اتنی سلاست اور کلام کی صفائی کے ساتھ شعر نہیں کہے تھے۔ سنائی کی شاعری سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنی جوانی میں فارسی شاعروں کے دیوانوں کے سوا عربی شاعروں کے کلام کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ فرزدق اور جریر یہ پہلی صدی ہجری کے دو مشہور عرب شاعر گذرے ہیں۔ یہ دونوں شاعر آپس میں مناظرہ کرتے رہتے تھے۔ جریر نے فرزدق کی ہجویں لکھی ہیں۔ سنائی نے اپنے ایک شعر میں ان دونوں شاعروں کا نام لیا ہے اور کہا ہے:

ہست تا نفس نفیست باعث تعلیم و یو   بود ہم فر فرزدق داعیہ جریر

اس شعر کے دوسرے مصرع میں اس خصومت کی طرف اشارہ ہے جو جریر کو فرزدق سے تھی۔

فارسی کے شاعروں میں خراسان کے شعرا جیسے منوچہری، فرخی اور مسعود سعد کا اثر سنائی کے کلام میں نمایاں ہے۔ سنائی کے وہ قصیدے جو حسب ذیل مطلعوں سے شروع ہوتے ہیں منوچہری کے "قصیدۂ شمعیہ" کی یاد بالکل تازہ کر دیتے ہیں:

ای ہمیشہ دل بحرص و آز نہ کردہ مرتہن | دادہ یکبارہ عناں خود بدست اہرمن

اسی طرح:

ای امیرالمومنین ای شمع دیں ای بوالحسن | ای بیک ضربت ربودہ جان دشمن از بدن

اسی طرح:

دی ز دل تنگی زمانی طرف کردم در چمن | یک جہان جان دیدم آنجا رستہ از زندان تن

ایک اور قصیدے میں جس کا مطلع ہے:

مکن در جسم و جان منزل کہ ایں دونست و آن والا
قدم زیں ہر دو بیرون نہ نہ اینجا باش و نہ آنجا

فرخی کے سبک کی پیروی کی ہے۔ اسی قصیدے میں ایک جگہ کہتے ہیں:

نخواہم لاجرم نعمت نہ در دنیا نہ در جنت | ہمی گویم بہ ہر ساعت چہ در سرا چہ در ضرا
کہ یارب مر سنائی را سنائی دہ تو در حکمت | چناں کز وی برشک آید رواں بو علی سینا
نگردانم دریں عالم ز بیش آرزی و کم عقلی | چو رای عاشقاں گردان چو طبع بیدلاں شیدا

ان اشعار میں سنائی نے فلسفہ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور آخری شعر میں فرخی کا مصرع لے کر اس پر تضمین کی ہے۔ ایک اور قطعہ میں جو نہایت وجد و کیف کے عالم میں لکھا گیا ہے کہتے ہیں

حال با شعر فرخی آریم | رقص بر شعر بوالفتوح کنیم

اسی طرح مسعود سعد کے دیوان سے سنائی کے دیوان کا مقابلہ کیجیے تو اس میں بہت سے ایسے قصیدے ملیں گے جو وزن، قافیہ، بعض تشبیہوں اور تعبیروں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مشابہ نظر آئیں گے۔

تقلیدی دور کے بعد جب سنائی عرفانیات کے عالم میں پہنچ گئے تو انھوں نے مستقل طور پر صوفیانہ اشعار لکھنے شروع کیے۔ ان کے یہ سب اشعار ان کے دیوان اور ان کی مثنویوں میں موجود ہیں۔ ایسے اشعار میں استاد سنائی ہمیں تصفیۂ نفس، ترکِ غرور، ترکِ ظاہر اور حسب ذیل

باتوں کی تعلیم دیتے ہیں :

ایسا علم جس سے تو اپنے آپ کو نہ پہچان سکے اس سے جہل بہتر ہے۔ جاہ و مال کا بندہ نہ بن کہ مال سخاوت اور بخشش کے لئے ہے۔ خود پرست عالم غافل ہے۔ "خفتہ را خفتہ کے کند بیدار"، وہ دوسروں کی رہنمائی کیسے کر سکتا ہے۔ اسیرِ مال اور بندۂ قال نہ بنو۔ آدمیت صفائے باطن، خدمت اور کوشش سے حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر، ظاہرداری اور جاہ و مال کے ذریعہ حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ اس کے لئے سعی و کوشش اور عبادت لازم ہے :

ہر کسی از رنگ گفتاری بدین رہ کی رسد
درد باید مرد سوز و مرد باید گام زن !!

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

ماہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آفتاب
زاہدے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن

عمرہا باید کہ تا یک کودکی از روی طبع
عالمی گردد نکو یا شاعری شیریں سخن

دیو شہوت کو سلیمان وار اپنا فرماں بردار بنا۔ مسیحا کی طرح اہل یقین بن۔ بے حسی کے پردے سے نکل۔ اگر عمر جاوداں کی خواہش ہے تو جسمانی زندگی کی ہوس نہ کر اور لوگوں کے ساتھ انصاف کر۔ زہرہ کی طرح اوج آسمان پر جلوہ گر ہونا چاہتا ہے تو علم و دانش حاصل کر۔ اپنے باطن کو یوں صاف رکھ کہ ضمیر کے آئینہ میں خدا کا جلوہ تجھے دکھائی دے۔ حقیقت ایک ہے من و تو کا جھگڑا بے کار ہے۔

تاریخ سے اور خود ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ سنائی نے باطن کی خوب سیر کی تھی اور تزکیۂ نفس کے مقام پر پہنچ چکے تھے اور بڑے عالی اخلاق ان کے اندر پیدا ہو چکے تھے، حق کے عشق میں وہ اپنے آپ کو فنا کر چکے تھے۔ ان کا دل آتش عشق سے روشن ہو چکا تھا وہ کسی کے دل کو دکھانا روا نہ رکھتے تھے۔ ہر کام میں وہ خدا پر نظر رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ کسی سے بھی اپنے حق میں نیکی کے امیدوار نہیں، لیکن ہر شخص کے حق میں وہ نیکی کرتے ہیں۔ ان مطالب کو انھوں نے اپنے اشعار میں اس طرح بیان کیا ہے، فرماتے ہیں :

من از آتش عشق ہم نرم گردم !!
اگرچہ زپولاد سخت است لادم !

منم بندہ عشق تا زندہ باشم !
اگرچہ ز مادر من آزاد زادم !

ز نیک و بد این و آن فارغم من
بریں نعمت ایزد زیادت کنادم

نہ آدیزم از کس نہ بگریزم از کس
نہ گیرندہ بازم نہ ہمبہر خادم

کم آزار و بیرنج و پاکیزہ عنصر
کہ پاک ست الحمد للہ نژادم !

مرا بر تن خویش حکمیت نافذ
من استاد فرمانبر آن نفادم

بہر حال و ہر کار آید بہ پیشم
خداوند باشد در آنحال یادم

ز کس خیرہ و خوبی نباشد نخواہم
بد انچم بود باہمہ خلق رادم

دیوان سنائی میں زیادہ تر ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں لوگوں کی ظاہر پرستی، ریاکاری، بے عقلی، دوست آزاری، بے وفائی، بے ایمانی اور حرص کی شکایت کی گئی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے لوگوں کے ہاتھوں ایسی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ ہمیشہ لوگوں کو اصلاح حال، خود پرستی چھوڑنے، صفائے قلب، خدمت، حق کی پیروی کے لئے حصول دانش، کسب حکمت، شہوت کشی، ترک حرص اور سلوک، ایمان اور عرفان حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

مکن در جسم و جان منزل کہ این دونست و آن والا
قدم زین ہر دو بیرون نہ نہ اینجا باش نہ آنجا

بہرچہ از راہ دور افتی چہ کفر آنحرف و چہ ایمان
بہرچہ از دوست وامانی چہ زشت آنجا و چہ زیبا

سخن کز روی دین گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکاں کز بہر حق جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا

ترا دنیا ہمی گوید کہ دل در ما نبندی بہ
تو خود می پند نپنوشی از این گویان ناگویا !

گر امروز آتش شہوت بکشتی بیگمان رستی
وگرنہ تف این آتش ترا ہیزم کند فردا

چو علمت ہست خدمت کن چو دانایاں کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا !

چو علم آموختی از حرص آنگہ ترس کاندر شب
چو دزدی با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا !

بحکمت جامہ نو کن ز بہر آن جہاں ورنہ
چو مرگ این جامہ بستاند تو عریاں مانی و رسوا

گرا از زحمت ہمی ترسی ز ناہلان ببر صحبت   کہ از دام زبون گیران بعزلت رستہ شد عنقا

سنائی نے چند مثنویاں جیسے حدیقتہ الحقیقہ، طریق التحقیق، سیر العباد الی المعاد یا کنوز الرموز وغیرہ لکھی ہیں۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ سنائی نے ان کے سوا اور بھی مثنویاں لکھی تھیں جیسے کارنامہ، عشق نامہ، عقل نامہ، غریب نامہ یا عفونامہ وغیرہ۔ سنائی کی مثنویوں میں سب سے مشہور مثنوی حدیقہ ہے۔ یہ مثنوی ۵۲۵ھ میں ختم ہوئی۔ اس میں گیارہ باب اور دس ہزار شعر ہیں۔ ہر باب کے اکثر مطالب حکایت اور مثال کے طور پر بیان کئے گئے ہیں اسی مثنوی کو شاعر کا شاہکار سمجھنا چاہیئے صوفیانہ مطالب، بلاغت اور حسن سبک کے لحاظ سے یہ کتاب صوفیانہ مسائل کی کتابوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس تصنیف میں سنائی نے پادشاہ وقت یعنی بہرام شاہ غزنوی (۵۱۲ - ۵۴۸ھ) کی مدح بھی کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سنائی کی تمام مثنویوں کے مطالب صوفیانہ اور عرفانی مطالب سے متعلق ہیں۔ ان میں توحید، نعت رسول وصحابہ، ترک دنیا، ظاہر بیزاری، رجوع بباطن، خود پرستی وغرور کے ترک کی تعلیم اور مقامات معنوی کے کسب جیسے مضامین بیان کئے گئے ہیں۔

سنائی نے حدیقہ میں نہایت پسندیدہ مطالب، بلند اخلاق اور سودمند نصائح کو صوفیانہ مسائل کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے۔ یہاں ہم حدیقہ سے چند اشعار نمونے کے طور پر نقل کرتے ہیں:

کام اور خدمت کر کہ بے کاری سے کچھ حاصل نہیں ہوتا

پایہ بسیار سوی بام بلند   تو بیک پایہ چوں شدی خرسند

از پی کارت آفریدستند !   جامۂ خلقت بہ بدستند

ملک ملک از کجا بدست آری   چوں ہمی شصت روز بیکاری

ظاہری آرائش باطنی خوبی کی دلیل ہو سکتی ہے اور نہ ظاہر کی خرابی باطن کی خوبی کی دلیل مگر دار ہی خوبی کی علامت اور اس کا معیار ہے:

ابلهی دید اشتری بچرا — گفت نقشت همه کژ است چرا

گفت اشتر که اندرین پیکار — عیب نقاش می کنی هشدار

در کژی من مکن بعیب نگاه! — تو زمن راه راست رفتن خواه

علم و دانش کام اور کوشش کرنے کے لئے ہے، باتیں بنانے اور دھونس جمانے کیلئے نہیں:

تو بگفتار غره شب و روز — لیک معلوم تو نگشت امروز!

بیش مشنو نه نیک و بد گفتار — انچه بشنیدهٔ بکار درآر!

دانشت هست کار بستن تو — خنجرت هست صف شکستن تو

علم با کار سودمند بود! — علم بی کار پای بند بود

انسان کا بہترین رہنما اس کی عقل ہے:

عقل در راه حق دلیل تو بس — عقل هر جایگه خلیل تو بس

عقل خود کارهای بد نکند — هر چه آن ناپسند خود نکند

عقل بر هیچ دل ستم نکند — بطمع قصد مدح و ذم نکند

انسان اگر اچھی بات کرے تو اس کا بات کرنا اچھا ورنہ بے ہودہ گوئی سے خاموشی بہتر:

نطق زیبا ز خاموشی بهتر — ورنه در جان فرامشی بهتر

در سخن در ببایدت سفتن — ورنه گنگی به از سخن گفتن!

گنگ اندر حدیث کم آواز — به که بسیار گوی بیهده تاز

ایسے ہی اشعار پند و عبرت، مقام دانش و معرفت کی بلندی اور داد و دستگیری کی ضرورت کی اہمیت پر لوگوں کو شروع ہی سے متوجہ کرتے آتے ہیں۔

سنائی نے رباعیاں اور قطعے بھی لکھے ہیں۔ یہ بھی کافی مشہور اور نہایت اچھوتی اور دلکش ہیں۔ ان میں سنائی نے بڑے اچھوتے مضامین پیش کئے ہیں۔ دیکھئے اس قطعہ میں کس لطیف پیرایہ میں شراب کی برائی کرتے ہیں:

نکند دانا مستی نخورد عاقل می! | در رہ پستی ہرگز نہند دانا پی!
چه خوری چیزی که از خوردن آن چیز ترا | نی چناں سرو نماید بمثل سرو چونی
گر کنی بخشش گویند که می کرد نه او | گر کنی عربدہ گویند که رد کرد نه می

خلاصہ یہ کہ سنائی ایران کے بہت بڑے صوفی شاعر ہیں۔ انھوں نے عالم معانی میں قدم رکھا اور ان معانی کو اپنے دلکش اشعار میں پیش کیا۔ ان کا کلام پختہ اور استوار ہے۔ وہ پہلے بڑے صوفی شاعر ہیں۔ چنانچہ ایران کے صوفی شاعروں کے سرتاج مولانا جلال الدین رومی نے ان کی مدح کی ہے اور فرمایا ہے:

عطار روح بود سنائی دو چشم او | ما از پی سنائی و عطار آمدیم

اسی طرح مولانا اپنی مثنوی میں سنائی کو اس طرح یاد کرتے ہیں:

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام | از حکیم غزنوی بشنو تمام

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے جیسے ہی سنائی نے عالم عرفان اور عالم معنوی میں قدم رکھا انھوں نے دنیوی زندگی اور درباری ربط سے دست کشی اختیار کر لی حتیٰ کہ انھوں نے بہرام شاہ کی درخواست بھی قبول نہ کی جو انھیں اپنا مقرب اور مصاحب بنانا چاہتا تھا اور عزلت کو ترجیح دی۔

سنائی نے طویل عمر پائی اور غزنین میں انتقال کیا۔ ان کے سال وفات میں اختلاف ہے۔ تقی کاشی نے اپنے تذکرہ میں ان کی وفات کا سال ۵۴۵ھ لکھا ہے۔ یہی تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

شیخ عطار

شیخ فریدالدین محمد مشہور بہ عطار، جو صوفی شاعروں میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخِ ولادت قطعی طور پر معلوم نہیں۔ بہر صورت وہ چھٹی صدی ہجری کے وسط یعنی خراسان کے سلجوقیوں کے آخری دور میں پیدا ہو چکے تھے اخبار اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عطار نے بڑی لمبی عمر پائی تھی۔ غالباً ان کی عمر ایک سو سال سے بھی اوپر تھی۔ لیکن عطار کے دیوان میں ان کی عمر کے بارے میں صرف ایک ہی بار ذکر ملتا ہے اور یہ

ساٹھ ستر یا اس سے کچھ زیادہ سال کی عمر کا ذکر ہے. چنانچہ ایک قصیدہ میں کہتے ہیں:

مدت سی سال سودا پختہ ایم　　مدت سی سال دیگر سوختیم

ایک اور قصیدہ میں جس کا مطلع ہے:

کارم از عشق تو بجان آمد　　دلم از درد در فغان آمد

عطار کہتے ہیں:

چون ز مقصود خود ندیدم بوی!　　سوی عمر رہم زیان آمد

دین ہفتاد سالہ داد بباد　　مردمیٔ خانۂ معان آمد

اسی طرح ان کے دیوان سے ایک شعر نقل کیا گیا ہے:

مرگ در آوردہ پیش وادی صد سالہ راہ　　عمر تو افگندہ شب بر سر ہفتاد واند!

عطار نے اپنی جوانی کا زمانہ علوم و معارف کی تحصیل، مشائخ کی خدمت، تہذیب نفس اور کسب علوم میں گذارا۔ آخر میں وہ خود بھی مقام ارشاد پر فائز ہوئے اور اہل دل کا کعبہ بنے بعض تذکروں اور خود ان سے منسوب اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عطار نے کافی سفر کئے تھے اور مصر، دمشق، ہندوستان، ترکستان اور مکہ کی سیاحت کی تھی۔

عطار کے لقب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ دوا بیچا کرتے تھے اور اسی ضمن میں بیماروں کا علاج بھی کرتے تھے۔ چنانچہ مثنوی خسرو نامہ میں کہتے ہیں:

بدار و خانہ پانصد شخص بودند!　　کہ در ہر روز نبضم می نمودند

جسمانی امراض کے علاج سے انھیں فرصت ہوتی تو وہ روحانی مسائل کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور معنوی اشعار لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ "مصیبت نامہ" اور "الہٰی نامہ" دو مثنویوں کے نظم کرنے کے بارے میں کہتے ہیں:

مصیبت نامہ کاندوہ جہانست　　الہٰی نامہ کاسرار عیانست

بدارو خانہ کردم ہر دو آغاز　　چگویم زود رستم زین و آن باز!

معلوم ہوتا ہے کہ عطار کی نظر میں جو خود بھی پیر طریقت تھے، جسمانی شفا مقدمہ تھی روحانی کمال کا۔ ان کے یہاں عالم ابدان پر عالم ادیان فوقیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی مثنوی میں اپنے ایک دوست کی زبانی کہلواتے ہیں:

بمن گفت ای بمعنی افروز چنیں مشغول طب گشتی شب و روز
طب از بہر تن ہر ناتوانست ولیکن شعر و حکمت قوت جانست
اگرچہ طب بعا نونست اما اشارالست در شعر و معمّا

تذکروں اور خود شیخ کی منثور اور منظوم تصانیف سے آشکار ہے کہ انھوں نے نہ صرف عارفوں کے حالات کی تلاش اور ان کے اسرار معلوم کرنے کی کوشش میں اپنی زندگی بسر کی بلکہ وہ تمام عمر طریق عرفان میں سلوک کی سیر کرتے رہے اور عشق الٰہی کی آگ میں جلتے رہے۔ اسی راستے پر چل کر وہ عرفان کے افق پر چمکے اور مشعل کی طرح نزدیک اور دور لوگوں کے راستے منور کر دئے۔ بہت سے دل باختہ ان کی طرف بڑھے اور انھوں نے اپنی مشعل کے شعلہ سے ان کے دلوں کو منور کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عارف شاعروں کے امام مولانا جلال الدین انھیں اپنا بزرگ اور پیشوا مانتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ہیچ شمار کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

ہفت شہر عشق را عطار گشت ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں:

عطار روح بود سنائی دو چشم او ما از پئی سنائی و عطار آمدیم

ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

من آں ملای رومی ام کہ از نطقم شکر ریزد ولیکن در سخن گفتن غلام شیخ عطارم

اور کہیں فرما گئے ہیں:

انچہ گفتم در حقیقت ای عزیز آن شنیدستم من از عطار نیز

شیخ محمود شبستری جو خود بھی بہت بڑے صوفی بزرگ سمجھے جاتے ہیں فرماتے ہیں:

مرا از شاعری خود عار ناید   کہ در صد قرن چوں عطار ناید

علاء الدولہ سمنانی جنھوں نے آٹھویں صدی ہجری میں وفات پائی مشائخ صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں، عطار کی مدح میں فرماتے ہیں :

سرّی کہ در درون دل مرا پیدا شد   از گفتۂ عطار و ز مولانا شد

یہ اشعار اس گہرے اثر کا صرف ایک نمونہ ہیں جو عطار نے اپنے بعد آنے والے بڑے بڑے صاحب دل عارفوں، مشائخوں اور شاعروں پر ڈالا تھا حدیہ کہ ان کا اثر سعدی اور حافظ کے کلام تک میں نظر آتا ہے۔

عطار کی طبیعت نہایت رواں اور ان کی فکر نہایت بلند پرواز تھی۔ چنانچہ انھوں نے نثر اور نظم میں کئی تالیفیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد لوگوں نے قرآن کی سورتوں کی تعداد کے برابر لکھی ہے۔ چنانچہ کتاب مجالس المومنین میں لکھا ہے :

ہماں خریطہ کش داروی فنا عطار   کہ نظم اوست تسلی بخش عاشقان حزین

مقابل عدد سورۂ کلام نوشت !   سفینہ ہای عزیز و کتابہای گزین

بہرحال یہ مسلم ہے کہ شیخ نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں۔ کیونکہ کسی نے ان کی اس بسیار نویسی پر انھیں طعنہ دیا تھا اور ان پر پُرگوئی کا الزام لگایا تھا۔ اس تنقید کے جواب میں اپنی طرف سے صفائی پیش کرتے ہیں :

کسی کہ چون منی را عیب جوی است   ہمیں گوید کہ او بسیار گوی است

ولیکن چوں بسی دارم معانی   بسے گویم تو مشنوحی تو دانی !

واقعہ یہ ہے کہ شیخ کے دعوے کے مطابق ان کی توجہ معانی کی طرف ہی رہتی تھی اور انھوں نے اپنی تمام تصانیف میں صوفیانہ مسائل کی طرف ہی توجہ کی ہے۔ حتیٰ کہ انھوں نے اس راستے میں ادنیٰ معنی پر فصاحت کو قربان کر دیا ہے اور شعریت سے خالی اشعار بھی کہ گئے ہیں بلکہ معنی کے اس شوق میں شعر کے آداب و رسوم سے بھی تجاوز کر گئے ہیں۔ عام شاعروں کی طرح

انھوں نے کبھی کسی کی مدح میں شعر نہ کہا، چنانچہ کہتے ہیں:

بعمر خویشش مدح کس نگفتم — دُری از بہر دنیا من نسفتم

مثنوی مصیبت نامہ میں فرماتے ہیں:

شعر مدح و ہزل گفتن ہیچ نیست — شعر حکمت بہ کہ دردی ہیچ نیست

افسوس کہ عطار کی تمام تصانیف باقی نہیں رہیں اور جو تھوڑی بہت تصانیف باقی رہ گئی ہیں ان میں بھی اختلاف ہے۔

اوپر مصیبت نامہ، الہٰی نامہ، اور خسرو نامہ مثنویوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ عطار نے ان مثنویوں کے سوا پند نامہ، اسرار نامہ، جواہر نامہ، شرح القلب، مختار نامہ وغیرہ کے نام سے اور بھی مثنویاں لکھی ہیں۔ لیکن شیخ عطار کی سب سے بڑی یادگاروں میں اول ان کے قصائد اور غزلیات کا دیوان ہے جس میں دس ہزار کے قریب شعر ہیں، دوم مثنوی منطق الطیر اور سوم تذکرہ الاولیا ہے۔ عطار کے دیوان میں نہایت شور انگیز اور عارفانہ اشعار ہیں۔ ان میں شیخ نے ضمیر کے اسرار زبان شعر میں ادا کئے ہیں۔ منطق الطیر میں عارفانہ مطالب کو نہایت لطیف حکایات کے پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ منطق الطیر کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں کہ ایک دن تمام پرند یکجا جمع ہو کر کہنے لگے کہ کوئی شہر ایسا نہیں جس میں اس کا شہریار نہ ہو۔ ہمیں بھی چاہیے کہ اپنے شہریار کو ڈھونڈ نکالیں ہدہد جو پرندوں کا قاصد ہے بولا کہ اس شہریار کا نام سیمرغ ہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ پرندوں کو سیمرغ کی بارگاہ تک پہنچا دے گا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ دور دراز سفر کے لئے تیار ہو جائیں اور ایک لمبے سفر کے راستے کی سختیاں برداشت کریں۔ بہت سے پرندوں نے وہیں عذر پیش کرنے شروع کئے اور بہانے بنانے لگے۔ ہر ایک راہ وصال کی دشواری دیکھ دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگا۔ یہاں تک کہ صرف تیس پرندے (سی مرغ) ایسے رہ گئے جو سات خطرناک وادیوں کو طے کر کے سیمرغ کی بارگاہ میں پہنچے یہ طلب، عشق، معرفت، استغنا توحید، حیرت اور فنا کی وادیاں تھیں، اور نہایت خطرناک اور دشوار گذار وادیاں تھیں۔ سیمرغ کی

بارگاہ میں پہنچنے کے بعد انھیں ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آئینہ کے مقابل کھڑے ہیں۔ انھوں نے سیمرغ کو دیکھنا چاہا لیکن وہی تیس پرند (سی مرغ) کے سوا انھیں وہاں اور کچھ نظر نہ آیا۔ یہاں پہنچکر انھیں معلوم ہوا کہ اصل میں سیمرغ وہی تیس پرند (سی مرغ) ہیں جسے وہ بے خبری اور جہالت سے خارج میں تلاش کر رہے تھے حالانکہ وہ ان کے اندر ہی موجود تھا۔

"تذکرۃ الاولیا" میں عارفوں کے حالات اور پیشوایان طریقت کے مناقب، مکارم اخلاق اور ان کے اقوال بیان کئے گئے ہیں۔

شیخ عطار کی شاعری اور سبک

شیخ عطار نے خراسان کے دوسرے شاعروں کی طرح قصائد بھی لکھے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر ان قصیدوں میں دو فرق نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ شیخ نے اپنے قصیدے میں تغزل سے کام نہیں لیا ہے اور یہ قطعی طور پر فرخی، عنصری اور منوچہری کے لحن و روش سے مختلف ہے۔ ان کے کلام میں ان قصیدہ گو شاعروں کی سی پختگی اور استحکام ہے اور نہ یہ قصیدے ان قصیدہ گو شاعروں کے پایہ کو پہنچتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان قصیدہ گو شاعروں کے قصیدوں کا بڑا حصہ لوگوں کی مدح سرائی کے لئے وقف ہے، لیکن عطار نے لوگوں کی مدح سرائی سے اپنا دامن بالکل پاک رکھا، چنانچہ خود کہتے ہیں :

بعمر خویش مدح کس نگفتم

عطار کے قصائد نعت اور پند و عرفان کے لئے وقف ہیں۔ ان میں عطار قرآن کی آیتوں پر تضمین کرتے ہیں۔ دنیا کی ناپائداری کا ذکر کرتے ہیں انسان کو خواب غفلت سے جگاتے ہیں اور معرفت کے مضامین میں داد سخن دیتے ہیں اور اس فن میں وہ متانت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ایک قصیدہ میں جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے :

خطاب ہاتف دولت رسید دوش بما ۔۔۔ کہ ہست عرصہ بی دولتی سرای فنا

کہتے ہیں :

بشعر خاطر عطار ہمدم عیسیست　　از آنکہ ہست چو موسیس صد ید بیضا
ز وقت آدم تا این زماں نیافت کسی　　نظیر این گہر اندر خزانۂ شعراء

یہ واقعہ ہے کہ اس طرح کے دینی اور اخلاقی قصائد میں صرف سنائی اور ناصر خسرو ہی ان پر سبقت لے جا سکتے ہیں۔

ایک قصیدہ میں جو سپاس و توحید میں ہے، ان مضامین کو پیش کیا ہے:

خدائے تعالیٰ کی ذات اس سے کہیں بزرگ ہے کہ ہم انسان اس کا درک کر سکیں۔ انبیا کی عقل مقام درک میں خاک عجز پر پڑی رہ جاتی ہے۔ اگر تمام انسان مل کر ہزاروں قرن تک اس کے وصف پر غور کرتے رہیں تب بھی آخر میں اپنے عجز کا اعتراف کریں گے۔ کیونکہ ہمارا خیال اس کے مقام کے مقابلہ میں بالکل ایسا ہی ہے جیسے ذرہ فضا کی ماہیت کو جاننا چاہیے یا شبنم بے کنار سمندر میں شناوری کرنا چاہے۔ اس تک پہنچنے کا بس ایک ہی راستہ ہے اور وہ خود شناسی، اصلاح نفس، شہوت کو دبانے اور ہستی حق میں فنا ہو جانے کا راستہ ہے۔ وہ پند آمیز اور عبرت انگیز قصائد کے ضمن میں بار بار انسانی زندگی کے فانی ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور ہمیں فرصت عمر کو غنیمت جاننے، نکوکاری اور خدمت گذاری کی دعوت دیتے ہیں۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

ندارد درد ما درماں دریغا　　بماندم بے سر و ساماں دریغا
دریں حیرت فلکہا نیز دیریست　　کہ می گردند سرگرداں دریغا
رہے بس دور می بینیم دریں راہ　　نہ سر پیدا و نہ پایاں دریغا
چو نہ جاناں بخواہد ماند نہ جان　　ز جان دردا و ز جاناں دریغا
عزیزان جہاں را بین کہ بکراہ　　شدہ با خاک رہ یکساں دریغا
بیا تا در وفای دوستداراں　　فرو باریم صد طوفاں دریغا
ہمہ یاران بزیر خاک رفتند　　تو خواہی رفت چوں ایشاں دریغا

پس از وصلی کہ ہم چوں باد بگذشت — درآمد این غم ہجران دریغا
برای نان چہ ریزی آبروئیت — کہ آتش بہترت زان نان دریغا
ترا تا جان بود نان کم نیاید! — چہ باید کند چندیں جان دریغا
خداوندا ہمہ عمر عزیزم! — ز جہل آوردہ ام بزیان دریغا
چو دوران جوانی رفت بر باد! — بسی گفتم دریں دوران دریغا
نشد معلوم من جز آخر عمر — کہ کرد م عمر خود تاوان دریغا
مرا گر عمر بایستی حنہ بدن — تلف کی کردمی زین سان دریغا

اس قسم کی قصیدہ سرائی کے باوجود بلاتردید عرفانی اور صوفیانہ غزل کی استادی میں سنائی کے سوا کوئی عطار پر سبقت نہ لے جاسکا۔ اور اگرچہ سنائی نے بھی ان سے پہلے صوفیانہ اور شیریں غزلیں لکھی ہیں لیکن سوز و دلکشی اور اثر وجد آفرینی کے لحاظ سے سنائی کا کلام ان کے پایہ کو نہیں پہنچتا۔ اس فن میں عطار نہ صرف سب سے بڑے ماہر ہیں بلکہ ان کے بعد مولانا جلال الدین اور حافظ جیسے زبردست صوفی شاعروں نے انھیں اپنا نمونہ بنایا۔ عطار کے دیوان میں شروع سے آخر تک آتش عشق، سوز محبت اور شور وحدت کے وہ مظاہر نظر آتے ہیں کہ اسے پڑھ کر صاحب دل قاری کے دل میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ دیکھئے کیسی شور انگیز غزل ہے اور عرفان کا کیسا جذبہ طاری ہے:

دست در دامن جان خواہم زد — پای بر فرق جہاں خواہم زد
اسپ بر جسم و جہت خواہم تاخت — بانگ بر کون و مکاں خواہم زد
وآنگہ آن دم کہ میان من و اوست — از ہمہ خلق نہاں خواہم زد
چوں مرا نام و نشان نیست پدید — دم ز بی نام و نشان خواہم زد
ہاں مبر ظن کہ من سوختہ دل — آن دم از کام و زبان خواہم زد
تن پلید ست بخواہم انداخت — وان دم پاک بجاں خواہم زد

از دلم شعلہ ای خواہم ساخت	نفس شعلہ فشاں خواہم زد

ظاہر ہے کہ عطار کی تمام آتشیں غزلیں ان کے عرفانی افکار اور صوفیانہ ذوق کی ترجمانی کرتی ہیں۔ یہاں چند غزلیں بطور نمونہ نقل کی جاتی ہیں۔ ظاہر پرست زاہد بے جا دعوی کرتے ہیں، جھوٹ بکتے ہیں، مغرور ہیں، ان کے دل بیدار نہیں، اگر بیدار ہیں تو اس کو ثابت کر دکھائیں

الا ای زاہدان دین دلی بیدار بنمائید	ہمہ مستید در مستی یکی ہشیار بنمائید
ز دعوی ہیچ نکشاید اگر مردید اندر دیں	چناں کاندر دروں ہستید در بازار بنمائید
ہزاراں مرد دعوی دار بنمائیم ازیں مسجد	شما یک مرد دعوی دار از خمار بنمائید
من اندر یک زماں صد مست از خمار بنمایم	شما مستی اگر دارید از اسرار بنمائید
من ایں رندان مفلس را ہمہ عاشق ہمی بینم	شما یک عاشق صادق چنیں بیدار بنمائید

مقامِ وحدت تک پہنچنے اور وصال احدیت کے درک کے لئے اپنے آپ سے گذر جانا اور عالم جسمانی اور ہستی شہوانی کو فنا کر دینا لازمی ہے۔ خرابات عرفان کی جلوہ گاہ ہے۔ یہاں وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔ کیونکہ خراباتی وحدت دیکھتے ہیں نہ کثرت۔ وہ حق کے عاشق ہیں اور اس راستے میں پروانے کی طرح اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ وہ خدمت اور عمل کے راستے پر چلتے ہیں اور دوسروں کی طرح صرف باتیں بنانے پر اکتفا نہیں کرتے:

عزم خرابات بی فنا نتواں کرد	دست بیک درد بی صفا نتواں کرد
چوں نہ وجود است نہ عدم بخرابات	لاجرم ایں یک از آن جدا نتواں کرد
گم شدن و بی خودیست راہ خرابات	توشہ ایں راہ جز فنا نتواں کرد
لاشو اگر عزم می کنی تو بہ بالا!	ز آنکہ چنیں عزم جز بہ لا نتواں کرد

عاشقانی کز نسیم دوست جاں می پرورند	جملہ اندر سوختن چوں عود اندر مجمر اند!
فارغند از عالم و ز کار عالم روز و شب	والہ راہ شگرف و غرق بحر منکر اند

ہر کہ در عالم دوئی می بیند از احولیست　　ز آنکہ ایشاں در دو عالم جز یکی را ننگرند
جملہ غواصند در دریائے وحدت لاجرم　　گرچہ بسیارند لیکن در صفت یک گوہرند

عاشق آنست کہ چوں پروانہ است　　کہ تواند بترک جاں گفتن !!
شیر چوں می گریزد از آتش !　　شیر پروانہ را تواں گفتن !
راہ روتا بکے بود سخنت　　برتر از ہفت آسماں گفتن !
کم نہ ای آخر از قلم آموز　　رہ سپردن سخن رواں گفتن
کار کن نہ آنک بہتر است ترا　　کار کردن ز کارداں گفتن !

اگر کسی میں ہستی کا ایک ذرہ بھی ہو تو اسے محسوس ہو جاتا ہے کہ تمام ذرے ایک ہی ہستی کے ذرے ہیں۔ کثرت ظاہری اور عالم ظاہر دھوین کی طرح ہے جس کے وجود کا انحصار آگ پر ہے اور خود اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ پس ایک ہی ہستی ہے اور یہی ایک سب کچھ ہے۔ صاحب نظر کے پاس من و تو میں بھی کوئی فرق نہیں :

ہر کہ از ذرہ ای وجود بود　　پیش ہر ذرہ ای سجود بود !
نہ ہمہ بت ز زر و سیم بود　　کہ بت رہروان وجود بود
در حقیقت چو جملہ یک بود ست　　پس ہمہ بود ہا بنود بود !!
نقطہ آتشست در باطن　　دود دیدن از وچہ سود بود

در عشق تو من توام تو من باش　　یک پیرہنت گو دو تن باش
چوں جملہ یکیست در حقیقت　　گو در یک تن دو پیرہن باش
جانا ہمہ آن تو شدم من !!　　من آن توام تو آن من باش

عالم حقیقت تک پہنچنے اور درک وحدت کے لئے مقام عقل، علم اور قیل و قال سے گزرنا

جانا چاہیئے۔ چون وچرا کی گفتگو اور سوال کا خاتمہ کر دینا اور خود سے بے خود ہو جانا چاہیئے یعنی اپنے سر سے دانش اور دوسری ہوسوں کو نکال دینا چاہیئے۔ اسی وقت حال وجود میں آسکتا اور حقیقت اپنا جلوہ دکھا سکتی ہے۔ تعینات اور بحثیں ہمارے اندازوں اور ہماری عقلوں کی حدود کے اندر ہیں، حقیقت ان سب سے آگے ہے۔ اس حالت اور اس ذوق کو حاصل کرنا چاہیئے جو عقل سے آگے ہے۔

در عشق روی او ز حدوث و قدم مپرس ۔۔۔ گر مرد عاشقی ز وجود و عدم مپرس
مردانہ بگذر از ازل و از ابد تمام! ۔۔۔ کم گوی از ازل ز ابد نیز ہم مپرس
زیں چار رکن چون بگذشتی ببیں حرم ۔۔۔ آنگاہ دیدہ پر کن و پس آں حرم مپرس
آنجا کہ ہست نقطۂ توحید رنج نیست ۔۔۔ ز آن چار بر گذر بدمی و ز دم مپرس
لوح و قلم بطبع دماغ و زبان تست ۔۔۔ لوح و قلم بدان و ز لوح و قلم مپرس
چوں تو بدین مقام رسیدی اگر مباش ۔۔۔ گم گرد در فنا و دگر بیش کم مپرس

عطار کی غزلیں ایسے مطالب اور معانی میں ایک سے بڑھ کر ایک بہتر اور شور انگیز ہیں ان کے وزن میں تنوع ہے اور انھوں نے عام طور پر دلنشین اوزان اختیار کئے ہیں۔ دیوان عطار کے اکثر اشعار ردیف پر ہیں، اور ان میں قافیہ بہت کم ہے۔

یہاں ایک بات اور یاد رکھنی چاہیئے کہ اگرچہ عطار کا کلام پیچیدگی سے دور اور سادہ ہے، اور انھوں نے معانی کے مقابلہ میں الفاظ کی پرواہ نہیں کی ہے۔ پھر بھی انھوں نے تشبیہوں کے موقع پر شعری صنائع، بلند پروازی، اور نکتہ پردازی سے ضرور کام لیا ہے۔ مثلاً انھوں نے لب کو عناب سے، خط کو ریحان سے، دہن کو پستہ سے اور دانتوں کو مرجان سے تشبیہہ دی ہے زلف کو کہیں زنجیر سے، کہیں رات سے، کہیں جال سے، کہیں چور سے اور کہیں کفر سے تشبیہہ دی ہے۔ ایسی زلف جو چہرے کے اطراف حلقہ کئے ہوئے ہے گویا کفر ہے جو اسلام کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ خال کو کبھی دانہ سے، کبھی زنگی بچہ سے، ٹھوڑی کو سیب سے اور

زنخداں کو چاہ سے تشبیہ دی ہے لیکن عطار کے دیوان میں ایسی تشبیہیں بہت کم ہیں۔اسی طرح قدرتی مناظر کی تعریف جو فرخی، منوچہری اور عنصری کے اشعار میں کثرت سے ملتی ہے، اس کی طرف عطار نے بہت کم توجہ کی ہے۔ان کے دیوان میں ایسے اشعار بہت ہی کم ملتی ہیں

بادشمال می رسد جلوہ نسترن نگر　　　وقت سحر ز عشق گل بلبل نعرہ زن نگر

سبزۂ تازہ روی را لو خط جوئبار بین　　　لالۂ سرخ روی را سوختہ دل چو من نگر

خیری سرفگندہ را در غم عمر رفتہ بین　　　سنبل شاخ شاخ را مردۂ چمن نگر

یاسمن لطیف را ہم چو عروس بکر بین　　　بادمشاطہ فعل را جلوہ گر سمن نگر!

نرگس نیم مست را عاشق زرد روی بین　　　سوسن شیر خوارہ را آمدہ در سخن نگر

لعبت شاخ ارغوان طفل زبان کشادہ بین　　　ناوک چرخ گلستان غنچۂ بی دہن نگر

تا گل پادشاہ وش تخت نہاد در چمن　　　لشکریان باغ را خیمۂ نسترن نگر

ہیں کہ گذشت وقت گل سوئے چمن نگاہ کن　　　روح نصیب صبح بین ابر گلاب زن نگر

عطار کے اشعار کا بڑا حصہ ان کی کئی مثنویاں ہیں۔ان میں سے بعض کے نام ہم اوپر لے چکے ہیں۔ان سب میں صوفیانہ مضامین نظم کئے ہیں۔یہاں ہم ان کی سب سے مشہور مثنوی یعنی منطق الطیر کا تفصیلی ذکر کریں گے۔

سیمرغ سے ملنے کے لئے پرندوں نے جو سفر کیا اس سفر کی داستان میں عطار نے سیر سلوک راہ کوشش اور ریاضت کا حال بیان کیا ہے جو آدمیت کے عالی درجہ پر پہنچنے اور حقیقت کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کمال کا راستہ سراسر تکلیفوں سے پٹا پڑا ہے، اس راستے کو صرف جوئندہ اور بردبار انسان ہی طے کر سکتا ہے۔ان مقامات میں پہلا مقام جستجو اور طلب کا ہے۔جب تک دل میں سچی طلب نہ ہو کمال کے راستے پہ قدم بڑھانا محال ہے۔جوئندہ یابندہ، راہ مقصود میں کوشش و فداکاری شرط اول ہے:

جد و جہد اینجاست باید سالہا　　　زآنکہ اینجا قلب گردد سالہا

مال اینجا بایدت انداختن ! ملک اینجا بایدت در باختن!

دوسرا مقام، مقام عشق ہے۔ انسان کو اپنے مقصود سے ایسی دلبستگی ہونی چاہیئے کہ وہ بے درنگ راہ وصال پر چل پڑے۔ اس راستے میں چلنے سے نہ ڈرے۔ شک ویقین اور نیک وبد کے تصورات اسے پریشان نہ کریں۔ اپنے مقصود کی خدمت اور اپنے معبود کی جستجو کے راستے میں تامل اور عاقبت اندیشی کو روانہ رکھے:

بعد ازاں آں وادی عشق آمد پدید ، غرق آتش شد کسی کانجا رسید
کس دریں وادی بجز آتش مباد ، وآنکہ آتش نیست عیشش خوش مباد
عاشق آں باشد کہ چون آتش بود ، گرم رو سوزندہ و سرکش بود!
عاقبت اندیش نبود یکزماں ! ، غرق در آتش چون آن برق جہاں

تیسرا مقام، مقام معرفت ہے۔ راہ رؤں میں اپنی اپنی سمجھ بوجھ، اور اپنی اپنی دانش و بینش کے مطابق کسی نے محراب کو اور کسی نے بت کو اپنے لیے انتخاب کرلیا ہے۔ اسرار کا کھلنا بھی اسی کی اپنی ذاتی قدر کے مطابق ہے۔ راہ کمال میں لاکھوں گم ہو جاتے ہیں تو ان میں سے ایک پر اسرار کھلتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر شخص کا مقام معرفت کے لئے اس کی کوشش کے مطابق ہوتا ہے:

ہیچ رہ دردی نہ چون آن دیگر است ، سالک تن مالک جاں دیگر است
لاجرم بس رہ کہ پیش آید پدید ، ہر یکی بر حد خویش آید پدید
سیر ہر کس تا کمال او بود ، قرب ہر کس حسب حال او بود
معرفت ایں جا تفاوت یافتہ ، ایں یکی محراب و آن بت یافتہ
صد ہزاراں مرد گم گردد مدام! ، تا یکے اسرار بین گردد تمام
ہست دائم سلطنت در معرفت ، جہد کن تا حاصل آید ایں صفت

چوتھا مقام استغنا ہے۔ راہ رو عارف کو دانا، خردمند اور صاحب دل ہونا چاہیئے

اسے اپنے مقصود کے راستے میں دنیا اور دنیا والوں سے بے نیاز رہنا چاہئے۔ جو طفلانہ ہوسوں میں گرفتار ہو وہ اوج کمال پر کیسے پہنچ سکتا ہے۔ بینا صوفی بلند نظر ہوتا ہے، اس کی نظر میں دنیا ایک ایسا نقش ہے جو تختی پر اتارا جاتا ہے اور پھر اس تختی سے اسے میٹ دیا جاتا ہے:

دیدہ باشی کان حکیم پر خرد — تختۂ خاک آورد در پیش خود
پس کند آں تختہ و پر نقش و نگار — ثابت و سیار آرد آشکار
ہم ملک آرد پدید و ہم زمیں — گہ برآں حکمی کند گاہی بریں
ہم نجوم و ہم بروج آرد پدید! — ہم انول و ہم عروج آرد پدید
ہم نحوست ہم سعادت بر کشد — خانۂ موت و ولادت بر کشد
چوں حساب نحس گیرد و سعد ازآں — گوشۂ آں تختہ گیرد بعد ازآں
برفشاند گوئی آن ہرگز نبود — آں ہمہ نقش و نشاں ہرگز نبود
صورت ایں عالم پر پیچ پیچ — ہست ہمچوں صورت آں تختہ ہیچ

پانچواں مقام توحید ہے عارف جب اس مقام کا درک کر لیتا ہے تو پھر کثرت کی اس رنگا رنگی میں وحدت ہی دیکھتا ہے۔ اسے ہر چیز میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ یعنی خدا کی ہستی کے سوا، جو واقعی ہستی ہے وہ ہر چیز کو نابود سمجھتا ہے اور اس کی نظر میں من و تو کا امتیاز ہی باقی نہیں رہتا۔

چوں یکی باشد ہمی نبود دوئی! — ہم منی برخیزد اینجا ہم توئی!

چشم بینا جس جگہ اور جس شخص کو دیکھتی ہے وہ اس کی حقیقت یعنی خدا کو دیکھتی ہے، اسی لئے تو کہا گیا ہے:

"ما رایت شیئاً الا و رایت اللہ فیہ"

رفت پیش بوعلی آں پیرزن — کاغذ زر برد کایں بستان زمن
شیخ گفتا عہد دارم من کہ نیز — جز ز حق نستانم از کس ہیچ چیز

پیرزن درحال گفتا بوعلی! | از کجا آوردی آخر احولی!
مرد را در دیدہ اینجا غیر نیست | کعبہ را ضدیتی با دیر نیست

چھٹا مقام حیرت ہے۔ مرد عارف کا اس مقام پر پہنچنا ضروری ہے۔ اور اسے اس آوارگی اور شگفتگی کی وادی کو پار کرنا لازم ہے۔ اسی مقام پر انسان کو پتہ چلے گا کہ اس کے تمام علم محدود تھے پس وہ اپنے نہ جاننے کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مبہوت رہ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ہستی تک کو گم کر دیتا ہے:

مرد حیران چون رسد این جایگاہ | در تحیر ماندہ وگم کردہ راہ
گم شود در راہ حیرت محو و مات | بے خبر از بود خود و ز کائنات
ہر کہ زد توحید بر جانش رقم | جملہ گم گردد گم از وا و نیز ہم
گر بدو گویند ہستی یا نہ ای | سر بلند عالمی پستی کہ ای
در میانی یا برونی از میاں | بر کناری یا نہانی یا عیاں
فانیٔ یا باقیٔ یا ہر دوئی | ہر دوئی یا تو نہ ای یا نہ توئی
گوید اصلا می ندانم چیز من! | وین ندانم ہم ندانم نیز من

ساتواں مقام فنا ہے۔ اس مقام پر آدمی کی تمام شہوتیں، تمام نخوتیں، تمام خود پرستیاں اس سے دور ہو جاتی ہیں اس طرح وہ اپنے آپ کو گم کر دیتا ہے یعنی وہ عالم وحدت کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ اسے ساز کی طرح جو دوسرے سازوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور سب کے ساتھ مل کر ایک دلکش نغمہ پیدا کرتا ہے اور انفرادی حیثیت سے اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے وہ بھی آفرینش کے نغمہ کا ایک جزبن جاتا ہے۔ اس کے بعد ہی اسے حق کا وصال حاصل ہو سکتا ہے اور حقیقت میں اسی فنا سے اسے بقا نصیب ہوتی ہے:

ہر کہ در دریای کل گم بودہ شد | دائما گم بودہ و آسودہ شد!
گر تو ہستی راہ بین و دیدہ در! | موی در موی این چنین اندر نگر!

ہر کہ او رفت از میاں اینک فنا　　چوں فنا گشت از فنا اینک بقا

یہ ہیں وہ مراحل جنھیں کمال تک پہنچنے کے لئے مرد عارف کو طے کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ان سات وادیوں کو طے کرنے، بے پایاں مصیبتیں اٹھانے اور وادی فنا میں پہنچنے کے بعد آخرکار پرندے سیمرغ کی بارگاہ میں پہنچے اور وہاں اپنا ہی عکس دیکھا:

ہم ز عکس روی سیمرغ جہاں　　چہرۂ سی مرغ دیدند آں زماں
چوں نگہ کردند ایں سی مرغ زود　　بے شک ایں سی مرغ آں سیمرغ بود
کشف ایں سر قوی درخواستند　　حل مائی و توی درخواستند
بی زباں آمد از آں حضرت جواب　　کاینہ است آں حضرت چوں آفتاب
ہر کہ آید خویشتن بیند درو　　جان و تن ہم جان و تن بیند درو

اس طرح جب مرد عارف مقامات کو طے کرتا اور مراحل سے گزرتا ہوا اوج کمال پر پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ یہ عالم ظاہر کچھ نہیں اور خدا کی تلاش آپ سے خارج میں بیکار ہے، اسی وقت من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کا راز اس پر آشکار ہو جائیگا۔

عطار کا طرز بیان اکثر مثنویوں میں بشمول منطق الطیر یہ ہے کہ صوفیانہ مطالب کو ادا کرنے کے لئے حکایتیں بیان کی ہیں اور تمثیل میں اپنا مقصود ادا کر دیا ہے۔ اسی سبک کو مولانا جلال الدین رومی نے خاص طور پر اختیار کیا ہے۔

نثر میں عطار کی مشہور یادگار تذکرۃ الاولیا ہے۔ اس کتاب میں (۹۶) مشاہیر صوفیہ کی زندگی کے حالات سادہ اور شیریں فارسی میں بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب قاری کو صوفیوں کے درونی تجارب، ان کے ذوق و شوق اور ان کے افکار اور معتقدات سے واقف کراتی ہے

عرفان و ادب اور نظم و نثر میں شیخ عطار جس بلند مقام پر فائز ہیں اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ان کے بعد آنے والے شاعروں اور عارفوں نے ان کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ مولانا جلال الدین رومی نے نہ صرف عطار کے صوفیانہ افکار کی پیروی کی ہے بلکہ مثنوی لکھنے

کا سبک اور حکایتوں میں اپنا مطلب بیان کرنا بھی انھیں سے سیکھا ہے۔ بلکہ بعض جگہ تو شیخ کی عین عبارت ہی نقل کر دی ہے، مثلاً :

منطق الطیر میں عطار وادی عشق کے ذکر میں کہتے ہیں :

کس درین وادی بجز آتش مباد — وآنکہ آتش نیست عیشش خوش مباد

مولانا جلال الدین فرماتے ہیں :

آتش ست ایں بانگ نای و نیست باد — ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد!

اسی طرح دوسرے شاعروں پر بھی شیخ کا اثر نمایاں ہے۔ عطار کی مثنوی اسرار نامہ کی ابتدا، اس طرح ہوتی ہے :

بنام آن کہ جان را نور دیں داد — خرد را در خدا دانی یقیں داد

یہ شعر محمود شبستری کی مثنوی گلشن راز کی یاد تازہ کر دیتا ہے جس کی ابتدا، اس طرح ہوتی ہے:

بنام آن کہ جان را فکرت آموخت — چراغ دل بنور جان برافروخت

ریاض العارفین میں جو قصیدہ عطار سے منسوب کیا گیا ہے، وہ ہاتف اصفہانی کے ترجیع بند کو مجسم پیش نظر کر دیتا ہے۔

عطار فرماتے ہیں :

چشم بگشا کہ جلوۂ دیدار — متجلی است از در و دیوار!

ہاتف کہتے ہیں :

یار بے پردہ از در و دیوار — در تجلی است یا اولی الابصار

عطار کے سبک کا اثر حافظ کے کلام میں بھی نظر آتا ہے۔ عطار کے دیوان میں ایک شعر ہے، فرماتے ہیں :

بار دگر پیر ما رخت بخمار برد — خرقہ در آتش بسوخت دست بزنار برد

پھر کہتے ہیں :

پیر ما وقت سحر بیدار شد   از در مسجد بر خمار شد

خواجہ حافظ کا ارشاد ہے :

دوش از مسجد سوی میخانہ آمد پیر ما   چیست یاران طریقت بعد ازین تدبیر ما

عطار کے کلام کا اثر غیر صوفی شاعروں پر بھی پڑا ہے ۔ مثلاً عطار کے دیوان کا یہ شعر :

یک شربت آب می نتوان خورد در جہاں   کایں کوزہ ہای خاک تن ناتوان ماست

خیام کے افکار کی یاد دلاتا ہے ۔ عطار کے قصیدہ کا یہ شعر :

سبحان خالقی کہ صفاتش ز کبریا   در خاک عجز می فگند جملہ انبیا

اور ایسے ہی دوسرے اشعار سعدی کے قصائد کی یاد دلاتے ہیں ۔

عطار کی وفات کی تاریخ میں بڑا اختلاف ہے ۔ یقین سے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۶۱۶ھ میں زندہ تھے اور روایتوں کی رو سے ۶۲۷ھ میں مغلوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے ۔ ان کی تربت نیشاپور کے جنوب میں بمقام شادیاخ موجود ہے ۔

سلجوقی دور کے دوسرے نامی شعراء

اسدی ابو نصر علی بن احمد طوسی جو اسدی کے نام سے مشہور ہے پانچویں صدی ہجری کے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے ۔ یہ ان چند شاعروں میں سے ایک ہے جنھوں نے فردوسی کے شاہنامہ کو سامنے رکھ کر شاہنامہ کی طرز میں نظم لکھنے کی کوشش کی ہے ۔ طبع آزمائی کے اس میدان میں اسدی بھی فردوسی کی طرح شہسوار تھا ۔ چنانچہ اس زمین میں اس نے گرشاسب نامہ لکھا ۔ اگرچہ فضیلت ، سبقت ، زیبائی سخن ، پختگی فکر اور روانی میں کمال فردوسی کا حصہ ہے لیکن اس کے باوجود اسدی نے ایران کی ایک مشہور پرانی داستان یعنی داستان گرشاسب کو نظم کرنے میں بڑی محنت اٹھائی ہے اور اپنی شاعرانہ قابلیت کا اظہار کیا ہے ۔ یہ نظم بھی شاہنامہ کی طرز اور اسی وزن میں لکھی گئی ہے ۔

اس میں نو ہزار شعر ہیں۔ چنانچہ ایک قلمی نسخہ کے آخر میں یہ شعر آیا ہے:

بہ آمد ہمی بیتہا نہ ہزار   دو سال اندر و بردہ شد روزگار

گرشاسب کی داستان اوستا میں آئی ہے اور اسدی سے پہلے ابوالموید بلخی اور فردوسی نے اسے ضبط تحریر میں لے لیا تھا۔ سیستان کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے اس میں یہ داستان نقل ہوئی ہے اور اسدی کے گرشاسبنامہ سے بالکل مطابقت رکھتی ہے۔

گرشاسبنامہ کے نظم کی تاریخ ۴۵۸ھ ہے، چنانچہ خود کہتا ہے:

ز ہجرت بدور سپہری کہ گشت   شدہ چار صد سال و پنجاہ و ہشت

معلوم ہوتا ہے پانچویں صدی ہجری میں اسدی اپنے وطن سے نخجوان گیا اور اس کتاب کو اران اور نخجوان کے حکمران ابودلف کے نام معنون کیا۔ چنانچہ اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

ملک بودلف شہریار زمین   جہاں دار اران پاک دین

فردوسی کے شاہنامہ اور داستان گرشاسب کے بارے میں شاعر نے بیان کیا ہے:

بشہنامہ فردوسی نغز گوی   کہ از پیش گویندگان برد گوی

بسی یاد رزم یلان کردہ بود!   ازین داستان یاد ناوردہ بود

من اکنوں ز طبعم بہار آورم   مرین شاخ نو را ببار آورم

زابلستان میں گرشاسب جمشید کی نسل سے پیدا ہوتا ہے اور بڑا بلیتن پہلوان بن جاتا ہے۔ پھر اژدھوں، شیروں، پہلوانوں اور ڈاکوؤں سے جنگ کرتا ہے اور ہر جگہ دشمن پر فتح پاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے اسدی نے استاد فردوسی کی پیروی کی ہے اس لئے شاہنامہ کے ہیرو رستم کے مقابلہ میں اپنی داستان کا ہیرو گرشاسب کو بنایا ہے۔ گویا یہ مردانگی میں رستم پر بھی فوقیت رکھتا تھا جس طرح فردوسی نے کبھی اپنی داستانوں کو کسی نامہ

یا کسی دفتر سے منتسب کیا ہے اسی طرح اسدی نے بھی اپنی داستان کو ایک نامہ سے نقل کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

زگرد ار گرشاسب اندر جہاں — یکی نامہ بد یادگار مہان
پر از دانش و پند آموزگار! — ہم از راز چرخ و ہم از روزگار
ز فرہنگ و نیرنگ و داد و ستم — ز خوبی و زشتی و شادی و غم
ز نخچیر و گرد نفرازی و رزم — ز مہر دل و کین و شادی و بزم
کہ چون خوانی از ہر دری اندکی — بسی دانش افزاید از ہر یکی
ز رستم سخن چند خواہی شنود — گمانی کہ چون او بمردی نبود!
اگر رزم گرشاسب یاد آوری — ہمہ رزم رستم بباد آوری
ہمان بود رستم کہ دیو نژند — ببردش با بہرو بدریا فکند
زبون کرد ش اسپندیار دلیر — بکشتنش آورد سہراب زیر
سپہدار گرشاسب تا زندہ بود — نہ کرد ش زبون کس نہ افکندہ بود
بہ ہند و بروم و بچین از نبرد — بکرد آنچہ دستان رستم نکرد

ایک طرف اس داستان میں پہلوانوں کے قصے، لڑائیوں کی داستانیں اور دوسرے حالات و واقعات شاہنامہ ہی کی طرح لکھے ہیں تو دوسری طرف یہ نظم شاہنامہ سے مختلف بھی ہے۔ جیساکہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اگرچہ نظم گرشاسب نامہ ایک استوار اور روان نظم ہے پھر بھی اس میں شاہنامہ کی نظم کی سی لطافت اور دلکشی موجود نہیں۔ گرشاسب نامہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت سے ایسے مقاموں اور شہروں کے نام آئے ہیں جن سے ہند، چین، مختلف جزیروں، قرطبہ، روم اور توران کے سفر کے دوران میں گرشاسب گذرا تھا۔ پہلوانوں اور دوسرے لوگوں کے جو نام گرشاسب نامہ میں آئے ہیں ان میں اکثر نئے ہیں اور شاہنامہ میں نہیں ملتے۔ مثلاً بہو، نوشیابہ، آذرش، برزہ، گرھوال اور نشواد۔

گرشاسب نامہ کی ایک اور خصوصیت استعارہ، مجاز اور کنایے کی فراوانی ہے اور تاکید اور تشبیہ میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ مثلاً بعض اشعار میں آسمان کو ایوان مینا سے اور ستاروں کو بلوری مہروں سے، آفتاب کو "آتش سندروس" سے ہوا کو "دریای آب" سے، کالی زمین کو آبنوس سے، رات کو ہندو سے، کمان کو قوس وقزح سے، تیر کو بارش سے، گل کو "ترک" سے زرہ کو "آبگیر" سے، کلی کو موتی سے، اور درخت کو "طاؤس سے" تشبیہ دی ہے۔ کہتا ہے:

چو زایوان مینای پیروزہ بوم　　　فگندآں ہمہ مہرہ ہای بلور
ز دریای آب آتش سندروس　　　درافتاد در خانۂ آبنوس
ز ہندو جہاں پیل و لشکر گرفت　　　غو کوس کوہ و زمیں برگرفت

کمان آز فنداق شد ژالہ تیر　　　گل غنچہ ترک و زرہ آبگیر
شگوفہ چو بر رشتہ کردہ گہر　　　درختاں چو طاؤس بکشادہ پر

گرشاسب نامہ کے مطالعہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شاہنامہ کی بہ نسبت گرشاسب نامہ کی زبان ہمارے زمانے کی زبان سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دونوں کتابوں کی تالیف میں کافی طویل مدت کا فصل ہے۔

گرشاسب نامہ کے بہترین اور بلند پایہ اشعار وہ ہیں جن میں نصیحتیں کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی وہ نصیحت پڑھے جو اثرط نے گرشاسب کو کی تھی تو اسے معلوم ہوگا کہ یہ نصیحتیں کتنی سنجیدہ اور کتنی سودمند ہیں۔

یہاں کچھ اشعار اس نصیحت سے پیش کئے جاتے ہیں جو گرشاسب نے اپنے بھتیجے نریمان کو کی تھیں:

پس از من چناں کن کہ پیش خدای　　　بنازد روانم بدیگر سرای
نگر تا گناہت نباشد بسی!　　　بیزدان ز رنجت ننالد کسی

فرومایه را دار دور از برت　　مکن آن که ننگی شود گوهرت
از آن تیره کس کو از تو ترسان شود　　دگر با تو هر زمان دگر سان شود
مکن با سخن چین دو روی راز　　که نیکت به زشتی برد پاک باز
بکس بیش از اندازه نیکی مکن　　که گردد بد اندیش بشنو سخن
شب و روز بر چار بهره بپای　　یکی بهره دین را ز بهر خدای
دگر باز تدبیر و فرجام را　　سیم بزم را چارم آرام را!
بفرهنگ پرور چو داری پسر　　نخستین نویسنده کن از هنر
نویسنده را دست گویا بود!　　گل دانش از دستش بویا بود
بفرمان نادان مکن هیچ کار　　مشو نیز با پارسا بادسار
مده دل بغم تا نکاهد روان!　　بشادی همی دار تن را جوان
به بخشائی بر زیردستان بمهر　　برایشان بهر خشم مفروز چهر
چو دستت رسد دوستان را بپای　　که تا در غم آرند چهرت بجای
نگهدار از آزادگان فرهی　　مده ناسزا را بدیشان همی
با غالش هر کسی بد مکن!!　　نشانه مشو پیش تیر سخن!
مخند ار کسی را سخن نادرست　　که گویائی جان نه در دست تست
کرا چهره زشت از سرشتش نکوست　　مکن عیب کان زشت چهری نه زوست
نکوکار با چهرهٔ زشت دار　　فزا دان به از نیکوی زشت کار
گناهی که بخشیده باشی زبن　　سخن زان دگر باره تازه مکن
مکن بد که چون کردی و کار بود　　پشیمانی از پس ندارد ت سود

یہ نصیحت اور ایسی ہی دوسری نصیحتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسدی کتنا آزمودہ کار اور کتنا دانا و بینا تھا۔

گرشاسب نامہ کے اشعار میں داستان کی دلکشی اور سبک کی لطافت کے سوا ایک اور بڑے کام کی چیز ملتی ہے۔ یہ فارسی کے بہت سے کارآمد الفاظ ہیں جو اس نظم میں استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ نظم کا لکھنے والا اپنے زمانے کی ادبی زبان سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ کچھ عجب نہیں اس زمانے کی ایک لغت جو "فرہنگ لغات فرس" یا "لغات فرس" کے نام سے ملتی ہے وہ اسدی ہی کی تالیف ہو۔ کیونکہ اسدی لغت شناسی میں بڑا ماہر تھا۔

یہ لغت گرشاسب نامہ کے بعد کی تالیف ہے، یعنی یہ ۴۵۸ھ کے بعد لکھی گئی ہے۔ کیونکہ اس میں گرشاسب نامہ کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ لفظ "فنداق" کے ذیل میں لکھا ہے:

"از فنداق قوس وقزح بود، اسدی مصنف گوید در گرشاسب نامہ:

گماں آز فنداق شد ژالہ تیر گل غنچہ ترگ وزرہ آب گیر

اس فرہنگ میں اس زمانے کے تقریباً ستر شاعروں کا ذکر آیا ہے اور ان کے اشعار مثال میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس طرح بہت سے اشعار جن کی اصل جیسے رودکی کی کلیلہ ودمنہ ناپید ہوگئی ہے، محفوظ رہ گئے ہیں۔

اسدی نے ۴۴۷ھ میں ابو منصور موفق ہروی کی تالیف "کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ" جو ادویہ اور ان کے خواص پر ہے، اپنے قلم سے لکھی۔ جو فارسی قلمی نسخے باقی ہیں ان میں یہ نسخہ سب سے قدیم ہے۔ افسوس ہے کہ اسدی نے اپنی فرہنگ میں اس کتاب کے طبی الفاظ نقل نہیں کئے ہیں۔

اسدی نے قصیدے بھی لکھے ہیں۔ ان میں اس کے چار مناظرے بھی ہیں۔ ان مناظروں کے نام یہ ہیں: مناظرۂ آسمان و زمین۔ مناظرہ شب و روز۔ مناظرۂ مغ و مسلم۔ مناظرۂ نیزہ و کمان۔

اسدی نے ۴۶۵ھ میں وفات پائی۔

ناصر خسرو حکیم ناصر خسرو بن حارث قبادیانی ۳۹۴ھ میں بمقام قبادیان حوالی بلخ پیدا ہوئے چنانچہ خود کہتے ہیں:

بگذشت ز ہجرت پس سی صد ونود وچار　　بنہاد مرا مادر بر مرکز اغبر

جوانی ہی سے ناصر خسرو نے علوم وفضائل، تحقیق ادیان وعقائد، ایران وعرب کی شاعری کا مطالعہ شروع کیا اور ہر خرمن سے خوشہ چینی کی یہاں تک کہ مقام دانش پر فائز ہوئے خود کہتے ہیں:

بہر نوعی کہ بشنیدم ز دانش　　نشستم بر در او من مجاور

نماند ز ہیچ گوں دانش کہ من زان　　نکردم استفادت بیش وکمتر

ناصر خسرو نے سلطان محمود اور سلطان مسعود غزنوی کے دربار بھی دیکھے۔ چنانچہ اپنے سفرنامہ میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ اس کے بعد انھیں سلجوقی دربار میں دیوانی کی خدمت ملی اور وہ دبیر رہے۔ ناصر خسرو نے تحصیل علم اور تحقیق کے سوا سفر بھی بہت کئے تھے اور جوانی ہی میں ہندوستان، افغانستان اور ترکستان کا سفر کر چکے تھے۔ غالباً اس سیر وسیاحت کا مقصد مختلف قوموں کے حالات اور ان کے عقائد کی تحقیق تھی۔ چنانچہ انھوں نے حجاز میں طول طویل سفر کئے اور اس کے بعد اس بارے میں اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کئے۔ ان کا یہ سفر سات سال میں پورا ہوا۔ اس کی ابتداء ۴۳۷ھ میں ہوئی اور انھوں نے حجاز، ایشیائے کوچک شام اور مصر کی سیاحت کی اور ان ملکوں کی مختلف قوموں اور مذہبوں سے واقفیت حاصل کی۔ خاص کر انھوں نے مصر میں اسماعیلیہ شیعوں سے دینی مطالب اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی۔ اسماعیلیہ امام جعفر صادق کے فرزند اسماعیل کو امام ہفتم اور ان کے فرزند محمد کو امام قائم اور اپنے والد کے جانشین مانتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے عقائد چھپاتے تھے اور باطنی تھے۔ ناصر خسرو نے ان سے روابط پیدا کئے . . . . اور ان کا مذہب اختیار کر لیا اور اس طریقہ کے متعصب گمروہ میں داخل ہو کر ایرانیوں میں اس مذہب کی تبلیغ کے لئے ایران کا رخ کیا۔ ناصر خسرو کے اس سفر کا ایک اہم نتیجہ ان کا سفرنامہ ہے جو سفر سے واپس آنے کے بعد لکھا گیا ہے اس سفرنامہ میں ناصر خسرو نے بیشتر ان شہروں کا حال لکھا ہے جسے انھوں نے دیکھا تھا اور جن مشہور

لوگوں سے ملاقات کی تھی ان کا نام لیا ہے۔ اس طرح وہ آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے کی دنیا کے حالات ایک نفیس کتاب میں محفوظ کر کے اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔

اس سفر سے واپس آنے کے بعد ناصر خسرو بلخ گئے اور علانیہ اسماعیلی عقائد کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے علماء سے مباحثے کئے۔ ان کے عجیب و غریب عقائد کی وجہ سے بہت جلد سنی علماء اور فقہا ان سے ناراض ہو گئے اور سلجوقی امرا سے ان کی شکایت کی۔ سلجوقی امرا نے ان کے خلاف تادیبی رویہ اختیار کیا اور ناصر خسرو وہاں سے فرار ہو کر روپوش ہو گئے۔ پھر چھپتے چھپاتے ایک شہر سے دوسرے شہر میں غربت کی زندگی بسر کی، مصیبتیں اٹھائیں، اور ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کیں۔ چنانچہ اپنے بعض اشعار میں بڑے موثر انداز میں ان کا حال بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:

آزردہ کرد کژدم غربت جگر مرا — گوئی زبوں نیافت زگیتی مگر مرا
درحال خویشتن چو ہمی ژرف بنگرم — صفراہمی برآید ز اندہ بسر مرا
گویم چرا نشانہ تیر زمانہ کرد! — چرخ بلند جاہل بیداد گر مرا
گر بر قیاس فضل بگشتی مدار دہر — جز بر مقر ماہ نبودی مقر مرا!
نی نی کہ چرخ و دہر ندانند قدر فضل — ایں گفتہ بود گاہ جوانی پدر مرا
دانش بہ از ضیاع و بہ از جاہ و ملک و مال — ایں خاطر خطیر چنیں گفت مر مرا
با خاطر منور روشن تر از قمر — ناید بکار ہیچ مقر قمر مرا
با لشکر زمانہ و با تیغ تیز دہر — دین و خرد بس است سپاہ و سپر مرا

اس روپوشی اور آوارہ گردی کی یادگار کتاب "زادالمسافرین" ہے اور اس میں اسمٰعیلی عقاید کے بنیادی مسائل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور فلسفیانہ مقالات اور تحقیقات درج کی ہیں۔ اس کتاب کا شمار فارسی زبان کی گنتی کی چند فلسفیانہ کتابوں میں ہوتا ہے۔ خراسان، مازندران اور طبرستان میں کچھ دن رہنے کے بعد ناصر خسرو ۴۵۶ھ کے

آخر میں بدخشاں کے حوالی یمگان چلے گئے اور یہاں عزلت گزین ہو گئے اور یہیں ۴۸۱ھ
میں وفات پائی۔ حجاز سے واپس آنے سے لے کر اپنی موت تک ناصر خسرو اپنے عقائد کی وجہ
سے لعن طعن کے ہدف بنے رہے اور ہر وقت انھیں ڈرایا اور دھمکایا گیا اس کی وجہ سے
انھوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ چنانچہ ناصر خسرو نے اپنے اشعار میں ان تکلیفوں کی شکایت
کی ہے اور نالہ وزاری کی ہے اور اپنے اشعار میں ترک امیروں اور خلافت عباسی کے حامیوں
کی سخت شکایت کی ہے کیونکہ یہ لوگ ان کے خلاف تھے اور ان کے عقائد کو ناپسند
کرتے تھے۔

سفر نامہ اور زاد المسافرین کے سوا ناصر خسرو نے وجہ دین، خوان اخوان، دلیل المتحیرین
روشنائی نامہ، سعادت نامہ اور دیوان اشعار بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ اپنی تصانیف
کی کثرت کے بارے میں خود کہتے ہیں:

منگر بدین ضعیف تنم زانکہ در سخن زین چرخ پرستارہ فزونست اثر مرا

ناصر خسرو کے دیوان کے اشعار کی تعداد تیس ہزار تک لکھی ہے، لیکن اب اس میں بارہ
ہزار سے زیادہ اشعار نہیں ہیں اور اس میں فلسفیانہ، اخلاقی، اور مذہبی عبرت آمیز قطعات بہت ہیں
قصیدہ میں ناصر خسرو کی استادی مسلم ہے، اور قصیدہ کے بعد ان کی

سبک اور شاعری

مثنوی ہے۔ انھوں نے شعر کی دوسری قسموں کی طرف زیادہ توجہ
نہیں کی ہے۔ ناصر خسرو کے بیشتر قصائد کا موضوع دینی مسائل پر بحث واستدلال، ایمان اور
معنویت کی دعوت، مادی دنیا کی تحقیر، اس فانی دنیا کی آرائشوں اور فریبوں سے اعراض، دیانت
و تقویٰ کی تشویق اور ظاہر سے باطن کی طرف رجوع کی تحریک ہے۔ اس لحاظ سے ناصر خسرو کے
اشعار اور دوسرے مشہور قصیدہ سراؤں کے اشعار میں بڑا فرق ہے۔ ایک نمایاں فرق تو یہ ہے
کہ ناصر خسرو کے اشعار تغزل اور مدح سرائی سے خالی ہیں، چنانچہ اپنے مشہور قصیدہ میں جو اس
مطلع سے شروع ہوتا ہے:

نکوہش مکن چرخ نیلوفری را — برون کن ز سر باد خیرہ سری را

شاعر سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر شاعری را تو پیشہ گرفتی! — یکی نیز بگرفت خنیاگری را

صفت چند گوئی ز شمشاد و لالہ — رخ چون مہ و زلفک عنبری را

بعلم و بگوہر کنی مدحت آن را — کہ مایہ است مر جہل و بدگوہری را

بنظم اندر آری دروغ و طمع را — دروغست سرمایہ مر کافری را

من آنم کہ در پای خوکان نریزم! — مرین قیمتی دُرّ لفظ دری را!

ان کی نظر میں حقیقت کی دریافت کے لیے روشن ترین راستہ علم کا راستہ ہے اسی لئے انھوں نے اپنے کئی قصیدے دانش و بینش کی فضیلت میں لکھے ہیں، کہتے ہیں:

علم و حکمت را طلب کن گر طرب جوئی ہمی — تا بشاخِ علم و حکمت پُر طرب یابی رطب

تن بجان زندہ است و جان زندہ بعلم — دانش اندر کان جانت گوہر است

علم جان جان تست ای ہوشیار — گر بجوئی جان جان را در خور ست

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

ہر کہ جان خفتہ را از خواب جہل آگاہ کند — خویشتن را گرچہ دونست ای پسر والا کند

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکیم شاعر جس علم کی دعوت دیتا ہے وہ دین و ایمان سے الگ علم نہیں ہے جیسے کہ اہل فلسفہ صرف علم ہی پر تکیہ کئے رہتے ہیں:

سر علمہا علم دین است کان! — مثل میوہ باغ پیغمبریست

بدین از خری دور باش و بدان — کہ بے دینی ای پور بیشک خریست

مذہب اسماعیلیہ کی رو سے ناصر خسرو کا عقیدہ یہ ہے کہ معرفت اور قانون کا دروازہ اس کل امام زماں یا نائب اور حجت ہے اس لئے ناصر خسرو کے عقیدہ کے مطابق آخر میں عقل اور ایمان

کے راستے ایک ہی جگہ جا کر مل جاتے ہیں:-

محبت نور است رہبر بہ زی او پوی   تا علم و نیت نیک شود والا !!

ناصر خسرو کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام مستند کا علم کشف اور الہام پر مبنی ہے اس کے سوا وہ ایک عالمِ حقیقی کے بھی قائل ہیں جو اس عالمِ ظاہر سے آگے ہے۔ یہ ظاہر بین نگاہوں سے نہاں ہے اور صرف وہی لوگ اسے دیکھ سکتے ہیں جو نہاں بین نظر رکھتے ہیں، یعنی ایسے ہی لوگ جن میں کشف کی استعداد پیدا ہو جائے۔ پس اس عقیدے کی رو سے ناصر خسرو کا عقل اور علم کی دعوت دینا تصوف کے اثر سے خالی نہیں، چنانچہ کہتے ہیں:

بچشمِ نہاں بین نہانِ جہاں را   کہ چشمِ عیاں بین نبیند نہاں را
نہاں در جہاں چیست آزادہ مردم   نبینی نہاں را ببینی عیاں را
جہاں را بآہن نشاید ششش بستن   بزنجیر حکمت ببند ایں جہاں را
دو چیز است بند جہاں علم و طاعت   اگرچہ گشاد است مر ہر دواں را
تنت کان و جان گوہر علم و طاعت   بدیں ہر دو بگمار تن را و جاں را
بسان گماں بود روز جوانی !!   قراری نبودہ است ہرگز گماں را

بلند خیال شاعر اس بات پر بڑا زور دیتا ہے کہ علم اور کردار کا چولی دامن کا ساتھ ہونا چاہیئے۔ بے عمل علم بے فائدہ ہے اور ایسا ہی ہے جیسے کوئی زرگر ہو اور زرگری کے لیے اس کے پاس زر نہ ہو یا کپڑا نہ ہو جس پر بیل بوٹے کاڑھے۔ بے علم عمل ایسا کپڑا ہے جس پر کوئی نقش و نگار نہ ہو۔ اسی طرح بے عمل علم کھوٹا سکہ ہے:

بے علم عمل چون درم قلب بود زود   رسوا شود و شورہ برون آرد و زنگار
و آنکو نکند طاعت علمش نبود علم   زرگر نبود مرد چو بر زر نکند کار
جامہ است مثل طاعت و آہار بود علم   چون جامہ نباشد بچہ کار آید آہار

دانش کے بہترین نتائج میں سے ایک نتیجہ نیک خوئی ہے:

تا علم نیاموزی نیکی نتوان کرد | بی سیم نیاید درم و بی زرو نیار

اسی طرز فکر یعنی عمل کی ترجیح کو شاعر نے اور بھی کئی جگہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے:

ای خوانده کتاب زند و پازند | زین خواندن زند تا کی و چند
در فعل بفضل شو بیفزای | وز قول روان کی برآورند!
پندم چه دهی نخست خود را | محکم کمری ز پند در بند
پند از حکما پذیر زیرا | حکمت پدر است و پند فرزند
کاری که ز من پسند ناید | با من مکن آنچنان و مپسند
جز راست مگوی گاه و بی گاه! | تا حاجت نایدت بسوگند
گند است دروغ از و حذر کن! | تا پاک شود دهانت از گند
از نام بد ار همی بترسی! | با یار بد از به مپیوند!

ان مقدمات سے معلوم ہوتا ہے کہ ناصر خسرو ایک آزاد، صاحب نظر، ایمان دار اور دیانت دار شاعر تھا۔ دیانت، روحانی اور اخلاقی امور ان کا مدار فکر ہے ناصر خسرو نے نہ صرف ان عقاید کو نظم کا جامہ پہنایا ہے بلکہ وہ خود بھی ان پر یقین رکھتے تھے اس یقین کی وجہ سے ان میں قلبی قوت، فکر رسا اور معنوی فراغت پیدا ہوگئی ہے وہ ہر جگہ اپنے ایمان سے استناد کرتے ہیں، اس لئے انھیں قلب کا اطمینان اور سکون خاطر حاصل تھا جو ایمان کا پھل ہے۔ ان کی یہ کیفیت ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ ایمان کی اسی بلندی اور اوج معنوی سے ناصر خسرو عبرت انگیز اور پند آمیز اشعار پیش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں مئی و معشوق اور باغ و چمن کی جگہ روحانی اور اخلاقی مطالب ملتے ہیں۔ ان کی یہی خصوصیت . . . . ان کی اور تحریروں اور اصطلاحوں میں نظر آتی ہے۔ یہی خصوصیت ان کی شاعری کو ایک مخصوص رنگ دے دیتی ہے۔ اس لئے

ہو سکتا ہے کہ کوئی فرخی کا قصیدہ سن کر اسے عنصری کا سمجھ لے، لیکن ناصر خسرو کا سبک دوسروں سے اتنا ممتاز ہے کہ ان کے کلام کا لحن اور انداز ہی سب سے نرالا نظر آتا ہے۔ یہاں ہم پھر ایک بار اپنے دعوی کے ثبوت میں کچھ اور شعر پیش کرتے ہیں:

نامرد خرد کور و کر نباشد — از کار فلک بی خبر نباشد
داند که هر آن چیز کو بجنبد — نابود و بی حد و مر نباشد
من راز فلک را بدل شنودم — هشیار بدل کور و کر نباشد
چون دل شنوا شد ترا ازان پس — شاید اگرت گوش سر نباشد
بهتر ز کدوئی نباشد آن سر — کو فضل و هنر را مقر نباشد
در خورد تنوره و تنور باشد — شاخی که براو برگ و بر نباشد
در دام جهان همیشه — تخم و چینه جز سیم و زر نباشد
نتواند ازین دام زود رستن — گر مرد دره او سخت خر نباشد
فرزند هنرهای خویشتن شو — تا همچو تو کس را پسر نباشد
گنجور هنرهای خویش گردی — گر باشد مالت وگر نباشد
تو بار خدای جهان خویشی — از گوهر تو به گهر نباشد
در مملکت خویشتن نظر کن ! — زیرا که مملکت بی نظر نباشد
ملک تو گوش و دو چشم روشن — درهاست که به زبان دو در نباشد
امروز بدین ملک ـــ در نظر کن — آن چیز که فردا مگر نباشد
بنگر که چه باید همت کردن — تا بر تو فلک را ظفر نباشد
از علم سپر کن که بر حوادث — از علم قوی تر سپر نباشد
هر کو سپر علم پیش گیرد — از زخم جهانش ضرر نباشد

تذکروں میں ناصر خسرو کی وفات کا سال ۴۸۱ھ لکھا ہے، ان کی قبر صوبہ بدخشاں کے

قصبہ یمگان میں موجود ہے۔

قطران

سلجوقی دور کے مشہور شاعروں میں ایک ابومنصور قطران تبریزی بھی ایک مشہور شاعر ہے
اب تک جتنے شاعروں کا ذکر ہوا ان میں سے اکثر خراسان یا اس کے آس پاس
کے رہنے والے تھے۔ لیکن قطران تبریز میں پیدا ہوا اور یہیں اسے شہرت حاصل ہوئی۔ بڑے
سے بڑا سفر اس نے جو اختیار کیا وہ نواح آذربائیجان کا تھا۔ اس کے قصیدہ :

من آں کشیدم و آں دیدم از غم ہجران

سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ممدوح امیر وہسودان کی موغاں سے لڑائی کے وقت لشکر
گاہ میں حاضر تھا۔

۴۳۸ھ میں ناصر خسرو نے تبریز سے گذرتے ہوئے قطران کو دیکھا، اس سے ملاقات کی
اور اس کے اشعار کو پسند کیا تھا۔ قطران نے اپنے اشعار میں ایسے بہت سے سلاطین کی مدح
کی ہے جو اس زمانے میں آذربائیجان پر حکومت رکھتے تھے۔ مثلاً گنجہ کے حکمران ابوالحسن علی لشکری
فضلون، تبریز اور اس کے نواح کے امرا ابومنصور وہسودان اور ابونصر وہسودان اور نخجوان
اور ارّان کا حاکم ابودلف جو اسدی طوسی کا بھی ممدوح تھا۔ ان میں قطران نے خاص طور پر تبریز
کے حاکم ابومنصور وہسودان بن مملان (متوفی ۴۵۰ھ) اور اس کے بیٹے ابونصر محمد مملان ابن
وہسودان کی بہت تعریف کی ہے جو اپنے باپ کے بعد آذربائیجان کا حاکم ہوا۔ اور جس قصیدے
کا مطلع پیش کیا گیا ہے، اسی قصیدے میں قطران نے ان دونوں کے نام لئے ہیں، کہتا ہے:

نہ ہیچ کس پسری ہمچو میر مملان دید! نہ دید کس پدری ہمچو میر وہسودان

قطران کی شہرت ابوالحسن علی لشکری (۴۲۵ھ - ۴۴۱ھ) کے زمانے میں شروع ہوئی چونکہ
مملان کی کنیت بونصر تھی اور قطران نے اپنے اکثر قصیدوں میں اس کا ذکر کیا ہے شاید اس وجہ
سے متاخرین نے قطران کے قصیدوں کو رودکی سے منسوب کر دیا ہے۔ کیونکہ انھیں ابونصر سے
رودکی کے ممدوح نصر بن احمد سامانی یا اس بادشاہ کے باپ بونصر کی کنیت میں اشتباہ ہوا ہے۔

قطران کے ایسے قصیدوں میں جن سے اس کے زمانے کا تعین ہوتا ہے اس کا ایک پر اثر قصیدہ ہے جو اس نے تبریز کے زلزلہ پر لکھا ہے۔ تاریخ اور روایات کی رو سے یہ زلزلہ ۴۳۴ھ میں آیا تھا اور اس سال خود شاعر تبریز میں موجود تھا۔

قطران کا شمار فارسی کے درجہ اول کے قصیدہ گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس نے بھی زیادہ تر خراسان کے شاعروں کی طرز کی پیروی کی ہے۔ اس کے اشعار دولت شاہ (صاحب تذکرۃ الشعرا) کے زمانہ میں مشہور تھے۔

قطران کے قصیدہ نہایت متین اور عمدہ ہیں اس نے اپنے کلام میں صنائع لفظی، تجنیس، ترصیع اور ذو قافیتین سے کام لیا ہے اس نے بعض قصیدے ان ہی صنائع کی مثال کے طور پر لکھے ہیں۔ وقائع، فصول اور مناظر نگاری میں وہ بڑا استاد ہے۔ بعض مشہور شاعروں نے قطران کی بڑی تعریف کی ہے۔ جامی کہتے ہیں:

بود قطران نکتہ دانی سحر ساز	قطرۂ از کلک او دریای راز

قطران کے بعض بہترین قصیدوں میں اس کا ایک قصیدہ وہ ہے جو اس نے تبریز کے زلزلہ پر لکھا ہے۔ بونصر مملان کی مدح کے بعد گریز میں اسی زلزلے کی حالت پیش کی ہے اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بود محال ترا داشتن امید محال!	بعالمی کہ نباشد ہمیشہ در یک حال
ازاں زماں کہ جہاں بود حال ایں ساں بود	جہاں بگردد لیکن نگردد ش احوال
دگر شوی تو ولیکن ہماں بود شب و روز	دگر شوی تو ولیکن ہماں بود مہ و سال
محال باشد فال و محال باشد زجر	مدار بیہدہ مشغول دل بزجر و بفال
دل تو بستہ تدبیر و نالد از تقدیر	تن تو سخرۂ آمال و نالد از آجال
عذاب یاد نیاری بروزگار نشاط	فراق یاد نیاری بروزگار وصال
نبود شہر در آفاق خوشتر از تبریز	بایمنی و بمال و بہ نیکوئی و جمال

زناز و نوش ہمہ خلق بود نوشا نوش | زخلق و مال ہمہ شہر بود مالا مال
درو بکام دل خویش ہر کسی مشغول | امیر و بندہ و سالار و فاضل و مفضال
یکی بطاعت ایزد یکی بخدمت خلق | یکی بجستن مال و یکی بجستن حال
یکی بخواستن جام با سماع غزل | یکی بتاختن یوز در شکار غزال
بکام خویش ہمی گشت ہر کسی مشغول | بمال خویش ہمی داشت ہر کسی آمال
خدا بمردم تبریز بر فکند فنا | خدا بنعمت تبریز بر گماشت زوال
فراز گشت نشیب و نشیب گشت فراز | رمال گشت رماد و رماد گشت رمال
دریدہ گشت زمین و خمیدہ گشت نبات | دمندہ گشت بحار و روندہ گشت جبال
بسا سرای کہ بامش ہمی بسود فلک | بسا درخت کہ شاخش ہمی بسود ہلال
کزان درخت نماندہ کنون مگر آثار | وزان سرای نماندہ کنون مگر اطلال
کسی کہ رستہ شد از مویہ گشتہ بود چو موی | کسی کہ جستہ بد از نالہ گشتہ بود چو نال
یکی نبود کہ گوید بدیگری کہ مموی ! | یکی نبود کہ گوید بدیگری کہ منال
کمال دور کناد ایزد از جمال جہاں | کجی رسد بجمالی کجا گرفت کمال

اس قصیدہ سے اور اس کے سوا اور قصیدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر صرف مدح گو ہی نہ تھا، بلکہ طبعی حادثات اور تاریخی واقعات بھی اس کے پیش نظر رہتے تھے اور وہ تاریخی اشعار بھی لکھا کرتا تھا۔

دیوان اشعار کے سوا قطران کی اور بھی تصانیف تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے دیوان میں دس ہزار اشعار تھے۔ اس کے سوا اس نے ایک مثنوی قوس نامہ اور لغت پر ایک کتاب بھی لکھی تھی تذکروں میں قطران کی تاریخ وفات ۴۶۵ھ لکھی ہے۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس سے زیادہ عمر پائی تھی۔

مسعود سعد | مسعود سعد کا شمار غزنوی اور سلجوقی دور کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس کا

خاندان ہمدان کا رہنے والا تھا، لیکن یہ ہندستان کے مشہور شہر لاہور میں ۴۴۰ھ کے قریب پیدا ہوا۔ اس کے اجداد اہل ادب تھے، چنانچہ خود کہتا ہے:

اگر رئیس شدام یا عمید زادہ نیم　　ستودہ نسبت و اصلم ز دودہ فضلا ست

خصوصاً مسعود کے باپ سعد اور اس کے دادا سلمان کا شمار اپنے زمانے کے عالموں میں ہوتا تھا مسعود کے باپ سعد نے ساٹھ سال تک غزنوی سلاطین کی خدمت کی۔ چنانچہ مسعود اپنے ایک قصیدہ میں جس کا مطلع ہے:

گوہری جان نمای و پاک چو جان　　گوہری پر ز گوہر الوان!!

کہتا ہے:

شصت سال تمام خدمت کرد　　پدر بندہ سعد بن سلمان

کہ باطراف بودی از عمال　　کہ بدرگاہ بودی از اعیان

سلمان کی ہندستان میں جاگیر اور جائداد تھی۔ مسعود نے ایام جوانی میں غزنوی سلاطین کے دربار سے تعلق پیدا کیا اور یہ غزنوی خاندان کے پندرھویں بادشاہ سلطان ابراہیم بن مسعود (۴۵۱ھ–۴۹۲ھ) کا زمانہ تھا۔

جب سلطان ابراہیم غزنوی نے اپنے بیٹے محمود ملقب بہ سیف الدولہ کو ۴۶۹ھ میں ہندوستان کی حکومت عطا کی تو مسعود سعد اس کی ملازمت میں داخل ہو گیا اور اس کے دفتر کے خاص لوگوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ تمام جنگوں میں اس کا ہم رکاب ہونا لازم ہو گیا۔ اس کے بعد سے مسعود سعد کی شہرت بڑھی اور اسے بڑی عزت اور بڑا مرتبہ نصیب ہوا۔ لاہور میں اس کا بڑا محل اور اس کی بڑی شان و شوکت تھی۔ مسعود سعد نے اپنی زندگی کا ابتدائی زمانہ عزت اور راحت میں گذارا۔ لشکری اور کشوری امور اسی کے پاس تھے۔ مسعود کی جوانی کی بعض بہترین قصیدے اسی محمود سیف الدولہ کی مدح میں ہیں۔ ایسے ہی ایک قصیدے کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

چو روی چرخ شد از صبح بر صحیفۂ سیم | ز قصر شاہ مرا مژدہ داد باد نسیم
کہ عز ملت محمود سیف دولت را | ابو المظفر سلطان عالی ابراہیم
فزود حشمت و رتبت بدولت عالی | چو کرد مملکت ہند را بدو تسلیم
بنام فرخ او خطبہ کرد در ہمہ ہند | نہاد بر سر اقبالش از شرف دیہیم

لیکن ہندستان میں چند سال حکومت دینے کے بعد سیف الدولہ سے سلطان ناراض ہوگیا۔ سلطان نے حکم دیا کہ اسے اس کے بعض ندیموں کے ساتھ گرفتار کرلیا جائے اوران سب کو پکڑ کر زندان میں ڈال دیا گیا۔ مسعود سعد بھی اس زمانے میں اپنی املاک کے سلسلہ میں بعض حکام کی بد طینتی اور شرارت کی شکایت لے کر غزنین آیا ہوا تھا۔ حاسدوں اور دشمنوں نے اس کی بھی شکایت سلطان کے پاس کردی اوراسے سات سال تک قلعہ دھک اور قلعہ سو میں اور پھر تین سال تک قلعہ نای میں قید رکھا گیا، چنانچہ خود کہتا ہے :

ہفت سالم بکوفت سو و دھک | پس از آنم سہ سال قلعہ نای

دس سال کی قید کے بعد اس نے اپنا حال ایک قصیدہ میں لکھ کر سلطان ابراہیم کی خدمت میں روانہ کیا، اس میں کہتا ہے :

بزرگوار خدایا چو قرب دہ سالست | کہ می بکاہد جان من از غم و تیمار
چراز دولت عالی تو بہ پنجم روی | کہ بندہ زادہ این دولتم بہفت تبار
نہ سعد سلمان پنجاہ سال خدمت کرد | بدست کرد بہ رنج این ہمہ ضیاع و عقار
بمن سپرد و ز من بستدند فرعونان | شدہ بعجز و ضرورت ز خان و مان آوار
بحضرت آمدم انصاف خواہ و داد طلب | خبر نداشتم از حکم ایزد دادار
ہمی ندانم خود را گناہی و جرمی | مگر سعایت و تلبیس دشمن مکار !

اس طرح کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مسعود کے قید ہونے کی بڑی وجہ وہی دشمنوں کی بد خواہی اور حسادوں اور کمینوں کی دشمنی تھی۔ انھی سے کام لے کر دشمنوں نے سلطان ابراہیم

جیسے بادشاہ کو سعد سلمان سے بدگمان کر دیا اور انھوں نے سالہا سال تک مسعود جیسے آزاد طبع مرد کو حد سے زیادہ رنج اور تکلیف پہنچائی۔

معلوم ہوتا ہے مسعود سعد نے زندان میں بہرام نامی کسی شخص سے جو خود بھی قید تھا دوستی پیدا کر لی اور اس سے اختر شناسی سیکھی۔ چنانچہ سلطان ابراہیم کے حاجب اور اس کے دربار کے ایک رکن علی خاص کی مدح میں

تبارک اللہ بنگر میان بستہ بجان | زبہر خدمت سلطان سپہد سلطان

والے مطلع کے قصیدہ میں کہتا ہے :

یکی حکایت بشنو ز حسب حال رہی | بعقل سنج کہ عقلست عدل را میزان
برایں حصار مرا با ستارہ باشد راز | بچشم خویش ہمی بینم احتراق و قران
منم نشستہ و در پیشم ایستادہ بپای | خیال مرگ دہان باز کردہ چون ثعبان
گسستہ بند دو پای من از گرانی بند | ضعیف گشتہ تن من ز محنت الوان
نشستہ بودم در کنج خانہ بدحاب | بدولت تو مرا بود سیم و جامہ و نان
ولیک گشت مرا طبع این ہوای عفن | ز خیر گشتم ازیں مردمان بی سامان
نہ مردمیست کہ با او سخن توان گفتن | نہ زیر کیست کہ چیزی از و شنید توان
اگر نبودی بیچارہ پیر بہرامی | چگونہ بودی حال من اندریں زندان
گہی صفت کندم حالہای گردش چرخ | گہی بیان دہدم رازہای چرخ کیان
مرا ز صحبت او شد درست علم نجوم | حساب شد ہمہ ہیئت زمین و مکان

اسی قصیدے میں شاعر بڑے دردناک طریقہ پر اپنی ماں کو یاد کرتا ہے، کہتا ہے :

اگر نبودی تیمار آں ضعیفۂ زال | کہ چشمہاش چو ابرست و اشک چوں باران
خدای داند اگر غم نہادمی بر دل | کہ حال گیتی ہرگز ندیدہ ام یکساں
ولیک زالی دارم کہ در کنار مرا | چو جان شیریں پرورد و مرد کرد کلاں

نہ بست ہرگز او را خیال و نہ اندیشید　　　کہ من بقلعۂ سو مانم او بہ ہندوستان

نجوم سے سعد سلمان کی دلچسپی اس کے اور اشعار سے بھی نمایاں ہے۔ ان میں اس کا وہ قصیدہ بھی شامل ہے جو حسب ذیل مطلع سے شروع ہوتا ہے:

دوش در روی گنبد خضرا　　　ماندہ بود این دو چشم من عمدا

شاعر کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قید کا سب سے کٹھن زمانہ نای کے زندان میں گذرا ہے۔ یہیں اس نے نہایت دردناک اشعار لکھے ہیں۔ ان کے چند نمونے ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔

اسیری کے اس دور کے بعد سلطان ابراہیم نے اسے اپنے دربار کے ایک امیر عمید الملک ابوالقاسم خاص کی سفارش پر قید سے آزاد کیا۔ سعد اپنے وطن کو لوٹا اور اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملا۔ اس کا ایک قصیدہ اسی خواجہ کی مدح میں اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

روز نوروز و ماہ فروردین　　　آمد اندائے عجب زخلد بریں

اسی قصیدے میں کہتا ہے:

گر تو نیستی قوی دل من!　　　چکدی زہرۂ من مسکین!

از تو بودی ہمہ تعہد من　　　گاہ محنت بحصنہای حصین

جان تو دادی مرا پس از ایزد　　　اندریں حبس و بند بازپسین

سلطان ابراہیم کے جانشین یعنی اس کے بیٹے سلطان مسعود (۴۹۲ھ۔۵۰۸ھ) نے ہندوستان کی حکومت اپنے بیٹے امیر عضد دولہ شیرزاد کے سپرد کی۔ یہ مسعود کا دوست تھا اور علم و ادب سے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ اسی کی سفارش پر مسعود سعد کو لاہور کے قریب جالندھر کی حکومت عطا کی گئی چنانچہ مسعود سعد نے سلطان مسعود کی مدح میں اس مطلع کے ساتھ:

ملکا حال خویش خواہم گفت　　　نیک دانم کہ آیدت باور

جو قصیدہ لکھا ہے اس میں کہتا ہے:

سوی مولد گشید ہوش مرا | بوئے دختر و ہوای پسر
چوں بہ ہندوستان شدم ساکن | بر ضیاع و عقار یہ پدر
بندہ بونصر بہ گماشت مرا | بعمل ہمچو نایبان دگر!

لیکن زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ بونصر پارسی معتوب ہوگیا۔ چونکہ شاعر اس سے وابستہ تھا اور خود بھی بڑی آزاد طبیعت اور خودداری کا حامل تھا اس لئے سلطان نے مسعود کے حکم سے اسے دوبارہ گرفتار کر کے قلعہ مرنج میں قید کر دیا۔

اس کے بعد وہ پھر آٹھ سال تک قید رہا ۵۰۰ھ میں سلطان مسعود کے وزیر ثقۃ الملک طاہر علی مشکانی کی سفارش پر اسے رہائی ملی۔ مسعود سعد نے اس وزیر کی مدح میں کئی قصیدے لکھے ہیں۔ قید سے رہا ہونے کے بعد مسعود سعد کو شاہی کتب خانہ کی کتاب داری عطا کی گئی، اور بہت دنوں تک وہ اس خدمت پر فائز رہا۔

اس طرح مسعود سعد نے اپنی زندگی کے اٹھارہ بہترین سال زندان میں بسر کئے۔ دوسری مرتبہ قید سے رہائی پانے کے بعد وہ نہایت شکستہ دل، پریشان، کمزور اور بوڑھا ہوگیا تھا۔ بعد میں اگرچہ ملک ارسلان اور بہرام شاہ جیسے غزنوی بادشاہوں نے اس کی سرپرستی کی لیکن اس نے بادشاہوں کی خدمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنی باقی عمر عزلت میں گذار دی۔ ذیل کے اشعار اسی دور کی زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

چوں بدیدم بد بیدہ تحقیق! | کہ جہاں منزل فناست کنون
یاد مردان نیک محضر را | روی در بہ قع حیاست کنون
آسمان چوں حریف ناسفف | بر سر عشوہ و غناست کنون
دل فگار است ہمچو دانہ از آنک | زیر ایں سبزہ آسیاست کنون
طبع بیمار من ز بستر آز! | شکر یزدان درست خاست کنون
در عقاقیر خانہ توبہ! | نو شدار وی صدق خواست کنون

آنز بانی کہ مدح شاہان گفت — مادح حضرت خداست کنون
مدتی مدحت شہان کردم — نوبت خدمت ودعاست کنون

مسعود کی شاعری اور سبک مسعود سعد ایران کے قصیدہ گو شاعروں میں درجہ اول کا شاعر ہے اس کے سبک پر خراسان کے شاعروں کا اثر نمایاں ہے۔ مثلاً اپنے ایک مشہور قصیدے میں جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

شگوفہ با طرب آورد شاخ عشرت بار — کہ بوی نصرت وفتح آید از نسیم بہار

عنصری کی طرح کہتا ہے:

جز این چہ دانم گفتن کہ عنصری گوید — "چنیں نماید شمشیر خسروان آثار"

پھر ایک اور قصیدہ میں جس کا مطلع ہے:

آیا نسیم سحر فتحنامہا بردار — بہر ولایت از فتحنامہ ای بسپار

کہتا ہے:

نمود در ہند آثار فتح شمشیرت — "چنیں نماید شمشیر خسروان آثار"

ایک اور قصیدہ میں جس کا مطلع ہے:

"زشاہ ہنیم دلہای اہل حضرت شاد"

رودکی کی طرح کہتا ہے:

جز آن نگویم شاہا کہ رودکی گوید — "خدای چشم بد از ملک تو بگرداناد"

یا اپنے ایک ترجیع بند میں منوچہری کے ایک شعر پر تضمین کرتے ہوئے کہتا ہے:

"خیزید وخز آرید کہ ہنگام خزانست" — گر خواہی ازیں بہ دگری گویم ایں بار

اسی طرح لبیبی، شہید بلخی اور بعض دوسرے شاعروں کا سبک بھی مسعود کے پیش نظر رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مشابہت تقلید کا نتیجہ نہیں بلکہ استاد کی اپچ اور بداعت اس سے کہیں بالاتر ہے کہ اسیر تقلید ہو جائے۔ مسعود کا اپنا سبک جوانی ہی میں پختہ ہو چکا تھا اور اس کی طبیعت

کی روانی اور نظم پر عبور نے اس کی شاعری کو ایک خاص طرز اور رنگ دے دیا۔ اپنے بارے میں اس نے یہ جو دعویٰ کیا ہے اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے :

اشعار من آنست کہ در صنعت نظمش — نہ لفظ معار است و نہ معنیش مثنا
انشا کندش روح و مفتح کندش عقل — گردوں کند املا و زمانہ کند اصغا

استاد میدان نظم کا جیسا شہسوار ہے اسی طرح نثر میں بھی مہارت رکھتا ہے، چنانچہ خود کہتا ہے :

بنظم و نثر کسی را گر افتخار سزاست — مرا سزاست کہ امروز نظم و نثر مراست

مسعود کی شاعری میں خراسان کے شاعروں کی بہ نسبت معشوق، شراب اور فطرت کی تعریف کم ملتی ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے پاس نہایت پاکیزہ اور شیریں تغزل موجود ہے مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

یک شب از نو بہار وقت سحر — باد بر باغ کرد راہ گذر!
غنچۂ گل پیام داد ہمی — گفت من آمدم بباغ اندر
خیمہا ساختم ز میرم چین — فرش کردم ز دیبۂ ششتر
نز عماری من آمدم بیرون — نہ بدیدست روی من مادر
نگشادم نقاب سبز از روی — ننمودم بکس رخ احمر
باد بر من دمید مشک و عبیر — ابر بر من فشاند در و گہر

اسی طرح :

زیور آسمان چو بگشایند — کلہ ہای ہوا بپیرایند
کوہ را سر بسیم در گیرند — دشت را رخ بزر بندایند
زنگ ظلمت بصیقل خورشید — ہمچو آئینہ پاک بزدایند
اختران نور مہر ز دیدند — زان بدان ہیچ روی ننمایند

مہر چوں روز نور مہ بستد　　اختران شب ہمی پدید آیند
بینی اندر سپیدہ دم بہ نہیب　　کہ زلرزہ ہمی سنیا سایند

استاد مسعود صرف اپنی مادری زبان کا ہی ادیب نہ تھا بلکہ عربی اور ہندی سے بھی خوب واقف تھا اور عربی میں اس نے شعر کہے ہیں۔

مسعود سعد کا وہ خاص سبک جس نے اسے ایران کے بہت بڑے شاعروں کی صف میں جگہ عطا کی ہے، اس کے زندانی اشعار یا حبسیات میں جلوہ گر ہے۔ ایرانی ادبیات میں اس طرح کی شاعری کمیاب ہے۔ ان اشعار میں اندرونی احساسات کی سچی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان میں شاعر کی بے پایاں مصیبتوں کی بے مثل عکاسی کی گئی ہے یہ شعر دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں اور زندان کے تاریک گوشوں میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دل وجان کے تانے بانے سے انھیں تیار کیا گیا ہے۔ فارسی شاعری ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کی شاعری میں ایسے اشعار کم ہی ملیں گے اس کے یہ اشعار کیا ہیں یتیموں کے دلسوز اور تڑپا دینے والے نالے ہیں۔ اس لئے نظامی عروضی جیسا ادیب جو کم وبیش اس کا ہم عصر تھا، جب اس کے اشعار کے بارے میں یہ کہے تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے :

" وقت باشد کہ من از اشعار او ہمی خوانم موی بر اندام من بر پائے خیزد و جای آں بود کہ آب از چشم برود۔"

مسعود کے یہ زندانی اشعار اتنے پر اثر اور دلگداز ہیں کہ مغرب کے بعض زندانی اشعار جیسے "شیلن" یا مشہور انگریز شاعر بائرن کے اشعار بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ اگرچہ بائرن نے نہایت پر اثر اشعار لکھے ہیں اور نہایت دلنشین اور بدیع اشعار لکھے ہیں، پھر بھی اس نے اپنی آدھی سے زیادہ زندگی زندان میں بسر نہیں کی۔ اس نے یہ شعر صرف اپنے شاعرانہ تخیل کی بنیاد پر لکھے ہیں لیکن "شنیدن کے بود مانند دیدن" کے مصداق ان میں وہ اثر وگداز کہاں! مسعود کے اشعار کا سوز اور دل خراشی اس کی اپنی واردات ہے۔ اس نے اپنی سرگزشت

بیان کی ہے، اپنے تخیل کو پیش نہیں کیا ہے۔ اس خوش بیان، حساس، تعلیم یافتہ اور مہذب
آدمی کے کلام کے اثر کا مقابلہ جسے سالہا سال تک اپنے وطن، اپنے دوستوں، اپنے ماں باپ
اور اپنے بیوی بچوں سے دور محبس کے عذاب میں رکھا جائے، ایسے شاعروں کے کلام کے اثر
سے نہیں کیا جا سکتا جن کے دل میں سوز اور درد نہ تھا۔

مسعود کے شکوائی قصائد جو از راہ داد خواہی لکھے گئے ہیں غزنوی سلاطین سلطان
ابراہیم بن مسعود بن محمود (۴۵۱ھ - ۴۹۲ھ) اس کے بیٹے سلطان مسعود (۴۹۲ھ - ۵۰۸ھ) اور
ان کے اخلاف یعنی شیرزاد بن ابراہیم (۵۰۸ھ - ۵۰۹ھ)، ملک ارسلان بن مسعود (۵۰۹ھ -
۵۱۱ھ) اور بہرام شاہ بن مسعود (۵۱۲ھ - ۵۴۷ھ) کی مدح میں ہیں۔ ان قصیدوں میں شاعر نے
اپنا شکوہ پیش کرنے سے پہلے سلطان کی مدح کی ہے اور اس کے بعد اپنا اصلی موضوع شروع
کیا ہے۔ لیکن زندان سے رہائی کے لئے سلطان سے شدید احتیاج کے باوجود وہ کہیں بھی اسکی
مدح میں راہ اعتدال سے نہیں ہٹتا۔ اس لئے نہیں ہٹتا کہ وہ اپنی فطرت سے، اپنی طبیعت
سے نہایت متین، شجاع، خوددار اور اپنی عزت نفس کا خیال رکھنے والا تھا اور گدا طبیعت نہ تھا

مسعود کے دوسرے مدحیہ قصیدے وزیروں اور امیروں کی مدح میں ہیں۔ اس نے جن کی
مدح کی ہے وہ یہ ہیں: سلطان مسعود کا وزیر ثقۃ الملک طاہر جس کی مدح ابوالفرج رونی، سنائی
اور مختاری نے بھی کی ہے۔ ابو نصر پارسی جو شیرزاد کا سپہ سالار تھا۔ علی خاص جو سلطان ابراہیم
اور سلطان مسعود کا مقرب خاص تھا۔ ابوالقاسم خاص اور ایسے ہی چند لوگ جنھوں نے شاعر کے
ساتھ نیکی کی تھی اور بادشاہوں کے پاس اس کی سفارش کی تھی۔ ایسے ہی قصیدوں کے ضمن میں
شاعر نے زندان کی تکلیفوں، زمانے کی مصیبتوں اور جاں گداز نالوں اور لمبی راتوں کی گریہ وزاریوں
کا حال بیان کیا ہے۔ ان ظالم تاریک راتوں میں آسمان کے تاروں سے اس کے جو راز و نیاز
رہے ان سے وہ ہمیں واقف کرتا ہے۔ زندان کی ظلمتوں میں اسے اپنے ماں باپ اور بچوں
کی جو یاد ستاتی تھی ان کی شرح کی ہے۔ پھر اپنی بے گناہی، دشمنوں کی تہمت تراشی اور اپنے ذلیل

اغراض کے لئے ان کی دشمنی کا ذکر کیا ہے جو شاعر کی ان مصیبتوں کا باعث بنے۔ وہ بزرگوں کی زود باوری کا شکوہ کرتا ہے کہ انھوں نے حاسدوں کی باتوں پر یقین کر لیا۔ پھر اس پر روتا ہے کہ اس دنیا میں حق کیوں باطل کے ستم اٹھاتا ہے۔ یہاں اس کے زندانی قصائد سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

اپنی مایوسی کی اور بیچارگی کی حالت بیان کی ہے:

تا کی دل خستہ در گمان بندم — جرمی کہ کنم باین و آن بندم
بدھا کہ بمن ہمی رسد از من — بر گردش چرخ و بر زمان بندم
افتادہ و خم چرا ہوس چندین — بر قامت سرو بوستان بندم
دین لاشہ خر ضعیف بدرہ را — اندر دم رفتہ کاروان بندم
این سستی بخت پیر ہر ساعت — در قوت خاطر جوان بندم
چند از پی وصل در فراق افتم — وہم از پی سود در زیان بندم
وین دیدہ پرستارہ را ہر شب — تا روز ہمی بر آسمان بندم
در عجز دو گوش تا سپیدہ دم — در نعرہ و بانگ پاسبان بندم
ہرگز نپرد بہوا ے مقصودم! — ہر تیر یقین کہ در گمان بندم
چون اشک ز دیدہ بر دو رخ بارم — باران بہار در خزان بندم
خونی کہ ز سرخ لالہ بگشایم — اندر تن زار ناتوان بندم
از کالبد تن استخوان ماند! — امید درین تن از بجان بندم
از ضعف چنان شدم کہ گر خواہم — تا ندام گرہ چو خیزران بندم
یک تیر نماند و چون کمان گشتم — تا کی زہ جنگ بر کمان بندم

اپنے کئے اور کہے پر پشیمانی، چرخ کج رفتار کی ستم رانی، اپنی بے گناہی اور زندان کی وحشت کے بارے میں کہتا ہے:-

از کرده خویشتن پشیمانم — جز توبه ره دگر نمی دانم
کارم همه بخت بد بپیچاند — در کام زبان همی چه پیچانم
این چرخ بکام من نمی گردد — بر خیره سخن همی چه گردانم
در دانش تیز هوش برجیسم — در جنبش کند سیر کیوانم!
گه خسته ز آفت لهاورم — گه بسته بتهمت خراسانم
تا زاده ام ای شگفت محبوسم — تا مرگ مگر که وقف زندانم
چون پیرهن عمل بپوشیدم — بگرفت قضای بد گریبانم
بر مغز من ای سپهر هر ساعت — چندین چه زنی که من نه سندانم
در خون چه کشی تنم نه زوبینم — در تف چه بری دلم نه پیکانم
حمله چکنی که کند شمشیرم! — پویه چه دهی که تنگ میدانم
والله که چو گرگ یوسفم والله — بر خیره همی نهند بهتانم
گر هرگز ذرهٔ کژی باشد — در من نه ز پشت سعد سلمانم
بر بیهده باز مبتلا گشتم — آورد قضا بسیج ویرانم
برکند سپهر باز بنیادم! — بشکست زمانه باز پیمانم
در بند نه شخص روح میکاهم — از دیده نه اشک مغز میرانم
بیهش نیم و چو بیهشان باشم — صرعی نیم و بصرعیان مانم
چون سایه شدم ضعیف وز محنت — از سایه خویشتن هراسانم
اندر زندان چو خویشتن بینم — تنها گوئی که در بیابانم
گوریست سیاه رنگ دهلیزم — خوکیست کریه روی دربانم
که انده جان بپاس بگذارم — که آتش دل باشک بنشانم
تن سخت ضعیف و دل قوی بینم — امید بلطف و صنع یزدانم

از قصۂ خویش اندکی گفتم　　گرچہ سخنت بس فراوانم
پیوستہ چو ابر و شمع می گریم　　وین بیت چو حرز ورد می خوانم
فریاد رسیدم ای مسلمانان　　از بہر خدای اگر مسلمانم

ایام جوانی اور زندان کی مصیبتوں کا نقشہ کھینچا ہے:

دریغا جوانی و آن روزگار　　کہ از رنج پیری دل آگہ نبود
نشاط من از عیش کمتر نشد　　امید من از عمر کوتہ نبود
ز سستی مرا آن پدید آمدست　　درین مہ کہ ہرگز در آن مہ نبود
سراب خشک شد چشمہ بخت من　　مگر آب آن چشمہ را رہ نبود
در آن چاہم افگند گردون دون　　کہ از ژرفی آنچاہ را تہ نبود
بسا شب کہ در حبس بر من گذشت　　کہ بینای آن شب جز اکمہ نبود
سیاہی سیاہ و درازی دراز　　کہ آنرا امید سحرگہ نبود
یکی بودم و داند ایزد ہمی!　　کہ بر من موکل کم از دہ نبود
بدم ناامید و زبان مرا　　ہمہ گفتہ جز حسبی اللہ نبود

مسعود کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ان مصیبتوں اور تکلیفوں کے بوجھ کو جو پہاڑ تک کی کمر توڑ دینے کے لئے کافی تھیں، نہایت بردباری اور خودداری کے ساتھ سہا ہے یہ حقیقت اس کے کلام سے ظاہر ہے کہ اس نے قید کے ان دنوں کو بھی غنیمت شمار کیا ہے کہ انھوں نے اس کا تجربہ بڑھایا اور اسے آزمائش میں ڈالا۔ چنانچہ اسی قصیدے میں جس کے چند شعر اوپر پیش کئے گئے ہیں، کہتا ہے:

گرم نعمتی بود کاکنوں نماند　　کنوں دانشی ہست کانگہ نبود

ایک اور قصیدہ میں اپنی گرفتاری پر آہ وزاری کے بعد کہتا ہے:

چہ اناسپاسی کنم زین حصار　　چو در من بیفزود فرہنگ و ہنگ

ہنرہای طبعم پدید ار شد — تنم را ازیں اندہ آذرنگ
ز زخم و تراشیدن آید پدید — بلی گوہر تیغ و نقش و خدنگ

جیسا کہ ہم جانتے ہیں شاعر نے زندان میں ایک اور زندانی سے علم نجوم سیکھا۔ وہ ہمیشہ تحصیل علم میں مصروف رہا اور زندان کے رنج و محن نے اسے کسب فضائل سے باز نہ رکھا علم و دانش کے لئے ایسی تڑپ اور فوجی اور جنگی مہارت کی وجہ سے اس نے ان مصیبتوں کو نہایت مردانگی اور شجاعت کے ساتھ برداشت کیا، کہتا ہے:

از فلک تنگ دل مشو مسعود — گر فراوان ترا بیازارد
بد میندیش و سر چو سرو برآر — گر جہاں بر سرت فرود آرد

اس نے بادشاہوں کی مدح میں جو قصیدے لکھے ہیں وہ کچھ تو اس مصیبت سے خلاصی کے لئے، کچھ اپنے زمانے کی رسم کے مطابق اور کچھ اپنی قدرشناسی کی بنا پر لکھے ہیں۔ لیکن وہ کبھی اپنی حاجتوں کے لئے کسی کا منت پذیر نہیں ہوا۔ اس نے اپنی خودداری کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ حد یہ کہ ایسی حالت میں بھی جب کہ وہ انتہائی مصیبت میں مبتلا تھا، اپنی عزت نفس کو اس طرح پیش کرنے سے نہیں چوکتا:

تخم گشت اے عجب نگر سخنم — کہ پراگندہ بہ زمیں فگنم
او بروید ہمی و شاخ زند — من از و دانہ ہا ہمی بچنم
از فغاں سخن ہمی ترسم — کہ بغایت ہمی رسد سخنم
آفتابست ہمتم گرچند — عرضی گشت ہمچو سایہ تنم
باز گشتہ است پوست بر تن من — چوں تو الم کشید پیرہنم
روزگارم نشاند بر آتش — صبر تا کے کنم نہ برہمنم
ہر زمانی بدست صبر ہمی — گردن آرزو فرو شکنم
ہمہ آتشکدہ شدست دلم — من از آن بیم دم ہمی نزنم

که ز تف دل اژدها کردار | پر ز آتش همی شود دہنم
سر بہ پیش خسان فرو نارم | که من از کبر سرو بر چمنم
منت ہیچ کس نخواہم از آنک | بندۂ کردگار ذو المننم
گر ز خورشید روشنی خواہد | دیدگان را ز بیخ و بن بکنم

خلاصہ یہ کہ مسعود ایران کے قصیدہ گو شاعروں میں صف اول کا شاعر ہے۔ اس کا خاص سبک شکوائی قصیدے، بیان حال اور دردناک اور مصیبتوں سے بھری ہوئی زندگی کی اندوہناک آزمائشوں کی حکایت میں نمایاں ہے۔ استاد کے شعر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے شعر دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں۔ مسعود کے اکثر اشعار سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ مسعود نے بھی اور بہت سے شاعروں کی طرح سلاطین کی عین مدح میں انھیں اخلاق اور زندگی کا سبق دیا ہے اور اسی ضمن میں بعض تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جو تاریخی لحاظ سے فائدہ سے خالی نہیں۔

مسعود شاعر تھا آزاد منش اور بے نیاز۔ اس کی ہمت اور قوت برداشت اس کی جنگی مہارت کا نتیجہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ بزمی بھی تھا اور رزمی بھی۔

مسعود اپنے عالی مقام اور اپنے کلام کے اثر کی وجہ سے دربار کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات رکھتا تھا۔ اس کے ہم عصر بڑے بڑے شاعر اس کا احترام کرتے تھے۔ ان میں حکیم سنائی غزنوی بھی ہیں جنھوں نے خود مسعود کے زمانے میں یا اس کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد اس کے دیوان کو مرتب کیا تھا۔ ایک اور شاعر سید حسن غزنوی بھی ہمارے شاعر کا دوست تھا۔ مسعود اس کے پاس اپنا کلام بھیجتا تھا اور سید حسن اپنا کلام اس کے پاس بھیجتا تھا۔ رشیدی سمرقندی بھی جو ملک شاہ کے دربار کا شاعر تھا، اپنا کلام سمرقند سے مسعود کے پاس ہندستان بھیجتا تھا اور مسعود اس کا جواب دیتا تھا۔ رشیدی سمرقندی ایک جگہ مسعود کو مخاطب کر کے کہتا ہے

رسید شعر تو ای تاج شاعران بر من | چو نو شگفتہ گل اندر بہار گرد چمن

ایا چو اصل بزرگی بزرگ در ہمہ اصل　　ایا چو عقل تمامی تمام در ہر فن! بیت

ابو الفرج رونی بھی مسعود کے ساتھ شاعرانہ تعلقات رکھتا تھا، اس کی دوری کی شکایت کرتے ہوئے کہتا ہے:

بو الفرج خواجۂ آزاد مرد　　ہجر وصال تو مرا خیرہ کرد

سلطان سنجر کے دربار کا ملک الشعرا، معزی ہمارے شاعر کے بارے میں کہتا ہے:

شریف خاطر مسعود سعد سلمان را　　مسخر ست سخن چون پری سلیمان را

حکایت خرد ش روشنی دہد دل را　　روایت سخنش تازگی دہد جان را

خاقانی کے بھی مسعود کے ساتھ تعلقات تھے، چنانچہ اس نے اپنے ایک شعر میں مسعود کی تعریف کی ہے۔

مسعود سعد نے ۵۱۵ھ میں وفات پائی۔ اس وقت اس کی عمر (۷۵) سال کے لگ بھگ تھی۔ یہ بلند پایہ شاعر بڑی دردناک اور پُر ملال زندگی بسر کرنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوا، لیکن اس کا نام زندہ ہے اور اس کا کلام باقی ہے، چنانچہ خود کہتا ہے:

فہرست حال من ہمہ تاریخ و سند بود　　از رنج ماند عبرت واز بند پند ماند

لیکن بشکر گویم کز طبع پاک من　　چندیں ہزار بیت بدیع بلند ماند

عمر خیام ابو الفتح عمر بن ابراہیم جس کا شمار ایران کے بہت بڑے شاعروں اور دانش مندوں میں ہوتا ہے سلجوقی دور میں بمقام نیشاپور پیدا ہوا۔

خیام کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خراسان کے مختلف شہروں جیسے طوس، بلخ، بخارا اور مرو کی سیاحت کی تھی۔ بلکہ وہ بغداد بھی گیا تھا۔ اور ایک روایت کی رو سے اس نے حج بھی کیا تھا۔ خیام اپنے زمانے میں بہت بڑے علماء اور فضلا میں شمار کیا جاتا تھا اور چوٹی کے علماء جیسے غزالی اور سلجوقی سلاطین اور سلجوقی دور کے امراء جیسے ملک شاہ سلجوقی اور خواجہ نظام الملک طوسی سے تعلقات رکھتا تھا۔ سلطانی مجالس اور علمی اور ادبی محافل

میں عزت کے ہاتھوں لیا جاتا اور احترام کے ساتھ صدر میں بٹھایا جاتا تھا۔

ہمارا یہ حکیم شاعر اپنے زمانے کے اکثر علوم اور خاص کر نجوم، ہیئت اور حکمت میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ چنانچہ ملک شاہ نے تقویم کی اصلاح کے لئے جن بڑے بڑے منجموں کو مقرر کیا تھا ان میں سے ایک خیام بھی تھا۔ ملک شاہ کا بیٹا سنجر مرض آبلہ میں مبتلا تھا۔ خیام نے اس کا کامیاب علاج کیا۔ علم حکمت اور دوسرے علوم میں وہ حجۃ الاسلام غزالی جیسے علماؑ سے مباحثے کیا کرتا تھا۔

خیام کی شہرت کی بنیاد بہت بڑی حد تک اس کی رباعیاں ہیں۔ ان رباعیوں کو اس نے حساب، نجوم، طب اور حکمت کے باریک مسائل کی تحقیق سے تھک کر پریشان ہو جانیکے بعد تفریح طبع اور اپنے تاثرات کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے کہا ہے۔ ان رباعیوں میں اس نے نہایت بلند افکار کو نہایت سادہ اور شیریں زبان میں ادا کیا ہے۔ خیام سے پہلے شہید بلخی، ابو شکور بلخی، رودکی اور ابو سعید اور دوسرے رباعی گو شاعروں نے بھی رباعیاں کہی ہیں بلکہ انھوں نے وہ مضامین بھی باندھے ہیں جو خیام کا خاص موضوع ہیں۔ چنانچہ اس رباعی کو شہید بلخی سے منسوب کیا گیا ہے۔

دوشم گذر افتاد بویرانۂ طوس — دیدم جغدی نشستہ برجائی خروس
گفتم چہ خبر داری ازیں ویرانہ — گفتا خبر اینست کہ افسوس افسوس

لیکن خیام کی رباعیوں کا انداز، ان کی لطافت، ان کی تاثیر اور ان کی تازگی کچھ اور ہی ڈھنگ کی ہے۔ اس کی اکثر رباعیاں عبارت کے لحاظ سے مختصر لیکن مطالب و معانی کا سمندر ہیں۔ گویا جب استاد عقل و برہان کے راستے عالم کے مسائل کے حل کرنے سے تھک جاتا ہے تو بے اختیار ہو کر اپنے احساسات کو راہ دینے پر مجبور ہو جاتا اور اپنی حیرت، تاثر، رقت اور اپنے فکری بوجھ کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا اور انھیں زبان شعر عطا کر دیتا ہے وہ بے کران اور بلند ترین فضاؤں میں اڑتا اور عقل و خرد کو شعر اور تخیل

کے پر لگا دیتا ہے۔

خیام کی شاعری اور فلسفہ

خیام کی رباعیاں تعداد کے لحاظ سے کم، عبارت کے لحاظ سے سادہ لیکن معنی کے لحاظ سے بہت بلند پایہ اور قابل توجہ ہیں۔ حق یہ ہے کہ اس نے نہایت لطیف اور حکیمانہ خیالات کو دوبیتی کے سانچے میں ڈھال کر انھیں موثر ترین انداز میں پیش کیا ہے۔

خیام کی رباعیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حکیم شاعر کا دل بعض باتوں سے بہت متاثر تھا، ان باتوں پر اس کا دل جلتا تھا، اور اس نے اپنی عمران ہی لادوا دردوں کے علاج کے پیچھے گذاری ہے۔ لیکن جب اسے اپنے درد کی تسکین کی کوئی دوا دکھائی نہیں دیتی تو وہ ناچار اسی اندرونی دباؤ سے مجبور ہو کر اپنے ضمیر کی تسکین کے لئے شعر کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔

شاعر کا پہلا دلی تاثر تو وہی انسان کی نادانی اور بے خبری ہے۔ آفرینش کا راز اسے معلوم نہیں، دنیا کے معمے اس کے بس کے نہیں۔ کوئی ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ زندگی کی یہ گیرودار کیا ہے اور انسان زندگی کی اس بھول بھلیاں میں ایسا مایوس اور ایسا دل گرفتہ کیوں بھٹکتا پھرتا ہے؟

دوری کہ در و آمدن و رفتن ماست — اورا نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس می نزند دمی درین معنی راست — کیں آمدن از کجا و رفتن بکجاست

ز آوردن من نبود گردون را سود — وز بردن من جاہ و جلالش نفزود
وز ہیچ کسی نیز دو گوشم نشنود — کاوردن و بردن من از بہر چہ بود

شاعر کا دوسرا غم جس کے بوجھ تلے اس کا دل خون ہوا جاتا ہے یہ ہے کہ انسانی

زندگی کا درخت کیوں سرسبز نہیں ہوتا اور خشک ہو کر زمین کے برابر ہو جاتا ہے۔ تندرستی بیماری سے جوانی بڑھاپے سے اور زندگی موت سے بدل جاتی ہے اور دنیا کے بڑے بڑے آدمی تک بھی آخر کار ایک مشت خاک کے سوا اور کچھ نہیں رہتے:

پیش از من و تو لیل و نہاری بودست ‌‌ گردندہ فلک نیز بکاری بودست
زنہار قدم بخاک آہستہ نہی ‌‌ کان مردمک چشم نگاری بودست

ہر سبزہ کہ بر کنار جوئی رستست ‌‌ گوئی ز لب فرشتہ خوئی رستست
پا بر سر سبزہ تا بخواری ننہی ‌‌ کان سبزہ ز خاک ماہروئی رستست

ای چرخ فلک خرابی از کینہ تست ‌‌ بیدادگری پیشۂ دیرینۂ تست
ای خاک اگر سینۂ تو بشگافند ‌‌ بس گوہر قیمتی کہ در سینۂ تست

انسان جو حوادثات کا اسیر ہے، اس کی حیثیت ایک بازیچہ سے بڑھ کر نہیں بازی گر آسمان کچھ دیر نچا کر اسے نیست و نابود کر دیتا ہے اور وہ اپنی تمام آرزوئیں اپنے دل میں لئے زیر خاک چلا جاتا ہے اور کوئی اس کو اس کے جینے مرنے کے معمہ سے واقف نہیں کرتا:

از روی حقیقتی نہ از روی مجاز ‌‌ ما لعبتگانیم و فلک لعبت باز
بازیچہ ہمی کنیم بر نطع وجود ‌‌ رفتیم بصندوق عدم یک یک باز

جامیست کہ چرخ آفریں میزندش ‌‌ صد بوسہ ز مہر بر جبیں می زندش
وین کوزہ گر دہر چنیں جام لطیف ‌‌ می سازد و باز بر زمیں می زندش

ہمارے شاعر اعظم کا تیسرا تاثر وہی شکایت ہے ظاہرداری، فریب کاری، ریا دوروئی اور جھوٹ کی جس سے بعض پیشوایان دین کام لیتے ہیں۔ یہ لوگ ظاہر میں تقوی اور تقدس کا

جال پھیلاتے ہیں اور باطن میں اپنے اغراض کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے پیشوا لوگوں کی رہبری کی بجائے انھیں گمراہ کرتے ہیں۔ اس موضوع پر اس نے کئی پر اثر رباعیاں لکھی ہیں۔

زمانے کی گردش کی شکایت، انسان کی ناکامی اور اس کے غم، اس کی عمر کی بے مقداری اور ناپائداری اور پیران طریقت کی ریا اور سالوس کے ذکر کے بعد وہ ہماری نجات کی تدبیریں بھی سوچتا ہے۔ اور اس تمام رنج و مصیبت کے مقابلہ میں ہمیں جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے یہ ڈھنگ ہے عیش کا، خوشی کا اور ساری دنیا سے بے نیازی کا۔ ہم سب پر زمانہ ستم ڈھاتا ہے اور ہم سب فلک کجرفتار کے کھلونے ہیں۔ گذشتہ اور آئندہ پر ہمارا بس نہیں چلتا، دنیا کو ہم اپنی مرضی کے مطابق ایک نظام کے تحت نہیں لاسکتے، حادثات کو اپنا مطیع اور رام نہیں بنا سکتے۔ اس لئے ہمارے لئے سب سے بہتر یہی ہے کہ گزشتہ کا رنج اور آئندہ کا غم کم سے کم کھائیں دم غنیمت جانیں اور خوش رہیں۔ فرصت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں اور اس مختصر سی زندگی میں جو چند سالوں میں بڑھ کر نہیں اپنی دلی تمناؤں کو پورا کرلیں، اٹھیں اور زندگی کے کاموں پر کمربستہ ہوجائیں، زندگی کے حوادثات کا شکار نہ بنیں۔ ہر دم زندگی کی قدر پہچانیں اور اس کی مصیبتوں کا مقابلہ کریں۔ ذیل میں اسی قسم کے مضامین کی چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں۔

روزی کہ گذشتہ است از و یاد مکن — فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
بر نامدہ و گذشتہ بنیاد مکن — حالی خوش باش و عمر بر باد مکن

در خواب بدم مرا خردمندی گفت — کز خواب کسی را گل شادی نشگفت
کاری چکنی کہ با اجل گردد جفت — برخیز کہ زیر خاک می باید خفت

برخیز و مخور غم جہاں گذران — خوش باش و دمی بشادمانی گذران

درطبع جہاں اگر وفائی بودی   نوبت بتو خود نیامدی از دگران

امروز ترا دسترس فردا نیست   اندیشۂ فردات بجز سودا نیست
ضایع مکن ایں دم ار دلت شیدا نیست   کیں باقی عمر را بہا پیدا نیست

عمر خیام علوم وفنون کا بڑا ماہر تھا، اس نے جبر ومقابلہ اور علم ہندسہ میں رسالۂ جبر ومقابلہ طبیعات اور فلسفہ کون ووجود پر بہت اہم رسالے اور کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں ہندسہ اور جبر ومقابلہ پر جو رسالے لکھے ہیں وہ عربی میں ہیں اور رسالۂ وجود فارسی میں موجود ہے خیام کی رباعیوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ آج کل عام طور پر جتنی رباعیاں اس سے منسوب ہیں ان میں سے بڑا حصہ اور دوسرے مشہور رباعی گو شعراء جیسے ابن سینا، خواجہ عبداللہ انصاری، ابوسعید وغیرہ کی رباعیوں پر مشتمل ہے۔ عمر خیام کی رباعیوں کے مختلف مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں (۷۶) سے لے کر ایک ہزار دوسو تک رباعیاں خیام سے منسوب ملتی ہیں علمارحال کی تحقیق یہ ہے کہ (۷۶) رباعیاں ہی زیادہ قرین صحت ہیں اور خیام کی واقعی رباعیاں کم وبیش اتنی ہی ہیں۔

خیام کی رباعیوں کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام مشہور زبانوں میں ہوچکا ہے اور اس کے نام سے ساری دنیا واقف ہے۔ خیام کے ہم عصر نظامی عروضی سمرقندی کی روایت کے مطابق خیام نے ۵۳۰ھ سے کچھ سال پہلے انتقال کیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کافی لمبی عمر پائی تھی۔

خیام کا مدفن اس کے مولد نیشاپور سے آدھ میل کے فاصلہ پر امام زادہ محروق کے مقبرہ کے صحن میں واقع ہے۔ یہاں ہم خیام کی موت سے متعلق ایک دلچسپ اور پر اثر حکایت نقل کرتے ہیں یہ حکایت ہمارے شاعر کے ایک ہم عصر یعنی عروضی سمرقندی نے بیان کی ہے

"در ۵۰۶ھ ست وخمسائۃ بشہر بلخ در کوی بردہ فروشان در سرای امیر ابوسعد (۱)

(۱) تاریخ ادبیات ایران

حجرہ خواجہ امام عمر خیامی و خواجہ امام مظفر اسفرازی نزول کردہ بودند و من بدان خدمت پیوستہ بودم۔ در میان مجلس عشرت از حجتہ الحق عمر شنیدم کہ او گفت گور من در موضعی باشد کہ ہر بہاری شمال بر من گل افشاں می کند۔ مرا ایں سخن مستحیل نمود و دانستم کہ چنوئی گزاف نگوید۔ چوں در سنہ ثلثین بہ نیشاپور رسیدم چہار (یا چند) سال بود تا آن بزرگ روی در نقاب خاک کشیدہ بود و عالم سفلی از و یتیم ماندہ و او را بر من حق استادی بود۔ آدینہ بزیارت او رفتم و یکی را با خود ببردم کہ خاک او بمن نماید۔ مرا بگورستان حیرہ بیروں آورد۔ و بر دست چپ گشتم۔ در پائیں دیوار باغی خاک او دیدم نہادہ و درختاں امرود و زرد آلو سر از باغ بیروں کردہ و چنداں برگ شگوفہ بر خاک او ریختہ کہ خاک او در زیر گل پنہاں بود مرا یاد آمد آں حکایت کہ بشہر بلخ از و شنیدہ بودم۔ گریہ بر من افتاد کہ در بسیط عالم و اقطار ربع مسکون او را ہیچ جائے نظیری نمی دیدم ایزد تبارک و تعالیٰ جای او در جنان کناد، بمنّہٖ وکرمہٖ۔"

امیر معزی محمد بن عبدالملک متخلص بہ معزی نیشاپور میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ برہانی، الپ ارسلان کے دربار کا شاعر تھا۔ اس نے الپ ارسلان کے بیٹے ملک شاہ کے عہد حکومت کی ابتدا میں بحالت سفر بمقام قزوین انتقال کیا۔ اپنی موت کو نزدیک دیکھ کر برہانی نے اپنے بیٹے محمد کی سفارش میں ایک قطعہ لکھ کر سلطان ملک شاہ کے پاس بھیجا تھا، اس قطعہ میں لکھا تھا:

یک چند باقبال تو اے شاہ جہانگیر	گردستم از چہرۂ ایام ستردم
طغرائے نکوکاری و منشور سعادت	نزد ملک العرش بتوقیع تو بردم
آمد چہل و شش ز قضا مدت عمرم	در خدمت درگاہ تو صد سال شمردم

بگذاشتم این خدمت دیرینہ بفرزند
واندر سفر از علت دہ روزہ بمردم

رفتم من و فرزند من آمد خلف صدق
او را بخدا وند و بشما سپردم!

اگرچہ ملک شاہ کے دربار سے محمد کا تعلق ہوگیا تھا لیکن شاہی تقرب حاصل نہ تھا۔ سلطان کے ایک قرابت مند امیر علی فرامرز نے اسے سلطان کے حضور میں پیش کیا۔ کہتے ہیں کہ ایک روز سلطان رمضان کا چاند دیکھنے کے ارادے سے باہر نکلا اور اس نے دوسروں سے پہلے چاند دیکھ لیا۔ اس موقع پر معزی بھی موجود تھا۔ اس نے فوراً یہ رباعی کہہ کر سلطان کے نذر کی:

ای ماہ چو ابروان یاری گوئی
یا نی چو کمان شہریاری گوئی

نعلی زدہ از زر عیاری گوئی
در گوش سپہر گوشواری گوئی

سلطان کو یہ رباعی پسند آئی اور اس نے شاعر کو انعام میں ایک گھوڑا عطا کیا۔ معزی نے فوراً ایک اور رباعی کہہ کر گذرانی:

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید
از خاک مرا بر زبر ماہ کشید

چوں آب یکی ترانہ از من بشنید
چوں باد یکی مرکب خاصم بخشید

سلطان نے اور انعام دئے اور اس کا مرتبہ بڑھا کر حکم دیا کہ اسے امیر معزی کہا جائے۔ سلطان کا لقب معز الدنیا والدین تھا، اور اس نے معزی کو اپنے نام سے منسوب کیا۔ اس واقعہ کے بعد سے معزی کی شہرت بہت بڑھ گئی۔ وہ سلطان کے مقربوں میں شمار کیا جانے لگا اور اسے بڑی عزت اور بڑی شان و شوکت حاصل ہوئی۔ اس کے بارے میں تذکرہ لباب الالباب میں لکھا ہے:

"سہ کس از شعرا در سہ دولت اقبالہا دیدند و قبولہا یافتند چناں کہ کس را آں مرتبہ میسر نبود۔ یکی رودکی در عہد سامانیاں و عنصری در دولت محمودیاں و معزی در دولت سلطان ملک شاہ"

۴۸۵ھ میں سلطان ملک شاہ نے انتقال کیا۔ اس کے بعد معزی سلطان سنجر کے دربار کا

ملک الشعراء بنا۔ اس کے عہد میں معزی کی شان و شوکت اور عزّ و حشمت بہت بڑھ گئی تھی۔ یہاں تک ایک روایت کی رو سے معزی سلطان سنجر کی طرف سے سفیر بن کر روم بھی گیا۔ معزی کے دیوان میں اٹھارہ ہزار پانچسو شعر پائے جاتے ہیں اور اس کا دیوان قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے۔

معزی کا سبک

معزی کی شاعری کے رنگ اور خراسان کے متقدم شعراء کے رنگ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ معزی نے ان شاعروں کی خوب پیروی کی ہے اور اس کے قصیدے کیا موضوع کے لحاظ سے اور کیا الفاظ کے لحاظ سے عنصری اور فرخی کے قصیدوں سے بہت ملتے جلتے ہیں اور بعض جگہ تو ان کے سبک کی مشابہت بہت ہی نمایاں ہے۔ مثلاً اس کا وہ قصیدہ جو اس نے عمید الدولہ جمشید بن بہمنیار وزیر فارس واصفہان کی مدح میں لکھا ہے فرخی کے اس مشہور قصیدے سے بہت ملتا جلتا ہے جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

برآمد نیلگوں ابری ز روی نیلگوں دریا
چو رای عاشقان گردان چو طبع بیدلان شیدا

اب معزی کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے اور فرخی کے قصیدے سے ان کا مقابلہ کر کے دیکھئے:

برآمد ساج گوں ابری ز روی نیلگوں دریا
بخار مرکز خاکی نقاب قبۂ خضرا

چو پیوند دبهم گوئی که در دشت سیمائی
چو از ہم بگسلد گوئی مگر گشتیست در دریا

گہی چوں خرمن مشکست بر پیروزه گوں مفرش
گہی چوں تودۂ زنگست بر زنگار گوں صحرا

گہی چوں شاخ نیلوفر میاں باغ پر نرگس
گہی چوں تل خاکستر فراز کوه پر مینا

گہی کافور بار آید چہ بر کوه و چہ بر ہامون
گہی لولو فشاں آید چہ بر خارو چہ بر خارا

گہ لولو پراکندن بود چوں عاشقی جابر
گہ کافور پاشیدن بود چوں عاقلی شیدا

از و ہر ساعتی جیحوں شود پر تختۂ نقره
وز و ہر ساعتی دریا شود پر لولو لالا!

چو بگراید سوی بالا بر آرد گوہر از پستی
چو باز آید سوی پستی فشاند گوہر از بالا

گہی با خاک در بیعت گہی با باد در کشتی　　گہی با آب در صحبت گہی با آتش اندر وا
کجا خورشید رخشاں را بپوشد زیر دامن در　　بداں ماند کہ اہرمن ہمی پوشد ید بیضا

اسی طرح ایک اور دلکش قصیدے ہیں جو خواجہ نظام الملک طوسی کے بیٹے فخر الملک کی مدح میں لکھا گیا ہے، ہمارے شاعر نے عنصری کے اس قصیدے کو اپنے پیش نظر رکھا ہے جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

باد نوروزی ہمی در بوستاں بتگر شود　　تا ز صنعش ہر درختی لعبت دیگر شود

معزی کے اس قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

آمد آن فصلی کز و طبع جہاں دیگر شود　　ہر زمیں از صنعت او آسماں پیکر شود
باغ از و مانند صورت خانہ مانی شود　　راغ از و مانند لعبت خانہ آزر شود!
کوہسار از چادر سیماب گوں آید بروں　　چوں عروس باغ در زنگار گوں چادر شود
گاہ پر کوکب شود بی گنبد اخضر درخت　　گاہ بی کوکب چمن چوں گنبد اخضر شود
سرو ہمچوں منبری گردد ز مینا ساختہ　　شاخ گل مانندۂ بے جادہ گوں چنبر شود
گاہ بازی گر شود قمری گہی بلبل خطیب　　آن جہد بیروں ز چنبر وین سوی منبر شود
ابر چوں اندر دہاں لالہ اندازد مسر شک　　لؤلؤ اندر لالہ پنداری ہمی مضمر شود!

اس کے بعد ایک جگہ کہتا ہے:

گفتم ایں مدحت بدانسانی کہ گوید عنصری　　"باد نوروزی ہمی در بوستاں بتگر شود"

ایک اور قصیدہ پر جس کا مطلع ہے:

ایا نوشتہ سفر نامہ ہا بر دل زہزار　　و یا شنیدہ ظفر نامہ ہا بہ دل زنہار

عنصری کے اس قصیدے کا اثر صاف ظاہر ہے جس کا مطلع ہے:

چنیں نماید شمشیر خسرواں آثار

اسی طرح معزی کے کلام میں منوچہری کے کلام کا رنگ اور اس کے مضامین کا پرتو بھی صاف

دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کا وہ قصیدہ ملاحظہ ہو جو ملک شاہ کے عہد کے ایک امیر ابو سعید محمد بن منصور کی مدح میں لکھا گیا ہے اور اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

بفال فرخ و عزم درست ورای صواب سفر گزیدم و کردم سوی رحیل شتاب

اس قصیدے میں اس نے اپنے سفر کے عزم کے اسباب، گھوڑے کا وصف اور ستارو ں کی تعریف جس انداز میں کی ہے وہ منوچہری کی طرز کو پیش نظر کر دیتے ہیں اسی طرح اس کے اول بھی قصیدوں کا یہی رنگ ہے ان میں وہ قصیدہ بھی شامل ہے جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

تا باد خزاں حلہ بروں کرد ز گلزار ابر آمد و بپچید قصب بر سر کہسار

ان شاعروں کے سوا عسجدی کے کلام کا اثر بھی معزی کے کلام پر پڑا ہے۔ اپنے ایک قصیدے کے ضمن میں جو خواجہ نظام الملک طوسی کے بیٹے موید الملک کی مدح میں لکھا گیا ہے۔ اور اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

چو آتش فلکی شد نہفتہ زیر حجاب زدود بست فلک بر رخ زمانہ نقاب

عسجدی کو یاد کر کے اس کے بارے میں کہتا ہے:

بوزن و قافیت آں کہ عسجدی گوید! "غلام وار میان بستہ و گشادہ نقاب

معزی بہت بڑا قصیدہ گو اور مدحیہ قصیدہ کا بڑا زبردست استاد تھا۔ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے اس رنگ کے بڑے بڑے خراسانی شاعروں کی پیروی کی ہے اور حق یہ ہے کہ وہ اس فن میں وہ اس فن کے استادوں کی برابری کرتا ہے۔ اس کے قصیدے عام طور پر مفصل اور محکم ہوتے ہیں اور ان میں تشبیہ، مجاز اور استعارے کی ساری صنعتیں پائی جاتی ہیں۔ معزی نے غزلیں بھی کہی ہیں اور قطعے، مسمط اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔

ممدوح کے اوصاف کی مدح میں معزی حد سے زیادہ مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ جس بادشاہ یا جس امیر کی مدح کرتا ہے سخاوت میں وہ ہزار حاتموں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اولیا کی سی کرامات وہ دکھاتا ہے۔ اہل سخن کا بازار اسی کی مدح سے گرم ہے اور یہاں اسی کی باتیں روا ہیں۔ اس کی

مروت میں ریا کا شائبہ نہیں، وہ ہنرمندی کے میدان کا شہسوار اور اس کے گھوڑے کے سم کی خاک سرمہ اور توتیا ہے۔ وہ صفائے باطن کا ہادی اور شریعت کا رکن ہے اس کے تابناک چہرے پر آفتاب آفریں کہتا ہے۔ ابر اس کے دست کرم کو دیکھ کر بیوزاری کرتا ہے۔ پہاڑ اس کے حکم کو دیکھ کر پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ مملکت کی کشتی کے لئے اس کی رائے بادبان اور اس کا حلم لنگر ہے۔ جس کسی کو اس کی بارگاہ میں باریابی نصیب ہوئی اُس نے جیتے جی اس دنیا میں جنت کی سیر کر لی۔ اس کا حلم اور اس کی طبیعت خاک و باد کی صفت رکھتے ہیں اور اس کی سخاوت اور اس کا غصہ آب و آتش کا حکم رکھتے ہیں۔ دل کے چھپے ہوئے راز بے کہے اس کے آگے روشن ہیں۔۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے معزی کے پاس تشبیہوں، استعاروں اور مجاز کی کمی نہیں مثلاً ایک قصیدہ میں جس کا مطلع ہے :

بفال فرخ و عزم درست و رائی صواب　　　سفر گزیدہ و کردم سوی رحیل شتاب

منوچہری کے رنگ میں لکھا ہے۔ اس قصیدے میں جس قسم کے مضامین باندھے ہیں وہ یہ ہیں: زمین گویا ایک قالین ہے جس پر طرح طرح کے نقش ونگار کاڑھے گئے ہیں، آسمان گویا آئینہ ہے جس پر پارہ پھیلا دیا گیا ہے، یا فولادی سپر ہے بر جیس کے ہاتھ میں۔ تارے چاندی کے دم ہیں یا آسمان ایک دریا ہے اور اس میں مریخ آگ کے ایک شعلہ کی طرح دمک رہا ہے، گویا سبز میدان ہے جس میں زہرہ گیند کی طرح پڑا ہے یا نیل گوں دریا ہے جس میں آفتاب اپنا زرین لنگر ڈالے پڑا ہے۔ یہ گھومنے والا آسمان گویا زمردین رہٹ ہے اور چودھویں کا چاند اس میں چاندی کی چکی ہے۔ فلک کا قبہ مسجد ہے اور چودھویں کا چاند اس میں گویا قندیل، بنات النعش گویا منبر اور کہکشاں گویا محراب ہے۔

معزی کی شاعری کا موضوع تمام تر مدح گوئی ہے تاہم اور دوسرے موضوع اس کے پاس سرے سے ناپید نہیں ہیں۔ مثلاً اپنا مشہور قصیدہ جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے :

شغل دولت بی خطر شد کار ملت با نظر   تا ہمی شد دولت و ملت ز شاہ داد گر

ملک شاہ اور اس کے وزیر خواجہ نظام الملک طوسی کے مرثیہ میں لکھا ہے جو ایک ہی سال میں کچھ دنوں کے فصل سے اس دنیا سے اٹھ گئے تھے۔ ان اشعار کو فارسی کے درجہ اول کے مرثیوں میں شمار کرنا چاہیئے۔ اس کے سوا معزی نے بعض نہایت پر اثر اشعار بھی لکھے ہیں۔ ان میں عرب شاعروں کے مضامین کی پیروی کی گئی ہے اور منوچہری کا سبک اختیار کیا گیا ہے اور اس ویرانی اور اس اندوہ و پریشانی کا نقشہ کھینچا ہے جو اس صدی میں بیرونی حملہ آوروں کی تاخت و تاراج کی وجہ سے ایران میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات سے شاعر کا دل حد درجہ متاثر تھا اور اس نے اپنے اشعار میں اسی کا شکوہ کیا ہے۔ معزی کی وفات کے ستر سال بعد راوندی نے اپنی کتاب راحۃ الصدور میں غز ترکوں کے حملوں کا حال لکھا ہے جو ۵۴۸ھ میں یعنی معزی کی وفات کے بعد شروع ہوئے ہیں۔ ان حملوں کا حال لکھتے ہوئے راوندی نے ایسے اشعار بطور شہادت پیش کئے ہیں۔ اس کی ابتدا میں کہتا ہے:

"و در شہری چوں نیشاپور آنجا کہ مجامع انس و مدارس علم و محافل صدور بود مراعی اغنام و مکامن وحوش و ہوام شد و پنداری امیر معزی ایں حال را مشاہد بود کہ می گوید"

ای ساربان منزل مکن جز در دیار یار من   تا یک زماں زاری کنم بر ربع و اطلال و دمن

ربع از دلم پر خوں کنم خاک دمن گلگوں کنم   اطلال را جیحون کنم از آب چشم خویشتن

از روی یار خرگہی ایوان ہمی بینم تہی   وز قد آں سرو سہی خالی ہمی بینم چمن

بر جای رطل و جام می گوران نہاد ستند پی   بر جای چنگ و نای و نی آواز زاغ ست و زغن

آنجا کہ بود آں دلستان با دوستان در بوستاں   شد گرگ و روبہ را مکان شد کوف و کرگس را وطن

ابر ست بر جای قمر زہر ست بر جای شکر   سنگ ست بر جای گہر خار ست بر جای سمن

آری چو پیش آید قضا مروا شود چوں مرغوا   جای شجر گیرد گیا جای طرب گیرد شجن

کاخی کہ دیدم چوں ارم خرم تر از روی صنم   دیوار او بینم بخم مانند پشت شمن

تمثالهای بلعجب چاک آوریده بی سبب — گوئی دریدند ایعجب بر تن زحسرت پیرہن ہا
زین سان کہ چرخ نیلگون کرد این سراہا را نگون — دیار کی گردد کنون گرد دیار یار من

شعر معزی کی ان خوبیوں کے سوا جن کا ذکر ہو چکا ہے، اس کے قصیدوں میں سلجوقی عہد کے تاریخی واقعات بھی بہت ملتے ہیں۔ یہ واقعات ۶۵ھ یعنی ملک شاہ کے سال جلوس سے لے کر ۵۲۰ھ تک (اور اسی سنہ میں شاعر کا انتقال ہوا ہے) کے دور پر حاوی ہیں۔ ان قصیدوں سے سلطان ملک شاہ اور سلطان سنجر کے اخلاق، عادات، اور ان کی لڑائیوں اور صلح ناموں کا حال، ان کے ندیموں اور خواجہ نظام الملک، اس کے بیٹوں اور دوسرے وزیروں اور دوسرے لوگوں سے متعلق تفصیلات ملتی ہیں۔

شاعر کی زندگی کے آخری دور میں ایک دردناک واقعہ پیش آیا۔ یعنی چھٹی صدی کے پہلے دہے میں ایک روز سنجر تیر اندازی کی مشق کے لئے نکلا۔ بدقسمتی سے اس کا تیر خطا گیا اور معزی کی بدنصیبی سے اس کے جا لگا۔ اس تیر سے معزی بری طرح زخمی ہو گیا۔ اگرچہ وہ اس زخم سے فوراً ہی نہیں مرا لیکن ایک عرصہ تک وہ اس زخم کی مصیبت سہتا رہا اور آخر ۵۲۰ھ میں اس نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

اس زخم سے وہ فوراً نہ مر گیا، اس بارے میں خود کہتا ہے:

منت خدا یرا کہ بہ تیر خدایگان — من بندہ بے گنہ نشدم کشتہ رائگاں
منت خدا یرا کہ بجانم نکرد قصد — تیری کہ شہ بقصد رہا ساخت از کماں

معزی کے مشہور ہم عصر شاعر حکیم سنائی نے اس کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے کہتے ہیں:

تا چند معزا ای معزی کہ خدا بیش — زینجا بفلک برد و قبای ملکی داد
چوں تیر فلک بود قرینش بہ آورد — پیکان ملک برد و بہ تیر فلکی داد

سنائی کے ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے آخر میں سلطان کے تیر کے زخم ہی سے اپنی جان دی تھی۔

فخرالدین گرگانی

فخرالدین اسعد گرگانی پانچویں صدی کا مشہور شاعر تھا۔ یہ سلجوقی سلطان ابو طالب طغرل بک محمد بن میکائیل (۴۳۲ھ - ۴۵۵ھ) کے دربار کا شاعر تھا۔ اپنی مثنوی ویس و رامین میں شاعر نے اس سلطان کی تعریف کی ہے اور کہا ہے :

ابوطالب شہنشاہ معظم | خداوند خداوندان عالم
بہر کس زو رسیدہ عز و نعمت | ملک طغرل بک آں خورشید ہمت

فخرالدین کی شہرت کی بڑی وجہ اس کی مشہور داستان ویس و رامین ہے۔ اس داستان کو اس نے پہلوی زبان سے لے کر نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کام کا شوق اسے ابوالفتح مظفر نیشاپوری نے دلایا تھا جو طغرل کی طرف سے اصفہان کا حاکم تھا۔

نظامی کی خسرو شیریں کی طرح ویس و رامین بھی ایک ایرانی داستان ہے۔ ان داستانوں میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ مگر خسرو شیریں میں عفت، عصمت اور محبت کا جو تصور پیش کیا گیا وہ ویس و رامیں پیش کئے ہوئے تصور سے زیادہ بلند ہے مثنوی ویس و رامیں ۴۴۶ھ یا اس کے کچھ دنوں بعد لکھی گئی ہے۔ مثنوی ویس و رامیں کے سوا فخرالدین گرگانی کے دوسرے اشعار ناپید ہو گئے ہیں۔

فخرالدین کا کلام نہایت سادہ، شیریں اور رواں ہے۔ یہاں اس مثنوی کے کچھ ابتدائی شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ اشعار پروردگار کی حمد میں ہیں اور ان کے پڑھنے سے نظامی کے کلام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے :

سپاس و آفریں آں پادشا را | کہ گیتی را پدید آورد و مارا!
بدو زیبا ست ملک و پادشاہی | کہ ہرگز نایدانہ ملکش جدائی
خدای پاک و بی ہمتا و بی یار! | ہم از اندیشہ دور و ہم ز دیدار
نہ بتواند مرو را چشم دیدن | نہ اندیشہ درو داند رسیدن
نہ نیزاضداد بپذیرد نہ جوہر | نہ زاں گردد مرادو حال دیگر

نشاید وصف او گفتن کہ چون است | کہ از تشبیہ واز وصف او برون است
بوصفش چند گفتن ہم نہ زیبا است | کہ چند یرا مقادیر است و اجزا است
بوصفش ہم نشاید گفت کی بود | کجا ہستیش را مدت نہ پیمود!

اس مقدمہ کو شروع سے آخر تک پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ شاعر دینی علوم اور حکمت سے بھی بے بہرہ نہ تھا۔

ذیل کے اشعار میں اصفہان سے طغرل کی روانگی، ابوالفتح مظفر کے وہاں حاکم مقرر ہوئے خود شاعر کے وہاں ٹھیرائے جانے اور اسی امیر کی تحریک پر ویس و رامین کو نظم کرنے کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

خداوند جہاں سلطان اعظم | برون رفت از صفاہان شاد و خرم
مرا اندر صفاہان بود کاری! | در آں کارم ہمی شد روزگاری
شدم نزی تاج دولت خواجہ بوالفتح | کہ بادش جاوداں در کارہا فتح
پس آنگہ گفت با ما ایں زمستاں | ہمی باش و مکن عزم کہستان
مرا یک روز گفت آں قبلۂ دین | چہ گوئی در حدیث ویس و رامیں
کہ می گویند چیزے سخت نیکوست | دریں کشور ہمہ کس دارد ش دوست
بگفتم کان حدیث سخت زیباست | زگرد آوردہ شش مرد دانا ست
ولیکن پہلوی باشد زبانش | نداند ہر کہ بر خواند بیانش

شاعر نے اس داستان کو استاد فردوسی اور حکیم نظامی کے رنگ میں لکھا ہے۔ کہیں پر مصائب واقعات کا ذکر کہتے ہوئے عبرت آمیز اشعار بھی لکھے ہیں۔ لیکن ویس و رامین میں اس قسم کے اشعار کم ہیں۔ ویس کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

جہاں را رنگ و شکل بیشمار است | خرد را با فرینش کارزار است
زمانہ بند ہا داند نہادن! | کہ نتواند خرد آنرا گشادن

شہرو کے نام موبد کے خط میں کہتا ہے:

اگر ماند ست لختی زندگانی ! گذاریمش بناز و شادمانی

جہاں از دست ما آسودہ باشد زبرخاش ستم پالودہ باشد

چو گیتی را بآسانی تواں خورد چہ باید باہمہ کس دشمنی کرد

ماں کے نام رامین کے خط میں کہتا ہے:

جہاں را کار تا چونین تشگفتست خنک آنکس کزو عبرت گرفتست

نباید چند بازی بلعجب وار پس آنکہ نہ طرب ماند نہ تیمار

مگر تا از بلای او نہ نالی کہ گر نالی ز نالہ بر محالی

مگر تا از ہوای او نہ نازی کہ گر نازی ز نازش بر مجازی

فخرالدین اسعد نے پانچویں صدی کے وسط میں وفات پائی۔

انوری اوحدالدین محمد انوری دشت خاوراں خراسان کے جنوب میں ولایت ابیورد کے قریہ بدنہ میں پیدا ہوا اور اسی مناسبت سے ابتدا میں خاوری اور پھر انوری تخلص اختیار کیا۔ شاید یہ لقب لوگوں نے اسی مناسبت سے اسے عطا کیا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے:

دادند مہتران لقب انوری ولیک چہ خرمی چہ خواند خاقان روزگار

انوری کو سب سے زیادہ عروج سلطان سنجر کے دور حکومت میں حاصل ہوا۔ اسی کے بیان کے مطابق دربار سلطانی میں اس کے تقرب کا سبب اس کا قصیدہ ہوا۔ یہ قصیدہ سلطان سنجر کی مدح میں لکھا گیا ہے اور اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

گر دل و دست بحر و کان باشد دل و دست خدایگاں باشد

۵۴۲ھ میں سلطان سنجر نے خوارزم شاہ کو سزا دینے کے لئے دوسری بار خوارزم پر حملہ کیا اس حملہ میں انوری بھی سلطان کے ہم رکاب تھا۔ سلطان کی فوجوں نے جب قصبۂ ہزار اسب کا محاصرہ کر لیا تو انوری نے سلطان سنجر کو مخاطب کر کے یہ رباعی لکھی۔ اس رباعی کو ایک تیر کے

باندھ کر اتسز کی لشکر گاہ میں پہنچا دیا گیا :

ای شاہ ہمہ ملک زمیں حسب تراست   وز دولت اقبال جہاں کسب تراست

امروز بیک حملہ ہزار اسپ بگیر   فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

۵۴۸ھ میں غز ترکوں نے بغاوت کی اور انھوں نے سلطان سنجر کو مغلوب کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد غزوں نے خراسان کو لوٹنا شروع کر دیا۔ انوری بھی اپنے زمانے کے بہت سے عالموں، ادیبوں اور فاضلوں کی طرح مصیبتوں کا شکار ہوا۔ اس نے ظالم غزوں کے مظالم اور ان کی ستم رانیوں کے نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ اس خونی واقعہ کے بعد انوری کئی سال تک جیتا رہا۔ اس دوران میں اس کا تعلق سلجوقی بادشاہوں اور امرا کے درباروں سے برابر باقی رہا۔ ان میں بلخ کے امرا اور ارسلان کا بیٹا طغرل وغیرہ شامل ہیں۔ اس نے خراسان کے تقریباً تمام بڑے شہروں کا سفر کیا اور عرصہ تک بلخ میں مقیم رہا۔ انوری کے بعض مخالفوں نے بلخ کے لوگوں کے خلاف ایک ہجو کی اور اسے انوری سے منسوب کر دیا۔ اس ہجو سے بلخ کے لوگ انوری سے برہم ہو گئے اور عوام نے اس کی بڑی رسوائی کی اور اسے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ چنانچہ انوری نے ان واقعات کے بارے میں اپنے تاثرات اس قصیدے میں پیش کئے ہیں جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے :

ای مسلمانان فغان از جور چرخ چنبری!   وز نفاق تیر و قصد ماہ و کید مشتری

کہتے ہیں کہ انوری نے نجوم کے لحاظ سے یہ حکم لگایا تھا کہ سیاروں کے اقتران سے (جو ۵۸۲ھ میں پیش آیا) ہوا کے شدید جھکڑ چلیں گے اور ان سے بڑی بڑی عمارتیں زمین کے برابر ہو جائینگی اس خبر سے لوگوں میں بڑا ہراس پھیل گیا اور وہ اپنے مکانات چھوڑ کر دشت ہامون کی طرف نکل گئے۔ لیکن جب وہ مقررہ وقت آیا اور سیاروں کا اقتران ہوا۔ تو ہر طرف اتنا سکون رہا کہ ایک پتہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس سے انوری کی بڑی رسوائی ہوئی۔ لوگوں نے اس کا بڑا مذاق اڑایا اور اسے بہت ذلیل کیا۔ ناچار انوری نے مرو کا رہنا چھوڑا۔ پہلے نیشاپور گیا، پھر بلخ گیا، کہتے

ہیں اس واقعہ کے بعد سے اس نے شاعری کا پیشہ بھی ترک کر دیا، لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑا اور گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گیا۔

انوری کا شاعری اور سبک

اس میں اصلا کوئی شک نہیں کہ انوری ایران کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر ہے۔ اس سے پہلے اس فن کے بڑے بڑے استاد عنصری اور فرخی وغیرہ گذر چکے تھے۔ ان استادوں نے قصیدے کی بنیاد رکھی اور فصاحت کے لحاظ سے اس کو بڑے بلند مرتبہ پر پہنچایا لیکن انوری کے عہد تک فارسی شاعری میں بڑی وسعت اور پختگی پیدا ہو چکی تھی اور وہ وقت آگیا تھا کہ انوری جیسے باکمال شاعر اس سے کام لیں، انوری ان لوگوں میں تھا جو فارسی زبان اور عربی لغت پر پورا پورا عبور رکھتے تھے۔ انوری کی شاعری صرف شاعری نہ تھی بلکہ وہ علومِ حکمت ریاضی اور نجوم میں بھی ماہر تھا، چنانچہ خود کہتا ہے :

راستی گویم نگویم با نصیبی وافرم منطق و موسیقی و حکمت شناسم اندکی
گر تو تصدیقش کنی در شرح بسطش ماہرم وز الہٰی، آنچہ تصدیقش کند عقل صریح
ز رہی باور نداری رنجہ شو من حاضرم نیستم بیگانہ از اعمال و احکامِ نجوم

انوری کا زمانہ آسمانِ ادب کے ستاروں کے یک جا جمع ہونے کا زمانہ تھا۔ نظامی، خاقانی ادیب صابر، ظہیر فاریابی، رشید الدین وطواط، معزی، ابو الفرج رونی، عمعق بخارائی جیسے شاعر اور دوسرے نامی گرامی علما و فضلا اور نثر نویس کم و بیش اس کے ہم عصر تھے اور شاعری کا معیار بہت بلند ہو چکا تھا ظاہر ہے ایسے ہی زمانے میں انوری جیسا اپج رکھنے والا، صاحبِ علم و فضل اور زبان کے باریک نکتوں اور اس کی گہرائیوں پر عبور رکھنے والا ہی قصیدہ کا مکمل ترین نمونہ پیش کر سکتا تھا۔

اس لئے بے شبہ انوری کی شاعری میں قصیدہ کیا الفاظ، عبارت اور ترکیب کی فصاحت کے لحاظ سے اور کیا پختگی اور معنی کی گہرائی کے لحاظ سے اپنے پورے کمال پر پہنچ چکا تھا۔ قصیدہ کی ابتدا میں تشبیب، وصف، اور اظہارِ عشق کا تغزل انوری کی قصیدوں میں بہت کم ملتا ہے

ایسے اشعار اس کے پاس شاذ و نادر ہی ملتے ہیں:

باغ سرمایۂ دگر دارد | کان شد از بسکہ سیم و زر دارد
ہیچ طفلی رسیدہ نیست دراو | کہ نہ پیرایۂ دگر دارد
می نماید کہ از رسیدن عید | چوں دگر مرد مان خبر دارد
طبع بر کارگاہ شاخ نگر | کہ چہ دیبای شوشتر دارد
گل رعنا بیاد نرگس مست | جام زریں بدست بر دارد
گر زبی جادہ تاج دارد گل | زیبدش ملک تاجور دارد

روز عیش و طرب لبستان است | روز بازار و گل وریحانست
تودہ خاک عبیر آمیز است | دامن باد عبیر افشانست
وز ملاقات صبا روی غدیر | راست چوں آژدہ سوہانست
لالہ بر شاخ زمرد بمثل | قدحی از شبہ و مرجانست
تاکشیدست صبا خنجر بید | ہمہ گلزار پر از پیکانست

لیکن انوری کی شاعری میں پچھلے استادوں کے قصیدوں کی باقی تمام فنی خوبیاں کمال درجہ پر موجود ہیں۔ الفاظ کی کثرت، تشبیہ کی لطافت، مضمون کی گہرائی، طرزِ ادا کی دلکشی، تجنیس، ایہام، استعارہ، تمثیل، صنائع اور خاص کر مبالغہ جو مدحیہ قصائد کی جان سمجھا جاتا ہے، غرض یہ سب چیزیں اس کے کلام میں ایک خاص بانکپن کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اس کے بعض مبالغہ آمیز مضامین کو ہم یہاں نثر میں پیش کرتے ہیں:

"بادشاہ کے جاہ و جلال کے مقابلہ میں آسمان کا آفتاب گویا ایک چمگادڑ ہے جو اس کی حفظ و امان میں باہر نکلی ہے۔ اس کا دشمن گویا ریشم کا کیڑا ہے جو اپنی نوک زبان سے اپنا کفن بن رہا ہے۔ اس کے عہد میں بحر و بر معمور اور مامون ہیں اس کے عدل کی وجہ

سے تمام راستے کمیں گاہوں سے خالی ہیں اگر آسمان اس کا نظیر دیکھنا چاہے تو اسی وقت دیکھ سکتا ہے جب اس کی طرف دیکھے۔ اس کے وجود میں عقل مجرد اور روح القدس انسان کی صورت میں آیا ہے۔ اس کے ہاتھ سے چلنے والے تیر معرکہ سوز اور اس کے جسم پر کی زرہ کی آنچ حادثہ بین ہے اس کے دستِ کرم کا ایک نیا قاعدہ اور اس کے قلم کا ایک نیا مرتبہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

انوری کی اس طرز کی وضاحت کے لئے اس کے دو مشہور قصیدوں سے کچھ شعر پیش کئے جاتے ہیں :

باز ایں چہ جوانی و جمالست جہاں را   ویں حال کہ نو گشت زمیں را و زماں را

مقدار شب از روز فزوں بود و بدل گشت   ناقص ہمہ ایں را شد و کامل ہمہ آں را

ہم جمرہ بر آورد فرو بردہ نفس را!   ہم فاختہ بگشاد فرو بستہ زباں را

در باغ چمن ضامن گل گشت ز بلبل   آں روز کہ آوازہ فگندند خزاں را

اکنوں چمن و باغ گرفتار تقاضاست   اری بدل خصم بگیرند ضماں را!

آہو بسر سبزہ مگر نافہ بینداخت   کز خاک چمن آب لشد عنبر و باں را

گر خام نبستہ است صبا رنگ ریاحین   از عکس چرا رنگ دہد آب رواں را

ژالہ سپر برف ببرد از کتف کوہ!   چوں رستم نیساں تجسم آور دکماں را

از غایت تری کہ ہوا راست عجب نیست   گر خاصیت ابر دہد طبع دخاں را

گر نا بژہ ابر نشد پاک بریدہ!   چوں ہیچ عناں باز نہ پیچد سیلان را

ور ابر نہ در دایگی طفل شگوفاست   یاراں سوی او از چہ گشاد است دہاں را

در لالہ نو رستہ نہ افروختہ شمعی است   روشن ز چہ دارد ہمہ اطراف و مکاں را

نی رمح بہاراست کہ در معرکہ کرداست   از خون دل دشمن شہ لعل سناں را

شاہی کہ چو کردند قراں بیلک و دستش   البتہ کماں خم ندہد حکم قراں را

گر ثور چو عقرب نشدی ناقص وبی چشم   بر قبضۂ شمشیر نشاندی دبران را

گر دل و دست بحر و کان باشد — دل و دست خدایگان باشد
شاہ سنجر کہ کمترین خدمش — در جہاں پادشہ نشاں باشد
من نگویم کہ جز خدای کسی — حال گردان و غیب داں باشد
گویم از رای و رایتت شب و روز — در اثر در جہاں عیاں باشد
رایتت رازہا کند پیدا — کہ ز تقدیر در نہاں باشد
رای تو فتنہ ہا کند پیدا — کہ چو اندیشہ بیکراں باشد
در جہانی و از جہاں بیشی — ہمچو معنی کہ در بیاں باشد
روز ہیجا کہ از درخش سناں — گرد را کسوت دخاں باشد
ہم عناں اجل سبک گردد! — ہم رکاب اجل گراں باشد
ہر کمیں کز قضا گشادہ شود — از پس قبضۂ کماں باشد
اشک بر درعہای سیمابی — نسخہ راہ کہکشاں باشد

ان اشعار میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو انوری کی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں الفاظ کا انتخاب بھی خوب ہے اور معنی کی گہرائی بھی موجود ہے۔ سلاست، روانی، پختگی اور قصیدے کے فنی مضامین کے سوا ان اشعار سے شاعر کی عظمت بھی ظاہر ہے۔ اس کے قصیدے مطالعہ میں گہرے غور و فکر کے طالب ہیں۔

دوسری طرف انوری نے اسی گہری علمیت اور دانش کی بنا پر نہایت مشکل اور پیچیدہ قصیدے بھی لکھے ہیں اس کی بہت سی ترکیبیں شرح و بسط کی محتاج ہیں۔ یہ سارا تکلف اس نے مدح گوئی کے لئے اختیار کیا ہے اور اس کا اصلی مقصد سلاطین اور ان کے وزراء اور امراء کی مدح سرائی کرنا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے دیوان میں اس کی مخصوص فصاحت اور متانت کے ساتھ ساتھ رباعیات خیام کے ذوق و مشرب والے اشعار یا خاقانی کے قصیدۂ مدائن کی طرح کے رقت انگیز اور پر اثر اشعار شاذ ہی نظر آتے ہیں۔ اس کے ایسے رواں قصیدوں میں بھی جیسے کہ اوپر نقل

ہوئے ہیں دشوار پسندی اور مضمون آفرینی برابر موجود ہے۔ مثلاً یہ شعر:

گر ثور چو عقرب نشدی ناقص و بی چشم

مشکل بھی ہے اور رقت پیدا کرنے یا متاثر کرنے کی بجائے شعر کے معنی پر غور و فکر کرنے کی طرف مائل کرنے والا ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ شعر میں چند برجوں کے نام لئے ہیں ایک برج ثور ہے، دوسرا برج عقرب ہے۔ برج ثور میں ایک ستارہ ہے دبران۔ اسے شاعر ثور یعنی بیل کی آنکھ بتاتا ہے اور بادشاہ کو اتنا قوی سمجھتا ہے کہ ثور کے اندھے ہو جانے کا خیال نہ ہوتا تو وہ اسے آسمان سے توڑ کر اپنی تلوار کے قبضہ پر لگا لیتا۔ عقرب سے ایہام کا لطف بھی ظاہر ہے۔ یہی حال اس کے دوسرے اشعار کا ہے۔

انوری کی غزل کا رنگ بھی خوب ہے اس نے بڑی اچھی غزلیں کہی ہیں۔ ہجو لکھنے میں بھی وہ ماہر تھا۔ اسی طرح اس کے بعض نہایت لطیف اور سودمند قطعات بھی اس کی یادگار ہیں غزل میں اس کا مرتبہ متقدمین شعرا اور اس دور کے بعد آنیوالے شعراء سے کم نہیں۔ سعدی جیسے غزل گو استادوں کی طرح اس نے بھی نہایت پر اثر غزل کہی ہے۔ انوری کے قطعے بہت مشہور ہیں خاص کر وہ قطعے جن میں اخلاقی مضامین پیش کئے گئے ہیں یہاں ایسے ہی چند قطعے نقل کئے جاتے ہیں:

ہنرمندوں کے آئین کے چار رکن:

چہار چیز شد آئین مردم ہنری — کہ مردم ہنری زین چہار نیست بری

یکی سخاوت طبعی چو دست گاہ بود — بہ بینک نامی آں را بہ بخششی و بخوری

دو دیگر آنکہ دل دوستاں نیازاری — کہ دوست آئینہ باشد چو اندرو نگری

سہ دیگر آنکہ زبان را بگاہ گفتن زشت — نگاہ داری تا وقت عذر غم نخوری

چہارم آنکہ کسی کو بجائی تو بد کرد! — چو عذر خواہد نام گناہ از و نبری

واقعہ یہ ہے کہ اگر انسان کی طبیعت میں سخاوت ہو، ہمیشہ اس کوشش میں رہے کہ دوستوں کا دل نہ دکھے، بری بات منھ سے نہ نکلے، اور خطا کاروں کی خطاؤں سے درگذرے تو یقیناً

اسے زندگی میں بہت بڑا مقام حاصل ہو سکتا ہے۔

انسان کو چاہیئے کہ آزاد رہے اور لوگوں کے احسان نہ اٹھائے :

آلودۂ منتِ کساں کم شو! تا یکشبہ در وثاق تو نانست
ای نفس برستہ قناعت شو! کانجا ہمہ چیز نیک ارزانست
تا بتوانی حذر کن از منت کاین منت خلق کاہشِ جانست
در عالم تن چہ می کنی ہستی چون مرجع تو بعالم جانست
شک نیست کہ ہر کہ چیز کی دارد وانرا بدہد طریق احسانست
لیکن چو کسی بود کہ نستاند احسان آنست و پس نہ آسانست
چندان کہ مروتست در دادن در ناستدن ہزار چندانست

دوسروں سے فائدہ اٹھایا انھیں فائدہ پہنچا :

خواہی کہ ہمین کار جہاں کار تو باشد زین ہر دو یکی کار کن از ہر چہ کنی بس
یا فائدہ دہ آنچہ بدانی دگری را یا فائدہ گیر آنچہ ندانی ز دگر کس

بہادر، سچا، اور کم آزار بن :

عادت کن از جہان سہ خصلت را ای خواجہ وقت مستی و ہشیاری
زیرا کہ رستگار بدان گردی!! امید رستگاری اگر داری
با ہیچ کس نگشت خرد ہمرہ کان ہر سہ را نکرد خریداری
در ہیچ دین و کیش کسی نشنید! ہرگز از این سہ مرتبہ بیزاری
دانی کہ چیست آن بشنو از من رادی و راستی و کم آزاری!!

نیکی کر اور بروں سے نہ ڈر :

من توانم کہ نگویم بد کس در ہمہ عمر نتوانم کہ نگویند مرا بد دگران!
گر جہان جملہ بہ بدگفتن من برخیزند من و این کنج و بعبرت بجہان درنگران

جز تکوئی نکنم با ہمہ گر دست دہد　　کہ بر انگشت بہ پیچید بدم بی خبران
نفس من برتر از آنست کہ مجروح شود　　خاصہ از گپ زدن بیہدہ بی بصران

انوری کی وفات کی تاریخ میں بڑا اختلاف ہے۔ جو کچھ صحت سے قریب معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اس نے ۵۸۷ھ کے قریب وفات پائی۔

ازرقی ابوبکر زین الدین ازرقی ہروی اسی اسماعیل وراق کا بیٹا ہے جس نے فردوسی کو غزنی سے فرار کے موقع پر اپنے پاس پناہ دی تھی اور فردوسی ہرات میں اسی کے گھر میں کچھ دنوں تک روپوش رہا تھا ازرقی خراسان کے حاکم اور اسپ ارسلان کے بیٹے شمس الدولہ طغان شاہ کے دربار سے تعلق رکھتا تھا اور اس نے اپنے قصیدوں میں اس سلجوقی شہزادے کی مدح کی ہے۔ اسی کے دربار میں اسے بڑی ترقی نصیب ہوئی اور اسی کی سرپرستی میں اسے بڑی عزت حاصل ہوئی۔ اس کے اشعار کا دیوان موجود ہے۔ اس نے مشہور حکایت "سندبادنامہ" یا اس کے ایک حصہ کو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ اس کے اشعار میں بڑے اچھے قطعات اور قصیدے ہیں۔ لیکن یہ نامانوس تشبیہوں اور شعری تکلفات سے خالی ہیں ممدوح کی تعریف میں بڑے مبالغہ اور اغراق سے کام لیتا ہے تشبیہات، توصیف اور تعریف میں بڑا ماہر ہے۔ اس کی قادرالکلامی کا ایک نمونہ ذیل کا قصیدہ ہے۔ یہ قصیدہ اس نے طغان شاہ کی بنائی ہوئی عمارت اور باغ کی تعریف میں لکھا ہے اور اس میں وصف کے ہنر کی بڑی داد دی ہے:

بفال ہمایوں و فرخندہ اختر　　بجخت موفق و سعد موقر
بوقتی کہ ہست اندرو فال عربی　　بروزی کہ ہست اندرو سعد اکبر
بنبرم تو اندر سرای نو آمد　　خداوند فرزانہ شاہ مظفر
سخی شمس دولت گزین کہف ملت　　ملک بوالفوارس طغان شاہ صفدر
بباغی چنر امید خسرو کہ ادرا　　بہار و بہشت است مولی و چاکر

چمن ہا او را ز نزہت ریاحین | روشنہا او را ز خوبی صنوبر
بگاہ بہار اندرو روی لالہ | بوقت خزاں اندرو چشم عبہر
درختانش از عود و برگ از زمرد | نباتش ز مینا و خاکش ز عنبر
یکی برکہ ژرف در صحن بستاں | چو جان خردمند و طبع سخنور
نہادش نہ دریا و کوثر و لیکن | بژرفی چو دریا بپاکی چو کوثر
زپاکی چو جان و زخوبی چو دانش | زصفوت ہوا و ز لطافت چو آذر
دوان اندرو ماہی سیم سیما | چو ماہ نو اندر سپہر منور!
بیکسوی ایں باغ خرم سرائی | پر از صفہ و کاخ و ایوان و منظر
نگویم کہ عین بہشت است لیکن | بہشت است اندر سرای مکدر
زبس نغز کاری چو باغ سلیمان | زبس استواری چو سد سکندر
تصاویر او دہشت طبع مانی | تماثیل او حسرت جان آزر
ہمہ سایہ و صورت و شخص ایوان | در آن برکہ لاجوردین مصور
تو گوئی مگر جام کیخسرو ستی! | منقش در و شکل ہر ہفت کشور

چہار مقالہ میں نظامی عروضی کی ایک حکایت کے مطابق ایک دن طغان شاہ نرد کھیل رہا تھا۔ دو چھ ڈالنا چاہتا تھا، دو ایک پڑا۔ اس پر اسے بڑا غصہ آیا۔ اس موقع پر ازرقی نے یہ رباعی کہی:

گر شاہ دو شش خواست دو یک زخم افتاد | تا ظن نبری کہ کعبتیں داد نداد
آن زخم کہ کرد رای شاہنشہ یاد | در حضرت شاہ روی بر خاک نہاد

ازرقی کی تاریخ وفات ٹھیک طور پر معلوم نہیں، بہرحال وہ ۴۶۵ھ سے پہلے انتقال کر چکا تھا۔

ادیب صابر

شہاب الدین ادیب صابر بن اسماعیل کو خراسان کے شمال کے شہر ترمذ کا لکھا ہے۔ اس کے باپ کا نام ادیب اسماعیل تھا۔ کہتے ہیں اتسز خوارزمشاہ سے

سنجر کی لڑائی کے موقع پر اسے سنجر کی طرف سے بڑے ارادوں کے ساتھ اتسز کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس نے بڑے رواں اور بہترین قصیدے لکھے ہیں۔ اس بارے میں خود کہتا ہے:

بشعر روان گفت مدحت توانم　　روانی فزودست شعر روانرا

شعر صابر ز بحر خاطر و طبع　　غصه درّ و رشک مرجانست

بلاغت میں ادیب نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ حد یہ کہ انوری نے اپنے ایک مشہور قصیدے کے ضمن میں ادیب صابر کے مقابلہ میں اپنے آپ کو کمتر بتایا ہے اور کہتا ہے:

چون سنائی ہستم آخر گر نہ ہمچون صابرم

سبک کے لحاظ سے وہ زیادہ تر عنصری اور فرخی کا پیرو ہے اور مسعود سعد اور معزی سے عقیدت رکھتا ہے۔ عربی زبان پر بھی اسے پورا پورا عبور حاصل تھا۔ چنانچہ اس نے عرب شاعروں کا کلام خوب پڑھا تھا وہ اپنے کلام میں ان شاعروں کا نام لیتا ہے اور اپنے بعض فارسی اشعار کے مضمون کو عربی کا جامہ پہنایا ہے۔

صابر نے بڑی شیریں اور دلکش غزلیں بھی لکھی ہیں اور ایسی غزلیں لکھی ہیں جو اسے اپنے ہم عصر شاعروں سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ وہ پر شور عشق کا نغمہ الاپتا ہے اور اس کے اشعار سے ظاہر ہے کہ وہ خود بھی مے گسار اور شب زندہ دار تھا، کبھی تاریک راتوں میں مئے سرخ سے شغل کرتا تھا، عیش و نشاط کا دلدادہ اور دم غنیمت جاننے والا تھا۔ اپنے ہم عصر شعراء میں رشید الدین وطواط، خاقانی، عروضی، سنائی، انوری اور دوسرے شاعروں سے اس کی دوستی تھی اور وہ رشید وغیرہ سے شعر بازی بھی کرتا تھا۔ عاشق پیشہ ہونے کے باوجود وہ آخرت کی فکر سے بے نیاز نہیں۔ اس دنیا کو فانی مانتا ہے، اسے انسان کی بے چارگی اور اس کے عجز کا اعتراف ہے۔ موت کو یاد کرتا ہے جو تمام چیزوں کا فیصلہ کر دینے والی ہے اور کہتا ہے:

جو رازین برکشیده ایوانست　　که در و مشتری و کیوانست

گرچہ گہ سعد و گاہ نحس دہد | ورچہ گہ رزق و گاہ حرمانست
زو چہ نالی کہ چوں تو مجبوراست | زو چہ گریی کہ چوں تو حیرانست
نایب پردہ ہای اسرارست | پردہ راز ہای پنہانست
دور او ہر چہ کرد و ہر چہ کند | کردۂ کردگار یکسانست
جان کہ جان آفریں بما داد است | ملک ما نیست بلکہ مہمانست
نزد برنا و پیر عاریتیست | مرگ در حق ہر دو یکسانست
زندگی راز وال در پیش است | زندۂ بی زوال یزدانست
مرگ چوں موم نرم خواھد کرد | تن ما گر ز سنگ و سندانست
ای نزاخانہ ہای آبادان | خانۂ دینت سخت ویرانست
کار دنیات اگر فراہم شد | کار عقبات بس پریشانست

گویا وہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہوئے اپنے کردار کو نیک بنانے کی آرزو ظاہر کرتا ہے، کہتا ہے:

حق ببیں و بگو بچشم و زبان | تا بصحرای دین رسی ز نہفت
کور نادان کہ حق نخواھد دید | گنگ نادان کہ حق نیارد گفت

نگردان روی خود در فکرت بد | کہ بد کردن نہ کار بخردانست
بدی اندیشہ کردن در حق خلق | بدی کار تو در روی نہانست
کسی کو نیکی اندیشہ بہر کس | بنیکی در جہاں صاحب قرانست
برو نیکی کن و از بد بپرہیز | کہ بد کردن نہ کار زیرکانست
اگر نیکی کنی پنہاں نہ ظاہر | بنزد نیک مردان نیکی آنست

صابر کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جبر کا قائل تھا۔ وہ اپنے آپ کو حوادثات اور

قسمت کے ہاتھوں مجبور اور معذور پاتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں ایسے ہی مضامین کو پیش کیا گیا ہے۔ کہتا ہے:

زروزگار حذر کن زگردگار بترس ‫ ‬ وگرت بر ہمہ آفاق دسترس باشد

چو روزگار بر آشفت وگردگار گرفت ‫ ‬ زوال دولت تو در یکی نفس باشد

نہ کردگار بتدبیر خلق کار کند ‫ ‬ نہ روزگار بفرمان ہیچ کس باشد

عجیب بات ہے کہ شاعر کی موت بھی بدنصیبی، تقدیر کی برگشتی، اور تدبیر کے بے اثر ہونے ہی کو ثابت کرتی ہے۔ کہتے ہیں اتسنر کو صابر کے اصلی مقصد کا پتہ چل گیا۔ کیونکہ مشہور یہ ہے کہ سنجر نے اتسنر کے پاس جاسوسی اور خفیہ خبر رسانی پر مقرر کیا تھا۔ اتسنر کو جیسے ہی اس کا پتہ چلا اس نے صابر کو اس جرم کی پاداش میں دریائے جیحون میں غرق کرا دیا (۵۴۶ھ)

صابر کے دیوان میں قصائد ہیں، غزلیں ہیں، قطعات اور رباعیاں بھی ہیں۔ اس نے زیادہ تر سید مجدالدین ابوالقاسم علی بن جعفر رئیس خراسان اور کبھی کبھار سنجر اور اتسنر کی مدح کی ہے

رشید وطواط رشیدالدین محمد بن عبدالجلیل بلخی ملقب بہ وطواط ۴۸۰ھ کے قریب بلخ میں پیدا ہوا۔ یہ خوارزمشاہیوں کے دربار کا شاعر تھا اور اس خاندان کے بادشاہ اتسنر ارسلان اور تکش کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس نے تکش کے جلوس کے موقع پر ایک رباعی بھی کہی تھی۔ لیکن اسے خوارزم کے بادشاہ اتسنر (۵۲۱ - ۵۵۱) کے عہد میں بڑی شہرت حاصل ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا شمار اس بادشاہ کے دربار کے دبیروں میں ہوتا تھا شاعر عمر بھر اسی بادشاہ سے وابستہ رہا۔ چنانچہ خود کہتا ہے:

سی سال شد کہ بندہ بصف نعال در ‫ ‬ بودست مدح خواں و تو بر تخت مدح خواہ

خدایگانا سی سال مدح خوان توام ‫ ‬ نہ مدحت تو شدم در ہمہ جہان مذکور

سلطان سنجر سے اتسنر کی لڑائی اور ہزار اسپ کے محاصرہ کے وقت رشید نے انوری کی

اس رباعی کا جواب لکھا جو تیر کے ذریعہ لشکرگاہ میں پہنچایا گیا تھا۔ جواب میں کہتا ہے :

گر خصم تو ای شاہ شود رستم گرد — یک خر ز ہزار اسپ نتواند برد !

ہزار اسپ کی فتح اور اتسز کی شکست کے بعد سنجر نے پہلے تو رشید کو سزا دینی چاہی پھر اس پر مہربان ہو گیا اور منتجب الدین کی سفارش پر اسے معاف کر دیا۔

رشید نے کچھ دنوں مدرسہ نظامیہ بلخ میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے استادوں میں ایک امام ابوسعید ہروی بھی تھے۔ رشید نے فارسی، عربی اور انشا میں بڑی عبارت پیدا کی تھی رشید بہت پست قامت اور دبلا پتلا تھا۔ اسی لئے از راہ مذاح اسے وطواط (ابابیل) کہتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی گنجا بھی تھا کہتے ہیں ایک دن سلطان کے حضور میں وطواط ساغر و گل لینے کے لئے اٹھا۔ سلطان نے از راہ مزاح کہا : بیٹھ بھی کہ تو ہمارے لئے ساغر و گل ہے۔ یعنی ان دو لفظوں کو قدرے بگاڑ کر پڑھیے تو شاعر اور گل (گنجا) بن جاتے ہیں۔ خود سلطان نے شاعر کی مدح میں کہا تھا :

از فضل سرت بر آسماں می ساید — زاں بر سر تو موی ہمی بر ناید !!

اسی طرح ایک روز شاہی مجلس میں رشید بعض علماء کے ساتھ بحث کر رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک دوات رکھی تھی۔ خوارزمشاہ نے از راہ مزاح کہا کہ دوات اٹھا لو، معلوم ہو جائیگا کہ دوات کے پیچھے کون ہے، رشید اس کا مطلب سمجھ کر اٹھ کھڑا ہوا، اور برجستہ کہا : المرء باصغریہ قلبہ ولسانہ

معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت خوارزمشاہ نے رشید کو اس کے دشمنوں کے کہنے سننے پر اپنے دربار سے دور کر دیا تھا۔ اس موقع پر شاعر نے اشعار لکھے ہیں اور اس حادثہ کے بارے میں اپنے دلی تاثرات پیش کئے ہیں :

خدایگانا من بندہ را ز قہر عدو — ہمی بسوزد جان و ہمی بکاہد تن
زنا ز دوست ہمی گشتی ملول کنون — چگونہ صبر کنم بر شماتت دشمن

مرا مباد فراموش حق نعمت تو　　　اگر تو راست فراموش حق خدمت من

ایک اور قصیدہ کے دوران میں کہتا ہے:

از نظم من برند بہر خطہ یادگار　　　از نثر من زنند بہر بقعہ داستان

ہم کاتب بلیغم ہم شاعر فصیح　　　ہم صاحب بیانم ہم حاکم بنان

قومی کہ بستہ اند میاں بر خلاف من　　　چو نیند نام خویش ہمی اندر آن میان

رشید کے دیوان میں زیادہ تر قصیدے ہیں اکثر قصیدے اتسز کی لڑائیوں کی تعریف میں ہیں ان میں سنجیدہ اور رواں اشعار زیادہ ہیں، لیکن ان میں ایسے شعر بھی پائے جاتے ہیں جو پر تکلف اور پر تصنع ہیں۔ ان اشعار کے لکھنے کا مقصد غالباً یہ تھا کہ صنائع لفظی کو پیش کیا جائے

صابر کے پر اثر قصیدوں میں ایک قصیدہ وہ ہے جس میں اس نے خوارزم سے سفر، بوڑھی ماں سے ملاقات، واپسی کے وقت اس کی بے تابی اور اس کے حال زار کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے، کہتا ہے:

صدرا بفر تو کہ نہشتم بعمر خود!　　　عرض کریم را بہوی در کف ہوان

زا نہا نیم کہ بر در ہر کس کنم قرار　　　ہمچون سگان ز بہر یکی پارہ استخوان

گر مال نیست ہست مرا فضل بی شمار　　　در سیم نیست ہست مرا علم بیکران

بل فضل بہ مرا کہ بسی در شاہوار　　　بل علم بہ مرا کہ بسی گنج شایگان

خواہم شدن چو تیر از ین جا سوی عراق　　　با قامتی ز بار عطای تو چون کمان

مسکین ضعیفہ والدہ گندہ پیر من　　　بر خود ہمی بپیچد از این غم چو خیزران

دارد سر گران ز دل و خاطری سبک　　　دارد دلی سبک ز غم واندہی گران

جانش رسیدہ در کف تیمار من بلب　　　کارش رسیدہ از غم تیمار من بجان

چون تار ریسمان تن او شد بزار و من　　　بستہ کجا شوم بیکی تار ریسمان

پوشیدہ رفت خواہم از و کز گرستنش　　　بر بندد اشک دیدہ او راہ کاروان

یارب چہ گونہ صبر کند در فراق من! | آں طبع نازکیش وآں شخص ناتواں!
شبہای نیزہ را زبسی گفت خواہد او | یارب تو آں غریب مرا باز من رساں
حالی شگفت دیدہ ام امروز من از و | واللہ کہ نیست ہیچ خلاف اندریں بیاں
شد ناگہاں ز عزم من آگاہ و زجزع | خاشاک شد دو گوہر تابانش ناگہاں
گر حق آں ضعیفہ بیچارہ نیستی!! | در دل مرا کجا بودی یاد خان ومان

ظہیر فاریابی ابوالفضل طاہر بن محمد ظہیر الدین فاریابی بلخ کے قصبہ فاریاب میں پیدا ہوا، جوانی ہی میں شعر و ادب میں کمال پیدا کیا، علوم کی تحصیل کی اور خاص کر عربی زبان، علم حکمت اور نجوم میں بڑی مہارت پیدا کی، خود کہتا ہے:

رکن ہائی سریر دانش من! | ہمچو ارکان عالمست چہار
تازی و پارسی و حکمت شرع | ایں دو اشعار دارم اندو شعار
شعر من نیست زاں بضاعتہا | کہ بیک جایگہ شود پر کار!

کمال دانش من کو ر دیدہ کہ بشنید | بنظم و نثر چہ در پارسی چہ در تازی
برون ز حکمت و انواع آں کہ در ہر باب | مرا رسد کہ کنم با فلک ہم آوازی

ظہیر نے ایران کے مختلف حصوں کا سفر کیا اور نیشاپور، مازندران اور آذربایجان کی سیاحت کی۔ اس نے اپنے زمانے کے بہت سے سلاطین اور امراء کی مدح کی ہے۔ ان میں مازندران کے باوندی خاندان کا بادشاہ حسام الدولہ اردشیر (۶۰۲ - ۵۶۷)، نیشاپور کا حاکم طغان شاہ (۵۶۹ - ۵۸۱) محمد بن ایلدگیز، قزل ارسلان اور آذربایجان کا اتابک نصرۃ الدین ابوبکر شامل ہیں۔

ظہیر فاریابی نے شکوائی قصیدے بھی لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض قصیدے ان مطلعوں سے شروع ہوتے ہیں:

منم امروز و دلی زندہ گیتی بدو نیم | بیم آنست دلم را کہ بجاں باشد بیم

بحکم آں کہ خرابست صاحبا امروز! | زنند باد حوادث وجود را بنیاد!
دور نگر کاندر و چو من کسی از چرخ | در پی ترتیب خورد و خواب نیامد

ان قصیدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہیر نے بڑی تنگ دستی اور افلاس میں زندگی بسر کی اور مسافرت کی تکلیفوں اور غمِ روزگار نے اسے بڑا ستایا ہے۔

ظہیر نے نہایت اچھے قصیدے لکھے ہیں اور سب کے سب مدحیہ ہیں۔ اس نے شاعری میں اپنے ہم عصر شعرا انوری اور خاقانی کی برابری کی کوشش کی ہے اور حق یہ ہے کہ اس نے بعض قصیدے بڑے محکم، بعض قطعے بہت خوب اور غزلیں بڑی شیریں لکھی ہیں اس کے اشعار کا دیوان نہایت بلند پایہ ہے۔ مجد ہمگر کی طرح بعض لوگوں نے اسے انوری کا ہم پایہ مانا ہے۔

آخر عمر میں ظہیر نے مدح گوئی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس نے ۵۹۸ھ میں بمقام تبریز انتقال کیا اور مقبرہ شعرا میں دفن ہوا۔

جمال الدین اصفہانی جمال الدین محمد بن عبدالرزاق اصفہانی، خاقانی اور نظامی کا ہم عصر یعنی چھٹی صدی ہجری کا شاعر ہے۔ یہ اصفہان میں پیدا ہوا اور اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وہیں بسر کیا اس کے بعد اس نے آذربایجان اور شہر گنجہ کا سفر کیا۔ گنجہ میں اس نے نظامی سے ملاقات کی۔ چنانچہ گنجہ کی تعریف میں کہتا ہے:

چو شہر گنجہ اندر کل آفاق | ندیدستم حقیقت در جہاں خاک
کہ رنگ خلد و بوی دمشک دارد | گلابش آب باشد زعفران خاک

معلوم ہوتا ہے اس نے مازندران کا بھی سفر کیا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک واقعہ یہ ہے اس کی آنکھوں میں شدید درد ہو گیا تھا اور اس کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ چنانچہ ایک قطعہ میں کہتا ہے

محروم ماندہ ام ز فوائد بدرد چشم | خود الحریص محروم در حق ماست راست
طفل بصر در آبلہ گشتست شیر خوار | صد بار بیش خورد تو گوئی کہ ناشتاست

در خون من شد آبلہ دمن زابلہی　　بر دیدہ می نشانمش این خود چہ توتیاست

اسی طرح اس کی زبان میں لکنت بھی تھی، چنانچہ ذیل کے اشعار سے یہ بات ظاہر ہے:

گویند کج زبانم کج باشش گو زبان　　چوں ہست در معانی و در نفظ استوا

طرف کلاہ خوباں خود کج نکو تر ست　　ابروی زلف دلبر کج بہتر و دوتا

جمال الدین نے اصفہان کی تعریف بھی کی ہے اور برائی بھی۔ لیکن وہ مجیر الدین وغیرہ جیسے لوگوں سے جنھوں نے اصفہان اور اصفہان کے لوگوں کی برائی کی ہے اور بھی زیادہ زود رنج تھا اور اس نے وہاں کے لوگوں پر سخت حملے کئے ہیں۔ جمال الدین کا شمار عراق کے مشہور قصیدہ گو اور غزل سرا شاعروں میں ہوتا ہے۔ اسے اپنے زمانے میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ اس کا کلام رواں اور تعقید و تکلف سے پاک ہے۔ قصیدے، غزلیں، ترجیع بند اور بہت سے دلکش اشعار اس کی یادگار ہیں۔ اس کے پر اثر قصیدے وہ ہیں جو دنیا کی ناپائداری اور لوگوں کی بے وفائی پر لکھے گئے ہیں۔ جمال کے بیشتر مدحیہ قصیدے عراق کے سلجوقی سلاطین یعنی ارسلان بن طغرل (۵۵۶ - ۵۷۳) اور اس کے بیٹے طغرل (۵۷۳ - ۵۹۰) کی مدح میں ہیں جو اس خاندان کے آٹھویں اور نویں بادشاہ ہیں۔ ان کے سوا اس نے آذربایجان کے دوسرے اتابک جہاں پہلوان محمد بن ایلدگز (۵۶۸ - ۵۸۱) اور بعض باوندی امراء کی بھی مدح کی ہے جو مازندران اور اس کے نواح میں حکومت کرتے تھے۔ اسی طرح اس نے اصفہان کے دو بڑے اور مشہور خاندان یعنی آل خجند اور آل صاعد کی بھی مدح کی ہے۔ آل خجند بزرگان شافعی ہیں اور آل صاعد رؤسائے حنفی میں شمار ہوتے تھے۔ خاقانی، نظامی اور انوری وغیرہ جمال الدین کے ہم عصر شاعر تھے۔ جمال الدین ان کی شاعری سے متاثر ہوا ہے۔ چنانچہ وہ خود بھی حکیم انوری، سید حسن غزنوی اور رشید وطواط کو اپنا پیشوا مانتا ہے، کہتا ہے:

اشرف و وطواط و انوری سہ حکیمند　　کز سخن ہر سہ شد شگفتہ بہارم

واقعہ یہ ہے کہ اس کے اشعار میں اس کے ہم عصر شاعروں کے سبک کی جھلک صاف

دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً انوری کہتا ہے:

خنداباز می کند وہردم دگرگوں زیوری! آسمان برعالمی بندد زمین برکشوری

جمال الدین کہتا ہے:

اینک اینک نوبہار آورد بیروں لشکری ہر یکی چوں نوعروسی در دگرگوں زیوری

اس نے خاقانی کے طرزِ کلام کی پیروی بھی کی ہے۔ ایک جگہ فخریہ کہتا ہے:

ولی بشعر گہ افزوں نیَم ز خاقانی بہ ہیچ حال تو دانی کہ کم نیَم ز مجیر

اسی طرح جمال الدین کی شاعری میں سنائی کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے:

جمال الدین کہتا ہے:

الحذار ای غافلاں زیں وحشت آباد الحذر الفرار ای عاقلاں زیں دیو مردم الفرار

سنائی کہتے ہیں:

ای خداوندان مال الاعتبار الاعتبار ای خداخوانان قال الاعتذار الاعتذار

جیساکہ اوپر بیان ہو چکا ہے ان شاعروں میں بعض شاعر آپس میں پھکڑبازی اور مطائبہ نوازی بھی کیا کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں ان شاعروں نے آپس میں ایک دوسرے کی ہجو اور ہزل میں اشعار بھی لکھے ہیں۔

اوپر بتایا جاچکا ہے کہ جمال الدین عراق کے قصیدہ گو شاعروں کا سرتاج ہے۔ مدح، غزل، تشبیہوں اور مضامین میں اس کا سبک پچھلے استادوں جیسا ہی ہے، لیکن اس کا سبک خراسانی سبک سے اور اس کی زبان اور انداز ہمارے عہد سے قریب تر ہے۔ اس کے سوا اس کا کلام اپنے بعض ہم عصر شعراء جیسے انوری اور خاقانی وغیرہ کے کلام کی بہ نسبت زیادہ سادہ لفظی تعقید اور معنوی پیچیدگی سے زیادہ آزاد ہے۔

جمال الدین کے پاس مبالغہ آمیز مضامین کی کمی نہیں۔ لیکن ان میں لطافت ہے، ادبی دلکشی ہے اور اس نے بڑے دلچسپ اور دلکش نکتے پیش کئے ہیں۔ مثلاً اس عہد کی ایک

بڑی شخصیت خواجہ رکن الدین کی مدح میں اس طرح کے مضامین باندھے ہیں :

"تیرے قلم کی گرد شیں شریعت کے چہرے کے خال ہیں۔ تیرے اخلاق کی بو کو عقل سمجھتی ہے۔ تیری بلند پایہ ہستی کے آگے آسمان لپیٹ ہے۔ تیری انگشت معانی میں علم کا لوہا موم ہے۔ تیرے مرتبے کے آگے آسمان کے نو دائرے بھی ایک نقطۂ موہوم سے بڑھ کر نہیں۔"

خواجہ قوام الدین کے بارے میں کہتا ہے : وہ بحر علوم، کوہ وقار، سپہر مجد، کان سخا، گنج کرم اور معدن حیا ہے۔ اس کا لطف و کرم نسیم سحر اس کا خلق پھولوں پر چلنے والی ہوا، اس کا فرمان پہلوئے قدر اور اس کا حکم زانوئے قضا ہے۔ اس کا غصہ انسان کو دام جہل سے اور اس کی دُربار ہتیلی فقر سے نجات دلا دیتی ہے وہ آسمان کا ہم عنان، قسمت کا ہم رکاب، عقل اس کی ہم نشین اور غیب سے آشنا ...... !

مختصر یہ کہ جمال الدین کے قصیدوں میں (جو سب کے سب بادشاہوں، امیروں، قاضیوں عالموں اور فقیہوں کی مدح میں ہیں) اگرچہ تشبیہ اور مضامین کا انداز قدما جیسا ہی ہے لیکن اس کا کلام ان سے زیادہ سادہ ہے۔ اس کا کلام جو نہایت فصیح ہے۔ پڑھیے تو خاقانی یا انوری کے کلام کی طرح اس پر بڑے غور و فکر کی ضرورت نہیں پڑتی اور معمے حل کرنے نہیں پڑتے۔ عام طور پر وہ اپنے قصیدوں میں تشبیب اور تغزل کے بغیر بے دھڑک اپنے ممدوح کی مدح شروع کر دیتا ہے۔ اس کے پاس مناظر فطرت کی عکاسی بھی بہت کم ملتی ہے یہ چند شعر جو متقدمین کی طرز اور ان کے انداز میں لکھے گئے ہیں شاذ و نادر ہی اس کے کلام میں دکھائی دیتے ہیں :

اینک اینک نوبہار آورد بیروں لشکری	ہر یکی چوں نو عروسی در دگر گوں زیوری
گر تماشا می کنی بر خیز کاندر باغ ہست	باد چوں مشاطہ ای و باغ چوں لعبتگری
از ہر آن جانب کہ روی آری زبس نقش بدیع	جبرئیل آنجا بگسترداست گوئی شہپری
لعبتان باغ پنداری ز فردوس آمدند	ہر یکی در سر کشیدہ از شکوفہ چادری !
آسمان بر فرق نرگس دوخت شش ترکی کلاہ	بوستاں در پای سوسن ریخت ہم سیم و زری

پر طوطی گشت گوئی جامۂ ہر غنچہ — چشم شاہین گشت گوئی دیدۂ ہر عبہری

باد اندر آب می پوشد بہر دم جوشنی! — خاک از آتش نہد بر فرق لالہ مغفری

ہست ہر شاخی بزیبائی کنون چون طوطئی — ہست ہر حوضی بزیبائی کنون چون کوثری

لالہ و نرگس نگر در باغ سرمست آمدہ — بر سر این افسری و بر کف آن ساغری

قصائد ہی کے سلسلہ میں اس نے چند قصیدے بعض امیروں، عالموں اور بزرگوں کے مرثیے میں لکھے ہیں جو بجائے خود نہایت پر اثر، اور دلسوز ہیں۔ ان میں ایک وہ مرثیہ بھی ہے جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

مرا باری دریں حالت زبان نیست — دل اندیشہ و طبع بیان نیست

یہی حال قوام الدین کے مرثیہ کا ہے جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

باز این چہ ظلمتست کہ در مجمعی چنین — کس را شکیب نیست دریغا قوام دین

اس شاعر کے سب سے زیادہ پر اثر اور دل سے نکلے ہوئے اشعار وہ ہیں جو زمانے کی گردش، لوگوں کی بے رخی، اپنی مصیبتوں کی داستان اور دوستوں کے تغافل پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ایسے ہی چند پر اثر قصیدوں کے مطلع یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

دگر بارہ چہ صنعت کرد بابا — سپہر سرکش فرتوت رعنا

دریں متربس زنگار خوردہ دود اندود — مرا بکام بداندیش چند باید بود

بازم ز دور چرخ جگر خون ہمی شود — کارم ز روزگار دگرگون ہمی شود!

یہ آخر کا شعر ایک نہایت ہی پر اثر ترکیب بند کا مطلع ہے۔ یہ ترکیب بند اس نے اپنی مصیبتوں، سوختہ سامانیوں، دل توڑنے والے صدموں، لوگوں کی بے وفائی، حسد اور بدخواہی پر لکھا ہے۔

جمال الدین نے کچھ قصیدے حکمت اور موعظت پر بھی لکھے ہیں، مثلاً اس کا یہ قصیدہ
الرحیل ای خفتگاں کا بینک صدای نفخ صور رخت بر بندید ازین منزلگہ دار الغرور
اسی طرح ذیل کے یہ شعر بھی بڑے عبرت انگیز ہیں اور ہمیں عالی ہمتی، بلند خیالی اور اپنی پست خواہشوں کو مارنے کی دعوت دیتے ہیں:

بذروہ ملکوت ای ازین نشیمن خاک کہ نیست لایق تخت ملوک تخت مغاک
بخاک باز دہ این خاک و سوی علوی گرہ کہ جان پاک سزا نیست جز بعالم پاک
محیط دور فلک چیست جسم سانی دود بسیط روی زمیں چیست کاوباری خاک
بجان بمیر و بدل زندہ گرد دائم کہ جان زندہ دلاں را ز مرگ ناید باک
بمیر و شاد بخسپی زانکہ ہر دو نیست بہم نشاط زندگی با تنگ چشمی اثراک
مال
دریغ نیست کہ ضایع شود ز تو عمری! بجمع کردن مال و عمارت و املاک

اس تمہید کے ساتھ وہ ہمت کو بلند کرنے، ظاہر کی دنیا کو ہیچ جاننے، معنوی دنیا کو حاصل کرنے، فروتنی اختیار کرنے اور دوسروں کی خوبیوں کو پہچاننے کی دعوت دیتا ہے۔

یک نصیحت بشنو از من کاندراں بنوع جن چوں کنی رائی نہی تجربت از پیش کن
طاعت فرمان ایزد شفقت بر خلق او در ہمہ حال این دو معنی را شعار خویش کن
کار تو دایم تواضع بود با خرد و بزرگ منصبت گر بیشتر گشتست اکنون بیش کن
آب در حلق ضعیفاں از کرم چوں نوش ساز موی بر اندام خصم از بیم ہمچوں نیش کن
گر تکبر می کنی با خواجگان سفلہ کن! ور تواضع می کنی با مردم درویش کن
چوں کسی دردی گوید تر از احوال خویش گوش بر درد دل آن عاجز دلریش کن
مصلحت از لفظ دین داراں کامل عقل جوی مشورت بارای نزدیکان دور اندیش کن

شاعر کے بعض قصیدوں سے اس کی طبیعت کے استغنا اور اس کی بڑائی ظاہر ہے۔ وہ اس بات پر بڑا زور دیتا ہے کہ انسان کو سونے چاندی پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ عزت نفس اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اسے اپنے ایمان اور اپنا ضمیر کسی قیمت پر بھی بیچنا نہیں چاہیے:

این ہمہ لاف مزن گرچہ ترا سیم و زر است — کہ زر و سیم بر اہل خرد مختصر است

دل مبند ار خردی بر سیم و زرت — کہ زر و سیم جہاں ہمچو جہاں در گذر است

نرگس ار باز رونق نشدہ باشد گو باش — لاجرم از پی حفظش ہمہ شب در سہر است

تاج زر بر سر شمع است چرا می گرید — خود ہمہ گریش از آنست کہ آں تاج زر است

از ترازو دو کفش تو قیاسی می کن — کانکہ زر دارد زیر آنکہ ندارد زبر است

فاختہ پیرہن کہنہ بپوشیدہ از آن — فارغ از بند و ز دام قفس حیلہ گر است

باز طاؤس گرفتار بدست نا اہل — بہر آنست کہ زر بر زبر بال و پر است

سرو آزاد از آن شد کہ تہی دست آمد — غنچہ دل تنگ بدانست کہ در بند زر است

اس طرح کے اخلاقی اشعار کے مطالعہ کے سلسلہ میں قصیدے کے لطف مضمون، باریکی فکر، اور تشبیہ کے اچھوتے پن کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ فن کے لحاظ سے قصیدے کی ادبی قدر و قیمت میں ان چیزوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔

شاعر کے دیوان کے اشعار میں جو بیشتر مدح میں ہیں، پند آمیز اشعار نایاب نہیں ہیں ان میں ایک وہ نصیحت بھی ہے جو اس نے ماں باپ کی عزت اور ان کے احترام کے موضوع پر نظم کی ہے:

بشنو از من نصیحتی کہ ترا! — کار ہر دو جہان شود بنظام

بد نخواہی کہ باشدت ہرگز — بد مکن خاصہ با اولی الارحام

حق مادر نگاہدار و بترس — ز ایزد ذوالجلال والاکرام

کانکہ با مادر و پدر بد کرد! — بود خسر ہمیشہ دشمن کام

کچھ عجب نہیں شاعر نے جن باتوں کی دوسروں کو نصیحت کی ہے خود بھی ان پر کاربند رہنے کی اس نے کوشش کی ہو اور عالم باعمل رہا ہو۔ اسی کو لیجئے کہ اس کا دیوان مبالغہ آمیز مدحیہ قصیدوں سے بھرا پڑا ہے، پھر بھی کئی جگہ یہ بات نمایاں ہے کہ وہ نہایت مستقل مزاج صاحب نظر اور آزاد منش آدمی تھا۔ اس نے کمینوں کے آگے اپنی گردن جھکانا گوارا نہیں کیا ہے

چنانچہ خود کہتا ہے:

بدان خدای کہ بر خوان پادشاہی او | بہ نیم پشہ رسد کاسۂ سر نمرود!
کہ نزد ہمت من بس تفاوتی نکند | از آنچہ چرخ بمن داد یا ز من بربود
نہ خاک نیستیم ز آتش غرور بکاست | ز آب ہستی در باد نخوتم افزود
مرا تواضع طبعی عزیز آمد لیک | مذلتیست تواضع بنزد سفلہ نمود

اوپر اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ جمال الدین اپنے زمانے کے شعرا سے شعر بازی کیا کرتا تھا ان میں مجیر بیلقانی اور خاقانی وغیرہ شامل ہیں۔ ایسے ہی ایک قصیدہ اس نے خاقانی کو خطاب کر کے لکھا ہے۔ اس کی ابتدا میں اس کی مذمت اور آخر میں مدح کی ہے۔ یہ قصیدہ بہت مشہور ہے اور اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

کیست کہ پیغام من بشہر شروان برد | یک سخن از من بدان مرد سخندان برد

اس قصیدے میں عراق کے شاعروں کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:

ہنوز گویندگان ہستند اندر عراق | کہ قوۂ ناطقہ مدد از یشان برد

اس کے بعد خاقانی کی مدح شروع کرتا ہے اور کہتا ہے:

این ہمہ خود طیبت است باللہ اگر مثل تو | چرخ بصد قرآن گشت بدوران برد
نتایج فکر تو زینت گلشن دہد! | معانی بکر تو زیور بستان برد
فلک ز الفاظ تو زیور عالم دہد! | خرد ز اشعار تو حجت و برہان برد

جمال الدین نے اپنے دیوان اشعار کے سوا ایک فرزند بھی یادگار چھوڑا تھا۔ اس کا نام کمال الدین تھا اور وہ بھی شاعر تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آنے والا ہے۔ جمال الدین نے ۵۸۸ھ میں وفات پائی۔

ابو الفرج رونی ابو الفرج رونی سلجوقی دور کے مشہور شاعروں میں شمار ہوتا ہے یہ غزنوی دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے غزنوی خاندان کے پندرھویں اور سولھویں بادشاہ

ابراہیم بن مسعود (۴۵۱ھ - ۴۹۲ھ) اور اس کے بیٹے مسعود بن ابراہیم (۴۹۲ھ - ۵۰۸ھ) کی مدح کی ہے۔

تذکرہ نویسوں نے اس کی ولادت کا مقام ہندوستان میں لاہور کے قریب رونہ کا گانو لکھا ہے۔ یہ مسعود سعد کا ہم عصر تھا اور اس نے مسعود سعد کے ممدوحوں کی مدح کی ہے۔ طبیعت میں اپج اور لطافت تھی، سخن شناس تھا، بڑا اچھا قصیدہ نگار تھا، اپنے ہم عصر شاعروں سے شاعرانہ تعلقات رکھتا تھا اور انوری اور مسعود سعد جیسے اس عہد کے بڑے شاعروں نے اس کی تعریف کی ہے۔

ایک قصیدہ میں انوری کہتا ہے:

در متانت خیل اقبالت چو شعر ابوالفرج !　　　وز عذوبت مشرب عیشت چو نظم فرخی

مسعود سعد اس کی تعریف اور توصیف میں کہتا ہے:

خاطر خواجہ بوالفرج بدرست　　　گوہر نظم و نثر را کان گشت

ذہن باریک بین و دور اندیش　　　سخن او بدید و حیران گشت

رونی اپنے قصیدوں کو عام روش کے مطابق اکثر تغزل کے ساتھ شروع کرتا ہے۔ اس کا ایسا ہی ایک قصیدہ سیف الدولہ محمود بن ابراہیم غزنوی کی مدح میں ہے۔ یہ اس زمانہ میں اپنے باپ کی طرف سے ہندستان میں حکومت کرتا تھا اور یہ وہی سیف الدولہ ہے جس کی مسعود سعد نے بھی مدح کی ہے:

نوروز جوان کرد بدل پیر و جوان را　　　ایام جوانی است زمین را و زمان را

ہر سال درین فصل برارد فلک از خاک　　　چون طبع جوانان جہاندوست جہان را

گر شاخ نوان بود زبی برگی دی برگ　　　از برگ نوا داد قضا شاخ نوان را

بگرفت شکوفہ بچمن برگذر باغ !　　　چونان کہ ستارہ گذرد کاہکشان را

آن غنچہ گل بین کہ ہمی نازد و بر باد　　　از خندۂ دزدیدہ فروبستہ دہان را

ذیل کے اشعار منصور (منصور شاہ ابن بہرام شاہ غزنوی) کے ایک مدحیہ قصیدہ کے ابتدائی اشعار ہیں۔ ان میں مناظر قدرت کی لطافت اوران کی پاکیزگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

جشن فرخندہ فرور دین است　　روز بازار گل و نسرین است

آب چون آتش عود افروز است　　باد چون خاک عبیر آگین است

باغ پیراستہ گلزار بہشت　　گلبن آراستہ حور العین است

برج نور است مگر شاخ سمن　　کہ گلشن را شبہ پروین است

در گلستان ز فروغ لالہ　　گوئی آتش کدہ بر زمین است

آب چین یافتہ در حوض از باد　　ہمچو بر کار حریر چین است

رونی کے قصیدوں میں تاریخی اشارے بھی موجود ہیں۔ ان میں وہ غزنویوں کی لڑائیوں کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً اس کا یہ قصیدہ:

سپہر دولت و دین آفتاب ہفت اقلیم　　ابو المظفر شاہ مظفر ابراہیم

سلطان بن ابراہیم بن مسعود کی مدح میں ہے اسی طرح یہ قصیدہ بھی تاریخی اشارات کا حامل ہے:

شاد باش ای مطلع فتنہ نشان　　ای زامن تو خفتہ فتنہ شبان

یہ شاعر بھی دوسرے ہوشمندوں کی طرح اس آفت خیز جہاں اور اس غم انگیز دنیا میں آزردہ خاطر ہی رہا، چنانچہ کہتا ہے:

گردون ز برای ہر خردمند　　صد شربت جان گزا در آمیخت

گیتی ز برای ہر جوان مرد　　ہر زہر کہ داشت در قدح ریخت

از بہر ہنر در این زمانہ!　　ہر فتنہ کہ صعب تر برانگیخت

جز آب دو دیدہ می نشوید!　　خالی کہ زمانہ بر رخم ریخت

بر اہل ہنر جفا کند چرخ　　نتوان ز جفای چرخ بگریخت

رونی کا دیوان چھپ چکا ہے۔ اس میں چار ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ وہ اپنے

زمانے کے شاعروں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھتا تھا۔ اس کی مسعود سعد کے ساتھ بڑی دوستی تھی۔ دونوں شاعروں نے ایک دوسرے کے بارے میں اشعار لکھے ہیں۔ اسی میں رونی کا ایک قطعہ بھی ہے جو اس نے مسعود کے نئے مکان کے بارے میں لکھا ہے۔ اس قطعہ کے ابتدائی اشعار یہ ہیں :

بوالفرج را دریں بنا کہ در آن — اختلاف سخن فراوان گشت
سخن چند معجب است کہ عقل — باو توفش رسید و حیران گشت

مسعود نے اس کے جواب میں قطعہ لکھ بھیجا، اس کا مطلع ہے :

خاطر خواجہ بوالفرج بدرست — گوہر نظم و نثر را کان گشت

مسعود سعد نے خود استاد ہونے کے باوجود رونی کے بارے میں یہ اشعار لکھے ہیں:

ای خواجہ بوالفرج نکنی یاد من — ناشاد گردد ایں دل ناشاد من!
دانی کہ ہست بندۂ آزاد تو — ہر کس کہ ہست بندہ آزاد من!
نازم بدانکہ ہستم شاگرد تو ! — شادم بدین کہ ہستی استاد من
مانا نہ آگہی تو کہ باران اشک — از بن ہمی بشوید بنیاد من !

رونی نے چھٹی صدی کے آخر میں یا ساتویں صدی کی ابتدا میں وفات پائی۔

سید حسن غزنوی | سید حسن بن ناصر علوی ملقب بہ اشرف اپنے زمانے کے مشہور واعظوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی وعظ کی محفلوں میں ہزاروں آدمی حاضر رہتے تھے اس کے ساتھ ساتھ وہ بلند طبع بھی تھے انھوں نے زیادہ تر انیسویں غزنوی بادشاہ بہرام شاہ بن مسعود (۵۱۲-۵۴۷ھ) کی مدح کی ہے اور اس کی فتوحات کی تعریف کی ہے۔ اپنے وعظوں کی وجہ سے انھیں جو شہرت اور جو اثر حاصل ہو گیا تھا اس کی وجہ سے سلطان کو ان سے بغض و حسد پیدا ہو گیا۔ مجبوراً سفر کا ارادہ کیا اور پہلے حج کیا۔ حج سے واپسی میں بغداد میں عراق کے سلجوقیوں کے چوتھے بادشاہ غیاث الدین مسعود بن محمد (۵۲۹

۷۴۵ھ) نے ان کی بڑی عزت افزائی کی۔

صاحب مجمع الافصحا کے قول کے مطابق سید حسن کے دیوان اشعار میں پانچ ہزار اشعار تھے۔ ان کا سنہ وفات ۵۰۶ لکھا ہے اور دولت شاہ کے قول کے مطابق ان کا محل وفات ولایت جوین کا قریہ آزادوار ہے۔ ان کا بھائی جمال الدین محمد بن ناصر بھی مشہور شاعروں میں شمار ہوتا تھا اور بہرام شاہ کے دربار سے تعلق رکھتا تھا اس کے مدحیہ قصائد میں سے ایک قصیدہ وہ ہے جس کا ایک شعر راحۃ الصدور میں نقل ہوا ہے:

ای خوردہ آسمان بیسارت بسی یمین　　　وی بردہ آرزو زہمیت بسی یسار

اسی قصیدے کا مطلع ہے:

اکنونکہ تروتازہ بخندید نوبہار　　　ماوسماع و بادہ رنگین وزلف یار

ایک اور مدحیہ قصیدہ سنجر کی مدح میں ہے۔ ذیل کے اشعار اسی قصیدے سے لئے گئے ہیں

جہان را شاہ فرخ پی چنین باید چنین باید　　　کہ خلق عالمی در سایۂ عدلش بیاساید

خجستہ رای او از ملک راہ فتنہ بربندد　　　مبارک روی او از خلق کار بستہ بگشاید

چو دریا طبع او رادی کند اما غنی ماند　　　چو گردون کار را وگردشش بود اما نفرساید

گہی بر صفحۂ اقبال نقش خویشش بنگارد　　　گہی زآئینۂ انصاف زنگ ظلم بزداید

ولی را گر عطا باید عدو را گر خطا افتد　　　خداوخلق داند کاین ببخشد وآن ببخشاید

بہرام شاہ کے مدحیہ قصیدہ میں یہ تغزل ملاحظہ ہو:

ہفتہ دیگر ببینی ابر مروارید بار　　　آور دشاخ شگوفہ عقد مروارید بار

گاہ باد از عارض گلبن برانگیزد نسیم　　　گاہ ابر از طرۂ شمشاد بنشاند غبار

باد می سوزد بخور وابر می ریزد گلاب　　　چرخ می گوید نوید و باغ می بارد نثار

گلبنان ہر صبحدم چون بلبلان خندند خوش　　　بلبلان ہر نیم شب چون بیدلان گریند زار

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے مسعود سعد کی سید حسن سے دلی دوستی تھی۔ یہ دونوں ایک

دوسرے کے بڑے ہمدرد اور غمگسار تھے جب سید حسن نے ۵۰۶ھ کے قریب وفات پائی تو مسعود سعد کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ وفات کے وقت سید حسن کی عمر تیس سال سے بھی کم تھی

سوزنی سمرقندی

محمد بن علی سوزنی جو خود اپنے دعوے کے مطابق حضرت سلمان فارسی کی اولاد میں تھا شہر نسف میں پیدا ہوا اور بخارا میں علوم کی تحصیل کی۔ سوزنی کا شمار چھٹی صدی کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے ماوراءالنہر اور خراسان کے دوسرے شعراء رشیدی سمرقندی، مختار غزنوی، رضی الدین نیشاپوری، عمعق بخارائی اور شمس طبسی کی طرح وہ ملوک خانیہ یا ملوک افراسیابیہ کا مداح تھا اس نے یہاں کے بزرگوں اور وزیروں اور ایک بڑے خاندان آل برہان کی بھی مدح کی ہے۔

سوزنی کے اشعار کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہایت سادہ اور رواں ہوتے ہیں۔
سوزنی نے ہزل بھی لکھی ہے یہ ہزل اس طرح لکھی گئی ہے کہ اس نے جوانی میں ناشایستہ زندگی سے پرہیز نہیں کیا اور شاعری میں بھی شرم و حیا کی حدود سے اپنے پیر بہت آگے پھیلائے ہیں لیکن فن کے لحاظ سے اس نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ایسے اشعار:

دراین جہاں کہ سرای غمست و نالہ و تاب   چو کاسہ بر سر آبیم و تیرہ دل چو سراب

گواہی دیتے ہیں کہ اسے اس دنیا کا عیش و نوش کچھ راس نہ آیا اور صفحہ دل سے غم کا غبار دور نہ ہو سکا۔

اپنے اشعار میں وہ ہمیں کبھی کسب ہنر کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے:

اندر جہاں چو بی ہنری عیب و عار نیست   با فخر و با ہنر زی و بی عیب و عار باش

فخر از ہنر نمای و با اہل ہنر گرای   وز عیب و عار بی ہنری بر کنار باش

سوزنی نے ۵۶۹ھ میں وفات پائی۔

عبدالواسع جبلی

عبدالواسع جبلی غرجستان کا رہنے والا تھا، اسی لئے اسے جبلی کہا گیا ہے۔ اس نے

قصیدے اور غزلیں لکھی ہیں اور ان میں لفظی صنائع و بدائع سے زیادہ کام لیا ہے وہ ذو بلاغتین تھا اور اشعار ملمع بھی خوب لکھتا تھا۔

طغرل تکین جس نے ۵۹۰ھ میں سلطان سنجر سلجوقی اور بہرام شاہ غزنوی کے ساتھ مل کر خوارزم پر حملہ کیا تھا اس کی عبدالواسع جبلی نے مدح کی ہے۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ عبدالواسع نے ۵۵۵ھ میں وفات پائی اس کے قصیدوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۵۴۵ھ تک بہر حال زندہ تھا۔

عبدالواسع بھی اپنے ہم کاروں اور ہم شعاروں کی طرح دقیق نظر، اور رقیق قلب لے کر آیا تھا۔ وہ انسان کی ستم گاری اور اس کی کوتہ نظری سے سخت نالاں ہے۔ وہ ابنای زمان کی خیانت اور دانش مندوں کی خواری پر اس طرح نالہ کناں ہے:

منسوخ شد مروت و معدوم شد وفا ۔۔۔ وز ہر دو نام ماند چو سیمرغ و کیمیا
شد راستی خیانت و شد زیرکی سفہ ۔۔۔ شد دوستی عداوت و شد مردمی جفا
گشتہ است باژگونہ ہمہ رسمہای خلق ۔۔۔ زین عالم نبہرہ و گردون بی وفا
ہر عاقلی بزاویۂ ماندہ ممتحن ۔۔۔ ہر فاضلی بداہیۂ گشتہ مبتلا!
با یک دیگر کنند ہمی کبر ہر گروہ! ۔۔۔ آگاہ نہ کز ان نتواں یافت کبریا
ہرگز بسوی کبر نتابد ہمی عنان ۔۔۔ ہر ک آیت تخشت نخواند زہل اتی
با این ہمہ کہ کبر نکوہیدہ عادتیست ۔۔۔ آزادہ را ہمی ز تواضع رسد بلا
آمد نصیب من ز ہمہ مردمان دو چیز ۔۔۔ از دشمناں خصومت و از دوستاں ریا

مختاری غزنوی

سراج الدین عثمان بن محمد مختاری غزنوی بھی چھٹی صدی کے قصیدہ گو شاعروں میں شمار ہوتا ہے یہ ارسلان بن کرمان شاہ (۴۹۴ھ۔ ۵۳۶ھ) حاکم کرمان، سلطان ابراہیم بن مسعود (۴۵۱ھ۔ ۴۸۱ھ) مسعود بن ابراہیم (۴۹۲ھ۔ ۵۰۸ھ) اور دوسرے غزنوی سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتا تھا اور ان کی اس نے مدح کی ہے

اس نے قصیدے کے سوا دوسری صنفوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے یہ ترجیع بند خوب لکھتا تھا ایک داستانی مثنوی شہر یار نامہ بھی اس سے منسوب ہے اس مثنوی میں اس نے استاد فردوسی کی پیروی کی ہے۔ اس مثنوی کے لکھنے میں اس نے پانچ سال صرف کئے اسے مسعود بن ابراہیم کے نام معنون کیا ہے، کہتا ہے:

سال اندریں رنج بر داشتم! سخن انچہ بد ہیچ نگذاشتم
گل باغ و بستان محمود شاہ جہاں جوئی بخشیدہ مسعود شاہ

مختاری نے بمقام غزنہ ۵۵۴ھ میں وفات پائی۔

مختاری کے قصائد عام طور پر نہایت متین، عمدہ، موزوں اور متناسب ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بڑی گہری نظر اور بڑی مہارت سے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کرتا ہے۔ اس کا وہ قصیدہ جو مسعود سعد کی مدح میں ہے اس کے اشعار اس دعوے کے شاہد ہیں:

بر اہل سخن تنگ گشت میداں وز جای بشد طبع ہر سخنداں
ہر طبع کہ بر سحر بود قادر! از عجز چو مسعود گشت حیراں
خاطر بزدپی ہمی بہ معنی فکرت بکشد سر ہمی ز فرمان
چوں جغد و بکل باز شد معانی زی خاطر مسعود سعد سلمان
مخدوم سخن پروران مجلس! سر دفتر خوان گستران میدان
آن چرخ کہ ہر صبح دم بر آرد خورشید کمال از رہ گریبان
تیر از قلم تیر قامت او در خنجر سر افراز تر زکیوان
ابر ہنرش نا پدید گوشہ!! بحر سخنش نا پدید پایاں!
در باغ بہار ثنای خسرو شعرش گل و طبعش ہزار دستان

جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے مختاری کی شاعری میں اور اس عہد کے دوسرے

قصیدہ گو شاعروں کی شاعری میں کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا تاہم بعض مضامین جیسے شاعر کی تشبیہ آسمان سے اور اس کی شاعری کو آفتاب سے تشبیہ وغیرہ، اس کا لحن اور آہنگ اس کے کلام میں ایک نئی تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔

بخاری نے قدرتی مناظر کی عکاسی بھی کی ہے اور دلکش استعارے بڑی ہنرمندی کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ اس کے ایک قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

شاخ مرصع شد از جواہر الوان ‏ ‏ شخ تل یاقوت شد ز لالہ نعمان

ابر گہرہائے گل بسفت ہمانا ‏ ‏ خوردۂ الماس گشت قطرۂ باران

حوض ز نیلوفر چمن ز گل سرخ ‏ ‏ کوہ نیشاپور گشت وکان بدخشان

بود گل ناشگفتہ بر صفت دل ‏ ‏ بازہ چو بشگفت گشت بر صفت جان

آہو از بسکہ بر ریاحین غلطید ‏ ‏ سبزہ و سنبل چو دھم از کتف وران

باغ چو میدان آبگینہ شد از خوید ‏ ‏ برگ شکوفہ ز باد تخت سلیمان

انجیل آغاز کرد بلبل بر گل ‏ ‏ چون ز بنفشہ بدید حالت برہان

شب ہمہ شب کبک ز عفران چرد از کوہ ‏ ‏ روز ہمہ روز زاں بگردد خندان

چون شبہی داشت مرغزار بدر بار ‏ ‏ لالہ بر اطراف او برست چو مرجان

گوئی در پیش آفتاب بہادند ‏ ‏ آینہ سایہای برگ درختان

اس طرح کی شاعری میں شاعر نے جیسی تشبیہیں استعمال کی ہیں اور خاص کر آخری شعر میں جو تشبیہ دی ہے وہ بڑی اچھوتی تشبیہیں ہیں اور شاعر کی اپج اور جدت پر دلالت کرتی ہیں۔

عمعق بخارائی

شہاب الدین عمعق بخارائی پانچویں صدی کے وسط میں پیدا ہوا اور ماوراء النہر میں شہرت پائی۔ اس نے ملوک افراسیابیہ یا ایلک خانیوں کے ایک بادشاہ ابو الحسن شمس الملک نصر (۴۶۰ھ - ۴۷۲ھ) کی مدح میں قصیدے لکھے ہیں اور خاص کر اس سلسلہ کے ایک بادشاہ خضر خاں کے دربار میں تقرب حاصل کیا اور امیر الشعرائی کا لقب پایا۔ اس نے

بڑی لمبی عمر پائی تھی۔ ۵۲۴ھ میں بہت بوڑھا اور ضعیف ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس سال جب سلطان کی بیٹی کا انتقال ہو گیا اور اس نے سوگواری میں مرثیہ لکھنے کے لئے اسے طلب کیا تو وہ ضعف پیری کی وجہ سے نہ جا سکا۔

ذیل کے اشعار میں اس نے اپنے ضعف کا حال صنعت اغراق و تشبیہ کے ساتھ جس حسن خیال کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی نظیر دوسرے شاعروں کے پاس کم ہی ملے گی:۔

اگر موری سخن گوید وگر موئی روان دارد   من آن مورم سخن گویم من آن مویم که جان دارد

اگر مر آب و آتش را امکان ممکن بود موئی   من آن مویم که هم طوفان و دوزخ در میان دارد

اگر با مور و با موئی شب و روزی شوم همبر   نه مور از من خبر یابد نه موی از من نشان دارد

بچشم مور در گنجم ز بس زاری و بس سستی   اگر خواهد مرا موری بموا اندر نهان دارد

عمق بخارائی کے بہترین اشعار میں اس کا ایک قصیدہ ابوالحسن شمس الملک نصر کی مدح میں ہے۔ ذیل کے اشعار اسی قصیدے سے لئے گئے ہیں:

خیز ای بت بهشتی آن جام بیار   کاردی بهشت کرد جهان را بهشت وار

نقش خورنق است همه باغ و بوستان   فرش ستبرق است همه دشت و کوهسار

وین چون بهار خانهٔ چین پر ز نقش چین   وان چون نگار خانهٔ مانی پر از نگار

آن افسر مرصع شاخ سمن نگر!   وین برده موشح گلهای کامگار

این چون عذار حور پر از گوهری سرشک   وآن چون بساط خلد پر از عنبرین نثار

گلبن عروس وار بیاراست خویشتن   وابرش مشاطه وار همی شوید از غبار

آن لاله بین نهفته در او آب چشم ابر   گوئی که جامهای عقیق است پر عقار

گم نام لعبتان بهشتی شدند باز   آراسته بدر و گهر گوش و گوشوار

جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔ شاعر قدرتی مناظر کے بیان، عمدہ الفاظ اور لطیف تشبیہوں کو اس عہد کے فن قصیدہ گوئی کے لحاظ سے اپنے قصیدوں میں خوب کھپاتا ہے۔ اس

شاعر نے بحیثیت مجموعی نہایت شیریں رواں اور کبھی درد انگیز اشعار لکھے ہیں۔ اس نے پر اثر قطعات بھی لکھے ہیں۔ اس کے ہم عصر شاعروں میں انوری نے اسے استاد سخن مانا ہے اور رشید وطواط نے اس کے اقوال سے استشہاد کیا ہے۔ یہ بات خاص طور پہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مرثیہ اور ماتمی شاعری میں عمق کا مرتبہ بہت بلند اور استادانہ تھا عمق نے اس طرز میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ذیل میں نمونے کے طور پہ دو شعر پیش کئے جاتے ہیں جو سلطان سنجر کی بیٹی کی موت پہ لکھے گئے ہیں:

هنگام آن که گل دمد از صحن بوستان — رفت آن گل شگفته و در خاک شد نهان

هنگام آن که شاخ شجر نم کشد ز ابر — بی آب ماند نرگس آن تازه ارغوان

عمق نے ۵۴۳ھ میں وفات پائی۔

آذربایجان کے شاعر

آج کل جو علاقہ آذربایجان کہلاتا ہے قدیم زمانہ میں اس کا علاقہ بہت زیادہ تھا۔ آج سے تین ہزار سال پہلے پہلی زبردست ایرانی سلطنت یعنی مادیوں کی سلطنت اسی علاقہ میں قائم ہوئی۔ مادی زبان ایک ایرانی زبان تھی اور مادی خود ایرانی تھے۔ آذربایجان ایرانی مذہب کے رسوم و رواج کے مراکز میں گنا جاتا ہے۔ ایرانی اور اسلامی تاریخوں سے ان شہادتوں کو امریکی مستشرق جیکسن نے جمع کر کے ایک کتاب لکھی ہے۔ ایران قدیم کے پیغمبر زردشت بھی آذربایجان ہی میں پیدا ہوئے۔ آذربایجان کا علاقہ ہمیشہ سے ایران کا پاسبان اور نگہبان رہا ہے۔ یونان، روم، عرب، مغل، ترک اور حالیہ حملوں میں ملک کی حفاظت کے لئے وہ ہمیشہ سینہ سپر رہا ہے۔ سکندر کے حملہ یعنی چوتھی صدی قبل مسیح میں آذربایجان کا شہربان (اس زمانے کی فارسی کے تلفظ میں "خشترپاون" اور یونانیوں کے تلفظ میں ساترابا) آتروپاتی یا موجودہ تلفظ کے لحاظ سے آذربد نامی ایک شخص تھا۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے آذربد یا آگ کا

نگہبان اور سرپرست حقیقت میں زرتشتی مذہب کا ایک مذہبی عہدہ اور ایک ایرانی نام ہے سکندر نے اس شخص کی لیاقت دیکھ کر اس کی حکومت بخش دی واقعہ یہ ہے کہ آذربائیجان نے دوسروں کے مقابلہ میں اپنی آزادی برقرار رکھی۔ اسی زمانے سے یہ ملک آترپاتیکان یعنی آذربد سے منسوب مقام کے نام سے مشہور ہوا (قدیم تاریخوں میں جیسے ارمنی تاریخوں میں یہ لفظ آتورپاتیکان لکھا ہے) آذربائیجان کی موجودہ صورت اور تلفظ اسی قدیم لفظ کی معرب صورت ہے۔

اس زیر بحث باب میں اس سے پہلے دوسرے شاعر جیسے ابوالحسن بہمنیار بن مرزبان (متوفی ۴۵۸ھ) جو ابو علی سینا کے شاگردوں اور ایران کے مشہور حکیموں میں تھا، محمد بن عبداللہ خطیب تبریزی (متوفی ۵۰۲ھ) اور قطران جس کا حال اوپر آچکا ہے اور دوسرے مشاہیر آذربائیجان کے آسمان علم و ادب پر طلوع ہو چکے تھے۔ اس دور کے بعد بھی بہت سے علما اور شاعر پیدا ہوئے۔ ان میں شیخ محمود شبستری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اور ان کا تفصیلی حال اس کتاب میں آگے آنے والا ہے۔

خاقانی شیروانی

افضل الدین بدیل بن علی خاقانی کا شمار ایران کے مشہور ترین اور اول درجہ کے قصیدہ گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ خاقانی ۵۲۰ھ میں بمقام شروان پیدا ہوا۔ اپنے نام بدیل کے بارے میں ایک قطعہ میں کہتا ہے۔

بدل من آمدم اندر جہاں سنائی را بدیں دلیل پدر نام من بدیل نہاد

کہتے ہیں اس نے پہلے حقایقی لقب اختیار کیا پھر خاقان اکبر منوچہر بن فریدون شیروان شاہ سے انتساب کی مناسبت سے خاقانی تخلص پایا۔ منوچہر اکتسویں عباسی خلیفہ المقتفی باللہ (۵۳۰-۵۵۵) کا ہم عصر تھا۔ منوچہر کے پاس خاقانی کو ابوالعلاء گنجوی لے گیا تھا، چنانچہ ابوالعلاء خود کہتا ہے:

چو شاعر شدم بردمت نزد خاقاں ! بخاقانیت من لقب بر نہادم

خاقانی کے باپ کا نام علی تھا، وہ درودگری یعنی نجاری کا پیشہ کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک قصیدہ میں جو امام ناصر الدین ابراہیم کے مرثیہ میں اس مطلع کے ساتھ لکھا ہے:

نثار اشک من ہر شب شکر ریز بیست پنہانی　　کہ ہمت را ز نا شوئیست از زانو و پیشانی

اس میں خود اپنی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:

نجوان معنی آرائی براہیمی پدید آمد　　زپشت آزر صنعت علی نجار شروانی

ایک اور قصیدے میں جو اپنے باپ کی مدح میں لکھا ہے کہتا ہے:

شیخ فہندس لقب پیر درودگر علی　　کازرو اقلیدس سند عاجز برھان او

تحفۃ العراقین میں بھی کہتا ہے:

ازسوی پدر درودگر دان!　　استاد سخن تراش دوران!!

استاد کا محل ولادت آذربایجان کے نواح کا شہر شروان تھا۔ چنانچہ اپنے اس مشہور شکوائی قصیدہ میں جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

قلم بخت من شکستہ سر است　　موی بر سر ز طالع ہنر است

کہتا ہے:

عیب شروان مکن کہ خاقانی　　ہست از آن شہر کابتداش شر است

عیب شہری چرا کنی بدو حرف　　کاول شرع و آخر بشر است

خاقانی کی ماں اس عہد کے ایک عیسائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اور نسطوری عیسائی تھی بعد میں اس نے دین اسلام قبول کیا۔ تحفۃ العراقین میں آیا ہے:

کاہم ز مزاج بد نہ رستی　　گر نہ دعوات مادر ستی

نسطوری و موبدی نژادش　　اسلامی و ایزدی نہادش

پس کردہ گزین بعقل و الہام　　بر کیش کشیش دین اسلام

معلوم ہوتا ہے شاعر کی زندگی بڑی تنگ دستی میں بسر ہوئی تھی۔ پہلے تو اس کی زندگی

باپ کی کمائی پر بسر ہوئی۔ پھر اس کی بے وقت موت کے بعد سے ماں کی کمائی پر اس کی زندگی کا مدار ٹھیرا۔ اس کی ماں طباخی اور جلاہی کا پیشہ کرتی تھی اور اسی سے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالتی تھی۔ اس بارے میں تحفتہ العراقین میں کہتا ہے:

از بہر خلایقم بیکبار   بر مایدہ علی نجار

پھر ماں کی طرف اشارہ ہے:

ہستم زپی غذائی جان در   طباخ نسب زسوی مادر

ایک پر اثر قصیدہ میں اپنے آپ سے خطاب کرتے ہوئے ماں کی نوازشیں گنائی ہیں، کہتا ہے:

ای ریزہ روزی تو بودہ   از ریزش ریسمان مادر
خو کردہ بہ تنگنای شروان   با تنگی آب و نان مادر
زیر صلف کسی نرفتہ   جز آن غذای و آں مادر
افسردہ چو سایہ و نشستہ   در سایہ دو کدان مادر
ای باز سپید چند باشی   محبوس بآشیان مادر
شرمت ناید کہ چوں کبوتر   روزی خوری از دھان مادر
تا کی چو مسیح بر تو بندد   از بی پدری نشان مادر

نہ صرف یہ کہ شاعر کو فراغت حاصل نہ تھی بلکہ تنگ نائی شروان میں شاد دل اس کے نصیب میں نہ تھا؛ یہاں وہ مونس دوستوں کے وجود سے بھی محروم تھا چنانچہ ایک قصیدہ میں جس کا مطلع ہے:

کار من بالا نمی گردد دریں شیب بلا   در مضیق حادثاتم بستۂ بند عنا

اس حالت کا ذکر یوں کیا ہے:

با کہ گیرم انس کز اہل وفا بی روزیم   روزی من نیست یا خود نیست در عالم وفا

در ہمہ شروان مرا حاصل نیامد نیم دوست　　دوست خود ناممکنت اے کاش بودی آشنا

خاقانی کا سب سے بڑا سرپرست اس کا چچا کافی الدین عمر بن عثمان تھا۔ یہ فلسفہ اور حکمت کا ماہر تھا۔ اس نے خاقانی کی پرورش علم و ادب کے ساتھ کی۔ شاعر نے کئی جگہ اس کی مہربانیوں کو یاد کیا ہے۔ ایک جگہ تحفۃ العراقین میں کہتا ہے:

من فائدہ جوی و او مفیدم　　عم بودہ مدرس و معیدم

خاقانی نے اپنے چچا اور دوسرے جن علماء سے اکتساب فیض کیا ان کے سوا اس زمانے کے شاعروں میں ابو العلاء گنجوی سے بھی خاقانی کو شرف تلمذ حاصل تھا۔ ابو العلاء گنجوی نے اپنی بیٹی بھی خاقانی کے نکاح میں دی اور جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے اسے دربار شاہی میں پہنچایا۔ لیکن بعد میں استاد اور شاگرد میں لڑائی ہوگئی اور دونوں نے ایک دوسرے کی ہجو لکھی۔ ان مقدمات اور خود اس کے اشعار کی شہادت پر اگر ہم اسے ایک عالم فاضل اور دانش مند مان لیں تو ہمارا یہ خیال غلط نہ ہوگا۔ چنانچہ اس کے ہم عصروں نے علم و ادب میں اس کی بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔ رشید وطواط کہتا ہے:

افضل الدین ابو الفضایل بحر فضل　　فیلسوف دین فزای کفر کاہ

اس میں کچھ شک نہیں کہ خاقانی نے ادب، فلسفہ، علوم دینی اور آداب قرآن کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان علوم میں کامل دست گاہ پیدا کی تھی یہ حقیقت اس کے کلام سے بھی واضح ہے۔

ہمارے شاعر کی زندگی کچھ ایسی کامیاب نہیں رہی اور اسے فراغت کے ساتھ جینا نصیب نہ ہوا۔ جوانی میں وہ مفلسی اور تنگ دستی کی مصیبتیں سہتا رہا اور تمام عمر ایسے جگری دوستوں کی آرزو میں ماتم گسار رہا جو غم واندوہ کے موقع پر اس کی غم گساری کرتے لڑکپن میں سر سے باپ کا سایہ اٹھا پچیس سال کا ہوا تھا کہ اپنے شفیق چچا کی سرپرستی اور اس کی نوازشوں سے محروم ہوا۔ عمر کا آفتاب ڈھلنے کو ہوا تو ۵۷۱ھ میں اس کا جوان بسال بیٹا

رشیدالدین بیس سال کی عمر میں مرگیا اور باپ کو داغ مفارقت دے گیا۔ خود کہتا ہے:

دریغ میوۂ عمرم رشید کز سر پائی! | بہ بیست سال بہ آمد بیک نفس بگذشت
مراز خیرہ ہمیں یک رشید بود از عمر | نتیجۂ شب و روزی کہ در ہوس بگذشت

بیٹے کی موت کے بعد اس کے غموں میں اور اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ خود کہتا ہے:

پسر داشتم چوں بلند آفتابی! | زناگہ بتاری مغاکش سپردم!
بدرد پسر مادرش چوں فروشد | بخاک آن تن دردناکش سپردم
یکی بکر چوں دختر نعش بودم! | بروشن دلی چوں سماکش سپردم
بماندم من و ماند عبدالمجیدی | ودیعت بیزداں پاکش سپردم

ان مصیبتوں کے سوا شاعر اپنی طبیعت کی آزادی، دربار کی عاجزانہ اور کورانہ خدمت سے خودداری، سفر کرنے، دنیا اور دنیا والوں کو دیکھنے، دوسرے امیروں کی مدح کرنے کی تمنا اور سب سے بڑھ کر اپنے ممدوحوں یعنی خاقان اکبر منوچہر اور اس کے بیٹے خاقان کبیر ابوالمظفر اختستان کے حاسد حاشیہ نشینوں کے بھڑکانے پر ان کے عتاب کا نشانہ بنا۔ حد یہ کہ سفر سے واپس آنے کے چند سال بعد بھی خدمت سلطانی سے انکار اور اپنی آزاد دلیشی کے بارے میں ہم اس کی دلکش غزلوں میں یہ شعر پڑھتے ہیں:

گفتی نکنی خدمت سلطان نکنم نی | یک لحظہ فراغت بدو عالم نفروشم

شاعر کے کلام میں سفر کی خواہش اور شروان کی شکایت کئی جگہ نظر آتی ہے۔ خاص طور پر وہ حج بیت اللہ اور خراسان کے سفر کا بڑا اشتیاق رکھتا تھا جس کی اسے ممانعت کردی گئی تھی۔ چنانچہ خود کہتا ہے:

چہ سبب سوی خراسان شدنم نگذارند | عندلیبم بگلستان شدنم نگذارند

آخر کار کسی طرح سفر کی اجازت حاصل کرہی لی، رے تک ہی چلا تھا کہ ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا۔ خراسان میں غز ترکوں نے فتنہ و فساد برپا کر رکھا تھا اور رے کے والی نے

بھی اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ مجبوراً واپس ہونا پڑا۔ رے کی شکایت میں اس نے جو قصیدہ لکھا ہے، اس میں کہتا ہے :

چون نیست رخصہ سوی خراسان شدن مرا — ہم باز پس شوم نکشم من بلای ری
گر باز قصد سوی تبریز اجازت است — شکرانہ گویم از طرف پادشاہ ری

ایک اور قطعہ میں کہتا ہے :

من بہ ری عزم خراسان داشتم — زانکہ جان بود آرزومندش مرا
والی ری بند بر عزمم نہاد! — نیک دامن گیر شد بندش مرا

معلوم ہوتا ہے کہ وہ اخستان بن منوچہر کے حکم سے سنہ ۵۷۰ھ میں قید کر دیا گیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر پچاس سال تھی۔ چنانچہ اپنے ایک پر اثر شکایتی قصیدہ میں جس کا مطلع ہے:

فلک کژ روتر است از خط ترسا — مرا دارد مسلسل راہب آسا

کہتا ہے :

مرا از بعد پنجہ سال اسلام — نزیبد چون صلیبی بند بر پا

شاعر کو اپنی زندگی میں بڑی شکایت لوگوں کے حسد اور شاعر کی قدر و قیمت نہ پہچاننے کی تھی۔ عمر بھر اس کی ہمت نہایت بلند رہی۔ لیکن اس کا مقام اس کی ہمت سے بھی بلند تھا۔ اسی تضاد کی وجہ سے رنج اٹھاتا تھا، اس قطعہ سے یہی بات ظاہر ہے :

نہ ہمت من بپایہ راضی است — نہ پایہ سزای ہمتم ہست
یارب چو ز ہمت و ز پایہ! — نگشاید کار و نگذرد دست
یا پایہ چو ہمتم بر افراز — یا ہمت من چو پایہ کن پست

رے تک کا سفر کرنے کے بعد ۵۵۱ھ میں خاقانی مکہ معظمہ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اس سفر میں اس نے ایک بہترین قصیدہ لکھا جو اس کے سبک کا ایک نہایت اچھا نمونہ ہے۔ یہ قصیدہ بیت الحرام کی مدح میں لکھا گیا ہے اور اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

صبح از حمایل فلک آہیخت خنجرش   کیمخت کوہ ادیم شد از خنجر زرش

کہتے ہیں کہ اس قصیدہ کو جس میں تجدید مطلع کے ساتھ ایک سو نو شعر ہیں مکہ کے خواص نے آب زر سے لکھا تھا۔

اس قصیدہ میں اس نے والی موصل کے وزیر جمال الدین اصفہانی کا بھی ذکر کیا ہے اس شخص نے مکہ کی تعمیر میں حصہ لیا تھا۔ کہتا ہے:

شکر جمال گوئی کہ معمار کعبہ اوست   یارب چو کعبہ دار عزیز و معمرش

مکہ سے واپس ہوتے ہوئے جب وہ ۵۵۲ھ میں بغداد آیا تو اس سال سلطان محمد سلجوقی نے بغداد کا محاصرہ کر رکھا تھا اور عباسی خلیفہ المقتفی باللہ شہر کا بچاؤ کر رہا تھا۔ اسی وزیر جمال الدین نے خاقانی کو خلیفہ کے حضور میں پیش کیا۔ خلیفہ نے اس کی بڑی عزت اور توقیر کی اور اس کو اپنا دبیر مقرر کیا۔ لیکن خاقانی بغداد اور بغداد والوں سے رنجیدہ تھا۔ اس نے یہ عہدہ قبول نہ کیا اور اسی زمانے میں ایران واپس ہو گیا۔ (اس سفر میں اور پھر مکہ کے دوسرے سفر میں اس نے عربوں کی طرز زندگی بھی دیکھی اور قدیم ایران کے کھنڈر دجلہ کے کنارے پر کھڑے دیکھے۔ ان چیزوں نے شاعر کے دل کو بہت متاثر کیا۔ اسی تاثر کا نتیجہ شاعر کا وہ مشہور قصیدہ ہے جو قصیدۂ مدائن کہلاتا ہے۔ مختصر یہ کہ خاقانی کی پوری زندگی مصیبت میں گذری صدموں پر صدمے اٹھائے اور دنیا نے اسے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ اس نے عمر بھر دینی اور اخلاقی مسلک کی پیروی کی۔ وہ لوگوں سے وفا اور راستی کا طالب تھا۔ لیکن دنیا نے کبھی اس کو فراغت اور آسایش کے ساتھ بیٹھنے نہ دیا۔

خاقانی نے ۵۹۵ھ میں بمقام تبریز وفات پائی اور مقبرۃ الشعراء میں جو شہر کے شمالی طرف کوئے سرخاب میں واقع ہے دفن ہوا۔

سبک اور شاعری

جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں خاقانی کا شمار ایران کے درجہ اول کے قصیدہ گو شاعروں میں ہوتا ہے خاقانی، نظامی اور ایسے ہی

دوسرے شعرا یہ ثابت کرتے ہیں کہ سرزمین ایران کے ہر حصہ میں خواہ وہ خراسان ہو کہ آذر بائجان ادب کے پھول کھل سکتے ہیں، پھل پھول سکتے ہیں اور نئے شگوفے پیدا کر سکتے ہیں۔ خاقانی کی شاعری نہایت محکم اور استوار ہے اور الفاظ و معنی کے لحاظ سے غیر معمولی اور نہایت بلند و لطیف ہے۔ اس کی شاعری کی بہت سی بنیادی خوبیوں میں سے ایک ادبی خوبی یہ ہے کہ وہ عام سطح سے بلند اور عام ڈگر سے الگ ہے۔ یعنی ایسے دقیق اور گہرے معنی کو جو ہر شخص کے خیال میں نہیں آ سکتے نہایت جامع اور فصیح الفاظ کے قالب میں ادا کرتا ہے۔ خاقانی کی شاعری کا بڑا حصہ اسی قسم کی شاعری پر مشتمل ہے۔

خاقانی کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان کی طرح عربی زبان پر بھی کامل عبور رکھتا ہے۔ وہ ان دونوں زبانوں کے الفاظ اور ادبی ترکیبوں پر اتنا حاوی ہے کہ ان کو جس طرح چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔ الفاظ اور ترکیبوں کا وہ گویا بادشاہ ہے۔ ترکیبیں اور الفاظ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں اور وہ ان سے جس طرح چاہتا ہے کام لیتا ہے۔

خاقانی کی شاعری میں نہایت مشکل مضامین بھی ملتے ہیں۔ ہر قسم کے الفاظ اور ہر قسم کی ترکیبیں اس کے پاس پائی جاتی ہیں۔ اس کے کلام میں آیتیں، ضرب الامثال اور اشارات و کنایات کی کمی نہیں۔ تجنیس، ایہام، تشبیہ، استعارہ وغیرہ جیسے شعری صنائع بھی اس کے پاس کافی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان سب میں وہ ایک تازگی پیدا کر دیتا ہے۔ یہی خصوصیت اس کی ترکیبوں میں حتیٰ کہ الفاظ کے انتخاب میں تک پائی جاتی ہے۔ یہی خصوصیت اس کی اور اسی کے ہم ولایت نظامی کی شاعری کو خراسان اور دوسرے مقاموں کی شاعری سے ممتاز کر دیتی ہے۔ اس نے نئے نئے الفاظ، نت نئی ترکیبیں اور اچھوتے معانی سے کام لیا ہے جن کا گننا تک دشوار ہے لیکن جو ناقدانہ نظر رکھتے ہیں اس کے کلام کے تقابلی مطالعہ سے اس فرق کو آسانی کے ساتھ محسوس کر سکتے ہیں۔ ایسے

مطالعہ سے آذر بایجان اور خراسان کے سبک کی خصوصیتیں اور ان کے لفظی اور فنی اختلاف ظاہر ہو جاتے ہیں۔ خود خاقانی نے عنصری سے متعلق ایک قصیدہ میں اس خصوصیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

مرا شیوۂ خاص تازہ است و داشت   ہماں شیوہ باستان عنصری

خاقانی کا جو نیا دیوان طہران میں چھپا ہے اس کے اسی قصیدے میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں جو اس نے اپنے بارے میں کہے ہیں:

شاعر منطق منم خوان معانی مراست   ریزہ خور خوان من رودکی و عنصری

زندہ چو نفس حکیم نام من از تازگی   گشتہ چو مال کریم حرص من از اندکی

ایک قصیدہ خود اپنی خوبیوں کی تعریف پر لکھا ہے اس میں اپنے بدخواہوں کو سرزنش کی ہے اور اپنی جدت طبع کا اظہار اس طرح کیا ہے:

نیست اقلیم سخن را بہتر از من پادشا   در جہاں ملک سخن راندن مسلم شد مرا

مریم بکر معانی را منم روح القدس   عالم ذکر معانی را منم فرمان روا

شہ طغان عقل را نایب منم نعم الوکیل   نو عروس فضل را صاحب منم نعم الفتیٰ

درع حکمت پوشم و بی ترس گویم القتال   خوان فکرت سازم و بی بخل گویم الصلا

نکتہ دو شیرہ من حرز زر دست از صفت   خاطر آبستن من نور عقلت از صفا

عقد نظامان سحر از من ستانند واسطہ   قلب ضرابان شعر از من پذیرد کیمیا

ہر کجا نعلی بیندازد براق طبع من   آسمان زان تیغ بر آن سازد از بہر غزا

من قرین گنج و ایناں خاک بیزان حسد   من چراغ عقل و آنہا روزہ کوران ہوا

من ہمی در ہند معنی راست ہمچو آدم   وین خران در چین صورت راست چوں کلام

چوں میاں کاسہ ارزیز دلشان بیفروغ   چوں دہان کوزہ سیماب کفشان کم عطا

اگر ہم ان ہی اشعار کو ایران کے دو حصوں کے شعراء جیسے خراسان کے شعراء کے کلام

سے مقابلہ کر کے دیکھیں تو ان دونوں کے فرق کا بہت آسانی کے ساتھ اندازہ لگا سکتے ہیں مثلاً "شہ طغان عقل" "درع حکمت" "نکتہ دوشیزہ" "نظامان سحر" "ضرابان شعر" "خاک بیزان حسد" "روزہ کوران ہوا" "ہند معنی" "چین صورت" جیسی ترکیبیں، جو اس قصیدہ کے سوا شاعر کے دوسرے قصیدوں میں پائی جاتی ہیں، دوسرے شاعروں کے پاس یا تو سرے سے ملتی ہی نہیں یا اگر ملتی بھی ہیں تو شاذو نادر ہی یہ تو ظاہر اور بدیہی ہے کہ ان ترکیبوں سے اور ان کے جوڑ سے جو معنیٰ پیدا ہوتے ہیں ان میں بڑی تازگی ہوتی ہے۔

اسی طرح خاقانی کی شاعری میں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو مقامی بولی سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالباً یہ الفاظ آذربایجان یا آذری زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً اس شعر میں "اکنون" کے معنیٰ میں "ایمہ" کا لفظ:

ایمہ نہ بغداد جای شیشہ گر است   بہر گلاب طرب فزای صفاہان!

جیساکہ ہم ادبیات ایران قبل اسلام کے حصہ میں دیکھ چکے ہیں ایمہ (این) کا لفظ "ایم" (این را) کی صورت میں سبستون کے کتبوں میں آچکا ہے۔

اسی طرح وہ دوسرے ملکوں کی زبانوں کے الفاظ بھی کبھی استعمال کر جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کے شعر میں ناچیرکی کا لفظ گرجی زبان کا لفظ ہے:

من و ناچیرکی و دیر مخزان   در بقراطیا نم جا و ملجا

مخزان، مطران، بطریق، استقف، نسطور، اور ملکا جیسے الفاظ سریانی نصرانیت کی اصطلاحیں ہیں اور یہ الفاظ اس زمانے کے نسطوریوں میں عام طور پر رائج تھیں۔ نصرانی عقاید سے واقفیت، انجیل کی قرائت اور اس دین کی تاریخ اور اس کی اصطلاحات سے لگاؤ کی وجہ سے خاقانی دوسرے تمام ایرانی شاعروں میں ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اس صفت کو اس کی شاعری کی ممیزات میں شمار کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس بارے میں اس کی ماں کے عیسائی ہونے کو بڑا دخل ہے۔

عام طور پر خاقانی کے قصیدے نہایت طویل اور مفصل ہوتے ہیں، بہت سے قصیدوں
کو تو وہ پھر مطلع ثانی سے شروع کرتا ہے۔ ان قصائد کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اکثر
قصیدوں میں مشکل الفاظ اور ترکیبیں، نہایت گہرے معانی، تشبیہیں، کنائے اور نہایت
وسیع مضامین پیش کئے ہیں۔ زبان، محاورے، ضرب الامثال پر کامل عبور، اسلامی روایات
اور اسلامی قصص و تاریخ سے واقفیت کے بغیر ان کا سمجھنا ممکن نہیں۔

مثلاً اس قصیدہ کو جو مکہ کی تعریف میں لکھا گیا ہے، اسے اس مطلع سے شروع کرتا ہے:

شبروان در صبح صادق کعبہ جان دیدہ اند   صبح را چون محرمان کعبہ عریان دیدہ اند

اور پھر تجدید مطلع سے اسے اور آگے بڑھایا ہے۔ اس قصیدہ میں اس نے تاریخی، ادبی
دینی معلومات اور مناسک اور نجوم وغیرہ سے متعلق اصطلاحوں سے کام لیا ہے۔ اس نے یہ
الفاظ اور اصطلاحیں خاص معنیٰ میں استعمال کی ہیں جن کا سمجھنا متوسط قاری کے لئے ممکن
نہیں۔ اس کے لئے ان اصطلاحوں سے واقفیت ضروری ہے۔ یہاں اسی قصیدے
سے چند شعر بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں:

تا خیال کعبہ نقش دیدۂ جان دیدہ اند   دیدہ را از شوق کعبہ زمزم افشاں دیدہ اند

عشق بر کردہ ہمہ آتشی کز شرق و غرب   کعبہ را ہر ہفت کردہ ہفت مرداں دیدہ اند

ماہ نورانیۂ قندیل عیسیٰ یافتہ   دجلہ را پر حلقۂ زنجیر مطران دیدہ اند

بر سر دجلہ گذشتہ تا مداین خضروار   قصر کسری و زیارت گاہ سلمان دیدہ اند

طاق ایوان جہانگیر و وثاق پیرزن   از نکونامی طراز فرش ایوان دیدہ اند

از تحیر گشتہ چون زنجیر پیچان کانزمان   بر در ایوان نہ زنجیر و نہ دربان دیدہ اند

تا حد ارش رفتہ و دندانہ ہای قصر شان   بر سر دندانہ ہای تاج گریاں دیدہ اند

راندہ زانجا تا بخاک حلہ و آب فرات   موقف الشمس و مقام شیر یزدان دیدہ اند

پس بکوفہ مشہد پاک امیر النحل را   ہمچو جنبش نحل جوشش انسی و جان دیدہ اند

راندہ از رحبہ دو اسبہ تا منارہ بحرہ — از سم گوران سر شیران ہراساں دیدہ اند
وان کجاوہ چیست میزان دو کفہ بار دار — باز جوزا دو کفہ شکل میزان دیدہ اند
بادیہ بحر است و بختی کشتی و اعراب موج — واقصہ سرحد بحر و مکہ پایان دیدہ اند
بہر دفع درد چشم رہروان ز آب وگیا — شیر مادر دختر و گشنیز بستاں دیدہ اند
دائرہ افلاک را بالای صحن بادیہ! — کم ز حرف جزم نحویان بر حرف قرآن دیدہ اند
وز طناب خیمہ ہا بر گرد لشکرگاہ حاج — صد ہزار اشکال اقلیدس ببریاں دیدہ اند
قاع صفصف دیدہ و صف صف سپہداران حاج — کوس را از زیر دستاں زیر دستاں دیدہ اند
کوہ محروق آنکہ ہمچو زر لشفشا ہنگ در — دیو را زو در شکنجہ حبس خذلاں دیدہ اند
از دم پاکان کہ بنشاندی چراغ آسمان — ناف باحور ابجا جرماہ آبان دیدہ اند
ماہ نو در سایہ ابر کبوتر فام راست — چون سحابی نامہ یا چون عین عنواں دیدہ اند
بامدادان نفس حیوان کردہ قرباں در منیٰ — لیک قرباں از خواص نفس انساں دیدہ اند
سعد ذابح بہر قرباں تیغ مریخ آختہ — جرم کیوانش چو سنگ کی افسان دیدہ اند
در سر جمرہ بودہ پیش مسجد خیف اہل خوف — سنگ را کاندا ختہ بر دیو عصیاں دیدہ اند
عید ایشان کعبہ و ز ترتیب پنج ارکان حج — رکن پنجم ہفت طوف چار ارکان دیدہ اند
رفتہ وسعی و صفا و مروہ کردہ چار و سہ — ہم بر آن ترتیب کز سادات اعیان دیدہ اند
پس برای عمرہ کردن سوئے تنعیم آمدہ — ہم بر آن آئین کہ حج را ساز و ساماں دیدہ اند

یہاں جس قصیدے کے یہ چند شعر نمونے کے طور پر پیش کئے گئے ہیں، اس کے سمجھنے کے لئے پڑھنے والے کو اسلامی اور ایرانی ادبیات سے بہت اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے۔ مثلاً اسے یہ جاننا چاہئے کہ ”ہفت کردہ“ سے مراد دلہن کے سات سنگار یعنی حنا وسمہ، سرخاب، سفیداب، زرک، غالیہ اور سرمہ ہے۔ ہفت مردان سے شاید اصحاب کہف یا عارفوں کے سات طبقے قطب، غوث، امام، اوتاد، ابدال، نجیب اور نقیب

یا اشکانیوں کے سات قدیم خانوادے مراد ہے جنھیں بیوت السبعہ کہا جاتا تھا اسی طرح مطران عیسائیوں کے روحانی پیشوا کا لقب ہے۔ ایوان کسریٰ اور مدائن (یا تیسفون) ساسانیوں کا پائے تخت ہے۔ سلمان فارسی ایرانی تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اسی طرح شہروں اور قصبوں کے نام جیسے رحبہ اور منارہ سے واقفیت بھی ضروری ہے امیر اور نر زنبور کو عربی میں یعسوب کہتے ہیں۔ چونکہ حضرت علی کے القاب میں یعسوب الدین بھی ایک لقب ہے اس لئے انھیں امیر النحل کہا ہے۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ جوزا ایک برج کا نام ہے۔ اسے دائرہ سے تشبیہ دی ہے۔ حزم نحویاں سے اس کے اطراف افلاک مراد ہیں خیمہ کی رسیوں کو اقلیدس کے سنہاسی اشکال سے تشبیہ دی ہے۔ قاع صفصف سے قرآن مجید کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے۔ سورہ طٰہٰ میں ارشاد فرمایا گیا ہے یسئلونك عن الجبال فقل ینسفها ربی نسفا فیذرها قاعا صفصفا"۔ حوراسے مراد موسم گرما کی شدید گرمی ہے۔ حاجر مکہ کے راستہ کی ایک منزل کا نام ہے۔ سعد ذابح، منازل قمر کی ایک منزل ہے۔ جمرہ اور عمرہ، طواف، صفا اور مروہ وغیرہ مناسک اور اعمال حج کی اصطلاحیں ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے معنی اور عبارتیں دوسرے شاعروں کے پاس بھی ملتی ہیں لیکن یہ یہ باتیں خاقانی کے کلام میں زیادہ ہیں۔ بہت سی مخصوص اور اچھوتی تعبیریں اس کے سوا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس شاعر کے قصیدوں کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں اس کے اکثر قصیدے بڑے طول طویل ہیں اور نئے مطلعوں سے انھیں پھر شروع کیا ہے۔ ان کی بحریں بھی لمبی ہیں اور بیشتر ردیف کی طرز پر ہیں۔ عام طور پر شاعر مطلع ہی میں اپنے مقصود کا اظہار کر دیتا ہے اور کبھی تغزل اور تشبیب سے کام لیتا ہے اور جلوۂ صبح، طلوع آفتاب یا عشق و محبت یا مناظر قدرت کی عکاسی سے ان کا آغاز کرتا ہے۔

صبح کی منظر کشی، فجر اور آفتاب تاباں کے ظہور کی عکاسی خاص طور پر خاقانی کو پسند

تھی۔ یہ مناظر اس کے کئی ایک قصیدوں میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہ قصیدے :

دست صبا بر فروخت مشعلہ نوبہار   مشعلہ داری گرفت کوکبۂ شاخسار
ز آتش خورشید شد نافہ شب نیم سوخت   قوت از ان یافت روز خوشدم از ان شد بہار
خامہ مانیست طبع چہرہ کشای جہاں   نایب عیسی است ماہ رنگرز شاخسار

صبح از حمایل فلک آہیخت خنجر بش!   کیمخت کوہ ادیم شد از خنجر زریش
صبح از صفت چو یوسف دمہ نیمۂ ترنج   بگران چرخ دست بریدہ برابرش

می وشگست کہ با صبح بر آمیختہ اند   یا بہم زلف و لب یار در آمیختہ اند
صبح چوں خندہ گہ دوست شد ست آتش سرد   آتش سرد بعنبر مگر آمیختہ اند!

در کام صبح از ناف شب مشکست عمدا ریختہ   گردوں ہزاراں نرگسہ از سقف مینا ریختہ
صبحست گلگوں تاختہ شمشیر بیروں آختہ   بر شب شبیخوں ساختہ خونش بعمدا ریختہ

جو بجو راز جہاں ہمنود صبح   مشک جو جو از دہاں ہمنود صبح

لاف از دم عاشقان زند صبح   بیدل دم سرد از ان زند صبح

مثنوی تحفۃ العراقین میں بھی صبح کی آب و تاب شاعر کی نور پرست آنکھوں کو متاثر کرتی ہے اور وہ آفتاب کو مخاطب کر کے اپنے دل کا حال سناتا ہے۔ ذیل میں ہم اس مثنوی سے ایسے ہی چند شعر نمونتاً پیش کرتے ہیں۔ یہ شعر اس نے دل گرفتگی، غم و اندوہ کی حالت میں غالباً زندان میں کہے ہیں:

ای مهرد ہاں روزہ خواراں — جاندار وی علت بہاران
ای کعبہ رہرو آسماں را — وی زمزم آتشین جہاں را
از سہم تو در نقاب خضرا — مستوری صد ہزار رعنا
زر باشی و ناگشادہ گنجی — تب داری و ناکشیدہ رنجی
گہ راست گہی کج اندرائی — گہ تیز دوی و در سرائی
در قصر شہاں بسی نیائی — زی بنگه تولیان گرائی
روشن بتو چشم شاہ و درویش — جود تو زفیض آسمان بیش
ای زنگ آمیز این گہرہا — وی از تو گزارش صورہا
آن نور کہ بی درایغ باری! — از خاقانی دریغ داری
این شیوہ نہ شرط دوستانست — این سنت و فعل دشمنانست
شروان زتو گرم و روشن اوقات — من در کو سرد و سرد ظلمات
نہ ہم نفسی نفس گشاہم! — نہ خوش سخنی ہوس زدایم
تو گرچہ درخش ہانمائی — روزی نکنی گرہ گشائی!
بر روزن من نتابی از خشم — نہ در دل من زغرفہ چشم
نی نی غلطست ہرچہ گفتم — راہ ہوست ہرچہ سفتم
صبحست سوی تو عذر خواہم — صبحست شفیع این گناہم!
صبح آئینہ دار تازہ روئیست — صبح از سر صدق راستگوئیست

ان تمام خصوصیات اور اچھوتے پن کے باوجود خاقانی کے کلام پر خراسان کے بڑے بڑے شاعروں کا اثر بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ قصیدہ ملاحظہ ہو، انوری کے سبک کا اثر اس پر نمایاں ہے:

ضامندار سلامت شد دل من — کہ دار الملک عزلت ساخت مسکن

اہل چوں صبح کاذب گشت کم عمر! | چو صبح صادق دل گشت روشن
بوحدت رستم از غرقاب وحشت | بہ رستم رستہ گشت از چاہ بیژن

خاقانی نے عنصری اور رودکی اور دوسرے شاعروں کی طرف جو اشارے کئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ اس نے ان شاعروں کے کلام کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ خاص طور پر عنصری کے کلام کی اس کی نظر میں بڑی وقعت تھی۔ چنانچہ جہاں جہاں اس نے اپنے آپ پر فخر کیا ہے وہاں اکثر عنصری کو ایک زبردست حریف اور رقیب کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ میں کہتا ہے:

بدیہہ ہمی بارم از خاطر ایں در | کز وسمعہا بحر عمان نماید
ازیں شعر خجلت رسد عنصری را | دگر عنصری جان جانان نماید

حد یہ کہ ایسے لوگوں کو جواب دیتے ہوئے جنھوں نے خاقانی کے کلام پر عنصری کے کلام کو ترجیح دی ہے، اپنے کلام کو اس کے کلام سے بڑھ چڑھ کر بتاتا ہے اور کہتا ہے:

بتعریض گفتی کہ خاقانیا | چہ خوش داشت نظم روان عنصری
بلی شاعری بود صاحبقراں | زممدوح صاحبقران عنصری
زمعشوق نیکو و ممدوح نیک | غزل گو شد و مدح خواں عنصری
جز از طرز مدح و طراز غزل | نکردی ز طبع امتحان عنصری
شناسند افاضل کہ چوں من بود | بمدح و غزل درفشاں عنصری
کہ ایں سحر کاری کہ من می کنم | نکردی بسحر بیاں عنصری
زدہ شیوہ کان حلیت شاعراست | بیک شیوہ شد داستاں عنصری
مرا شیوہ خاص تازہ است و داشت | ہماں شیوہ باستاں عنصری
نہ تحقیق گفت و نہ وعظ و نہ زہد | کہ حرفی ندانست از آں عنصری
بنظم چو پروین و نثر چو نعش | بنود آفتاب جہاں عنصری

ادیب و دبیر و مفسر نبود! نہ سحبان یعرب زبان عنصری

زہد اور دین داری کی طرف خاقانی کا رجحان اس کے ایسے اشعار سے، جیسے کہ کعبہ کی تعریف اور رسول اللہ صلعم کے نعتیہ قصیدوں وغیرہ سے ہویدا ہے۔ اس نے ہر جگہ روحانیت اور ایمان کی بنیادی اہمیت پر زور دیا ہے اور حکمت یزداں کو حکمت یونان پر ترجیح دی ہے، کہتا ہے:

فلسفی فلسی و یونان ہمہ یونی ازرد! نفی این مذہب یونان بخراسان یابم

فقیہی بہ ز افلاطون کہ آں کش چشم درد آید یکی کحال کابل بہ ز صد عطار کرمانش

فلسفہ در سخن میامیزید وانگہی نام آں جدل منہید

وحل گمرہیست بر سر راہ ای سران پای در وحل منہید

خاقانی اپنے مدحیہ قصیدوں میں اپنے ممدوح کو انصاف، سخاوت، اور دانش پروری کی دعوت دیتا ہے۔ ان قصیدوں میں اس کا سبک ویسا ہی پُرشکوہ، مرکب تشبیہوں، اغراق اور مبالغہ سے بھرا ہے جیسا کہ خراسانیوں میں بھی عام طور پر مروج تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس قسم کی شاعری کو فنی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے اور کلام کی پختگی، فکر کی لطافت، تخیل کی بلندی، تشبیہ، ایہام، تجنیس اور نکتہ سنجی وغیرہ کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ مثلاً شاہ اخستان کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں اسی قسم کے مضامین باندھے ہیں:

بادشاہ کے انصاف کی خاک میں کسریٰ کا سرمہ اور عمر کا سرمایہ ملایا گیا ہے، تلوار کی آگ میں اسے پکایا گیا ہے اور قضا و قدر کی اکسیر اس میں ملا کر اسے چرخ کے برتن میں رکھا گیا ہے۔ اس کی بارگاہ کی زمین دادخواہوں کے آنسوؤں سے بجلیاں گراتی ہے،

سات آسمانوں کا عنصر اس کی آتش قدرت کے دھویں سے قائم ہے اور سات زمینوں کی طینت اس کے گھوڑے کے قدموں کی خاک کی وجہ سے دائم ہے جس طرح حضرت یعقوب کی آنکھیں بیٹے کی بُو سے روشن ہوگئیں اسی طرح اس کی سن رسیدہ رائے اس کے جواں بخت کا ساتھ دیتی ہے۔ اس کی تلوار بجلی کی طرح چمکتی ہے اور خون کا مینہ برساتی ہے۔ اس کی خوشنودی فردوس کے جھونکے اور اس کا غضب دوزخ کی سموم ہے

اس طرح کے مدحیہ قصیدوں میں شاعر اپنے ممدوح کو نہ صرف سخاوت اور عدل کی ترغیب دیتا ہے بلکہ اس نے مستقل طور پر اخلاقی مضامین پر قطعات بھی لکھے ہیں اور زندگی کے اعلیٰ اخلاقی اصولوں کا پرچار بھی کیا ہے۔ اس نے لوگوں کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اٹھائی تھیں اس لئے وہ ہمیں ناامیدی، بروں اور برائی سے بچنے کی دعوت دیتا اور اس کے مقابلہ میں نیکی کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ حق یہ ہے کہ اسی کو وہ بزرگوں کا شیوہ اور عارفوں کا شعار سمجھتا ہے:

بترس از بد خلق خدا قانیا	ولیکن زبد دہ اماں خلق را
وفا طبع گردان وایمن مباش	زغدری کہ طبعست آں خلق را
دروغی مران بر زبان ومدان	کہ صدقی بود بر زباں خلق را
در افکار خلق آشکارا شود	قضائی کہ آید نہاں خلق را
بد خلق ہر حیث فزوں تر رسد	نکوئی فزوں تر رساں خلق را

اس سلسلہ میں جو بات خاص طور پر قابل ذکر ہے یہ ہے کہ شاعر نہ صرف دوسروں کو نصیحت کرتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ان نصیحتوں پر کاربند تھا اس نے زندگی کے تجربوں سے سبق حاصل کیا تھا۔ اس نے زندگی کی بڑی تلخیاں سہی تھیں اس نے کئی سفر کئے تھے اور وہ بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرا تھا۔ اس کے ساتھ اس میں شدید دین داری کا جذبہ بھی تھا۔ اس جذبہ نے اس کی باطن کی صفائی میں بڑا حصہ ادا کیا

تھا۔اسی جذبہ نے اس میں درگذر، نیکوکاری اور فداکاری کے عالی جذبات پیدا کئے تھے۔ان سب باتوں نے اسے عمل میں بھی نیک اور پاک بنادیا تھا۔چنانچہ یہ قطعہ اس کا شاہد ہے :

منکہ خاقانیم ایں مایہ صفا یافتہ ام　　کہ بدل در حق بدخواہ شدم نیکی خواہ
چوں شوم سوختہ از خامی گفتار بدن　　نیکوکار پناہ آرم داو ہست پناہ
کہ نگویم کہ مکافات بدیشاں بدکن　　لیک گویم کہ مرا از بدشان دار نگاہ

یہ واقعہ ہے کہ خاقانی نے تمام عمر ابنائے روزگار کے ہاتھوں ستم سہے اس لئے اُسکی بدگمانیاں بے وجہ اور بے بنیاد نہیں۔حتیٰ کہ دوستوں کی دوستی پر بھی اسے شبہ ہے اور ان کو نہایت باریک بینی کے ساتھ پرکھنا چاہتا ہے :

کیست ز اہل زمانہ خاقانی　　کہ تو اہل وفاش پنداری
دوستی کز سر غرض شد دوست　　ہاں و ہاں تا کہ دوست نشماری
خواجہ گوید کہ دوستدار توام　　پاسخش دہ کہ دوست چوں داری
تا عزیزم مرا عزیز کنی !　　چوں شدم خوار خوار انگاری

انسان کی نکوکاری کے بارے میں اس کے یہ شکوک اور یہ تاریک اندیشی بعض ایسے واقعات اور حادثات پر مبنی ہے جن سے شاعر کا دل بہت متاثر ہوا تھا ان میں شاید سب سے زیادہ دردناک حادثے اس کے عزیزوں کی موت ہے۔ ذیل میں شاعر کے اس مرثیہ کے چند شعر نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں جو اس نے اپنے جوانامرگ بیٹے کی موت پر لکھے تھے۔ان اشعار سے اس کے غم واندوہ اور اس کے درد و کرب کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے :

صبحگاہاں سر خونین جگر بکشائید　　ژالہ صبح دم از نرگس تر بکشائید
دانہ دانہ گہر اشک بیارید چنانک　　گرہ رشتہ تسبیح ز سر بکشائید

خاک لب تشنه خونست و ز سرچشمهٔ دل — آب آتش زده چون چاه سقر بگشائید
سیل خون از جگر آید سوی باغ دماغ — ناودان مژه را راه گذر بگشائید
چون سیاهی عنب کاب دهد سرخ شما — سرخی خون ز سیاهی بصر بگشائید
تف خون کز مژه بر لب زد و لب آبله کرد — زهر پیری ز لب آبله ور بگشائید
بر وفای دل من نامه برارید چنانک — چنبر این فلک شعبده گر بگشائید
چون دوستان جمع برائید چو یاران مسیح — بر من این ششدر ایام مگر بگشائید
بجهان پشت مبندید و بیک صدمت آه — مهره پشت جهان یک زد گر بگشائید
گریه گر سوی مژه راه بنیابد مژه را — [illegible] گذر بگشائید
غم رصد وار ز لب باج نفس می گیرد — لب نه بیم رصد غم بحذر بگشائید
آگهید از رگ جانم که چه خون می ریزد — خون ز رگهای دل وسوسه گر بگشائید
نه کمید از شجر رز که گشاید رگ آب — رگ خون همچو رگ آب شجر بگشائید
همه هم خوابه و هم درد دل تنگ منید — مرکب خواب مرا تنگ سفر بگشائید
خواب بد دیدم و از بیم خطرناکی خواب — نیک بدرنگ شدم بند خطر بگشائید
آتشی دیدم کو باغ مرا سوخت بخواب — سر این آتش آن باغ بهر بگشائید
گر ندانید که تعبیر کنید آتش و باغ — رمز و تعبیر ز آیات و سور بگشائید
اری آتش اجل و باغ بهر فرزندانست — رفت فرزند شما زیور و زر بگشائید
نازنینان منا مرد چراغ دل من — همچو شمع از مژه خوناب جگر بگشائید

ای نهان راشدگان موی ز سر بگشائید — وز سر موی سر اغوش بزر بگشائید
شد شکسته کرم دست برارید ز جیب — سر زنان نوحه کنان جیب کمر بگشائید
گیسوان بافته چون خوشه چه دارید هنوز — بند آن خوشه که آن بافته تر بگشائید

سکۂ روی بناخن بخراشید چو زر را — خون برنگ شفق از چشمہ خور بگشائید

بامدادان ہمہ شیون لب بام برید — زہ آتشین آب مژہ موج شرر بگشائید

مادرش بر سر خاکست بخون غرق و زخلق — دم فرو بست عجب دارم اگر بگشائید

ای ہمہ عاجز اشکال قدر ممکن نیست — کہ شما مشکل این غم بہ ہنر بگشائید

این نوانید کہ مادر بفراق پسر است — پیش مادر سر تابوت پسر بگشائید

پدر سوختہ در حسرت روی پسر است — کفن از روی پسر پیش پدر بگشائید

تا بہ بینید کہ بباغش نہ سمن ماند نہ سرو — در آں باغ بہ آئین وخطر بگشائید

از پی دیدن آن داغ کہ خاقانی راست — چشم سبدائل از چشم سحر بگشائید

یہ صحیح ہے کہ اگر اس پر اثر قصیدے کو شروع سے آخر تک غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس سوز اور تڑپ کے باوجود مرثیہ میں مضمون آفرینی اور اسے لفظی محاسن سے آراستہ کرنے سے باز نہیں رہا ہے یعنی اس واقعہ سے اس کا دل اور اس کا دماغ دونوں متاثر تھے اور احساسات اور عقل دونوں نے اس کا اثر قبول کیا تھا۔ حالانکہ اگر کسی کا دل آتش غم میں جلے تو اسے نکتہ پردازی اور ہنر نمائی کا ہوش کہاں رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان اشعار میں دل کی آواز صاف سنائی دیتی ہے اور غم زدہ باپ کے لطیف احساسات ان میں نمایاں طور پر جلوہ نما نظر آتے ہیں۔ ان میں سوختگی ہے۔ ان میں دل کی گہرائی ہے۔ اس قسم کے اشعار شاعر کے دیوان میں عام طور پر ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ خاقانی کے دیوان میں دل سے نکلے ہوئے اشعار کی کمی نہیں۔ اس کے ایسے ہی اشعار وہ ہیں جو شاعر نے تنہائی، اپنی بے یاری اور لوگوں کی بے وفائی پر لکھے ہیں یا زندان کی تکلیفوں سے متاثر ہو کر جو قصیدے لکھے ہیں اور جو ان مطلعوں سے شروع ہوتے ہیں:

قلم بخت من شکستہ سر است — موی در سر بطالع ہنر است

دل روی مراد از آن ندیدست　　کز اہل دلی نشان ندیدست
ہر صبح پای صبر بدامن در آورم!　　پرگار عجز گرد سر و تن در آورم
ہر صبح سر ز گلشن سودا در آورم　　وز صور آہ بر فلک آواز آورم

حیرت ہے کہ شاعر نے قید و بند کی مصیبتیں اٹھائیں اور دنیا بھر کے غم سہے، لیکن ان کے باوجود وہ اپنی بردباری اور اپنی عزت نفس کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ عاجزی پر اتر نہیں آتا۔ وہ چاپلوسی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کی زندگی کے حالات اور اس کے اشعار سے یہ بات بالکل واضح ہے۔ امام ناصر الدین کی مدح میں اس نے جو قصیدہ لکھا اس کے یہ اشعار خاقانی کے مردانہ وار تصور زندگی کو بالکل واضح کر دیتے ہیں:

در این دانگہ ارچہ ہمدم ندارم　　بحمد اللہ از ہیچ غم غم ندارم
مرا با من از نیستی ہست سری　　کہ کس را در این باب محرم ندارم
ندارم دل خلق دگر راست خواہی　　سر صحبت خویشتن ہم ندارم!
چو از عالم خویش بیگانہ گشتم　　سر خویشتن ہر دو عالم ندارم
بسیمرغ مانم ز روی حقیقت　　کہ از ہیچ مخلوق ہمدم ندارم
بنام و بوحدت چنو سر فرازم　　کہ این ہر دو معنی از و کم ندارم
مرا کشت وزار بیست در طینت دل　　کہ حاجت بجو او آدم ندارم!
بہ پیش کس از بہر یک خندۂ خوش　　قد خویش چون ماہ نو خم ندارم
چو در سبز پوشان بالا رسیدم　　دگر جامہ حرص معلم ندارم
دہان خشک و دل خستہ ام لیکن از کس　　تمنای جلاب و مرہم ندارم!
بپا از ہر کس ننگرم گرچہ بر خوان　　یکی لقمہ بی شربت سم ندارم

خاقانی ظاہر پرستی، تلبیس اور تملق سے بہت دور بھاگتا ہے اور ہمیں حق پرستی کی دعوت دیتا ہے۔ حتیٰ کہ کمبل پوش صوفیوں تک کو ظاہر کی آرائش سے آزادی

اور باطن کی صفائی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اسی مضمون کو تحفۃ العراقین میں یوں ادا کیا ہے:

معنی طلب از لباس بگذر — دیبا پوشی ز کعبہ خوشتر
کان پیران کاسمان سرشتند — خرقہ ز درون نفس پوشتند
ہر چند بنفشہ صوفی آساست — این معنی صوفیانہ گلراست
صوفی کہ صفاست گوہرش را — چہ کفش چہ تاج زر سرش را

خاقانی کی شعری خصوصیات اور اس کے اخلاق کے ذکر میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے وطن ایران میں جو واقعات پیش آ رہے تھے ان کی عکاسی بڑے ماہرانہ انداز میں کرتا ہے۔ ان واقعات میں غز ترکوں کے ہجوم کرنے کا خونیں حادثہ بھی ہے جو ۵۴۸ھ میں ولایت خراسان میں پیش آیا تھا۔ اس حادثہ نے ملک کو ویران کر دیا اور بے شمار جانیں اس میں ضائع ہوئیں۔ امام محمد یحییٰ جیسے بزرگ اس راستے میں شہید ہوئے۔ ان جانگداز مصائب سے شاعر کا دل بہت متاثر ہوا۔ بے اختیار لب پر نالہ آ گیا اور ان واقعات سے متاثر ہو کر کئی قصیدے لکھے۔ ایسا ہی ایک قصیدہ ہے:

آں مصر مملکت کہ تو دیدی خراب شد — واں نیل مکرمت کہ شنیدی سراب شد

سفر حج اور زیارت بغداد کے موقع پر شاعر نے اسی حساس قلب کے ساتھ ساسانیوں کے پر شکوہ محل کے کھنڈر دیکھے۔ چشم جویان و گریان کے ساتھ ان کا نظارہ کیا۔ ایران کا صاحب دل شاعر اس سے اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار اس کی زبان سے یہ عبرت بار اشعار نکل گئے:

ہاں اے دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہاں — ایوان مداین را آئینہ عبرت دان!
یکرہ ز لب دجلہ منزل بمداین کن! — وز دیدہ دوم دجلہ بر خاک مداین ران
خود دجلہ چنان گرید صد دجلہ خون گوئی — کز گرمی خونابش آتش چکد از مژگان
بینی کہ لب دجلہ چوں کف بدہان آرد — گوئی ز تف آہش لب آبلہ زد چندان

از آتش حسرت بین بریان جگر دجله — خود آب شنیدستی کاتش کندش بریان
بر دجله گری نو نو وز دیده زکوتش ده — گرچه لب دریا هست از دجله زکوة استان
گر دجله در آمیزد باد لب و سوز دل — نیمی شود افسرده نیمی شود آتشدان
تا سلسله ایوان بگست مداین را — در سلسله شد دجله چون سلسله شد پیچان
گه گه بزبان اشک آوازه ایوان را — تا بو که بگوش دل پاسخ شنوی ز ایوان
دندانه هر قصری پندی دهدت نو نو — پند سر دندانه بشنو ز بن دندان
گوید که تو از خاکی ما خاک توئیم اکنون — گامی دو سه بر ما نه اشکی دو سه هم بفشان
از نوحه جغد الحق مائیم بدرد سر — از دیده گلابی کن درد سر ما بنشان
آری چه عجب داری کاندر چمن گیتی — جغد است پی بلبل نوحه است پی الحان
ما بارگه دادیم این رفت ستم بر ما — بر قصر ستمکاران تا خود چه رسد خذلان
گوئی که نگون کرده است ایوان فلک وش را — حکم فلک گردان یا حکم فلک گردان
بر دیده من خندی کاینجا ز چه می گرید — خندند بران دیده کاینجا نشود گریان
این است همان ایوان کز نقش رخ مردم — خاک در او بودی دیوار نگارستان
این است همان درگه کو را ز شهان بودی — دیلم ملک بابل هندو شه ترکستان
این است همان صفه کز هیبت او بودی — بر شیر فلک حمله شیر تن شادروان
پندار همان عهد است از دیده فکرت بین — در سلسله درگه در کوکبه میدان
مست است زمین زیرا خورده است بجای می — در کاس سر هرمز خون دل نوشیروان
کسری و ترنج زر پرویز و تره زرین — بر باد شده یکسر با خاک شده یکسان
پرویز بهر خوانی زرین تره گستردی — کردی ز بساط زر زرین تره را بستان
پرویز چنین گم شد زان گم شده کمتر گو — زرین تره کو برخوان رو کم ترکوا برخوان
خاقانی ازین درگه دریوزه عبرت کن — تا از در تو زین پس دریوزه کند خاقان

مجیر الدین بیلقانی

اس زمانے کے آذربایجانی شاعروں میں ایک مجیر الدین بیلقانی بھی ہے بیلقان، آذربایجان کے شمال میں واقع ہے اور شہرستان کے ایک شہر اراّن اور علاقہ شروان کا ایک قصبہ ہے۔

اس شاعر کے تفصیلی حالات زندگی معلوم نہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ وہ نہایت خوش لحن اور بلند پایہ قصیدہ گو شاعر تھا۔ اس نے شمالی آذربایجان کے امراء میں سے ایک امیر سیف الدین ارسلان کی مدح کی ہے۔ اس کے سوا اس نے عراق کے سلجوقی بادشاہ ارسلان بن طغرل بن محمد ملک شاہ سلجوقی (۵۵۵-۵۷۱) اور آذربایجان کے اتابکوں میں اتابک ایلدگز (۵۵۵-۵۶۸) اس کے بیٹے جہاں پہلوان محمد بن ایلدگز (۵۶۸-۵۸۱) اور قزل ارسلان عثمان بن ایلدگز (۵۸۱-۵۸۷) کی مدح کی ہے۔

معلوم ہوتا ہے مجیر الدین کو ان امیروں کے دربار میں رسوخ حاصل تھا۔ شعر خوب لکھتا تھا، ان کی مدح کرتا تھا اور ان سے انعام واکرام حاصل کرتا تھا۔ محمد ایلدگز جہاں پہلوان نے اسے جاہ و مال اور فارغ البالی بخشی تھی۔

ابتداء میں قزل ارسلان نے بھی اس کی بڑی قدر کی۔ پھر کسی وجہ سے دو اور شعراء اثیر الدین اخسیکتی اور جمال الدین اشہری کو اپنے دربار میں بلایا اور انھیں مجیر پر برتری عطا کی چنانچہ وہ اپنے اس قصیدہ میں جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

شاہا بدان خدای کہ آثار صنع او جان بخشی و وجود دہی بندہ پرورست

کہتا ہے:

گفتند کرد شاہ جہاں از اثیر یاد! وز اشہری کہ بنشیۂ او مدح گستر است
داند خدایگان کہ سخن ختم شد بمن تا در عراق صنعت طبع سخنور است

جیسا کہ ہم جانتے ہیں مجیر الدین، خاقانی کا شاگرد تھا۔ لیکن بعد میں کچھ ایسے افسوسناک واقعات پیش آئے کہ وہ استاد کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا اور بالکل اسی طرح جیسے

خاقانی نے اپنے استاد ابوالعلار گنجوی کی ہجو کی تھی مجیر نے بھی خاقانی کی ہجو کی۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ مجیر اصفہان کا صوبہ دار مقرر ہو کر وہاں آیا تھا، لیکن چونکہ خود وہ اس عہدہ کا اہل نہ تھا اس لیئے اصفہان والوں نے اس کی پرواہ نہ کی اس بات سے اسے بڑا رنج ہوا اور اس نے ہزل میں اصفہانیوں کی ہجو لکھی۔ اس میں یہ رباعی بھی ہے:

گفتم زصفاہاں مددِ جاں خیزد ! — لعلی است مروت کہ ازاں کان خیزد
کی دانستم کاہل صفاہان کورند — با ایں ہمہ سرمہ کز صفاہاں خیزد

ایسے ہی کچھ اور شعر ملاحظہ ہوں:

صفاہاں خرّم و خوش می نماید — بساں پر شہر آرائی طاؤس
ولی زین زاغ طبعان کاہل شہرند — خجل شد بال خوش سیمائی طاؤس
یقین می دان کہ سیمرغ صفاہان — چو طاؤس است وا نیان پائی طاؤس

ان اشعار کی وجہ سے اصفہان کے لوگ اور بھی برہم ہوئے اور یہاں کے شاعروں نے بھی جواب میں اس کی خوب ہجو کی۔

اسی سلسلہ میں جمال الدین عبدالرزاق نے اس تصور میں کہ مجیر نے یہ ہجو خاقانی کے اشارے پر لکھی ہے مجیر اور خاقانی دونوں کی ہجو لکھ ڈالی۔ خاقانی کے کانوں تک یہ ہجو پہنچی۔ تو اس نے رفع اشتباہ کے لیئے اصفہان کی مدح میں اپنا وہ مشہور قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے:

نکہت حور است یا صفائی صفاہان — جبہت جوز است یا لقای صفاہان

اس قصیدے میں مجیر کو الٹ کر "رجیم" بنایا ہے اور اس کی اس طرح ہجو کی ہے:

دیو رجیم آنکہ بود دز ربیانم — گر دم طغیان زد از ہجای صفاہان
او بقیامت سپید روی نخیزد — زانکہ سیہ بست بر قفای صفاہاں

ایک روایت کے مطابق اصفہان کے اوباش عوام نے مجیر کو ۵۸۶ھ میں مار ڈالا۔

مجیر کا دیوان ملتا ہے۔ اس میں قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات ہیں۔ وہ ایک نہایت اچھا قصیدہ گو شاعر تھا۔ اس کے کلام میں شیرینی، لطافت اور اثر موجود ہے لیکن علمی گہرائی یا روحانی بلندی اس کی شاعری میں کم ہی ملتی ہے۔ مدح میں وہ اسی شاعرانہ مبالغہ، ماہرانہ ہنر نمائی، استادانہ تشبیہ اور استعارے سے کام لیتا ہے جو خراسان کے شاعروں کی خصوصیت ہے۔ وہ اپنے ممدوح کے عدل، اس کی سخاوت، امن دوستی اور شجاعت کی داد دیتا ہے اور بار بار داد دیتا ہے۔ سلجوقیوں کی ایک تاریخ "راحت الصدور" کے مصنف نے مجیر کے چند قصیدے جو سلطان ارسلان کی مدح میں ہیں اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں ان میں سے چند کے نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

شاہ جہان ارسلان کہ در چمن ملک — آمد از و شاخ فتح بار گرفتہ
آنکہ ز تاثیر عدل اوست دریں دور — مور مکان در دہان مار گرفتہ
سایہ چترش کہ عالمست بصد فتح — ملک جہاں آفتاب وار گرفتہ
گنبد گردوں لقب شکوہ و لطافت — از دل او روز بزم بار گرفتہ
موج کف زر فشان او گہ بخشش — شہرہ ایں سقف زرنگار گرفتہ
خطبہ و سکہ ز نام و کنیت عالیش — مایہ و قانون و افتخار گرفتہ

ذیل کے اشعار بھی ارسلان بن طغرل کی مدح میں ہیں۔ ان میں شاعر نے نہ صرف اچھوتے مضامین باندھے ہیں اور نکتہ جوئی سے کام لیا ہے بلکہ اس کے قالب کلام میں اثر بھی ہویدا ہے۔ ان میں نہ صرف عاقلانہ نکتہ پردازی ہے بلکہ احساسات دروئی بھی جلوہ گر ہیں۔

باد صبحت کہ مشاطہ جعد چمنست — یا دم عیسی پیوند نسیم سمنست
نکہت نافہ مشکست نہ نافست و نہ مشک — اثر آہ جگر سوختۂ ہمچو منست
نفس سرد سحر گرم رواز بہر چہ است — یا دم آمد زپی آنکہ رسول چمنست

یارب ایں شیوہ نو چیست کہ از جنبش باد — طرّہ لالہ پر از نافہ مشک ختنست

باد با دست تہی بر سر خس تاج نہست — ابر با دامن پر بر در گل نوبہ زنست

بید یا سبح زن باغست و صبا حلقہ ربای — ابر نادر کن و صاعقہ زد بین فکنست

لالہ و گل را ز اندیشہ آن عمر کہ نیست — گر دلی ہست ہمہ روزہ بغم ممتحنست

سبزہ گر نیم چہ بر آب کشند باکی نیست — کاب را روز و شب از باد زرہ در بدنست

اسی طرح کے اور قصیدے جو قزل ارسلان اور دوسرے امرا کی مدح میں لکھے ہیں، راحۃ الصدور میں آئے ہیں۔

جیساکہ ہم جانتے ہیں خاقانی، نظامی، اثیرالدین اخسیکتی، اشہری، جمال الدین عبدالرزاق وغیرہ جیسے بڑے بڑے شاعر مجیر کے ہم عصر تھے اور ان میں سے اکثر ایک دوسرے سے مناظرہ اور معارضہ رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہم خاقانی اور جمال الدین کا ذکر کر چکے ہیں۔ اثیرالدین سے بھی اس کی نظیرہ گوئی اور ہجو بازی ہو چکی ہے۔ امیر خسرو دہلوی نے اپنے دیوان غرۃ الکمال میں مجیر کی تعریف کی ہے اور اسے خاقانی پر برتری عطا کی ہے

شاعر کی زندگی نہ صرف یہ کہ اس طرح کی ناروا باتوں میں گزری اور حاسدوں اور بد خواہوں نے اسے ستایا بلکہ معیشت کے لحاظ سے بھی اس کی زندگی تنگدستی میں گذری اور خوش بختی کی اس نے کبھی صورت نہ دیکھی۔ چنانچہ اس کے بعض قصیدوں سے یہ حقیقت بالکل واضح ہے۔ ایسا ہی ایک قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

ہر شب کہ سر بجیب تحیر فرو برم — ستر فلک بدرم وا زسدرہ بگذرم

اس قصیدے میں شاعر نے اپنے فقر اپنی زندگی کی مصیبت اور دنیا کے خسیسوں کے طعنوں کا ذکر کیا ہے۔ لوگوں کے احسان اٹھانے پر موت کو ترجیح دی ہے۔ ذیل کا قصیدہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے:

تا دست خوش جہان شدم من! — در دست قناعتم ممکّن!!

خود را بہ ہزار فن گستم	از ہمدمی جہاں پرفن
بی سر بزم چو مردم چشم	با مردمی از ہمہ جہاں من
برپا بنہم چو مرغ آزاد	از دانہ دل شدم مستمن
محنت شودم سپر ز محنت	کاہن شود آئینہ ز آہن
شبدوست از آں شدم کہ در شب	خورشید تابدم بروزن!
گر شمع فلک بسازدم قوت	چوں شمع کنم نوالہ از تن
از خود نہ برای خود بسازم	مانندہ عنکبوت مسکن
حلوای زمانہ چوں خورم کو	خونیست فشردہ از تن من
شادم کہ شدست گردن دہر	از گوہر نظم من مزین
سنگ سخن از مجرہ بگذشت	تا یافت بطبع من فلاخن

عجب نہیں اس آخری شعر میں شاعر نے منوچہری کے قصیدۂ نونیہ کو اپنے پیش نظر رکھا ہو۔ شاعر نے اپنی رنجیدگی، حاسدوں کے حسد، فرزند آدم کی ستم گاری اپنے کلام کی زیبائی اور اپنی طبع رواں کی جودت کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔

فلکی شروانی اس عہد کے آذر بایجانی شاعروں میں ایک ابوالنظام محمد فلکی شروانی بھی ہے۔ یہ شاعر چھٹی صدی ہجری کی ابتدا میں قصبہ شماخی شروان میں پیدا ہوا۔ علوم متداولہ میں کامل تھا اور خاص کر علوم نجوم میں بڑی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ اسی لحاظ سے فلکی تخلص اختیار کیا تھا۔ ایک تذکرہ نویس کے قول کے مطابق نجوم پہ اس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ فلکی نے اپنی پوری زندگی شہرستان شہروان اور شروانشاہوں کے دربار میں خاص کر خاقان اکبر منوچہر بن فریدون کے دربار میں بسر کی۔ چنانچہ اپنے قصیدوں میں اس کی کئی جگہ تعریف کی ہے۔ افسوس ہے یہ شاعر بھی خاقانی کی طرح مدتوں قید رہا۔ چنانچہ اپنے اشعار میں وہ

اپنی اس ناکامی پر ماتم کرتا ہے ۔

ہیچ کس چارہ سازِ کارم نیست　　چکنم بخت سازگارم نیست

ستم روزگار کا شکوہ کرتا ہے ۔ خاقانی کی طرح اسے اپنے وطن میں کوئی جانی دوست نہ مل سکا، چنانچہ اسی قصیدہ میں ایک جگہ کہتا ہے :

زیں دیارم نژاد بود ولیک　　ہیچ یار اندریں دیارم نیست

تقی الدین کاشی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس نے ۵۸۷ھ میں وفات پائی ۔
فلکی نے قصیدے، غزل، قطعات، رباعیاں اور مسمط لکھے ہیں۔ تذکروں میں اس کے اشعار کی تعداد (۰۰۰،) لکھی ہے لیکن جو دیوان چھپا ہے ان میں صرف بارہ سو اشعار ملتے ہیں
فلکی کے اشعار اپنے ہم عصروں اور ہم وطنوں جیسے خاقانی کی بہ نسبت بہت زیادہ سادہ اور رواں ہیں ۔ ان میں اینچ اور تصرف بہت کم ہے لیکن اس کا کلام نہایت شیریں، دلکش اور رواں ہے ۔ اس نے زیادہ تر قصیدے لکھے ہیں اور اکثر قصیدوں میں تغزل سے کام لیا ہے مے اور معشوق کا ذکر عام ہے ۔ مدح میں فنی مبالغہ سے کام لیا ہے یعنی بدیعہ گوئی اس کو بہت زیادہ پسند تھی ۔ مثلاً یہ قصیدہ ملاحظہ ہو :

دوش چو کرد آسماں افسر زر زسر یلہ　　ساخت زماہ و اختراں یارہ عقد و سلسلہ
شکل فلک خراش شد مہر چو دانہ آسکسں　　عقدہ راس داس شد از پی کشت سنبلہ
طرف جبیں نمود ماہ از طرف بساط شاہ　　آمدہ با قبول و جاہ از قبل مقابلہ
از پی تیر آسمان ساختہ ماہ نو کمان　　تا زکمان بہ بدگماں ہیچو یلاں کند یلہ
زہرہ چو شیر شرزہ ای بردہ ز دہر بہرہ ای　　آختہ شہرہ دہرہ ای دادہ صقال و مصقلہ
شاہ فلک ز بارگہ کردہ بساط خوابگہ　　بر در بارگہ سیہ ساختہ شمع و مشعلہ
شیر سپہر پنجمیں شیر سپہر کردہ زیں　　خیرہ چو شیر ہا بکین تا کہ کند مجادلہ

خراسانی شاعروں کا اثر اس کی شاعری پر نمایاں ہے ۔ کہتے ہیں اس نے مسعود سعد کا

کلام خوب پڑھا تھا۔ یہ اشعار خراسانی طرز کی یاد تازہ کردیتے ہیں :

نارست شعلہ شعلہ دلبرم ز تاب　　مارست عقدہ عقدہ دو زلفش بر آفتاب

زین شعلہ شعلۂ آتش نهفته روز　　زان عقدہ عقدہ عقدۂ تنین گرفته آب

چون نافه نافه مشک دو زلفش برنگ و بو　　در توده توده عنبر تو برده رنگ و آب

زین نافه نافۂ مشک اندر اهتمام　　زان توده توده تودۂ عنبر در اکتساب

اس صنعت تکرار کو فلکی سے پہلے خراسان کے کئی شاعر استعمال کر چکے ہیں، مثلاً عسجدی کہتا ہے :

باران قطره قطره همی بارم ابروار　　هر روز خیره خیره ازین چشم سیل بار

زان قطره قطره قطرۂ باران شده خجل　　زین خیره خیره خیره دل من ز هجر یار

یاری که ذره ذره نماید همی نظر　　هجران پاره پاره من بر نهاد بار

زان ذره ذره چو کوه آیدم بدل　　زان پاره پاره پاره بچشم آیدم غبار

فلکی کی شاعری کا بیشتر حصہ فنی ہے اور صنائع و بدائع کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے لیکن اس کے پاس ایسے اشعار کی کمی نہیں جو سادہ ہیں اور دل سے نکلے ہیں۔ ایسا ہی ایک قصیدہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ان اشعار میں شاعر نے فراق کی جو دلی کیفیات پیش کی ہیں وہ نہایت پر اثر ہیں :

سودازدۂ فراق یارم　　بازیچۂ دست روزگارم

ناچیده گلی ز گلبن وصل　　صد گونه نهاد هجر خارم

بی آنکه شراب وصل خوردم　　از شربت هجر در خمارم

اندیشه دل نمی گذارد　　یک لحظه مرا که دم برآرم

نتوانم گفت کز غم دل　　ایام چگونه می گذارم

از بهر خدا یه انگوئی !　　ایدل که ز دست تو چه دارم

یکبارہ سیاہ گشت روزم — یکبارہ تباہ گشت کارم!
این جامہ صبر چند پوشم — وین تخم امید چند کارم
کارم ہمہ انتظار و صبر ست — من گشتۂ صبر و انتظارم
دل دارم و رفت دلنوازم — غم دارم و نیست غمگسارم
عید آمد و شد جدا ز من یار — عیدم چہ بود چو نیست یارم
ای آنکہ ز بیم خشم نامت — گفتم بزبان ہمی نیارم
جز نقش خیال تو نجویم — بر ہر چہ دو دیدہ بر گمارم
دریاب ز بہر روز فردا — امروز مرا کہ سخت زارم

نظامی حکیم ابو محمد الیاس بن یوسف بن زکی بن موید نظامی ۵۳۵ھ میں بہ مقام گنجہ (موجودہ الزبتھ پول (ELZABETH POLE) مترجم) پیدا ہوئے جو نواحِ آذر بایجان میں واقع ہے۔ نظامی نے اپنے اشعار میں کئی جگہ گنجہ کا ذکر کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں:

نظامی ز گنجہ بگشای بند — گرفتاری گنجہ تا چند چند
نظامی کہ در گنجہ شد شہر بند — مبادا ز سلام تو نا بہرہ مند

ان کی تاریخِ ولادت کی ایک اور دلیل خود ان کا ایک شعر ہے، یہ شعر مخزن الاسرار میں ملتا ہے جو ۵۷۰ھ میں لکھی گئی ہے۔ کہتے ہیں:

پانصد و ہفتاد بس ایام خواب — روز بلند است بمجلس شتاب

نظامی نے جو اشعار رشک کرنے والوں کی برائی میں لکھے ہیں ان میں اپنی جوانی اور رشک کرنے والے شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت انکی عمر (۳۵) اور (۴۰) کے درمیان تھی۔ دوسری طرف ان کی جو عمر بتائی گئی ہے اور ان کا جو سال وفات ہمیں معلوم ہے اس کے لحاظ سے بھی ان کا یہ سنہ ولادت صحت سے قریب ہے۔

گنجہ کے باشندے سنی اور کٹر سنی تھے۔ یہاں علمار اور فضلا، کی کمی نہ تھی۔ جوانی میں نظامی ان سے بہت متاثر ہوئے تھے اور ان کی صحبتوں سے اکتساب فیض کیا تھا۔

نظامی نے اپنی مثنوی لیلیٰ ومجنوں میں اپنے والد اور والدہ کا ذکر کیا ہے اور ان کی موت کا دردناک اشعار میں ذکر کیا ہے غالباً نظامی کے والدین ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے کہتے ہیں:

گر شد پدرم بہ سنت جد | یوسف پسر زکی مؤید!!
با دور بداوری چہ کوشم | دور است نہ دور چوں خروشم
گر مادر من رئیسہ کرد! | مادر صفتانہ پیش من مرد
آں لابہ گری کہ اکنم یاد | تا پیش من آردش بفریاد
با این غم و درد بی کنارہ | داروی فرامشیت چارہ

نظامی نے شادی بھی کی تھی ان کا ایک لڑکا محمد نامی تھا۔ مثنوی خسرو شیریں کے اختتام کے وقت اس کی عمر سات سال تھی۔ چنانچہ کہتے ہیں:

ببیں ای ہفت سالہ قرۃ العین | مقام خویشتن در قاب قوسین

چونکہ مثنوی خسرو شیریں ۵۷۶ھ میں ختم ہوئی ہے اس حساب سے محمد ۵۶۹ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ لیلیٰ ومجنوں کی ابتداء کے وقت ان کی عمر (۱۴) سال تھی، چنانچہ کہتے ہیں:

ای چاردہ سالہ قرۃ العین | بالغ نظر علوم کونین

ہفت پیکر میں بھی اپنے اس لڑکے کا نام لیا ہے:

شاعر نے اپنے فرزند کا نام لے کر حکیمانہ نصیحتیں کی ہیں جو نہایت دلکش اور دلنشین ہیں۔ لیکن اقبال نامہ میں اس لڑکے کا نام نہیں لیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اپنے اس لڑکے سے کچھ ناراض ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جس بچہ نے لڑکپن میں ایسی دلنشین نصیحتیں سنی تھیں۔ جوان ہو کر اس نے ان سب کو بھلا دیا تھا۔ چنانچہ اس شعر میں

اس کی طرف اشارہ ملتا ہے :

چو شد جامہ بر قد فرزند راست — نباید دگر مہر فرزند خواست

نظامی کے ایک ماموں خواجہ عمر تھے۔ ان کے بارے میں کہتے ہیں :

گر خواجہ عمر کہ خال من بود — خالی شدنش وبال من بود

اس زمانہ میں آذر بایجان اور اس کے اطراف کے علاقہ پر مختلف خاندان حکمران تھے۔ ان میں آذر بایجان اور موصل کے اتابک اور شروان شاہ نے اس زمانے میں بڑی شہرت پائی۔ یہ سب خاندان سلجوقی سلطنت کے باج گذار تھے۔ نظامی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے وطن گنجہ ہی میں گذارا اور بڑے بڑے سفر نہیں کئے۔ صرف ایک بار اتابک قزل ارسلان کے حکم کی تعمیل میں تبریز تک کا سفر کیا تھا۔

اس خوش طبع اور سخن سنج شاعر کے حالات اور اس کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظاہرداری کے رسوم کا کچھ ایسا پابند نہ تھا حالانکہ مذکورہ بالا حکمران خاندانوں کے بعض سلاطین کی نظامی نے مدح کی ہے۔ یہ بادشاہ بھی ان کی قدر کرتے تھے اور انکو نوازنے میں کمی نہ کرتے تھے لیکن نظامی نے ان کی مدح میں کبھی مبالغہ نہیں کیا اور صرف بادشاہوں سے انعام واکرام حاصل کرنے کے لئے شعر نہیں لکھے خصوصاً اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ گوشہ گیر ہو گئے تھے اور دنیا سے آزردہ تھے۔ انھوں نے امراء کی پیش گاہ میں کبھی اپنا سر نیاز نہیں جھکایا۔ شاعری میں سچائی کا راستہ اختیار کیا، جھوٹ اور بری باتوں سے پرہیز کیا۔ چنانچہ مثنوی خسرو شیریں میں کہتے ہیں :

منم روی از جہاں در گوشہ کردہ — کمی از زیست جور انوشہ کردہ

اگر چہ در سخن کاب حیات است — بود جایز ہر انچہ از ممکنات است

چوں نتواں راستی را درج کردن — دروغی را چہ باید خرج کردن

دگر گوئی سخن را فت در کم گشت — کسی کو راست گوشد محتشم گشت

شاعر کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فضیلت صرف شعر و شاعری پر ہی منحصر نہ تھی۔ انھیں جوانی ہی سے فنون ادب، تاریخ اور قصص سے بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے علوم کے حاصل کرنے پر کمر ہمت کسی تھی۔ اور خاص کر علم نجوم میں بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:

هرچه هست از دقیقه‌های نجوم | با یکایک نهفته‌های علوم
خواندم و هر ورق که می‌جستم | چون ترا یافتم ورق شستم

نظامی کی شہرت کی بنیاد اور ان کی استادی کا ثبوت ان کی کتاب خمسہ یا پنج گنج ہے جو مثنوی کی طرز میں لکھی گئی ہے۔ اس میں کم و بیش ۲۸ ہزار شعر ہیں۔ ان میں سب سے پہلی مثنوی مخزن الاسرار زہد و تقویٰ اور معنوی مقامات پر لکھی گئی ہے۔ باقی چار مثنویاں قصص و حکایات پر مشتمل ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

خسرو شیریں، لیلیٰ و مجنوں، ہفت پیکر اور سکندر نامہ۔

خمسہ کی ترتیب کے بارے میں خود نظامی اسکندر نامہ میں کہتے ہیں:

سوی مخزن آوردم اول بسیچ | که سستی نکردم در آن کار هیچ
وزو چرب و شیرینی انگیختم | به شیرین و خسرو در آویختم
وز آنجا سراپرده بیرون زدم | در عشق لیلی و مجنون زدم
وزین قصه چون باز پرداختم | سوی هفت پیکر فرس تاختم
کنون بر بساط سخن پروری | زنم کوس اقبال اسکندری

پنج گنج کی تالیف کی تاریخ اس کتاب کے اشعار سے معلوم ہوتی ہے، اور حسب ذیل ہے:
مثنوی مخزن الاسرار ۵۷۵ھ میں لکھی گئی اور روم کے سلجوقی بادشاہ قلج ارسلان کے باج گذار فخر الدین بہرام شاہ بن داؤد (متوفی ۶۲۲ھ) حکمران ارزنگان کے نام معنون کی گئی ہے:

اس وقت مصنف کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی، خود کہتے ہیں :

شاہ فلک تاج سلیمان نگین — مفخر آفاق ملک فخر دین
یک دلۂ شش جہت ہفت گاہ — نقطۂ نہ دایرہ بہرام شاہ
خاص کن ملک جہاں بر عموم — ہم ملک ارمن و ہم شاہ روم

اس مناسبت سے حدیقۂ سنائی کو جو بیسویں غزنوی حکمران بہرام شاہ بن مسعود کے نام معنون کیا گیا ہے۔ یاد کیا ہے۔ کہتے ہیں :۔

نامہ دو آمد ز دو ناموس گاہ — ہر دو مسجّل بدو بہرام شاہ!
آں بدر آورد نہ غزنین علم — ویں زدہ بر سکہ رومی رقم

حدیقہ کے مطلع کا شعر یہ ہے :

فاتحہ فکرت و ختم سخن — نام خدایست بر او ختم کن

مثنوی خسرو شیریں ساسانی دور کی ایک داستان ہے۔ اس میں نظامی نے اپنے زمانے کے مشہور امراء کے نام لئے ہیں۔ مثلاً عراق اور کردستان کے سلجوقی بادشاہ طغرل بن ارسلان (۵۷۳-۵۹۰)، شمس الدین بن جعفر محمد بن ایلدیگز جہاں پہلوان (۵۶۸-۵۷۲) اور آذر بایجان کے اتابکوں میں جہاں پہلوان کے بھائی قزل ارسلان ایلدگز (۵۸۲-۵۸۸) یہ مثنوی انھوں نے شمس الدین محمد کے نام معنون کی ہے اور کہا ہے :

طرازِ آفریں بستم قلم را — زدم بر نام شاہنشہ درم را

خسرو شیریں ۵۷۶ھ میں ختم ہوئی۔ چنانچہ اس شعر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے :

گذشتہ پانصد و ہفتاد و شش سال — نزد بر خط خوباں کس چنیں فال

اس مثنوی کے اشعار کی تعداد چھ ہزار اشعار سے زیادہ ہے۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے اس قصے کو سب سے پہلے فردوسی نے نظم کا جامہ پہنایا تھا (۱۹) نظامی نے اس میں کئی تصرف کئے ہیں۔ استاد طوسی کے بارے میں کہتے ہیں :۔

حکیمی کایں حکایت شرح کردست | حدیث عشق از ایشان طرح کردست
نگفتم ہرچہ دانا گفت ز آغاز | کہ فرخ نیست گفتن گفتہ را باز

مثنوی لیلیٰ و مجنوں ۵۸۴ھ میں شروانشاہ ابو المظفر اختستان بن منوچہر... کی فرمائش پر لکھی گئی ہے۔ شروانشاہ نے ایک خط لکھ کر اپنے قاصد کے ہاتھ نظامی کے پاس بھیجا تھا اور اس خط میں اس بات کی فرمائش کی تھی۔ شاعر نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں یہ قصہ نظم کر دیا اور اسی کے نام معنون کر دیا۔ اس میں شروانشاہ کی مدح بھی کی ہے کہتے ہیں

تاج ملکان ابو المظفر | زبیندہ تخت ہفت کشور
شروانشہ آفتاب سایہ | کیخسرو کیقباد پایہ!
شاہ سخن اختستان کہ نامش | ہرسیت کہ ہر شد غلامش

لیلیٰ و مجنوں میں چار ہزار شعر ہیں۔ اس کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:

اے نام تو بہترین سر آغاز | بی نام تو نامہ کی کنم باز

خسرو شیریں ایک ایرانی داستان ہے۔ اس کے برعکس لیلیٰ و مجنوں میں ایک عربی داستان پیش کی گئی ہے۔

ہفت پیکر یا بہرام نامہ بھی ساسانی عہد کی ایک ایرانی داستان ہے۔ یہ مثنوی ۵۹۳ھ میں لکھی اور اسے علاء الدین کرب ارسلان کے نام معنون کیا یہ علاء الدین مراغہ کا امیر تھا اور اقسنقر کی اولاد میں تھا۔ چنانچہ نظامی کہتے ہیں:

از پس پانصد و نود سہ قران | گفتم این نامہ را چو ناموران
عمدۃ المملکت علاء الدین | حافظ و ناصر زمان و زمین
شاہ کرب ارسلان کشور گیر | بہ ز الب ارسلان بتاج و سریر
نسل اقسنقری موید از او | جد و آباء کمال احمد از او

ہفت پیکر میں چار ہزار چھ سو اشعار ہیں۔ اس کا آغاز اس شعر سے کرتے ہیں:

ای جہاں دیدہ بود خویش از تو　　ہیچ بودی بنودہ پیش از تو!

اسکندر نامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں سکندر کو ایک بڑے فاتح کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں اسے ایک حکیم اور پیمبر کی حیثیت دی ہے۔ نظامی نے اس مثنوی کو "شرف نامہ" "مقبل نامہ" اور "اقبال نامہ" کا نام بھی دیا ہے۔ کہیں دونوں حصوں میں سے ایک کو ان ناموں سے یاد کیا ہے اور دوسرے حصہ کو خرد نامہ بھی کہا ہے۔

اسکندر نامہ نصرۃ الدین ابوبکر محمد جہاں پہلوان (۵۸۷-۶۰۷) کے نام معنون کیا ہے جو آذربایجان کا اتابک تھا۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:

جہاں پہلوان نصرۃ الدین کہ ہست　　بہ اعدا رخود چوں فلک چیرہ دست

ذیل کے شعر میں بادشاہ کے نام کے حروف کے اعداد کی طرف اشارہ کیا ہے جو ابوبکر ہے:

بدیں گونہ شش چیز در ظرف تست　　گواہ سخن نام شش حرف تست

سکندر نامہ کے بعض نسخوں میں اس کے دوسرے حصہ کا نام شرف نامہ ملتا ہے۔ اس میں موصل کے حاکم الملک القاہر عزالدین ابوالفتح مسعود بن نورالدین ارسلان شاہ (۶۰۷-۶۱۵) کی اس طرح مدح کی ہے:

سر سر فرازان و گردن کشاں　　ملک عز دین قاہر شہ نشاں

طغرای دولت چو طغرل تکین!　　ابوالفتح مسعود بن نور دین!!

نظامی کے حسب ذیل اشعار کی بنا پر سکندر نامہ کی تالیف کا سنہ ۵۹۷ھ ہے:

بگفتم من ایں نامہ را در جہاں　　کہ تا دور آخر بود در جہاں

بتاریخ پانصد نود ہفت سال　　چہارم محرم بوقت زوال

لیکن اگر وہ اشعار جو ملک القاہر عزالدین مسعود سے متعلق اوپر نقل ہوئے ہیں نظامی ہی کے ہیں تو کم سے کم یہ ماننا پڑے گا کہ اسکندر نامہ کا خاتمہ ۵۹۷ھ میں نظم ہوا، اور نظامی کم سے کم اس سنہ تک ضرور زندہ تھے۔

اسکندر نامہ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں :

خدایا جہاں پادشائی تراست — زما خدمت آید خدائی تراست

اس داستان کو بھی خسرو شیریں کی طرح سب سے پہلے استاد فردوسی طوسی نے نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ نظامی نے استاد کی اس افضلیت کو تسلیم کیا ہے اور خود اس کے مکمل کرنے کا ذکر اس طرح کیا ہے :

سخن گوئی پیشینہ دانای طوس — کہ آراست روی سخن چون عروس

دران نامہ کاں گوہر سفتہ راند — بسی گفتنیہا کہ ناگفتہ ماند!

نگفت انچہ رغبت پذیرش نبود — ہماں گفت کز دی گزیرش نبود

نظامی کہ در رشتہ گوہر کشید — قلم دیدہ ہا را قلم در کشید

اسکندر نامہ کے ایک قطعہ کے مطابق اسکندر نامہ کی تالیف کے وقت نظامی کی عمر ساڑھے ترسٹھ سال تھی۔ چونکہ ان کا سن ولادت ۵۳۵ھ ہے اس لئے ان کا سنہ وفات ۵۹۹ قرار پاتا ہے اور یہ تخمینہ دوسرے قرائن سے بھی قریب تر معلوم ہوتا ہے۔ بہر صورت اسکندر نامہ کی تالیف ہفت پیکر کے نظم کرنے کے بعد یعنی ۵۹۳ھ کے بعد ہوئی ہے۔ سکندر نامہ کے اشعار کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔

سبک اور شاعری

نظامی کا شمار بہت بڑے داستان سرا شعراء میں ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ فردوسی کے بعد پھر کوئی دوسرا ان کے برابر شہرت حاصل نہ کر سکا۔ بے شبہ داستانی مثنوی کے وہ استاد اور دوسروں کے پیشرو ہیں۔

نظامی کا سبک متین اور ان کی نظم شیریں ہے۔ ان کے شعر صاف اور رواں ہیں اور ان کا کلام تعقید سے بالکل پاک ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان کے اشعار میں پیچیدہ عبارتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ نظامی نے داستان سرائی میں حکیم فردوسی کو اپنا نمونہ بنایا تھا، لیکن جیسا کہ کہا جا چکا ہے اس طرزِ سخن میں خود انھوں نے بڑا کمال حاصل کیا اور

امیر خسرو، جامی اور دوسرے شاعروں کے لئے نمونہ بنے خمسہ کے بعض اشعار جن میں انسان کے فطری اور طبعی احساس کی عکاسی کی گئی ہے فارسی زبان کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں
نظامی کے وہ اشعار جو انھوں نے معانی حکمت، توحید اور نعت میں لکھے ہیں، بڑے بلند پایہ اور ایک مخصوص لحن اور بڑی لطافت کے حامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے مقامِ توحید اور نعت کو اپنے کلام میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے کلام کو ایک خاص عظمت حاصل ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی پانچوں مثنویوں کے ابتدائی حصے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہاں مخزن الاسرار۔ کے مقدمہ سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جو پروردگار عالم کی توحید میں لکھے گئے ہیں:

ای ہمہ ہستی ز تو پیدا شدہ	خاک ضعیف از تو توانا شدہ
زیر نشین علمت کائنات	ما بتو قائم چو تو قائم بذات
ہستی تو صورت و پیوند نہ	تو بکس و کس بتو مانند نہ
آنچہ تغیر نپذیرد توئی	انکہ نمردہ است و نمیرد توئی
ما ہمہ فانی و بقا بس تو راست	ملک تعالی و تقدس تو راست
ساقی شب دستکش جام تست	مرغ سحر دستخوش نام تست
پردہ برانداز و برون آی فرد	گر منم آں پردہ بہم در نورد
عجز فلک را بفلک وانمائی	عقد جہاں را ز جہاں واگشائی
ای بازل بودہ و نابودہ ما	وی باید ماندہ و فرسودہ ما
دور جنیبت کش فرمان تست	سفت فلک غاشیہ گردان تست

اسی طرح خسرو شیریں میں آیا ہے:

بنام آنکہ ہستی نام ازو یافت	فلک جنبش زمیں آرام ازو یافت
خدائی کافرینش در سجودش	گواہی مطلق آمد بر وجودش

تعالی اللہ یکی بی شل و مانند ۔ کہ خوانندش خداوندان خداوند
فلک بر پای دار و انجم افروز ۔ خرد را بی میانجی حکمت آموز
جواہر بخش فکرت ہای باریک ۔ بروں آرندۂ شبہای تاریک
غم و شادی نگار و بیم و امید ۔ شب و روزہ آفرین ماہ و خورشید
نگہدارندۂ بالا و پستی! ۔ گوا بر ہستی او جملہ ہستی
وجودش بر ہمہ موجود قاہر ۔ نشانش بر ہمہ بینندہ ظاہر
کواکب را بقدرت کار فرمای ۔ طبایع را بصنعت گوہر آرای
سواد دیدۂ باریک بیناں ۔ انیس خاطر خلوت نشیناں
خداوندی کہ چوں نامش بخوانی ۔ نیابی در جوابش لن ترانی

اگرچہ شاعر کی نظر داستان سرائی کی طرف ہی رہی ہے اس کے باوجود داستان کے ضمن میں شاعر نے اخلاقی اور حکمی مضامین بھی پیش کئے ہیں اور غفلت سے جاگنے کی نصیحتیں کی ہیں۔ اس لحاظ سے نظامی کا کلام فردوسی کے کلام سے بہت ملتا جلتا ہے، فردوسی نے بھی کہیں کہیں داستان کے ضمن میں پند و عبرت کو نظم کیا ہے۔ پند آمیز اشعار کے درمیان نظامی نے بڑے دلنشین اور لطیف اشعار لکھے ہیں۔ ان میں خاص طور پر وہ اشعار جو انھوں نے اپنے فرزند محمد نظامی کو مخاطب کر کے پدرانہ شفقت کے ساتھ لکھے ہیں، ایک خاص لطافت کے حامل ہیں اور بڑے اثر آفریں ہیں۔ خسرو شیریں کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ببیں ای ہفت سالہ قرۃ العین ۔ مقام خویشتن در قاب قوسین
منت پروردم و روزی خدا داد ۔ نہ بر تو نام من نام خدا باد
دریں دورہ ہلالی شادمی خند ۔ کہ خندیدیم با ہم روزکی چند
چو بدر انجمن گردد ہلالت ۔ برافروزند انجم را جمالت

قلم در کشش بحرفی کان ہوائیست | علم بر کشش بعلمی کان خدائیست
بناموسی کہ گوید عقل نامی! | زہی فرزند فرزانہ نظامی

لیلیٰ مجنوں کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں :

ای چاردہ سالہ قرۃ العین | بالغ نظر علوم کونین!
آں روز کہ ہفت سالہ بودی | چوں گل بچمن حوالہ بودی
واکنوں کہ بچاردہ رسیدی | چوں سرو باوج سرکشیدی
غافل منشین نہ وقت بازیست | وقت ہنر است و سرفرازیست
دانش طلب و بزرگی آموز | تا بہ نگرند روزت از روز
چوں شیر بخود سپہ شکن باش | فرزند خصال خویشتن باش
دولت طلبی سبب نگہدار | با خلق خدا ادب نگہدار
وال شغل طلب ز روی حالت | کز کردہ نباشدت خجالت
می کوش بہر ورق کہ خوانی | کان دانش را تمام دانی

ظاہر ہے ان اشعار میں تربیت اور پرورش کے بڑے لطیف نکات موجود ہیں اپنی نصیحتوں میں شاعر ہمت کی بلندی، رفتار و گفتار کی ارجمندی، کارسازی اور مردم نوازی کی دعوت دیتا ہے۔ اسی طرح شاعری کے بارے میں کہتے ہیں :

با اینکہ سخن بلطف آبست | کم گفتن ہر سخن صوابست
آب ارچہ ہمہ زلال خیزد | از خوردن پر ملال خیزد
کم گوی و گزیدہ گوی چون در | تا ز اندک تو جہاں شود پر
لاف از سخن چو در توان زد | آن خشت بود کہ پر توان زد
یکدستہ گل دماغ پرور! | از صد خرمن گیاہ بہتر
گر باشد صد ستارہ در پیش | تعظیم یک آفتاب از و بیش

استاد نے اپنے فرزند کو جو بلند پایہ نصیحتیں اپنے دلآویز اور عبرت خیز انداز میں کی ہیں ان میں ایک وہ نصیحت ہے جو ہفت پیکر میں آئی ہے۔ یہاں اس کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

ای پسر ہان وہان ترا گفتم — کہ تو بیدار شو کہ من خفتم
چون گل باغ سرمدی داری — مہر باغ محمدی داری
سکہ بر نقش نیک نامی نہد — کز بلندی رسی بچرخ بلند
صحبتی جوی کز نکو نامی — در تو آرد نکو سرانجامی
ہمنشینی کہ نافہ بوی بود — خوشتر ز آنکہ یافہ گوی بود
عیب یک ہمنشست باشد بس — کافکند نام زشت بر صد کس
در چنین رہ حسب چون پیران — گرد کن دامن از زبون گیران
رقص مرکب مبین کہ رہوار است — راہ بین تا چگونہ دشوار است
گر برین رہ پری چو باز سپید — دیدہ بر راہ دار چون خورشید
بارچندان برایں ستور آویز — کہ نماند برایں گریوہ ہتیز
چون رسد تنگی ز دور دور زتنگ — راہ بر دل فراخ دار نہ تنگ
بس گرہ کو کلید پنہانیست — بس درشتی کہ دروی آسانیست
ای بسا خواب کو بود دل گیر — واصل آن دلخوشیست در تعبیر
گرچہ پیکان غم جگر دوز است — درع صبر از برائی ایں روز است
عہد خود با خدای محکم دار — دل ز دیگر علاقہ بی غم دار
چون تو عہد خدای نشکستی — عہدہ بر من کز ایں وآن رستی
گوہر نیک خود ز عقد مریز — وانکہ بد گوہر است ازو بگریز
ہنر آموز گر ہنرمندی — در گشائی کن و نہ دربندی

هر که ز آموختن ندارد ننگ — در برآرد ز آب و لعل از سنگ
ای بسا تیز طبع کاہل کوش — که شد از کاہلی سفال فروش
وای بسا کور دل که از تعلیم — گشت قاضی القضات ہفت اقلیم
خویشتن را چو خضر باز شناس — تا خوری آب زندگی بقیاس
آب حیوان نه آب حیوانست — جان با عقل و عقل با جان است
جان چراغست و عقل گوہر او — عقل جانست و جان ما تن او
عقل با جان عطیۂ احدیست — جان با عقل زنده ابدیست
تا جوانی و تندرستی ہست — آید اسباب ہر مراد بدست
تو که سرسبزی جہاں داری — رہ کنوں رو که پای آں داری

جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں نظامی پہلے ایرانی شاعر ہیں جنھوں نے بزمیہ داستان کو اپنی شاعری کا اصلی موضوع قرار دیا۔ انھوں نے رواں مثنوی میں نئی ترکیبیں اور نئی تعبیریں ایجاد کر کے ایک خاص اثر پیدا کر دیا۔ اس لحاظ سے اس صنف شاعری میں افضلیت کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ان کا یہ دعویٰ کہ میں نے کسی کی نقل نہیں کی اور اپنے دل کے حکم پر شعر لکھے ہیں، بالکل درست ہے۔ کیونکہ انھوں نے نئے نئے معانی، نئی نئی تشبیہیں اور فکر و نظر کے نئے نئے زاویے پیدا کئے ہیں:

عاریت کس نپذیرفته ام — آنچه دلم گفت بگو گفته ام!
شعبدۂ تازه برانگیختم — ہیکلی از قالب نو ریختم

نظامی نے داستان سرائی کے ضمن میں بہت سے شاعرانہ کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک کمال تو وہی پند گوئی ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ دوسرا کمال عبرت آمیز نتائج کا استخراج ہے جو انسانی واقعات اور حالات کے ذکر میں آئے ہیں۔ ان نتائج سے شاعر ہمیں ان سے متنبہ کرتا ہے اور عین عیش و نوش کے واقعات بیان کرتے ہوئے

وہ زمانے کی ناپائیداری اور دنیا کی فناپذیری سے خبردار کرتا رہتا ہے:

چہ خوش باغنیمت باغ زندگانی | گرامین بودی از بادخزانی
چہ خرم کاخ شد کاخ زمانہ | گرش بودی اساس جاودانہ
از آں سرد آمد این کاخ دلاویز | کہ چوں جاگرم کردی گویدت خیز
زفردا وزدی کس رانشان نیست | کہ رفت آں از میاویں درمیان نیست
یک امروزاست مارانقد ایام | بر او ہم اعتمادی نیست تاشام
بیاتا یک دہن پرخندہ داریم | یک امشب رابشادی زندہ داریم

شاعر کا ایک اور کمال انسان کے قلبی احساسات کی عکاسی ہے جو بے شبہ نہایت اچھوتی ہے ۔ مثلاً حالت انتظار کی تصویر کھینچی ہے:

ہمیشہ چشم بر رہ دل دو نیم است | بلای چشم بر راہی عظیم است
اگر چہ ہیچ غم بی دردسر نیست | غمی از چشم بر راہی بتر نیست
مبادا ہیچ کس را چشم بر راہ | کز و رخ زرد گردد و عمر کوتاہ

پھر انتظار کی تلخی کے بعد وصال کی شیرینی کا منظر کھینچا ہے:

اگرچہ آفت عمر انتظار است | چو سر با وصل دارد سہل کار است
چہ خوشتر زآنکہ بعد از انتظاری | بامیدی رسد امیدواری

عاشق پیشہ شوریدہ اور غافل جوان کے بارے میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے

ببخشد کشوری بر بانگ رودی | ز ملکی دوست تر دارد سرودی
ز گرمی رہ بکار خود نداند | ز خامی ہیچ نیک و بد نداند

رات کی سیاہی، تنہائی، دل کی دھڑکن اور اس کے اضطراب کی تصویر اس سے بہتر پیش نہیں کی جاسکتی:

چہ افتادی سپہر لاجوردی | کہ امشب چون دگر شبہا نگردی

مگر دود دل من راہ بستت — نفیر من خسک در پا شکستت
نہ زین ظلمت ہمی یابم امانی — نہ از نور سحر بینم نشانی
مرا بنگر چہ غمگین داری امشب — ندارم دین اگر دین داری امشب
شبا امشب جوانمردی بیاموز — مرا یا زندہ کش یا زود شو روز
چرا بر جای ماندی چون سیہ میغ — بر آتش میروی یا بر سر تیغ
دھل زن را اگر فتم دست بستند — نہ آخر پای پروین را شکستند
من آن شمعم کہ در شب زندہ داری — ہمہ شب می کنم چون شمع زاری
چو شمع از بہر آں سوزم بر آتش — کہ باشد شمع وقت سوختن خوش
گرہ بین بر سرم چرخ کہن را — بباید خواند و خندید این سخن را
بخوان ای مرغ اگر داری زبانی — بخند ای صبح اگر داری دہانی
اگر کافر نہ ای مرغ شبگیر — چرا بر ناوری آواز تکبیر

عشق و محبت میں جو حالت شوق اور جو رقت عاشق پر طاری ہوتی ہے، اور اپنے محبوب کی محبت اور الفت کے سبب سے زندگی کے تمام مظاہر سے اسے جو لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ چوپاؤں اور جانوروں تک سے اسے انس ہو جاتا ہے۔ ان سب احساسات کی ایک زندہ تصویر ہمیں مجنوں کی دلسوز داستان میں نظر آتی ہے۔ یہاں مجنوں صحرا کے آہوؤں سے، بارہ سنگھوں سے محبت کرتا اور بیابان کے وحشی جانوروں کے پیچھے پھرتا نظر آتا ہے۔

ان داستانوں کی طرز اور ان کا وزن چاہے وہ لیلیٰ و مجنوں ہو چاہے خسرو شیریں اتنا مترنم ہے کہ انھیں خود بخود دلکش نغموں کے ساتھ پڑھا جاتا تھا اور اب بھی پڑھا جاتا ہے۔ خود شاعر نے بھی ایک قطعہ میں اس موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جہاں شاعر نے خسرو کی بزم آرائی کا ذکر کیا ہے وہاں تیس مختلف راگوں کی تفصیل بھی دی ہے۔

جنھیں مشہور نغمہ ساز باربد نے ایجاد کیا تھا۔ باربد نے ایسے سو راگ ایجاد کئے تھے اور ان کو بڑے کمال کے ساتھ بربط پر بجاتا تھا۔ شاعر نے جن تیس راگوں کے نام بتائے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) گنج بادآور (۲) گنج گاؤ (۳) گنج سوختہ (۴) شادروان مروارید (۵) تخت طاقدیسی (۶) ناقوسی (۷) اورنگی (۸) حقہ کاوسی (۹) ماہ برکوہان (۱۰) مشک دانہ (۱۱) آرائش خورشید (۱۲) نیم روز (۱۳) سبز در سبز (۱۴) قفل رومی (۱۵) سروستان (۱۶) سروسہی (۱۷) نوشین بادہ (۱۸) رامش جان (۱۹) نازنوروز (۲۰) مشکویہ (۲۱) مہرگانی (۲۲) مروای نیک (۲۳) شبدیز (۲۴) شب فرخ (۲۵) فرخ روز (۲۶) غنچہ کبک دری (۲۷) نخچیرگان (۲۸) کین سیاوش (۲۹) کین ایرج (۳۰) باغ شیرین۔

اس کے سوا کئی شعر ایسے ہیں جن میں بڑا ترنم پایا جاتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ استاد موسیقی سے بھی واقف تھے اور اپنا بہت سا کلام نغمہ و ساز کے سانچے میں ڈھال چکے تھے۔

غرض نظامی کی روان اور وجد آور شاعری نیار، داستان، تغزل اور عشق و عاشقی کی وارداتوں سے لبریز ساز اور آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر دلدار ان بزم کے دلوں میں گھر کر گئی۔ اس اثر آفرینی کو خود شاعر نے محسوس کیا ہے۔ خسرو شیریں میں کہتے ہیں:

نصیحتہا کہ شاہان را بشاید
وصیتہا کہ و درہا گشاید

بسی پالودہ ہای زعفرانی
بشکر خند شان دارم نہانی

گہی چون ابر سان گریہ کشادم
گہی چون گل نشاط خندہ دادم

سماعم ساقیان را کردہ مدہوش
مغنی را شدہ دستان فراموش

شہنشہ دست بر دو چشم نہادہ
ز تحسین حلقہ در گوشم نہادہ

نظامی کی شاعری کی خصوصیات کے ذکر میں ان کے تصویر کشی کے کمال کو فراموش

نہ کرنا چاہیے۔ اگرچہ ان کا یہ کمال مصنوعی تشبیہوں سے آزاد نہیں، تاہم یہ تشبیہیں لطیف، اکثر اچھوتی اور فطرت سے قریب ہیں، مثلاً:

چو پیر سبز پوش آسمانی　　ز سبزہ بر کشد بیخ جوانی
جواناں را و پیراں را دگربار　　بسر سبزی درآرد سرخ گلزار
گل از گل تخت کاوسی برآرد　　بنفشہ پر طاؤسی برآرد
بسا مرغا کہ عشق آوازہ گردد　　بسا عشق کہن کان تازہ گردد
چو از خرم بہار و خرمی دوست　　بگلہا بر درید از خرمی پوست
گل از شادی علم در باغ می زد　　سپاہ فاختہ بر زاغ می زد
شمال انگیختہ ہر سو خروشی　　زدہ بر گاو چشمی پیل گوشی
سہی سرو از چمن قامت کشیدہ　　ز عشق لالہ پیراہن دریدہ
بنفشہ تاب زلف افگندہ بر دوش　　گشادہ باد نسرین را بنا گوش
عروسان ریاحین دست بر روی　　شکرخای شگوفہ شانہ در موی
ہلوا بر سبزہ گوہر باگستہ　　زمرد را بمروارید بستہ
تذروان بر ریاحین پر فشاندہ　　ریاحیں در تذروان پر نشاندہ
ز ہر شاخی شگفتہ نو بہاری　　گرفتہ ہر گلی بر کف نثاری
نوای بلبل و آوای دراج　　شکیب عاشقاں را دادہ تاراج

عام طور پر نظامی طلوعِ آفتاب کی منظر کشی یا نسیم سحر کی تعریف یا رات کے تاروں کی تصویر کشی کے بعد اپنی داستان شروع کرتے ہیں۔ پھر اصلی داستان کے ضمن میں بہت سے چھوٹے چھوٹے قصے بھی سناتے ہیں اور ان قصوں کو بڑی مہارت اور اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے صنعتِ ایجاز کا بڑا کمال دکھایا ہے۔

نظامی بھی خاقانی کی طرح ایران کے علاقہ شہرستان کے باشندے ہیں، خاقانی

کی طرح ان کے کلام میں بھی تازہ بتازہ مضامین اور اچھوتے معنی کثرت سے ملتے ہیں لیکن یہ معنی اور یہ عبارتیں مبہم اور ناقابلِ فہم سی ہوگئی ہیں اور کہیں انھوں نے چیستان کی زبان، عجیب و غریب استعارے اور تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ مثلاً مخزن الاسرار کے یہ اشعار جو نعتِ رسولؐ میں ہیں ملاحظہ ہوں :

تحفہ اول کہ الف نقش بست | بر در محجوبہ احمد نشست
حلقہ حا را کالف اقلیم داد | طوق ز دال و کمر از میم داد
لاجرم او یافت ازاں میم و دال | دایرۂ دولت و خط کمال
بود درایں گنبد فیروزہ خشت | تازہ ترنجی ز سرای بہشت
رسم ترنج است کہ در روزگار | پیش دہد میوہ پس آرد بہار

لیکن خمسہ کے بیشتر اشعار رواں، روشن، لطیف اور دلکش ہیں اور فارسی زبان میں داستان سرائی کا بہترین نمونہ ہیں۔ استاد کی ایک اور خصوصیت وصفی ترکیبوں کا کثرت سے استعمال ہے، مثلاً :

"یکی گوی" "شب سنج" "گراں سنگ سبکسیر" "پویہ پا" "فلک برپای دارد" "غم و شادی نگار" "شب و روز آفریں" "نکوسرانجامی"

نظامی کے کلام میں مخصوص الفاظ اور کلمے بھی آگئے ہیں اور یہ غالباً ان کے وطن میں بولے جانے والے الفاظ ہیں۔ ان الفاظ کو استاد نے امتیاز بخشا ہے۔

نظامی نے خمسہ کی مثنویوں کے سوا قصیدے اور غزلیں بھی لکھی ہیں ان میں سے چند کو جمع کر لیا گیا ہے۔ ان کے نام سے چند قطعے اور رباعیاں بھی ملتی ہیں۔ ان اشعار میں بھی انکی اُستادی اور بڑائی نمایاں ہے۔ ذیل کے اشعار ان سے منسوب ایک قصیدے سے لئے گئے ہیں۔ ان میں شاعر نے اپنے بڑھاپے کا حال نہایت دلپذیر اور پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے :

دریں چمن کہ ز پیری خمیدہ شد کمرم | ز شاخہای بقا بعد ازیں چہ بہرہ برم

نہ سایہ ایست زنخلم نہ میوہ ای کس را که تند باد حوادث بریخت برگ و برم
سپهر با قد خم گشته می کند لحدم بیاض موی زکافور می دهد خبرم
دو رشته پر ز گهر بود در دهن ما را ! جفای چرخ گسست و بریخت آن گهرم
رسید روز بآخر چو چند می خواهم کزین خرابه به معمورهٔ فنا ببرم
دوتا شدم که بیالایدم بخون دامن! که خون فشان شده چشم از تراوش جگرم
نشست برف گران بر سرم ز موی سپید زپست گشتن بام وجود در خطرم
زمن کسی نکند یاد ور آنکه بتو انم ! زضعف جان که برخاطر کسی گذرم

اس دلسوز موضوع پر کہ انسان کی پوری زندگی تاریکی میں گھری ہوئی ہے، اس نغز گو شاعر کا ایک قطعہ یا غزل بھی یہاں نقل کی جاتی ہے :

جوانی بر سرِ کوچ است در یاب این جوانی را که شهری بار کے باشد غریب کاروانی را
خمیده پشت ازاں گشتند پیرانِ جہاں دیدہ که اندر خاک می جویند ایامِ جوانی را
بهرزه می دهی بر باد عمر نازنین کز وی بحاصل می توان کردن حیاتِ جاودانی را
اگر تو شادمان باشی چه معز دلی رسد غم را دگر خود را کشی از غم چه نقصان شادمانی را

سلجوقی دور کی فارسی نثر

جیساکہ ہم اس فصل کی ابتداء میں بتا چکے ہیں فارسی نظم کی طرح فارسی نثر کو بھی سلجوقیوں کے دور یعنی پانچویں اور چھٹی صدی میں ترقی حاصل ہوئی اور اس دور میں بہت سے ادیب پیدا ہوئے ان ادیبوں نے مختلف علوم و فنون میں اپنی تصانیف پیش کیں - اور حق یہ ہے کہ فارسی نثر کے بعض شاہکار جیسے تاریخ بیہقی، چہار مقالہ، کلیلہ و دمنہ، تذکرۃ الاولیاء وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں جو اگرچہ سلجوقی دور میں تالیف ہوئی ہیں لیکن سلجوقیوں کے ہم عصر بعض دوسرے حکمران خاندانوں

اور امیروں کی سرپرستی میں لکھی گئی ہیں جیسے غزنوی اور خوارزم شاہی اور دوسرے خاندان۔ چنانچہ اس کا تفصیلی حال ہم آگے بیان کریں گے۔ اس دور کی نثر بھی پچھلے دوروں کی نظم کی طرح عام طور پر سادہ اور رواں ہے یعنی تکلفات اور عبارت پردازی سے عاری ہے اور حشو و زواید اور لفظی صنائع جو دورِ مغول کے بعد سے عام ہو گئیں۔ اس نثر میں شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں، یہ نثر حقیقت میں نہایت پختہ، آزمودہ، نہایت بدیع اور فصیح ہے۔ اس کے باوجود اس عہد کی بعض تالیفوں میں ہم عربی کے ثقیل الفاظ اور جملے، اصول ترسل، تحریر میں شواہد اور عربی اشعار کا استعمال دیکھتے ہیں ظاہری تمطراق اور نثر مرسل و مزین کی ابتداء ہو چکی تھی۔ اصل میں دورِ مغول کی طرزِ انشاء کی بنیاد اسی دور میں رکھی جا چکی تھی۔ یہاں مثال کے طور پر کتاب راحتہ الصدور راوندی اور کتاب التوسل الی الترسل (بہاء الدین بغدادی) کا نام لینا کافی ہے۔

تصوف کی کتابیں

کشف المحجوب کتاب کشف المحجوب پانچویں صدی ہجری کے وسط میں تالیف ہوئی یہ اولین مشہور ترین کتاب ہے جو مشایخ صوفیہ کے حالات، عقائد اور مقالات پر نہایت فصیح فارسی میں لکھی گئی ہے۔

اس کتاب کے مصنف ابو الحسن غزنوی ہیں جو غزنہ کے آس پاس کے دو مقامات کی نسبت سے جلابی اور ہجویری بھی کہلاتے ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف پانچویں صدی کی فارسی نثر کا ایک نہایت اہم نمونہ ہے اور اس میں نہایت مفید اور عمدہ اخلاقی اور صوفیانہ اقوال و حکم آئے ہیں بلکہ اس میں عربی اشعار اور مختصر عربی جملے بھی نقل ہوئے ہیں جن میں سے بعض تصوف کی تعریف میں ہیں۔

اسرار التوحید اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید بھی اہم صوفیانہ تصانیف میں

شمار ہوتی ہے اور نہایت شیریں فارسی نثر میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے نصف دوم اور غالباً ۵۶۰ھ میں کشف المحجوب سے تقریباً ایک سو سال بعد لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب شیخ ابوسعید ابی الخیر کی تعریف، ان کے حالات، کرامات اور اقوال پر لکھی گئی ہے۔ شیخ کے حالات اور کرامات کے ضمن میں اس کتاب میں صوفیانہ حکایتیں اور صوفیانہ اشعار بھی آگئے ہیں۔ اسی طرح اس عہد کے بہت سے علماء اور مشائخ کا حال بھی مناسبت کے لحاظ سے آگیا ہے۔ اسرار التوحید کے مولف محمد ابن منور ہیں جو شیخ ابوسعید کی اولاد میں ہیں۔

تذکرۃ الاولیاء

تذکرۃ الاولیاء بھی کشف المحجوب کی طرح اور اسی ترتیب کے مطابق بزرگانِ صوفیہ کے مقامات، ان کے عجیب و غریب صفات، ان کے منتخب اقوال اور ان کی عبادت اور عادات پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں مفید نصیحتیں، دل پسند حکایتیں اور عبرت انگیز واقعات کو تفصیل کے ساتھ موثر فارسی نثر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی عبارت آسان اور دلکش ہے۔ اس کتاب میں اور اسرار التوحید اور کشف المحجوب میں معانی اور اسلوب کے لحاظ سے بڑی مشابہت پائی جاتی ہے اور کہیں کہیں تو کشف المحجوب کی عین عبارتیں ذرا سے تغیر کے ساتھ اس میں دکھائی دیتی ہیں۔

جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں تذکرۃ الاولیا کے مؤلف شیخ فریدالدین عطار ہیں۔ اور یہ کتاب ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں تالیف پائی ہے۔

تاریخی کتابیں

زین الاخبار

زین الاخبار کا شمار فارسی زبان کی قدیم ترین تاریخی کتابوں میں ہوتا ہے اس کا مولف ابوسعید عبدالحی بن ضحاک بن محمود ہے۔ یہ شخص گردیز کا رہنے والا تھا جو ہند کے راستے پر غزنہ سے ایک روز کی مسافت پر واقع تھا۔

اس کتاب میں مؤلف کے زمانے تک کی ایران کی مختصر تاریخ اور ظہورِ اسلام کا حال، خلفاء کی تاریخ اور ۴۳۲ھ تک کے واقعات اختصار کے ساتھ درج ہیں۔ یہ کتاب محمود غزنوی کے بیٹے عبدالرشید کے دورِ حکومت یعنی ۴۴۰ھ تا ۴۴۴ھ میں تالیف ہوئی ہے۔ سامانیوں اور غزنویوں کی تاریخ کے لئے قُربِ زمانی کے لحاظ سے اس تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

تاریخِ بیہقی یہ اہم کتاب نہ صرف گردیزی کی کتاب کی طرح غزنوی خاندان کے تاریخی واقعات کے لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے لکھنے والے ابوالفضل بیہقی نے ان میں اکثر واقعات کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا بلکہ اس کا مولف اپنے زمانے کے بہترین نثر نگاروں میں تھا۔ اس نے (۱۹) سال تک غزنوی دربار کے دیوان رسائل میں منشی گری کی خدمت انجام دی تھی اس لحاظ سے اس نے اپنی کتاب نہایت شستہ، فصیح اور ادبی فارسی میں لکھی ہے۔ واقعات کے ذکر کے ضمن میں اس نے مناسب اشعار بھی استعمال کئے ہیں اور بہت سے عالموں اور ادیبوں کے نام لئے ہیں۔ اسی لئے یہ کتاب فارسی نثر کے شاہکاروں اور بہترین نمونوں میں شمار کی گئی ہے۔ اس کتاب کی اصل میں تیس جلدیں تھیں۔ اب چند ناقص جلدوں کے سوا جو تاریخِ بیہقی کے نام سے مشہور ہیں، باقی سب جلدیں ناپید ہوگئی ہیں۔ جو جلدیں باقی رہ گئی ہیں ان میں سلطان مسعود کے دورِ حکومت کا حال درج ہے۔ اس لحاظ سے اس کا نام تاریخِ مسعودی ہے۔ یہ کتاب سلطان محمود کے بیٹے فرخزاد کے عہدِ حکومت یعنی ۴۵۱ھ میں شروع ہوئی اور کئی سال کے بعد ختم ہوئی اُس کتاب کے مطالب سے یہ بات بھی اچھی طرح ہویدا ہے کہ ابوالفضل بیہقی ایک نیک، حق پرست اور نیکوکار آدمی تھا اس نے واقعات کے بیان... اور وقائع کی نقل میں نہایت انصاف اور بڑی چھان بین سے کام لیا ہے۔ اس نے حقیقت سے انحراف نہیں کیا ہے اور کہیں بڑے بول نہیں بولے ہیں

ابوالفضل بیہقی ۳۸۵ھ میں پیدا ہوا اور ۴۷۰ھ میں وفات پائی۔

مجمل التواریخ والقصص یہ دنیا کی ایک عام مختصر تاریخ ہے اور اس میں ایران کا خصوصی ذکر ہے۔ اس کتاب میں ابتداءِ عالم سے ۵۲۰ھ یعنی کتاب کی تالیف کے سال تک کے واقعات درج ہیں تاریخی واقعات کے ضمن میں بہت سے قصے اور داستانیں بھی اس میں آگئی ہیں۔

یہاں اگر تاریخ بیہق کا بھی ذکر کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کے وسط میں تالیف ہوئی اس کتاب کا فارسی نثر کے گراں بہا آثار میں شمار ہوتا ہے کتاب کا موضوع ولایت بیہق کی تاریخ اور اس علاقے کے بزرگوں اور دانش مندوں کے حالات ہیں ان میں ابوالفضل بیہقی بھی شامل ہے۔ اس کتاب کا مصنف ابوالحسن علی بن زید بیہقی ہے۔

راحتہ الصدور راحتہ الصدور سلجوقیوں کی تاریخ ہے اور فارسی کی اہم ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے اس میں ایران کے سلجوقیوں کی ابتداء سے لے کر خوارزمشاہیوں کے ہاتھوں ان کے انقراض تک کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

راحتہ الصدور کا مصنف ابوبکر محمد راوندی، کاشان سے قریب مقام راوند کا رہنے والا تھا۔ اس نے خود سلجوقی دربار دیکھا تھا اور عراق کے سلجوقیوں کے آخری حکمران طغرل بن ارسلان کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ اس نے اپنی کتاب چھٹی صدی ہجری کے آخر میں لکھی ہے اور اسے ۶۰۳ھ میں روم کے سلجوقی حکمران کیخسرو بن قلیج ارسلان کے نام معنون کیا۔ اس سلطان کے دربار میں راوندی کی بڑی عزت تھی۔

راحتہ الصدور کو نہ صرف سلجوقیوں کی تاریخ ہونے کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے بلکہ اسے بڑی ادبی اہمیت بھی حاصل ہے۔ کیونکہ اس کے مؤلف نے بہت سے شاعروں اور علماء و فضلاء کے نام لئے ہیں اور ان کے اشعار اور قصیدے بھی نقل کئے ہیں اسی طرح

بہت سے عربی امثال بھی اس نے نقل کئے ہیں۔

راوندی نے اور کتابیں بھی لکھی تھیں اور خود شعر بھی کہتا تھا۔ چنانچہ اسی کتاب میں اس کے کئی قصیدے کیخسرو اور قلیج ارسلان کی مدح میں درج ہیں۔

اخلاقی، اَدبی اَور طبّی کتابیں

سیاست نامہ سیاست نامہ یا سیر الملوک اولین مشہور فارسی کتاب ہے جو آداب معاشرت، اخلاق، بادشاہوں امیروں، وزیروں، قاضیوں، خطیبوں اور دوسرے طبقوں کی سیاست پر لکھی گئی ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں سنباذ، مزوک، باطنی اور خرم دینی جیسے مختلف فرقوں کا ذکر آیا ہے جو تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سیاست نامہ کی طرز انشا نسبتاً سادہ، شیریں اور متین ہے۔

اس کتاب کا مصنف خواجہ ابوعلی حسن بن علی نظام الملک طوسی ایرانی وزیر ہے۔ خواجہ نظام الملک تیس سال تک سلطان الب ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کے دربار میں منصب وزارت پر فائز رہا۔ اس نے سیاست نامہ کو ملک شاہ کی درخواست پر ۴۸۵ھ میں یعنی اسماعیلیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے کچھ ہی دنوں پہلے لکھا تھا۔

قابوس نامہ قابوس نامہ کا مصنف امیر کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس وشمگیر زیاری، حکمران تھا یہ کتاب اس نے اپنی زندگی کے آخری دور میں اپنے بیٹے گیلانشاہ کے لئے پند و نصیحت کی غرض سے ۴۴ فصلوں میں لکھی تھی۔ امیر کیکاؤس ایک نہایت سچا نیک اور پارسا آدمی تھا۔

قابوس نامہ آداب معاشرت، رسوم دوستی والفت، ترتیب زندگانی، کسب فضائل اور تہذیب خصائل پر لکھی گئی ہے یہ کتاب ۴۷۵ھ میں یعنی مصنف کی وفات سے کچھ ہی دنوں پہلے لکھی گئی ہے۔ امیر کیکاؤس شاعرانہ ذوق بھی رکھتا تھا اور اس نے اچھے شعر

بھی لکھے ہیں۔

کیمیائے سعادت یہ ایک اخلاقی اور دینی کتاب ہے۔ اسے حجتہ الاسلام امام غزالی نے پانچویں صدی ہجری کے آخر میں تصنیف کیا تھا۔ اصل میں یہ کتاب ان کی مشہور عربی کتاب احیار العلوم کے بہترین مطالب کا خلاصہ ہے جو فارسی میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اسلام کی اخلاقی تعلیم کے اصول کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے۔

کلیلہ و دمنہ اس مشہور داستان کی اصل ساسانیوں کے عہد میں ہندی زبان سے پہلوی زبان میں منتقل ہوئی۔ اس کے بعد عبداللہ بن مقفع نے اسے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ اگرچہ ابن مقفع کی کلیلہ کو سامانی دور میں فارسی نظم اور نثر کا جامہ پہنایا گیا تھا لیکن اب وہ ناپید ہو چکے ہیں اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے رودکی کی نظم کی ہوئی کلیلہ کے کچھ اشعار باقی رہ گئے ہیں۔ موجودہ کلیلہ دمنہ جس میں اصل ہندی پر دو تین ایرانی اور اسلامی حکایتیں بڑھائی گئی ہیں، ابو المعالی نصر اللہ بن عبدالحمید کا ترجمہ ہے۔ یہ شخص اس زمانے کے عالموں میں شمار ہوتا تھا اور اس نے ابن مقفع کے ترجمہ سے یہ ترجمہ چھٹی صدی ہجری کے وسط یعنی بہرام شاہ غزنوی (۵۱۲ - ۵۴۷ھ) کے دور حکومت میں مرتب کیا۔ نصر اللہ نے اس کتاب کو بہرام شاہ کے نام معنون کیا اور اس میں فارسی اور عربی امثال اور اشعار کا اضافہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے نہایت متین اور عمدہ نثر سے کام لیا ہے۔ اسی لئے یہ کتاب فارسی کی ادبی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ نصر اللہ نظم میں بھی مہارت رکھتا تھا اور اس نے عربی اور فارسی میں اشعار لکھے ہیں۔

چہار مقالہ یہ اہم کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے چار مقالوں پر محتوی ہے جس کی ترتیب یہ ہے: "در ماہیت علم دبیری۔ در ماہیت علم شعر۔ در ماہیت علم نجوم۔ در ماہیت علم طب" اس کتاب کا مصنف ابو الحسن احمد سمرقندی ملقب بہ نظامی عروضی

ہے۔ عروضی نہ صرف فارسی انشاء اور بلاغت کا استاد تھا بلکہ وہ علم ادب میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا اور خود بھی شعر کہتا تھا۔ چنانچہ اسی کتاب میں اس کے اشعار دیکھنے میں آتے ہیں

چہار مقالہ ۵۵۰ھ میں تصنیف ہوا، اس کتاب کو غزنوی شہزادے ابوالحسن حسام الدین علی کے نام معنون کیا گیا ہے۔

چہار مقالہ سلاست انشاء، طرز سخن، اسلوب عبارت کے لحاظ سے کار ردیف اول کے فارسی نثر کے آثار میں شمار ہوتا ہے اور فارسی نثر کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا پایہ تاریخ بیہقی اور کلیلہ و دمنہ کے برابر ہے۔

اس کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اس زمانے کے بہت سے شاعروں اور عالموں کے حالات اور ان کے اشعار آئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی تاریخی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ خاص کر ایسے شاعروں اور عالموں کے حالات کے لئے جو مصنف کے قریب العہد تھے — جیسے فردوسی — یا مصنف کے ہم عصر تھے — جیسے معزی اور خیام یہ کتاب بہت اہم معلومات کی حامل ہے۔

حدائق السحر حدائق السحر فی دقائق الشعر" صنائع شعری پر لکھی گئی ہے اور اس فن پر فارسی زبان میں یہ قدیم ترین کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ اس سے پہلے اس فن پر لکھی ہوئی کتابیں جیسے فرخی کی ترجمان البلاغہ وغیرہ اب ناپید ہو چکی ہیں۔

یہ کتاب نہایت بلیغ نثر میں لکھی گئی ہے اور اس میں عربی اور فارسی نظم و نثر کے امثال و شواہد آنے کی وجہ سے اس کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔

اس کتاب کا مصنف رشید الدین محمد وطواط چھٹی صدی ہجری کے مشہور شاعروں اور ادیبوں میں شمار ہوتا تھا۔ وطواط نے فرخی کی کتاب ترجمان البلاغہ کو اتسز خوارزمشاہ (۵۲۱ - ۵۵۱) کے حضور میں پیش کیا۔ اس بادشاہ نے یہ کتاب پڑھ کر اسے حکم دیا کہ وہ بھی اس فن پر ایک کتاب لکھے۔ چنانچہ وطواط نے حدائق السحر لکھنی شروع کی اور اسی زمانے میں

یا اس کے چند سال بعد اس کی تکمیل کی۔

مقامات حمیدی مقامات حمیدی مسجع فارسی کی مشہور کتاب ہے۔ کتاب کے مصنف کا مقصد مقامات حریری اور مقامات بدیع الزماں ہمدانی کی طرح نظیرہ گوئی ہے اس کتاب میں ۲۳ مقامات ہیں اور یہ ادبی مطالب، مباحثات، مناظرات اور چیستان پر مشتمل ہیں۔ مصنف کے پیش نظر فارسی میں مقامہ نویسی کی طرز کو رواج دینا اور بیرونی الفاظ اور مسجع عبارتوں سے فارسی کو مزین کرنا تھا۔ کتاب کا مصنف حمید الدین ابوبکر بن محمود بلخ کا مشہور قاضی اور مشہور ادیبوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے زمانے کے مشہور شعرا جیسے انوری وغیرہ نے اپنے اشعار میں اس کی مدح کی ہے۔ مقامات حمیدی چھٹی صدی ہجری کے وسط میں لکھی گئی ہے اور حمید الدین نے ۵۵۹ھ میں وفات پائی۔

ذخیرہ خوارزم شاہی ذخیرہ خوارزم شاہی دواؤں، زہروں اور مختلف بیماریوں اور انکی تشخیص پر ایک نہایت مفصل کتاب ہے۔ اس میں دس کتابیں ہیں اور ہر کتاب میں کئی ابواب اور کئی گفتار ہیں۔ اس کتاب کا مصنف زین الدین ابوابراہیم اسمٰعیل بن حسن جرجانی ہے جو ۵۰۴ھ میں ابوالفتح قطب الدین محمد خوارزمشاہ بن انوشتگین (۴۹۰ھ تا ۵۲۱ھ) کے حکم پر خوارزم آیا اور وہاں مقیم ہو گیا یہیں اس نے یہ مفید کتاب اس بادشاہ کے نام پر لکھی۔ اس کتاب کے مصنف نے ۵۳۱ھ میں وفات پائی۔

مرزبان نامہ مرزبان نامہ داستانوں، قصوں، حکایتوں اور افسانوں پر مشتمل کتاب ہے اور کلیلہ و دمنہ کی طرح بیشتر حیوانوں کی زبانی نقل کی گئی ہے۔ اس کتاب کو طبرستان کے ایک حکمران مرزبان بن رستم بن شروین نے — جس کے خاندان کو باوندیان یا آل باوند کہتے ہیں — چوتھی صدی ہجری کے آخر میں قدیم طبرستانی زبان میں تصنیف کیا تھا پھر ساتویں صدی کی ابتدا میں اس زمانے کے ایک بڑے ادیب اور درجۂ اول کے منشی سعد الدین وراوینی نے جو آذربایجان کا رہنے والا تھا اسے فصیح ادبی فارسی میں منتقل کیا اور اسے ربیب الدین

ہارون وزیر از بک بن محمد اتابک آذربایجان کے نام معنون کیا۔

عربی نویس ایرانی علماء اور حکماء

شیخ طوسی ابن بابویہ اور کلینی کے بعد شیخ ابوجعفر محمد بن حسن طوسی شیعہ مذہب کے بزرگ ترین فقیہوں میں شمار ہوتے ہیں۔ حدیث، تفسیر، فقہ، رجال، کلام اور ادب میں وہ شیعہ علماء کا مرجع سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں کتاب استبصار تہذیب الاحکام، کتاب العدۃ فی اصول الفقہ، کتاب الرجال اور کتاب الغیبہ ہیں۔ تفسیر میں شیخ نے ایک کتاب "کتاب التبیان" لکھی ہے جو مشہور ہے۔ ان کے سوا شیخ نے فہرست کتب الشیعہ واسماء المصنفین" کے نام سے ایک اور مفید کتاب بھی لکھی ہے۔ شیخ ۳۸۵ھ میں بمقام طوس پیدا ہوئے اور ۴۶۰ھ میں وفات پائی۔

غزالی سلجوقی دور کے بلند پایہ مشاہیر علماء میں ایک حجۃ الاسلام امام ابوحامد محمد بن محمد بن احمد غزالی بھی ہیں۔ غزالی ۴۵۰ھ میں بمقام طوس پیدا ہوئے۔ طوس میں پھر جرجان اور نیشاپور میں آپ نے علوم کی تحصیل کی اور مختلف علوم اور خاص کر فقہ اور حکمت میں اجتہاد کا مقام حاصل کیا۔

جوانی کا ابتدائی حصہ آپ نے تعلیم اور مشائخین صوفیا سے اکتساب فیض میں گذارا۔ نیشاپور میں آپ کے اولین معلموں میں امام الحرمین ابوالمعالی تھے۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد غزالی وعظ، درس وتدریس اور تالیف وتصنیف میں مشغول ہو گئے اور آپ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ آپ کی شہرت سن کر مشہور وزیر نظام الملک طوسی نے آپ کو اپنے پاس طلب کیا اور اسی وزیر کے ذریعہ امام غزالی کو سلطان ملک شاہ کے دربار میں تقرب حاصل ہوا پھر ۴۸۴ھ میں آپ خواجہ نظام الملک کی دعوت پر مدرسہ نظامیہ میں درس دینے کے لئے بغداد تشریف لے گئے اور چار سال تک وہاں درس دیتے رہے۔ یہاں آپ کی مجلس درس میں تین

سو سے زیادہ طالب علم حاضر رہتے تھے۔ یہیں آپ نے اپنی بعض اہم کتابیں تصنیف کیں عالم ظاہر کی تزئین کے بعد آپ نے عالم باطن کی صفائی کی طرف رجوع کیا۔ اور آپ کی روحانی حالت میں بڑا زبردست انقلاب پیدا ہو گیا۔ اس روحانی انقلاب کے وقت آپ کی عمر (۳۹) سال کے قریب تھی۔ پھر آپ اعتزال کی طرف مائل ہوئے، امام احمد غزالی کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور مدرسہ سے الگ ہو کر سفر حج پر روانہ ہوئے ایک عرصہ تک شام میں مقیم رہے، یہاں عزلت اور گوشہ گیری میں زندگی کے دن بسر کئے اور صرف عارفوں اور صوفیوں کے ساتھ ہی اٹھنا بیٹھنا رہا۔ آپ کی ایک مشہور کتاب جو احیاء العلوم الدین کے نام سے موسوم ہے اور فقہ، احکام، کلام، مذاہب اور خاص کر اسلامی اخلاق پر لکھی گئی ہے، اسی مقام پر لکھی گئی۔ فقہ، علم قرآن، حدیث اور حکمت پر امام غزالی کی کئی کتابیں ہیں۔ ان میں حکمت پر مقاصد الفلاسفہ، تہافت الافلاسفہ اور معیار العلم منطق پر لکھی ہے۔ غزالی کے ایسے رسالے جن میں ان کے روحانی تجارب اور ان کے عقاید پر روشنی پڑتی ہے ان میں سب سے اہم رسالہ المنقذ من الضلال ہے۔ سوریہ سے واپس ہونے کے بعد امام غزالی ایک عرصہ تک نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ میں درس دیتے رہے۔ پھر آپ نے عزلت اختیار کر لی۔ اور صرف مشائخ صوفیہ و علماء کے حلقہ کی حد تک ہی وعظ و تدریس میں اپنی زندگی کے آخری دن بسر فرمائے۔ آپ نے ۵۰۵ھ میں بمقام طوس (۵۵) سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

شیخ طبرسی شیخ ابو علی فضل بن حسن طبرسی بھی شیخ طوسی کی طرح بڑے پائے کے شیعی فقہا میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے حدیث، تفسیر اور فقہ میں تحقیق اور اجتہاد سے کام لیا اور بہت سے شیعہ علماء آپ کے قول کو حجت خیال کرتے ہیں شیخ کی مشہور کتابوں میں مجمع البیان ہے جو شیعوں کی معتبر اور اہم تفسیروں میں گنی جاتی ہے۔ شیخ طبرسی نے ۵۴۸ھ یا ۵۵۱ھ میں بمقام سبزوار انتقال کیا۔

امام فخر رازی

ابو عبداللہ فخر الدین محمد رازی اپنے زمانے کے ائمہ حکما، متکلمین، فقہا اور علوم اسلامی کے بہت بلند پایہ بزرگ اور عالموں میں شمار ہوتے ہیں۔ رازی نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ہرات میں گذارا اور یہاں ان کی مجالس وعظ و درس خاص و عام کی زیارت گاہ اور مقصد انام بنی ہوئی تھی۔

آپ کی اہم کتابوں میں نہایتہ العقول اور کتاب المحصل کلام اور حکمت پر ہے کتاب المباحث المشرقیہ تصوف پر ہے، کتاب المحصول اصول فقہ پر اور شرح اشارات ابو علی سینا منطق اور حکمت پر لکھی گئی ہے۔ رازی ۵۴۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۰۶ھ میں انھوں نے بمقام ہرات وفات پائی۔

شہاب الدین سہروردی

شہاب الدین یحیٰی بن حبش بن امیرک سہروردی جو شیخ اشراق کے نام سے مشہور ہیں سہرورد کے رہنے والے تھے۔ سہرورد علاقہ زنجان کا ایک شہر ہے۔ آپ اپنے زمانے کے حکمت اور اشراق کے علماء میں بہت بلند پایہ عالم گنے جاتے تھے۔ آپ نے امام فخر الدین رازی کی مجالس درس سے استفادہ کیا تھا اصول اور حکمت میں آپ نے اپنی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ شیخ کی مشہور کتاب حکمت الاشراق ہے۔ یہ کتاب تصوف عرفان اور اشراق کے رنگ میں فلسفیانہ مسائل کی شرح ہے۔ شیخ سہروردی ۵۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۸۷ھ میں بمقام حلب صلاح الدین ایوبی کے بیٹے ملک الظاہر (۵۸۲-۶۱۳) کے حکم پر حکمت سے شغف رکھنے کے جرم میں قتل کر دئے گئے۔

شہاب الدین سہروردی نامی ایک اور بزرگ بھی ساتویں صدی ہجری میں گذرے ہیں اور ان کا شمار بلند پایہ صوفیوں میں ہوتا ہے ان کا پورا نام ابو حفص محمد بن محمد تھا۔ انھوں نے ۶۳۲ھ میں وفات پائی۔ تصوف میں کتاب عوارف المعارف آپ ہی کی یادگار ہے۔ سعدی نے بوستاں میں آپ ہی کا ذکر کیا ہے۔

میدانی ابو الفضل احمد بن محمد میدانی نیشا پور کا رہنے والا تھا۔ عربی قواعد اور لغت میں استاد تھا۔ اس نے نحو پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی مشہور کتابیں کتاب مجمع الامثال اور السامی فی الاسامی ہیں مجمع الامثال میں عربی کی مشہور امثال جمع کر دی گئی ہیں اور السامی میں مذہبی، ہیئتی، جغرافیائی معلومات اور حیوانات کے نام فارسی ترجموں کے ساتھ درج کئے ہیں۔ میدانی نے ۵۱۸ھ میں بمقام نیشا پور وفات پائی۔

زمخشری ابو القاسم محمود زمخشری خوارزمی لغت، نحو، حدیث اور تفسیر کے محقق تھے۔ آپ کی مشہور کتابوں میں انکشاف عن حقیقۃ التنزیل، تفسیر پر اور المفصل نحو پر ہے۔ اسی طرح زمخشری نے اساس البلاغہ کے نام سے عربی لغت کی تحقیق پر اور عربی لغت کی تحقیق پر اور عربی سے فارسی میں ایک مفید لغت مقدمۃ الادب کے نام سے لکھی ہے۔ ۴۶۷ھ میں بمقام زمخشر پیدا ہوئے اور ۵۳۸ھ میں وفات پائی۔

شہرستانی ابو الفتح محمد شہرستانی بھی ایران نژاد علماء میں شمار ہوتے ہیں ۴۷۹ھ میں بمقام شہرستان پیدا ہوئے۔ فقہ، کلام اور علم ادیان میں صاحب تحقیق گذرے ہیں شہرستانی کی مشہور کتاب الملل والنحل اسلامی فرقوں اور مذاہب کی تفصیل اور حکماء کے خیالات کی تشریح پر ہے۔ شہرستانی نے ۵۴۸ھ میں وفات پائی۔

اس دور کے علماء میں ابو الحسن علی بن حسن باخرزی نیشا پور اور ہرات کے درمیان ایک قصبہ باخرز کے رہنے والے تھے۔ فقہ اور ادب میں استاد تھے اور عربی میں شعر کہتے تھے۔ ان کی مشہور تصنیف "دمیتہ القصر" ہے اس کتاب میں انھوں نے اپنے زمانے کے دو سو پچیس عربی گو شاعروں کے حالات اور اشعار درج کئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے شاعر ایرانی ہیں۔ ان کے سوا بہت سے ادیبوں اور مصنفوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ باخرزی نے ۴۶۷ھ میں وفات پائی۔

اس عہد کے ایک اور عالم عبد القاہر بن عبد الرحمٰن جرجانی ہیں جو علم نحو کے

استادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ علم نحو میں ان کی کئی اہم کتابیں ہیں۔ ان میں سے ایک العوامل ہے۔ جرجانی نے ۵۰۲ھ میں وفات پائی۔

ایک اور عالم **ابو اسمٰعیل حسن بن علی طغرائی اصفہانی** تھا یہ عراق کے سلجوقی بادشاہ مسعود بن محمد ملک شاہ (۵۴۷-۵۲۸) کا وزیر، مشیر اور صاحب تدبیر تھا۔ اس کا شمار اپنے زمانے کے مشہور ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ عربی میں اس کا دیوان بہت بلند پایہ سمجھا جاتا ہے۔ عربی کا مشہور قصیدہ لامیۃ العجم اسی شاعر کا قصیدہ ہے۔ طغرائی ۵۱۴ھ میں مارا گیا۔

ایک اور عالم **انوشیرواں بن خالد بن محمد کاشانی** عراق کے اولین سلجوقی بادشاہ سلطان محمود بن محمد بن ملک شاہ (۵۲۵-۵۱۱) کا وزیر تھا اور اپنے زمانے کے بلند پایہ ادیبوں اور مورخوں میں گنا جاتا تھا۔

ایک اور عالم **ابوذکریا یحییٰ بن علی تبریزی** جو خطیب تبریزی کے نام سے مشہور ہے عربی ادب اور لغت میں بہت بڑا امام مانا جاتا ہے۔ بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں درس دیتا تھا، عروض و قوافی، اعراب قرآن، شرح معلقات اور عربی دواوین کی شرح پر اس کی کئی کتابیں ہیں۔ اس نے ۵۰۲ھ میں وفات پائی۔

ماخذ:-

تصوف، صوفیا اور اولیاء کے لئے فارسی کتابیں:

کشف المحجوب۔ طبع روس

اسرار التوحید فی مقامات ابی سعید۔ طبع روس

اسرار التوحید فی مقامات ابی سعید طبع ایران، باہتمام آقای جہریار و تصحیح آقای بہمنیار

تذکرہ اولیاء شیخ عطار۔ طبع یورپ۔ مقدمہ از آقای محمد قزوینی نقد النصوص جامی۔

نفحات الانس، جامی

گوہر مراد، ملا عبدالرزاق لاہیجی

شرح گلشن راز، محمد لاہیجی

تاریخ ادبیات ایران، براؤن، ج ۲

رسالۂ ڈاکٹر رضا زادۂ شفق، حصہ اول، طبع برلن

سلجوقی دور کے لئے :

راحۃ الصدور، راوندی، طبع یورپ

سلجوقی دور کے شعراء ادباء اور مصنفوں کے لئے جیسے بابا طاہر، معزی، انوری، طغرائی، اسی کتاب کی فہرست ملاحظہ ہو۔

باباطاہر عریاں کے لئے :

راحۃ الصدور

مقدمہ دیوان باباطاہر۔ طبع طہران باہتمام مجلۂ ارمغان تاریخ ادبیات ایران براؤن، ج ۲

دوسرے شاعروں کے لئے :

رسائل خواجہ عبداللہ انصاری، طبع ارمغان ۱۳۱۹ھ باتصحیح آقائی تابندہ گنابادی۔

تاریخ برامکہ، جو چوتھی اور پانچویں صدی کی بہترین کتابوں میں ہے، باہتمام عبدالعظیم قریب گرگانی، ۱۳۱۳ھ

فہرست مخطوطات، ریو، ج ۲، (فارسی تذکروں کے لئے کتاب کے آخر میں دی ہوئی فہرست ملاحظہ ہو)

فرہنگ اسدی، طبع یورپ و طبع طہران باتصحیح آقای اقبال مقدمہ دیوان

ناصر خسرو- بقلم مرحوم غنی زادہ، طبع برلن۔
دیوان ناصر خسرو، طبع طہران، با مقدمہ آقای تقی زادہ قطران اور اس کے زمانے کے ملاحظہ ہو:
شہریاران گمنام، از آقای کسروی
منتخبات فارسی (کریستومانی)، تالیف شفر، ج ۲
سفرنامہ ناصر خسرو، طبع برلن
ابن الاثیر، حوادث سالہای ۴۱۸ و ۴۳۲ و ۴۵۰ تاریخ ابن خلدون، طبع مصر ص ۴۹۶
دیوان سنائی، بہ تصحیح آقای مدرس رضوی، طہران
سیر العباد الی المعاد، از حکیم سنائی، باہتمام آقای کوہی، بہ تصحیح آقای سعید نفیسی، طہران ۱۳۱۶ء۔
ویس رامین، از فخر الدین گرگانی، بہ تصحیح آقای مجتبیٰ مینوی، ج ۱ طبع طہران ۱۳۱۴ھ

خیام کے لئے ملاحظہ ہو:

تعلیقات چہار مقالہ، طبع یورپ بقلم آقای محمد قزوینی اور اسی کتاب کے متن کی حکایتیں۔
پروفیسر کریستنسن (CHRISTSNSEN) کی تحقیقات ان کی کتاب "رباعیات خیام" (انگریزی) میں
مقدمہ رباعیات خیام، از آقای سعید نفیسی، طبع طہران۔
مقدمہ رباعیات خیام، از دکتر رضا توفیق و حسین دانش، طبع استانبول، ترکی

عطار کے لئے ملاحظہ ہو:

تذکرۃ الاولیاء، طبع یورپ، با مقدمہ آقای محمد قزوینی
دیوان عطار، بہ تصحیح آقای سعید نفیسی، طہران ۱۳۱۹ء
احوال وآثار عطار، از آقای سعید نفیسی، طہران ۱۳۲۰ء

انوری اور معزی کے لئے ملاحظہ ہو :

حکایات چہار مقالۂ عروضی سمرقندی، طبع یورپ و طہران
انوری کے بارے میں ژدکوو سکی کی تحقیقات جس کا خلاصہ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران میں دیا ہے۔
حبیب السیر، طبع بمبئی، ج ۲، ص ۱۰۳
تاریخ راحۃ الصدور
تاریخ گزیدہ
دیوان امیر معزی، با مقدمہ و تصحیح آقای عباس اقبال، طہران ۱۳۱۸ء

مسعود سعد سلمان کے لئے ملاحظہ ہو :

"بہترین شرح حال مسعود سعد مستخرج از اشعار و اقوال خودش"
بقلم آقای محمد قزوینی، طبع یورپ (ترجمہ انگریزی)
دیوان مسعود سعد۔ بہ تصحیح و مقدمہ آقای رشید یاسمی، طبع طہران ۱۳۱۵ء
"حصار نای" مسعود سعد کی سوانح، از آقای سہیلی خوانساری

جمال الدین اصفہانی کے لئے ملاحظہ ہو :

دیوان جمال الدین اصفہانی (مختصر)، باہتمام آقای ادیب نیشاپوری طبع طہران
دیوان کامل جمال الدین اصفہانی، بہ تصحیح و حواشی آقای وحید دستگردی، طہران ۱۳۲۰ء

ابوالفرج رونی کے لئے ملاحظہ ہو :

دیوان ابوالفرج رونی، باہتمام آقای وحید دست گردی

خاقانی کے لئے ملاحظہ ہو:

تحقیقات خانیکوف، جس کا خلاصہ پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب تاریخ ادبیات ایران کی دوسری جلد میں دیا ہے۔ تاریخ ادبیات ایران از اتہ ترجمہ

سخن وسخنوران، از آقای بدیع الزماں فروزانفر، طبع طہران ج ۲

دیوان خاقانی، بہ تصیحح آقای عبدالرسولی، طبع طہران ۱۳۱۶ھ

نظامی اوران کے زمانے کے لئے ملاحظہ ہو:

مقدمہ خمسہ، طبع طہران

اخبار نظامی، از باخر (جرمن) طبع جرمنی، ۱۹۱۷ء

تاریخ ادبیات ایران، از پروفیسر براؤن، ج ۲

تاریخ ادبیات ایران، از اتہ

مقالات آقای سعید نفیسی، مجلہ ارمغان سال ۴، شمارہ ۳ و ۴

مقالہ پروفیسر ربیکا، مجلہ ارمغان، شمارہ اول، سال ۱۶

فہرست مخطوطات فارسی، ریو، ج ۲

ابن الاثیر۔ حوادث ۶۲۲ھ و ۶۲۵ھ

خمسہ نظامی، بانضمام منتخبات نصائح بعنوان اندرزنامہ و دیوان وشرح حال نظامی بعنوان گنجینۂ گنجوی، بہ تصیحح آقای وحید دستگردی، طہران

مقدمۂ حدائق السحر، طبع طہران، بقلم آقائی اقبال

عمق بخارائی، از آقای ذبیح صفا، مجلۂ مہر طہران، سال سوم، شمارہ ۳، ۴

مقدمۂ کشف المحجوب، طبع روس (روسی زبان میں)

تذکرۃ الاولیاء، دو جلد، طبع یورپ، با مقدمہ آقای قزوینی۔

داستان لیلیٰ و مجنوں و مقایسہ ادبی با رومیو و جولیٹ از آقای علی اصغر حکمت طہران ۱۳۲۰ھ

سیاست نامہ، طبع طہران

شرح حال بیہقی، ڈاکٹر رضا زادہ شفق، مجلۂ ارمغان شمارہ ۱۲، سال ۱۱، اور شمارہ ۱ و ۲، سال ۱۲

مقدمہ راحۃ الصدور، طبع یورپ از محمد اقبال، با شرح حال مصنف بقلم خود

مقدمہ قابوس نامہ، از آقای سعید نفیسی، طبع طہران ۱۳۱۲

مقدمہ مرزبان نامہ، بہ تصحیح آقای قزوینی، طبع طہران ۱۳۱۱ھ

کلیلہ و دمنہ، با مقدمہ آقای عبدالعظیم قریب

منتخبات کلیلہ و دمنہ، با مقدمہ و اہتمام آقای قریب، طبع طہران ۱۳۲۰ھ

کیمیای سعادت، طبع طہران، باہتمام آقای احمد آرام

غزالی نامہ، از آقای جلال ہمائی، طہران، ۱۳۱۸ھ

چہار مقالہ، طبع یورپ، با مقدمہ و حواشی آقای محمد قزوینی مقامات حمیدی طبع تبریز

ذخیرہ خوارزمشاہی، قلمی نسخہ، کتب خانہ سپہ سالار، طہران امام فخر رازی پر آقای سعید نفیسی کے مقالات، مجلۂ مہر، طہران

فقہا اور علماء کے لئے (اوپر کی کتابوں کے علاوہ) ملاحظہ ہو:

مجالس المومنین، قاضی نوراللہ شوشتری

روضات الجنات، خوانساری

قصص العلماء تنکابنی

فہرست شیخ طوسی

(۲۱) تاریخ ادبیات ایران

فہرست ابن الندیم
رجال کی کتابیں جیسے: طبقات الاطباء ابن ابی اصبعہ،
طبقات الشافعیہ، سبکی۔ معجم الادباء، یاقوت۔
اخبار الحکماء، قفطی۔ خاندان نوبختی از آقای اقبال۔
تاریخ ادبیات عرب از بروکلمان۔ وفیات الاعیان، ابن خلکان۔

۴۔ مغلوں اور تیموریوں کا دور

ایران پر مغلوں کا استیلا ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں ترکستان کی طرف سے چنگیز خاں کے حملہ سے شروع اور ایران میں اس کی اولاد کی تاسیس سلطنت پر ختم ہوا۔ چنگیز خاں کی یہ اولاد ایران میں ایل خانوں کے نام سے آٹھویں صدی ہجری تک حکومت کرتی رہی مغلوں کے حملہ سے پہلے ہی سلجوقیوں کی سلطنت نے اپنی جگہ خوارزم شاہیوں کو دیدی تھی۔ علاء الدین محمد خوارزم شاہ جو اس سلسلہ کے مشہور سلاطین میں تھا، مغلوں کے ہجوم میں گرفتار ہوا، میدان کارزار میں شکست کھائی اور سلسلہ خوارزم شاہی ۶۲۸ھ میں اس قوم کے ہاتھوں ختم ہو گیا۔

خوارزم شاہیوں کے معاصروں اور رقیبوں میں ایک اتابکان فارس بھی تھے جو خود بھی مغلوں کے استیلا سے دوچار ہوئے۔ لیکن ان کی اطاعت کی اور دوراندیشی سے ان کو خراج پیش کر کے جنوبی ایران کو محفوظ رکھا، آخر کار ۶۸۶ھ کے قریب یہ بھی ختم ہو گئے۔

سلسلۂ ایل خانی کا پہلا حکمران ہلاکو تھا اور اس سلسلہ کے مشہور سلاطین اباقا آن، غازان اور اولجاتو تھے۔ ایران میں غازان پہلا مغل سلطان تھا جس نے دین اسلام اختیار کیا مغلوں کی سلطنت کے انقراض کے کوئی نصف صدی بعد تیموریوں نے جو اصلاً مغلوں کے قرابت دار ہیں، ایران میں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی اور دسویں صدی ہجری کے اوائل یعنی صفوی خاندان کی ابتداء تک فرمان روائی کرتے رہے۔

تیموریوں کے سلسلہ کے مشہور فرماں روا تیمور لنگ، شاہ رخ، الغ بیگ اور ابو سعید تھے
مغلوں کی سلطنت کے انقراض کے بعد ایران کے مختلف حصّوں میں دوسرے
حکمرانوں کے چھوٹے چھوٹے سلسلہ وجود میں آئے، جیسے جلا یری، سربداری، آل کرت
مظفری اور قرہ قونیلو۔ ان میں سے اکثر ایل خانوں کے انقراض اور تیمور کے ظہور کی درمیانی
نصف صدی کے وقفہ یعنی آٹھویں صدی ہجری کے نصف دوم میں مختلف اقطاع ملک
پر حکومت کرتے رہے۔

مغلوں کا فتنہ اور تیمور کا حملہ تاریخ کی ایک بہت بڑی مصیبت ہے جو نہ صرف
ایران میں ظاہر ہوئی بلکہ اس نے ایشیا اور یورپ کے ایک بہت بڑے حصّہ کو ویران اور پریشان
کردیا۔ شمالی ایران کے تقریباً تمام شہر اور ان کے ساتھ ہزاروں دیہات اور قصبات غارت
و برباد ہوئے اور ان کے مکینوں کا قتل عام ہوا۔ اس قتل و غارت گری اور بربادی کا اثر سب
سے زیادہ ادبیات اور علوم پر پڑا۔ نہ صرف بے شمار علماء و فضلا انتہائی عذاب دے دے کر
مار ڈالے گئے بلکہ مساجد، مدارس، متبرک اور وقف عمارتیں، اور کتب خانے جن میں علوم و
آثار کے بے شمار خزانے تھے لوٹ اور غارت گری کے نذر ہو کر نیست و نابود ہو گئے
اس مصیبت سے جو اہل علم کسی طرح بچ گئے وہ ادھر ادھر فرار ہو کر روپوش ہو گئے۔ ان مقامات
میں علم و فضل کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ یہاں علم و معرفت کی جگہ وحشت و بربریت نے
لے لی۔ بایں ہمہ اس سرزمین میں غارت گری اور فتنہ نمودار ہونے کے باوجود علمی آثار اور
ادبیات ایران کامل طور پر زوال پذیر نہیں ہوئے بلکہ صدمات مغول کے پہلے دور کے
بعد انھیں فرصت مل گئی اور وہ پھر پروان چڑھنے لگے، بلکہ علوم کے بعض شعبوں میں خاص کر
تاریخ میں مغولی اور تیموری دور خاص امتیاز کا حامل ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس پورے عہد
نے ایران کی ادبی تاریخ میں اہمیت پیدا کر لی۔ اس تضاد کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ایران میں
تمدن، علوم اور ادب کی بنیادیں سامانیوں کے عہد سے مضبوط ہونے لگیں اور جیسے جیسے

زمانہ گزرتا گیا ان میں پختگی و کمال پیدا ہوتا گیا۔ اس سرزمین کے ہر گوشے سے سینکڑوں اہل دانش اٹھے اور اپنی تالیفات اور آثار یادگار چھوڑ گئے تھے۔ اس تمام معنوی ذخیرہ کو جو صدیوں کی نہایت مستحکم اور استوار یادگار تھی، ایک حملۂ مغول سے جو ہر چند بہت شدید اور خونریز تھا بالکلیہ نابود ہو جانا ممکن نہ تھا۔ کچھ کتابیں اور آثار اتفاقاً وحشی مغلوں کی نظر سے بچ رہے کچھ بعض دور دست شہروں میں بھیج دیے گئے۔ اسی طرح چند بزرگ اور دانش مند جلا مغلوں کے ہاتھ سے اپنی جان بچا لے گئے اور خاص کر جنوبی ایران کے ملکوں میں جو اس غارت گر قوم کی تباہ کاریوں سے مامون تھے پناہ گزین ہوئے۔ کچھ ہندوستان اور ایشیائے کوچک چلے گئے اور ان مقامات پر اطمینان کے ساتھ ایرانی ادبیات اور علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں مشغول ہو گئے۔

دوسری وجہ یہ کہ اگرچہ ابتدا میں مغول اور تیموری سلاطین درندے اور آدم خوار تھے لیکن ایران میں مقیم ہو جانے اور اس قوم کے افکار سے مانوس ہونے کے بعد ان کی ماہیت ہی بدل گئی۔ تاخت و تاز کی عادت اور حرص و آز کی خصلت بالکل چھوٹ گئی اور بتدریج اسلام اور ایران کے تمدن سے بہ آشنا ہونے لگے۔ علماء و فضلا کی صحبت پسند آنے لگی اور ان میں سے بعضوں نے خود ہنر پیدا کیا اور اہل ہنر کی سرپرستی کی۔ یہاں تک کہ بعض ایرانی اہل دانش کو جیسے خواجہ نصیر الدین طوسی، خواجہ شمس الدین محمد جوینی صاحب دیوان اس کے بھائی عطا ملک جوینی اور رشید الدین فضل اللہ کو مشیر بنایا گیا یا وزارت اور امارت پر انھیں فائز کیا گیا۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنی جگہ اہل فضل کی سرپرستی اور حمایت کی۔ خواجہ نصیر جو ہلاکو کے دربار میں نہایت محترم سمجھے جاتے تھے ایران کے مشہور اور بہت بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ خواجہ نصیر الدین طوسی کے حلقہ درس میں سینکڑوں شاگرد ہوتے تھے اس طرح وہ ایرانی اور اسلامی علوم و فضائل کی نشر و اشاعت کرتے تھے۔ اباقاآن کا وزیر صاحب دیوان علماء اور فضلاء کا مربی تھا اور شیخ سعدی جیسے استاد نے اس کی مدح

وتحسین کی ہے۔ اس کا بھائی ملک عطا جوینی جسے مغل بادشاہ کی طرف سے حکومت ملی تھی، علم و
ادب کی خدمت میں ہمیشہ کمربستہ رہا۔ اصل میں خاندان جوینی ایرانی علوم کی نشرو اشاعت
اور حسن خدمت میں ہمیشہ سے ممتاز رہا۔ غازان کا وزیر رشید الدین فضل اللہ کا شمار اس عہد
کے بہترین علماء طبیبوں اور مورخوں میں ہوتا ہے اور یہ عقل و تدبیر میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔

پس یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مغل اور تیموری عہد میں اتنی ویرانی اور پریشانی
کے باوجود نامی گرامی علماء و فضلاء پیدا ہوئے۔ نہ صرف یہ کہ درجہ اول کے ایرانی شاعر جیسے
سعدی نے اس عہد میں شہرت پائی اور مولانا جلال الدین رومی، حافظ، جامی اور دوسرے
مورخ، ادیب اور شاعر اس دور میں ظہور پذیر ہوئے بلکہ سرزمین ایران نے خود بعض مغل
اور تیموری شہزادوں اور امیروں کی ایسی تربیت کی کہ ان میں بھی صاحب ذوق لوگ پیدا
ہونے لگے۔ خود تیمور اپنی بے پناہ شقاوت، خونخواری اور درشتی کے باوجود ادبیات اسلام
و ایران کے معنوی لذائذ سے محظوظ ہوتا تھا۔ ادیبوں اور ظریفوں کی مجلسیں اسے پسند تھیں
اس کی اولاد اور اس کے جانشین بھی کم و بیش صاحبان فضل و دانش کو دوست رکھتے تھے
منجملہ ان کے الغ بیگ نے علماء کی سرپرستی کی، علم نجوم میں کافی مہارت حاصل کی اور زیچ
تیار کی۔ الغ بیگ کا بھائی بایسنقر بھی خاص ادبی ذوق رکھتا تھا، فارسی اشعار اور کتابوں کا
نہایت ذوق و شوق کے ساتھ مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ ایرانی شاعروں، موزوں
خوش نویسوں اور نقاشوں کا مجمع رہتا تھا۔ خوش نویسی میں خود استاد تھا۔ مشہد کی مسجد گوہر شاد
کے طاق پر اور اس کے داخلہ کے گرداگرد اس نے اپنے استادانہ قلم سے جو قرآنی آیات
لکھی ہیں، اس سے اس کی استادی ظاہر ہے۔ اسی کے حکم سے شاہ نامہ کا ایک نسخہ اس کے
لئے لکھا اور اس پر ایک مفید مقدمہ تحریر کیا گیا۔ آج شاہ نامہ کا جو مشہور قدیم ترین نسخہ موجود
ہے وہ یہی نسخۂ بایسنقری ہے جو ۸۲۹ھ میں لکھا گیا۔ تیمور کے علم دوست جانشینوں میں ایک
ابوالغازی سلطان حسین بھی تھا جس نے ہرات اور اس کے اطراف میں چالیس سال تک

حکومت کی۔ اس حکمران کا دربار جامی جیسے شعراء اور علمائے دولت شاہ، حسین واعظ اور خواند میر جیسے مورخوں اور ادیبوں، بہزاد اور منظفر شاہ جیسے نقاشوں اور سلطان علی مشہدی جیسے خوش نویسوں کا مرکز بنا ہوا تھا یہ سب کے سب اس کے بڑے امیر اور وزیر علی شیر نوائی کی سرپرستی سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ تیموریوں کی ہندی شاخ نے بھی ایرانی ادبیات کو رواج دیا۔ تیموری النسل بابر کے جانشینوں کے عہد میں ہندوستان فارسی ترجموں اور تالیفوں کا مرکز بن گیا، جس کا ذکر ہم دوسری فصل میں کریں گے۔

دوسرے حکمران خاندانوں میں بھی اہل فصل کچھ کم نہ تھے، آتابکان فارس میں ابو بکر اور اس کا بیٹا سعد، سعدی کے سرپرست تھے اور جو اہل فضل مغلوں کی یورش سے بھاگ کر ان کے پاس پناہ گزین ہوئے تھے ان کی دلداری کرتے تھے۔ منظفریوں میں شاہ شجاع حافظ کا شیدائی تھا، اور آل کرت میں فخرالدین نے اپنے پائے تخت کو ادیبوں کا مرکز بنا دیا تھا۔

اس عہد کا اہم ترین ادبی واقعہ ایران سے باہر فارسی زبان کا پھیلنا تھا۔ کیوں کہ ایرانی ادیبوں کی ہجرت اور بعض تیموری یا مغل سلاطین کے اثر سے ہمسایہ اور اطراف کے ملکوں اور خاص کر ہندوستان میں فارسی زبان رائج ہوگئی اور ان ملکوں میں فارسی زبان میں لکھنے والے، مصنف اور شاعر پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں فارسی زبان کے مشہور شعراء جیسے امیر خسرو، فیضی، ظہوری دکنی اور عرفی شیرازی نے اسی عہد کے بعد شہرت حاصل کی ہندوستان سے گذر کر ترکی میں بھی ان شاعروں کی تقلید اور اتباع ہونے لگی اور اس طرح ان ملکوں میں فارسی زبان کی بہت بڑی خدمت کی گئی۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ عہد مغول و تیموری کے غیر فطری طرزوں نے فارسی زبان کو عموماً اور اس کی نثر کو خصوصاً مصنوعی اور غیر فطری بنا دیا۔ سیدھی سادی اور شیریں نثر لکھنے کی قدیم طرز بالکل متروک ہوگئی۔ بہت سے لکھنے والے نفاظی پر اتر آئے اور اپنے مطالب کو طول طویل استعاروں، اشاروں اور کنایوں میں ادا کرنے لگے۔ عبارت آرائی ہونے لگی

بے ضرورت عربی الفاظ استعمال ہونے لگے۔ حشو وزوائد سے کام لیا جانے لگا۔ بے ضرورت مغلق الفاظ اور عبارتیں، بے جا مبالغے اور ناروا تشبیہیں رواج پا گئیں حتیٰ کہ تاریخی مطالب بھی اس لفاظی کے اصول کے ایسے تابع ہو گئے کہ ایک ذرا سے مطلب کے بیان کرنے کے لئے بڑی بڑی کتابوں کو بوجھل اور ثقیل عبارتوں سے پُر کرنے لگے۔ اگر تاریخ معجم یا تاریخ وصاف جیسی کسی کتاب کے (جو اس عہد کے اہم آثار میں ہے) پر تکلف طرز کا جس کی ایک مدت تک دوسرے مصنف تقلید کرتے رہے مثال کے طور پر تاریخ بیہقی سے مقابلہ کیا جائے تو ان دونوں کے اسلوب میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا اور اس سے فارسی زبان کے سبک کا صریح تنزل واضح ہو جائے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ اس طرز کو عمومیت حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ نظم اور نثر میں لکھنے والوں نے اسی قبل مغول طرز کو پیش نظر رکھا تھا یا کم از کم دوسروں کی طرح ظاہر پردازی میں غرق نہیں ہوئے تھے، اسی لئے فصیح اور شیریں نظم و نثر لکھتے تھے گلستان اور تاریخ جوینی یا تاریخ وصاف اور جامع التواریخ جو سب کی سب ایک ہی عہد کی تصنیفیں ہیں ان کی طرزوں میں اختلاف کی وجہ یہی ہے۔

دور مغول کی نظم کے بارے میں کہنا چاہیئے کہ اسی دور نے عرفانی یا صوفیانہ شاعری کے مکمل نمونے پیدا کئے اور واقعہ یہ ہے کہ اسی عہد میں تصوف کے بہترین اور لطیف ترین معانی نے موزوں فارسی عبارت کا قالب اختیار کیا۔ اس طرز میں کہنے والوں میں مشہور ترین حافظ، جامی اور خصوصاً مولانا جلال الدین رومی اسی عہد میں پیدا ہوئے۔ اس مسلک کے زور پکڑنے کے عوامل میں شاید ایک مغلوں کا ظلم و ستم، لوٹ اور غارت گری بھی ہے کہ اس کی وجہ سے صاحب دلانِ ایران دنیائے خارج کے اس ہنگامے سے رنجیدہ اور دل شکستہ ہو کر عالمِ داخلی کی طرف متوجہ ہوئے اس کی معنویت پر غور و فکر کیا، ریاضت کے ذریعہ تسلیِ خاطر حاصل کی اور عالم ظاہر کے آشوب کا بدل عالمِ باطن کے سکوت و سکون اور صفائی

کے ذریعہ کیا۔

مغلوں اور تیموریوں کے استیلا کا ایک ضمنی نتیجہ فارسی میں بے شمار مغول اور ترکی الفاظ کا داخل ہونا ہے جن میں بہت سے موجودہ فارسی میں بھی باقی اور متداول ہیں۔ یہاں مثال کے طور پر ان بیرونی الفاظ کا ذکر کیا جاتا ہے: ایلغار (ہجوم) نیما (تاخت و تاز و غارت) چپاول (غارت) یورت اور اردو (لشکر، فوجی چھاؤنی) ایلچی (نمائندہ۔ فرستادہ) قراول (پاسبان، سپاہی) تومان (دس ہزار، بیورہ) نویان (مغول شہزادوں کا درجہ اور لقب) کوچ (رحلت۔ روانہ ہونا) اوغراق (توشہ، زادراہ) تمغا (مہر)

اسی طرح خان (قاان)، خاقان اور خاتون کے القاب اور اسماء میں خاص طور پر البتکین، سبکتگین، خان بالیغ، ابش، منگبرنی، تکش اور تغلق اس کی مثالیں ہیں۔

مشہور شاعر اور سخن گو

سعدی مشرف الدین مصلح بن عبداللہ سعدی شیرازی۔ ایران کے آسمانِ ادب کا وہ درخشاں ستارہ جس کی بدیع نظم و نثر نے فارسی زبان کو فصاحت کے درجۂ کمال پر پہنچایا، جس نے بلاغت کا بہترین نمونہ پیش کیا اور حقیقت میں اپنے اس شعر کے مطابق ؎

ہفت کشور نمی کنند امروز   بے مقالات سعد انجمنی

ہر زمانہ میں مقبولِ اہلِ ذوق و ادب رہا۔

بوستان کے ایک شعر کے مطابق جو سعدی نے ۶۵۵ھ میں تصنیف کیا، اور کہا ہے ؎

الا اے کہ عمرت بہ ہفتاد رفت   مگر خفتہ بودی کہ بر باد رفت

(ایسی صورت میں کہ یہ شعر انھوں نے اپنے آپ سے خطاب کر کے کہا ہے) وہ ۵۸۵ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے اور ایک شعر کے مطابق جو گلستان میں آیا ہے ؎

ای کہ پنجاہ رفت و در خوابی! مگر این پنج روزہ دریابی!

گلستان کی تالیف کے وقت یعنی ۶۵۶ھ میں اپنے آپ کو خطاب کر کے کہا ہے تو ان کی تاریخ ولادت ۶۰۶ھ کے لگ بھگ آتی ہے۔

تاریخی قرائن دوسرے مفروضہ کو حقیقت سے بہت قریب کر دیتے ہیں اول تو یہ کہ کلیاتِ سعدی میں سلطان فارس اتابک سعد زنگی (۵۹۹ - ۶۲۳) کا ذکر نہیں ملتا حالانکہ شاعر اس خاندان سے منتسب تھا اور اس خاندان کے بادشاہوں کی مدح کی ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر سعد کے زمانے میں ابھی بالکل نوعمر جوان اور گمنام تھا دوسرے چونکہ سعدی کی وفات ۶۹۱ھ اور ۶۹۴ھ کے درمیان ہوئی اس لئے ان کی ولادت ۵۸۵ھ کی بہ نسبت اوائل قرن میں زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس طرح ان کی عمر سو سال سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ سعدی گلستان اور بوستان میں ابوالفرج بن جوزی (متوفی ۶۵۶ھ) شہاب الدین سہروردی (ابو حفص عمر بن محمد صاحب عوارف المعارف متوفی ۶۳۲ھ) جیسے استادوں اور واعظوں کا نام اس طرح لیتے ہیں جیسے ان لوگوں نے ان کو پند و نصیحت کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بغداد میں ان بزرگوں کے ارشاد اور تدریس کے موقع پر ہمارے شاعر نے ان سے تلمذ حاصل کر کے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ اس وقت ان کی اٹھتی جوانی ہوگی اور قرینِ قیاس یہ ہے کہ اس زمانے میں بیس بائیس سال سے زیادہ ان کی عمر نہ ہوگی۔

پس ان کی ولادت ۶۰۶ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی جیسا کہ "پنجاہ رفت و در خوابی" والے شعر سے ظاہر ہے، اور یہی سنہ درست معلوم ہوتا ہے۔

اوائل جوانی ہی میں شاعر کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا، چنانچہ کہتے ہیں:

مرا باشد از حال طفلان خبر   کہ در طفلی از سر برفتم پدر

من آنگہ سر تاجور داشتم   کہ سر در کنارِ پدر داشتم

سعدی کے اجداد اہلِ علم و دانش تھے اور علومِ دینی میں شہرت رکھتے تھے، خود فرماتے ہیں

همه قبیلهٔ من عالمان دین بودند　　　　مرا معلم عشق تو شاعری آموخت

سعدی نے ابتدائی تعلیم شیراز میں حاصل کی اور اس کے بعد بغداد روانہ ہوئے اور یہاں مشہور مدرسہ نظامیہ اور دوسری علمی محفلوں میں کسبِ علوم و فضائل کیا۔ جوانی ہی سے بے چین روح رکھتے تھے کسی ایک جگہ پابند ہو کر نہ رہے۔ ساری دنیا میں گھومنا اور لوگوں کو دیکھنا چاہتے تھے۔ واقعتاً یہ اشعار...... خود ان کے ترجمانِ حال تھے

به هیچ یار مده خاطر و به هیچ دیار　　　　که بر و بحر فراخست و آدمی بسیار

چو ماکیان بدر خانه چند بینی جور　　　　چرا سفر نکنی چون کبوتر طیار

زمین لگد خورد از گاو خر بعلت آن　　　　که ساکنست نه مانند آسمان دوار

شوق جہاں گردی کے سوا ان کا وطن ایران مغلوں کے ہجوم میں گرفتار اور فارس خوارزمشاہیوں اور اتابکوں کی اولاد کی کشمکش میں مبتلا تھا، اس لئے ان کا دل اپنے وطن سے اچاٹ ہو گیا اور پھر انھوں نے جہاں گردی شروع کر دی اور تیس سے چالیس سال کی مدت مسافرت ہی میں گذار دی۔ بغداد، شام اور مکہ سے لے کر شمالی افریقہ تک گھومتے رہے۔ مختلف شہر اور گوناگوں ملتوں کو دیکھا، مختلف مذاہب اور فرقوں سے واقف ہوئے اور مختلف طبقات انسانی سے اختلاط پیدا کیا۔ شاید اس قطعہ میں :

ندانی که من در اقالیم غربت　　　　چرا روزگاری بکردم درنگی

اسی مسافرت کی طرف اشارہ ہو۔ غالباً اس مسافرت کا آغاز غیاث الدین خوارزم شاہی کے حملۂ فارس کے سال یعنی ۶۲۲ھ سے ہوا ہو گا اور اگر گلستان کی بعض حکایتیں صرف شاعرانہ تخیلات نہیں ہیں، تو سعدی نے کاشغر، ہندوستان اور ترکستان بھی دیکھا ہے۔ ایک روایت کی رو سے وہ مکہ کے سفر میں تبریز پہنچے اور وہاں اباقاان، صاحب دیوان، اور اس کے بھائی سے ملے ہیں۔

اس طولانی سفر اور آفاق و انفس کی سیر کے بعد ہمارا جہان دیدہ شاعر تجاربِ معنوی اور افکارِ عالیہ کی ایک دنیا لئے ہوئے شیراز واپس ہوا۔ اس زمانے میں یہاں اس کا ممدوح اور سرپرست اتابک ابو بکر بن سعد بن زنگی (۶۲۳ - ۶۶۸) حکومت کرتا تھا اور ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا تھا، چنانچہ کہتے ہیں:

چو باز آمدم کشور آسوده دیدم! پلنگان رہا کرده خوی پلنگی

چناں بود در عہد اول کہ دیدی جہانی پر آشوب و تشویش و تنگی!

چنیں شد در ایام سلطان عادل اتابک ابو بکر بن سعد زنگی

اسی زمانے میں شاعر کو فراغت نصیب ہوئی اور اسے تصنیف و تالیف کا خیال آیا اپنے نغموں اور اپنے کلام کو جمع کیا، بوستان اور گلستان لکھی اور اپنے اشعار و قطعات کو مرتب کیا۔

سعدی ان خوش نصیب شاعروں میں تھے جنھوں نے اپنی زندگی میں بلکہ ابتدائے جوانی ہی میں اپنی شہرت کا غلغلہ سنا اور ان کی یہ ناموری اتابک ابو بکر کے زمانے میں کمال کو پہنچی۔ بوستان میں کہتے ہیں:

کہ سعدی کہ گوئے بلاغت ربود در ایام بو بکر بن سعد بود

سعدی نے اسی زمانے میں یعنی ۶۵۵ھ میں بوستان نظم کی، چنانچہ فرماتے ہیں:

ز ششصد فزوں بود پنجاه و پنج کہ من گفتم ایں نامبردار گنج!

اس کے ایک سال بعد گلستان تصنیف کی، اس کے مقدمہ میں کہا ہے:

دراں مدت کہ مارا وقت خوش بود ز ہجرت ششصد و پنجاه و شش بود

ان دو تصانیف کے سوا استاد کے قصائد، غزلیات، قطعات، ترجیع بند، رباعیات، مقالات اور عربی قصائد بھی ہیں جو ان کے دیوان کلیات میں جمع کر دیے گئے ہیں۔

سعدی، اتابکانِ فارس کے سوا صاحب دیوان اور اس کے بھائی عطا ملک جیسے

مشاہیر اور علماء و فضلاء سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی مدح کی ہے وہ اپنے زمانے کے شاعروں سے بھی ادبی روابط رکھتے تھے اور ان میں سے اکثر نے ان کی ستائش کی ہے۔ چنانچہ مجد ہمگر جو خود بھی اتابک ابو بکر کے دربار سے انتساب رکھتا تھا، کہتا ہے:

از سعدی مشہور سخن شعر رواں جوی　　کو کعبہ فضل است و دلش چشمہ زمزم

خواجہ ہمام الدین تبریزی نے جو خود بھی ایک شیریں مقال شاعر اور صاحب دیوان کا مدح گو تھا، سعدی کی اہمیت اور ان کے حسن شہرت کی طرف اشارہ کیا ہے کہتا ہے:

ہمام را سخن دلفریب و شیریں ہست　　ولے چہ سود کہ بے چارہ نیست شیرازی

آنے والی نسلوں نے سعدی کا جتنا اثر قبول کیا، دنیا میں ان کی جتنی شہرت ہوئی اور مشرقی اور خاص کر ایرانی ادبیات پر انھوں نے جو اثر ڈالا ان سب چیزوں کا ذکر اس مختصر سی کتاب میں ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے بے شمار عالموں اور دنیا بھر کے فاضلوں نے استاد کی بزرگی کے اعتراف میں گوناگوں عنوانوں کے تحت عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں اور بڑے بڑے شاعروں نے انھیں خراج تحسین ادا کیا ہے۔

لسان الغیب خواجہ حافظ فرماتے ہیں:

استاد سخن سعدیست نزد ہمہ کس اما　　دارد سخن حافظ طرز سخن خواجو

امیر خسرو دہلوی اس طرح ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں:

جلد سخنم دارد شیرازۂ شیرازی

اسی طرح قرآن السعدین میں کہتے ہیں:

نوبت سعدی مباد اکہن　　شرم نداری کہ بگوئی سخن

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت　　شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

سعدی نہ صرف ایران بلکہ تمام اسلامی ممالک اور تمام عالم علم و ادب میں اپنے زمانے

سے لے کر اب تک گنتی کے چند بڑے بڑے نامور شعرا میں شمار ہوتے آئے ہیں۔ ہر جگہ ان کے افکار اور اشعار شوق و رغبت کے ہاتھوں لیے اور عقیدت کی آنکھوں سے لگائے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ کتاب گلستاں سلاطینِ ہند اور سلاطینِ عثمانی کے درس میں رہی ہے اور ان ملکوں کے بادشاہ اور شہزادے اس کے اشعار از بر رکھتے تھے۔ ہمارے زمانے کے اہلِ علم و ادب نے ان کی جو قدر کی ہے اس کا کیا کہنا۔ ان کی تصانیف کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں ہو چکا ہے اور ان کا نام ساری دنیا میں جانا پہچانا ہے۔

سعدی کے سبک کی تقلید کیا نظم اور کیا نثر دونوں میں ان کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے کی ہے نظم اور نثر میں کئی رسالے اور کئی کتابیں ان کے سبک کی پیروی میں لکھی گئی ہیں۔ گلستان کی طرز میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: آٹھویں صدی کے شاعر مجد خوافی کی روضۂ خلد۔ جامی کی بہارستان معین الدین جوینی کی نگارستان اور قاآنی کی پریشان۔

اس عظیم المرتبت شاعر کی وفات ۶۹۱ھ سے ۶۹۴ھ کے درمیانی سالوں میں خود ان کے وطن شیراز میں ہوئی اور وہ اسی شہر میں دفن ہوئے۔

سبک و فکر اگر ہم تاریخ ادبیات میں ایسے استادوں سے روشناس ہونا چاہتے ہوں جو ایک خاص سبک کے موجد ایک خاص مسلک کے بانی اور اتیج اور جدت کے مالک گذرے ہیں اور ان کی پیروی کی گئی ہے تو ہمیں سعدی کا مطالعہ کرنا چاہیئے، کیونکہ بغیر کسی تردید کے خوف کے کہا جا سکتا ہے کہ ایسے صاحبانِ کمال میں ایک سعدی شیرازی بھی ہیں۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، سعدی نے شعر کی تمام صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے اور حق یہ ہے کہ وہ ہر صنف سے خوب عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ سعدی کے قصیدے متقدمین کے سبک پر ہیں، لیکن ان سے زیادہ روشن، سادہ اور بے تکلف ہیں ان کا موضوع خدا کی

حمد وثناء پند ونصیحت، مرثیہ اور مدح ہے۔ سعدی کے ممدوحوں میں زیادہ تر حسب ذیل لوگ ہیں:

اتابکانِ فارس یا سلغری خاندان کا چھٹا بادشاہ اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی، اس کا بیٹا سعد بن ابوبکر جس سے سعدی انتسابِ خاص رکھتے تھے اور اپنا تخلص بھی اسی کے نام پر رکھا تھا۔ اتابک محمد بن ابوبکر بن سعد بن زنگی۔ اتابک کی بیٹی ترکان خاتون اتابکان یزد میں محمود شاہ، اتابک سلجوق شاہ بن سلغر شاہ بن سعد بن زنگی۔ اتابک سعد بن ابوبکر کی بیٹی اتابک ابش خاتون۔ فارس کے حاکموں اور امیروں میں امیر انگیانو۔ مجد الدین رومی۔ دانش مند وزیروں میں ہلاکو کے مشہور وزیر صاحب دیوان شمس الدین محمد جوینی اور حاکموں میں اس کا بھائی عطا ملک جوینی۔

استادِ شیرازہ کے قصائد میں جو نکتہ خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے مدح میں متقدمین کی طرح کبھی تفصیل، اغراق اور مضمون آفرینی سے کام نہیں لیا، بلکہ وہ خصوصیت جو سعدی کے قصائد کو ایک امتیازِ خاص بخشتی ہے اور اس حیثیت سے ان کو تمام گذشتہ شعرا پر فوقیت عطا کرتی ہے، یہ ہے کہ وہ ایک نہایت شگفتہ اور دلپذیر انداز میں اپنے زمانے کے بادشاہوں اور امیروں کو عدل ونیکوکاری کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ وہ ان کو زمانے کے انقلاب، جاہ وجلال کے زوال اور تغیرِ احوال پر متنبہ کرتے اور انھیں بیدار کرنے سے نہیں چوکتے۔ اس طرح کی دلیرانہ نصیحت اس زمانے تک نہ صرف ادبیاتِ ایران میں بلکہ تمام دنیا کی ادبیات میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اسے ملک ایران کی فکرِ آزاد اور ہمتِ بلند کی ایک دلیل سمجھنا چاہیے کیونکہ ایرانی شاعر نے آج سے تقریباً سات سو سال پہلے جب کہ ساری دنیا تاریکی، جہالت اور اندھیرے میں غرق تھی، اپنے زمانے کے حکمرانوں کے راستے پر ایک چراغِ ہدایت روشن کیا اور حقایق کو نہایت بے باکی کے ساتھ ان کے سامنے بیان کیا جو زور اور زر دونوں کے مالک تھے۔ یہاں چند شعر نمونے کے طور

پر نقل کئے جاتے ہیں تاکہ اس سے ایرانی ادبیات میں حق پرستی اور آزادی کی روح اور سعدی کی طرز کا اندازہ ہو سکے اور جیساکہ خود شاعر نے کہا ہے یہ معلوم ہو جائے کہ :

نہ ہر کس حق تواند گفت گستاخ　　سخن ملکی است سعدی را مسلم

مجدالدین ۶۸۰ھ میں شیراز کا حاکم تھا، اس کی مدح میں ایک قصیدے کے ضمن میں کہتے ہیں :

جہاں بر آب نہادہ است و زندگی بر باد　　غلام ہمت آنم کہ دل برا و ننہاد

جہاں نماند و خرم روان آدمی!　　کہ باز ماند از و در جہاں بہ نیکی یاد

بر انچہ می گذرد دل منہ کہ دجلہ بسی　　پس از خلیفہ بخواہد گذشت در بغداد

گرت ز دست بر آید چو نخل باش کریم　　ورت نصیب نیفتد چو سرو باش آزاد

علاءالدین عطا ملک جوینی تاریخ جہانگشا کا مصنف صاحب دیوان کا بھائی اور عراق عرب اور خوزستان کا حاکم تھا (۶۲۳ھ ـ ۶۸۰ھ) اس کے مدحیہ قصیدے میں یہ شعر ملتے ہیں :

اگر ہمیں خور و خوابست حاصل از عمرت　　بہ ہیچ کار نیاید حیات بی حاصل

ثنای طول بقا ہیچ فایدہ نکند　　کہ در مواجہہ گویند راکب و راحل

بلی ثنای جمیل آن بود کہ در خلوت　　دعای خیر کنندت چنانکہ در محفل

اتابک سلجوق بن سلغر (۶۶۱ھ ـ ۶۶۲ھ) کی مدح کے ضمن میں فرماتے ہیں :

جہاں نماند و آثار معدلت ماند　　بخیر کوش و صلاح و بعدل کوش و کرم

خطای بندہ نگیری کہ مہتران ملوک　　شنیدہ اند نصیحت ز کہتران خدم

خنک کسی کہ پس از وی حدیث خیر کنند　　کہ جز حدیث نمی ماند از بنی آدم

حد یہ کہ اس قصیدے کی ابتدا جس کا عنوان ہی مدح اتابک ابوبکر ہے اس طرح کرتے ہیں :

بنوبت است ملوک اندریں سپنج سرای | کنوں کہ نوبت تست اے ملک بعدل گرای

نہ صرف یہ کہ ان کے مدحیہ قصائد پند ونصیحت اور ہدایت کے طرز پر ہیں بلکہ قصائد کے قصائد صرف پند ونصیحت پر لکھے ہیں جیسے ذیل کے مطلعوں سے شروع ہونے والے قصید ے

ایہا الناس جہاں جای تن آسانی نیست | مرد دانا بجہاں داشتن ارزانی نیست

ایضاً

خوشت عمر دریغا کہ جاودانی نیست | پس اعتماد برین پنج روز فانی نیست

ایضاً

روزیکہ زیر خاک تن ما نہاں شود | وآنہا کہ کردہ ایم یکایک عیاں شود

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدے سے جو انکیانو (۶۶۷ھ میں ہلاکو کی طرف سے فارس کی حکومت پر مقرر کیا گیا تھا) کی مدح میں لکھا گیا ہے، عبرت اور انتباہ کے لئے چند شعر یہاں نقل کئے جائیں تاکہ اس سے استاد کی طرز کا بھی اچھی طرح اندازہ ہو جائے:

بس بگردید و بگردد روزگار | دل بدنیا در نبندد ہوشیار

اے کہ دستت می رسد کاری بکن | پیش ازاں کز تو نیاید ہیچ کار

ایں کہ در شہنامہا آوردہ اند | رستم و روئین تن اسفندیار

تا بدانند ایں خداوندان ملک | کز بسی خلقست دنیا یادگار

ایں ہمہ رفتند و مای شوخ چشم | ہیچ نگرفتیم از ایشان اعتبار

ای کہ وقتی نطفہ بودی در شکم | وقت دیگر طفل بودی شیر خوار

مدتی بالا گرفتی تا بلوغ! | سرو بالائی شدی سیمین عذار

ہم چنیں تا مرد نام آور شدی | فارس میدان و مرد کارزار

انچہ دیدی بر قرار خود نماند | وانچہ بینی ہم نماند بر قرار

دیر و زود ایں شکل و شخص نازنیں | خاک خواہد گشتن و خاکش غبار

این ہمہ ہیچست چوں می بگذرد　　تخت وبخت وامر ونہی وگیرودار
نام نیکو گر بماند ز آدمی !!　　بہ کزو ماند سرای زرنگار

ان چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ مروجہ قصیدے کے دوراز کار مضامین، عبارت آرائی اور مبالغہ آمیز مدح کی بجائے انھوں نے ان سے بہتر مضامین اور ان سے بہتر عبارت سے قصیدے کو فصاحت بخشی اور اسے اور چمکایا۔ ان کی زیادہ تر توجہ لوگوں کے خیالات کی درستی، ان کے اخلاق کی صفائی، حق پروری اور دادگستری کی طرف ہی مرکوز رہی ہے۔

یہ بدیہی واقعہ ہے کہ اس استاد اجل نے قدماء کے اشعار کا مطالعہ کیا تھا، ان کے سبک اوران کے مضامین سے اچھی طرح استفادہ کیا تھا اور ان میں اپنی طرف سے نہایت خوب تصرف کیا قصیدہ جو ایک آدھ استثنیٰ کے سواسر تا سر مدح سرائی کے لیے وقف تھا، اس کو انھوں نے پند و نصیحت اور ہدایت کا عنوان قرار دیا۔ ذیل کی چند مثالوں سے جو محض نمونے کے طور پر پیش کی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ انھیں گذشتہ شعراء جیسے فردوسی، اسدی، سنائی انوری ظہیر فاریابی وغیرہ سے بڑی محبت تھی اور ان کے سبک کو انھوں نے اپنے پیش نظر رکھا ہے

فردوسی کہتے ہیں :

زناپاک زادہ مدار ید امید　　کہ زنگی بشستن نگردد سفید

سعدی فرماتے ہیں :

ملامت کن مرا چندانکہ خواہی　　کہ نتواں شستن از زنگی سیاہی

فردوسی کہتے ہیں :

ازیں پنج شین روی رغبت متاب　　شب وشاہد وشہر وشمع وشراب

سعدی فرماتے ہیں :

شب است وشاہد وشمع وشراب وشیرینی　　غنیمت است دمی روی دوستاں بینی

فردوسی کہتے ہیں :

که چوں بچہ شیر نر پروری !! چو دندان کند تیز کیفر بری

سعدی فرماتے ہیں :۔

یکی بچہ گرگ می پروریدا! چو پروردہ شد خواجہ را بردرید

اسی طرح استاد اسدی کی طرف توجہ کی ہے اور اس شعر میں :

مکن تکیہ بر ملک و دنیا و پشت که بسیار کس چوں تو پرورد و کشت

اس سے استفادہ کیا ہے ۔

اسی طرح سنائی کہتے ہیں :

اندریں راہ در بدی نیکی است کآب حیوان درونِ تاریکی است

سعدی فرماتے ہیں :

زکارِ بستہ میندیش و دل شکستہ مدار که آب چشمۂ حیوان درونِ تاریکی است

اسی طرح گلستان کی حکایت "روباہ و شتر" انوری کے ایک قطعہ سے ماخوذ ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے :

روبہی می گریخت از پی جان روبہ دیگرش بدید چو آن

اسی طرح غزلیات میں بھی استاد نے ظہیر فاریابی سے استفادہ کیا ہے، جیسے :

ظہیر :

ہزار توبہ شکستہ است زلف پر شکنش کجا بچشم در آید شکست حال منش !

سعدی :

رہا نمی کند ایام در کنار منش که داد خود بستانم ببوسہ از دہنش !

بااین ہمہ شاعری میں ان کا امتیاز، ان کی اپج، ان کی بداعت اور قصیدہ میں ان کا تصرف، اور اسے مدح سے پند و وعظ میں تبدیل کرنا بالکل ان ہی کا حصّہ ہے ۔

شاعری میں سعدی کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے مدحیہ

تصیدے کو جذبا نظر انداز کیا اتنی ہی غزل کو آرائش بخشی، یہ صحیح ہے کہ ان سے پہلے بڑے بڑے شاعروں نے تغزل کے رنگ میں کہا تھا، یا غزلیں لکھی تھیں، لیکن یہ شعر رسمی تھے اور سب کے پیش نظر وہی قصیدہ تھا۔ غزل کو ضمنی اور ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ ادھر سعدی نے غزل کو اکثر احساسات کے تعبیر کا ذریعہ بنایا اور قصیدہ پر، جسے انھوں نے ایک خاص مقصد کے لئے استعمال کیا، اسے ترجیح دی، غزل کو رواج دیا اور سچ تو یہ ہے کہ آئینِ سخن سرائی میں ہمارے شاعر نے دماغ کے ساتھ دل کی اور احساسات کے ساتھ خرد کی جنگ و جدل کا تماشا عجیب پُر لطف طریقہ پر دکھایا ہے۔ اس میں عشق و ذوق، شور و شوق، تخیل کی بلند پروازی، نکتہ پردازی اور مضمون آفرینی کو ایسے کمال کے ساتھ پیش کیا ہے کہ بلا مبالغہ سعدی اور ان کے بعض ہم عصروں کے ظہور کے بعد غزل فارسی کے اقسامِ شعر میں ردیف اول میں شمار ہونے لگی اور قصیدہ جو پہلے بادشاہوں کی مجلسوں کی رونق اور درباری جشنوں کی جان تھا، پیچھے رہ گیا۔ یہاں ان کی دو غزلوں سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جن سے ان کے رنگ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے [۵]

مشنوای دوست کہ غیر از تو مرا یاری ہست	یا شب و روز بجز فکر توام کاری ہست
بکمندِ سر زلفت نہ من افتادم و بس	کہ بہر حلقۂ زلف تو گرفتاری ہست
گر بگویم کہ مرا با تو سرو کاری نیست	در و دیوار گواہی بدہد کاری ہست
ہر کہ عیبم کند از عشق و ملامت گوید	تا ندیدہ است ترا بر منش انکاری ہست
صبر بر جور رقیبت چکنم گر نکنم	ہمہ دانند کہ در صحبتِ گل خاری ہست
نہ منِ خام طمع عشق تو ورزیدم و بس	کہ چو من سوختہ در خیل تو بسیاری ہست
من ازیں دلق مرقع بدر آیم روزی	تا ہمہ خلق بدانند کہ زناری ہست

۵ے اس غزل کے لئے ملاحظہ ہو سعدی نامہ از آقای ملک الشعراء بہار، ص ۲۱۶

عشق سعدی نہ حدیثی است کہ تنہا ماند   داستانیست کہ در ہر سر بازاری ہست

من ندانستم از اول کہ تو بی مہر و وفائی!   عہد نابستن از آں بہ کہ بہ بندی و نپائی
دوستاں عیب کنندم کہ چرا دل بتو دادم   باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی
ای کہ گفتی مرو اندر پی خوباں زمانہ!   ما کجائیم دریں بحر تفکر تو کجائی
پردہ بردار کہ بیگانہ خود آں روی بیند   تو بزرگی و در آئینۂ کوچک نہ نمائی
گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم!   چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی
سعدی آں نیست کہ ہرگز ز کمندت بگریزد   تا بدانست کہ در بند تو خوشتر کہ رہائی

سعدی کا تیسرا امتیاز کہ اس میں بھی وہ پیشوا اور بے شبہ بے ہمتا ہیں وہ ان کی شیریں اور رواں نثر ہے جو ہر طرح ان کی نظم کی ہم پلہ ہے۔ ان سے پہلے کسی نے ایسی نثر نہ لکھی۔ سعدی کی نثر مسجع ہے اور اس کا سب سے اچھا نمونہ کتاب گلستاں ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایرانی ادبیات کا گل سرسبد ہے۔ اس شاہ کار تصنیف میں سعدی نے صنعت سجع کی خوب داد دی ہے۔ انھوں نے الفاظ کے حسن انتخاب حسن وزن اور تناسب کو فارسی عبارت میں خوب بٹھایا ہے اور اس طرح اپنے پیشرو سجع کہنے والوں جیسے شیخ عطار وغیرہ کے دفتر پر گویا خط بطلان کھینچ دیا ہے۔ ان سے پہلے کے لکھنے والے ان کے آگے ماند پڑ گئے ہیں۔ صاحب کلیلہ و دمنہ ابوالمعالی نصراللہ جیسے نثر مرسل کے استادوں کا اعجاز ان کے آگے باطل ہو کر رہ گیا ہے حالانکہ ان کا سبک خود سعدی نے اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ سجع کا لازمہ تصنع ہے، اس کے باوجود انھوں نے ایک بھی مصنوعی اور پر تصنع جملہ نہ لکھا ان کی عبارتیں آب رواں کی طرح رواں، آہنگ جاناں کی طرح جاذب، شیریں، گوش نواز اور دلفریب نکلی ہیں جیسے:

نہ ہر کہ بقامت مہتر بقیمت بہتر۔ توانگری بہنر است نہ بمال و بزرگی بعقل است

نه بسال۔ ہمہ کس را عقل خود بکمال نماید و فرزند بجمال محالست کہ ہنرمندان بمیرند و بی ہنران جای ایشان گیرند۔

زمین را از آسمان نثار است و آسمان را از زمین غبار۔ گوہر اگر در خلاب افتد ہم چنان نفیس است و غبار اگر بہ آسمان رود ہم چنان خسیس۔ دوران با خبر در حضور و نزدیکان بی بصر دور۔ خانہ دوستان بروب و در دشمنان مکوب۔ عالم بی عمل زنبور بی عسل است تہی دستان را دست دلیری بستہ است و پنجہ شیری شکستہ ....."

سعدی کی وہ نثر جو گلستان میں اپنی بہار دکھا رہی ہے، اس کی ایک خوبی عبارت کے ضمن میں موزوں اشعار اور شواہد کا لانا ہے جس سے ان کی بات میں ایک خاص اثر پیدا ہو جاتا ہے خصوصاً وہاں جہاں قرآن کریم سے استشہاد کیا ہے اور آیات بینات کے معنی کو نظم کا جامہ پہنایا ہے، مثلاً انا اقرب الیہ من حبل الورید کی تفسیر کی ہے:

دوست نزدیک تر از من بمن است ۔۔۔ وین عجب تر کہ من از وی دورم

چکنم با کہ توان گفت کہ او ۔۔۔ در کنار من و من مہجورم!

یا اس آیت: فلما راینہ اکبرنہ وقطعن ایدیہن .... کی تفسیر کی ہے:

کاش کانانکہ عیب می جستند ۔۔۔ رویت ای دلستان بدیدندی

تا بجای ترنج در نظرت ۔۔۔ بی خبر دستہا بریدندی

سعدی سے پہلے اس طرح کی نثر ملمع کا رواج بہت کم تھا اور اس میں یہ خوبی اور یہ دلکشی تو گویا تھی ہی نہیں۔

چوتھے یہ کہ گلستان در حقیقت پند و نصیحت اور تہذیب و اخلاق پر لکھی ہوئی کتاب ہے اور اس کی تمام حکایتوں اور مثالوں کا مقصد ادب، تربیت اور تہذیب نفس ہے۔ استاد کا کمال یہ ہے کہ ان حقایق کو طول طویل استدلال اور طول کلام کے بغیر از راہ تمثیل بڑی پیاری اور بڑی میٹھی عبارت میں بیان کر دیا ہے اور حقیقت میں شعر و شاعری

کے معنی یہی ہیں۔ مثلاً کسی کو صبر و شکیبائی کی تلقین کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں:

بچشم خویش دیدم در بیابان — کہ آہستہ سبق برد از شتابان
سمند باد پا از تگ فرو ماند — شتربان ہم چناں آہستہ می راند

امورِ معیشت میں نظم و ترتیب' قائم رکھنے کے متعلق فرماتے ہیں:

چو دخلت نیست خرچ آہستہ تر کن — کہ می گویند ملاحان سرودی
اگر باران بکوہستان نبارد — بسالی دجلہ گردد خشک رودی

گلستان کے لطیف ترین حصے تو وہ ہیں جہاں شاعر اپنی روح عرفانی کے ساتھ کبھی فطرت کی، درختوں میں سرسرانے والی نسیم کی اور مرغان نواسنج کی صدا گوش جان سے سنتا ہے اور وہ سب کے سب نہایت ذوق و شوق کے ساتھ وحدت کا نغمہ اور آہنگ تخلیق کا مترنم ترانہ آلاپ رہے ہیں۔ ایسے میں خود شاعر پہ بھی ایک جذب و مستی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ پرندوں کا چہچہانا تک اسے صدائے دل سے عالم آگاہ بنا دیتا ہے اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

دوش مرغی بصبح می نالید — عقل و صبرم ببرد و طاقت و ہوش
یکی از دوستان مخلص را! — مگر آواز من رسید بگوش
گفت باور نداشتم کہ ترا — بانگ مرغی چنیں کند مدہوش
گفتم ایں شرط آدمیت نیست — مرغ تسبیح خوان و من خاموش

اسی طرح روح عرفاں اور مرکز جہاں کے معنی کی طرف توجہ استاد کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ اس کی فکر کو بلند پرواز بنا دیتی ہے اور اس طرح اس کی جامع نظر اور رائے محیط حقائق کو پا لیتی ہے اور وہ وحدت کی بلندی سے اس انسانیت کو جو آج کی طرح تفرقہ بندی میں گرفتار تھی، یگانگت اور اتحاد و اتفاق کی یوں صدا دیتا ہے:

بنی آدم اعضای یک دیگرند — کہ در آفرینش ز یک جوہرند

چو عضوی بدرد آورد روزگار　　　دگر عضوها را نماند قرار

اور کینہ توزی کے اس زمانے میں جب کہ ہر فرقہ اپنے معتقدات کو میزان حق سمجھتا اور دوسروں کو گمراہ تصور کرتا تھا، اس شاعر بزرگ نے انسان کی ان ظاہری خود پسندیوں کو طفلانہ بتایا اور اس سے پیدا ہونے والی بچگانہ دشمنیوں کو اپنے شاعرانہ قہر قند کے ساتھ اس تمثیل میں بیان کیا ہے:

یکی جہود و مسلمان نزاع می کردند　　　چنانکہ خندہ گرفت از حدیث ایشانم
بطیرہ گفت مسلمان گر این قبالۂ من　　　درست نیست خدایا جہود میرانم
جہود گفت بتوریت می خورم سوگند　　　وگر خلاف کنم ہمچو تو مسلمانم
گر از بسیط زمین عقل منعدم گردد　　　بخود گمان نبرد ہیچ کس کہ نادانم

سعدی کے عارفانہ مسلک کے ذکر میں یہ نامناسب نہیں معلوم ہوتا کہ گلستان کے باب دوم "اخلاق درویشان" سے وہ عبارت نقل کر دی جائے جس میں انھوں نے اس مسلک کو متعین کیا ہے:

"پادشاہی بدیدۂ استحقار در طایفہ درویشان نظر کرد یکی از ایشان بفراست بجای آورد و گفت، ای ملک ما درین دنیا بجیش از تو کمتریم و بعیش خوشتر و بمرگ برابر و بقیامت بہتر۔ ظاہر درویش جامۂ ژندہ است و موی ستردہ، وحقیقت آن دل زندہ و نفس مردہ۔ طریق درویشان ذکر است و شکر و خدمت و طاعت و ایثار و قناعت و توحید و توکل و تسلیم و تحمل۔ ہر کہ بدین صفتہا کہ گفتم موصوف است بتحقیق درویش است اگر در قباست اما ہرزہ گرد، بی نماز، ہوا پرست، ہوس باز کہ روزہا بشب آرد در بند شہوت و شبہا روز کند در خواب غفلت و بخورد ہر چہ درمیان آید و بگوید ہر چہ بر زبان آید رند است وگر در عباست۔"

پوری کتاب گلستان حسب ذیل آٹھ ابواب پر مشتمل ہے: (۱) در سیرت بادشاہان

(۲) در اخلاق درویشان (۳) در فضیلت قناعت (۴) در فوائد خاموشی (۵) در عشق و جوانی (۶) در ضعیف و پیری (۷) در تاثیر صحبت (۸) در آداب صحبت۔ جو کچھ حصہ یہاں ہم نے بطور نمونہ نقل کیا ہے اسی طرح پوری کتاب اجتماعی، اخلاقی اور تربیت کے بہترین نکات سے مملو ہے اور یہ بھی ایک بہت بڑی فضیلت ہے کہ اس کتاب کو عالمی ادب میں بلند ترین مقام حاصل ہے کیونکہ اس کی ہر بات میں ایسے عمیق اور سودمند مطالب درج ہیں جن سے ہر شخص اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔

کتاب بوستاں کا موضوع بھی تربیت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سعدی اجتماعی اور اخلاقی مثنوی میں ماہر اور باکمال ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے سابقین جیسے شیخ عطار کے کام کو درجہ کمال پر پہنچا دیا ہے اور ایسے حقایق جو نہایت اہم اور سودمند ہیں حکایتوں کے پیرایہ میں بیان کر دئے ہیں۔

بوستاں دس ابواب پر مشتمل ہے۔ شاعر کی طرز سخن کا اندازہ کرنے کے لئے یہاں ہر باب سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

باب اول عدل اور تدبیر و رائے پر ہے۔ ذیل کے اشعار اسی باب سے لئے گئے ہیں:

شنیدم کہ در وقت نزع رواں	بہ ہرمز چنیں گفت نوشیرواں
کہ خاطر نگہدار درویش باش	نہ در بند آسایش خویش باش
نیاساید اندر دیار تو کس	چو آسایش خویش خواہی و بس
نیاید بنزدیک دانا پسند!	شباں خفتہ و گرگ در گوسفند
برو پاس درویش و محتاج دار	کہ شاہ از رعیت بود تاجدار
مکن تا توانی دل خلق ریش	کہ چوں می کنی می کنی بیخ خویش
فراخی در آن مرز و کشور مخواہ	کہ دل تنگ بینی رعیت ز شاہ
رعیت نشاید نہ بیداد کشت	کہ مر سلطنت را پناہند و پشت

مراعات دہقاں کن از بہر خویش　　　که مزدور خوشدل کند کار بیش

باب دوم احسان کی فضیلت پر ہے، اس میں فرماتے ہیں:

یکی را خری در گل افتاده بود　　　ز سودا ش خون در دل افتاده بود

بیابان و باران و سرما و سیل　　　فرو هشته ظلمت بر آفاق ذیل

همه شب درین غصه تا بامداد　　　سقط گفت و نفرین و دشنام داد

نه دشمن برست از زبانش نه دوست　　　نه سلطان که این بوم و بر زان اوست

قضا را خداوند آن پهن دشت　　　در آن حال منکر بر او بر گذشت

شنید این سخنهای دور از صواب　　　نه صبر شنیدن نه روی جواب

بچشم سیاست در او بنگریست　　　که سودای این بر من از بهر چیست

یکی گفت شاها به تیغش بزن!　　　ز روی زمین بیخ عمرش بکن

نگه کرد سلطان عالی محل　　　خودش در بلا دید و خر در وحل

ببخشود بر حال مسکین مرد　　　فرو خورد خشم سخن های سرد

باب سوم "عشق و مستی و شور" پر ہے۔ اس میں نہایت وجد و طرب اور جذبۂ عرفان کے ساتھ یہ اشعار لکھے ہیں:

ره عقل جز پیچ بر پیچ نیست　　　بر عارفان جز خدا هیچ نیست

توان گفتن این با حقائق شناس　　　ولی خرده گیرند اهل قیاس

که پس آسمان و زمین چیستند!　　　بنی آدم و دام و دد کیستند

پسندیده پرسیدی ای هوشمند　　　بگویم گر آید جوابت پسند

که هامون و دریا و کوه و فلک　　　پری و آدمی زاد و دیو و ملک

همه هر چه هستند از آن کمترند　　　که با هستیش نام هستی برند

باب چہارم تواضع پر ہے، اس میں من جملہ اور باتوں کے فرماتے ہیں:

یکی قطره باران ز ابری چکید   خجل شد چو پہنای دریا بدید
که جائیکه دریاست من کیستم   گر او ہست حقا که من نیستم
چو خود را بچشم حقارت بدید   صدف در کنارش بجان پرورید
سپہرش بجائی رسانید کار   که شد نامور لولوٴ شاہوار
تواضع کند ہوشمند گزین   نہد شاخ پر میوه سر بر زمین

باب پنجم رضا کی فضیلت پر ہے اس میں کہتے ہیں:

عبادت با خلاص نیت نکوست   وگرنه چه آید ز بی مغز پوست
چه زنار مغ در میانت چه دلق   که در پوشی از بہر پندار خلق
باندازهٴ بود باید نمود ! !   خجالت نبرد آنکه ننمود و بود!
اگر کوتہی پای چوبین مبند   که در چشم طفلان نمائی بلند
وگر نقره اندوده باشد نحاس   توان خرج کردن بر ناشناس
منه جان من آب زر بر پشیز   که صراف دانا نگیرد به چیز
زر اندودگان را بآتش برند   پدید آید آنگه که مس یا زرند

باب ششم قناعت پر ہے، ذیل کے اشعار اسی باب سے ملاحظہ ہوں:

شنیدی که در روزگار قدیم   شدی سنگ در دست ابدال سیم
نپنداری این قول معقول نیست   چو قانع شدی سیم و سنگت یکیست
گدا را کند یک درم سیم سیر   فریدون بملک عجم نیم سیر
اگر بادشاہست وگر پینه دوز   چو خفتند گردد شب ہر دو روز
چو بینی توانگر سر از کبر مست   برو شکر یزدان کن ای تنگدست
نداری بحمدالله آن دسترس   که برخیزد از دستت آزار کس

باب ہفتم تربیت پر ہے، اس میں بداندیشوں اور بدگمانوں کی طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں

اگر در جہاں از جہاں رستہ است | در از خلق بر خویشتن بستہ است
کس از دست جور زباں ہا نرست | اگر خود نمایست وگر حق پرست
اگر بر پری چوں ملک ز آسماں! | بدامن در آویزدت بدگماں!
بکوشش تواں دجلہ را پیش بست | نشاید زبان بد اندیش بست
تو روی از پرستیدن حق مپیچ! | بہل تا نگیرند خلقت بہ ہیچ

باب ہشتم "شکر بر عافیت" پر ہے، اس میں فرماتے ہیں:

یکی گوش کودک بمالید سخت | کہ ای بلعجب رای برگشتہ بخت
ترا تیشہ دادم کہ ہیزم شکن | نگفتم کہ دیوار مسجد بکن
زباں آمد از بہر شکر و سپاس | بہ غیبت نگرداندش حق شناس

باب نہم "توبہ و صواب" پر ہے، اس میں کہتے ہیں:

ز عہد پدر یاد دارم ہمی! | کہ باران رحمت برو ہر دمی
کہ در خردیم لوح و دفتر خرید | ز بہرم یکی خاتم زر خرید
بدر کرد ناگہ یکی مشتری | بخرمائی از دستم انگشتری
چو نشناسد انگشتری طفل خرد | بخرمائی از وی تواند برد
تو ہم قیمت عمر نشناختی | کہ در عیش شیریں برانداختی

باب دہم "مناجات" پر ہے، یہ چند شعر اسی سے لئے گئے ہیں:

خدایا بعزت کہ خوارم مکن | بذل گنہ شرمسارم مکن
مسلط مکن چوں منی بر سرم | ز دست تو بہ گر عقوبت برم
بگیتی نباشد بتر زین بدی | جفا بردن از دست ہمچوں خودی
مرا شرم ساری بہ روی تو بس | دگر شرم ساری مکن پیش کس
گرم بر سر افتد ز تو سایہ ای | سپہرم بود کمترین پایہ ای

اگر تاج بخشی سرافرازدم — تو بر دار تا کس نیندازدم

خلاصہ یہ کہ استاد سعدی شیرازی کے آثار خواہ نظم ہیں خواہ نثر میں ایسے عقاید اور افکار کے منظہر ہیں جو ان کی ایک عمر کے تجربہ، غور و فکر، آفاق و انفس کے مطالعہ سیر و سفر، مختلف قوموں اور ملتوں سے ملنے اور تاریخی واقعات کے مشاہدے سے حاصل ہوئے ہیں، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

در اقصای عالم بگشتم بسی — بسر بردم ایام با ہر کسی
تمتع ز ہر گوشۂ یافتم — ز ہر خرمنی خوشۂ یافتم

ایسے ہی گراں بہا تجربوں کو سعدی نے نہایت موزوں اور دلکش عبارت میں نہایت برجستہ حکایات و امثال اور اشعار کے پیرائے میں بیان کر دیا ہے اور اس طرح بیان کیا ہے کہ اس سے بہترین اخلاقی اور اجتماعی اصولوں کا ایک ایسا نفیس مجموعہ اور بہترین ادبی فارسی کا ایک ایسا نمونہ عالم وجود میں آیا ہے جس کا مطالعہ بدون تردید "متعلمان را بکار آید و مترسلان را بلاغت افزاید"۔

شیخ محمود شبستری شیخ سعد الدین محمود بن عبد الکریم شبستری قصبۂ شبستر میں جو تبریز سے سات میل پر واقع ہے پیدا ہوئے۔ اسی مقام پر نشو و نما پائی اور سن رشد کو پہنچے۔ الجایتو اور ابو سعید کے عہد میں انھیں شہرت حاصل ہوئی اور تبریز کے نامی علماء اور فضلاء میں شمار کئے جانے لگے۔ ان کے تفصیلی حالات زندگی معلوم نہیں، لیکن ان کی شہرت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے صوفی علماء میں شمار ہوتے تھے۔ دینی اور حکیمانی مسائل کے حل کرنے میں بڑی دقت نظر سے کام لیتے تھے اور ان موضوعوں پر ان کے تبحر کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی تھی اور لوگ ان مسائل میں ان سے رجوع کیا کرتے تھے۔ طالبان حق اطراف و اکناف سے ان کی خدمت بست میں دوڑے آتے تھے اور علمی مسائل میں اپنی مشکلوں کو حل کرنے کی ان سے درخوا

کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ نے اپنی مشہور ترین تصنیف یعنی مثنوی گلشن راز خراسان کے ایک بزرگ یعنی شیخ بہاء الدین ملتانی (شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ) کے مرید اور خلیفہ سید حسینی ہروی کے ایسے ہی سوالوں کے جواب میں لکھی ہے۔ یہ سوال جیسا کہ گلشن راز کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے ۷۱۷ھ میں شیخ کے پاس پہنچے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:

بسال ہفدہ از ہفت صد سال ز ہجرت ناگہاں در ماہ شوال

رسولی با ہزاراں لطف و احسان رسید از خدمت اہل خراسان

یہ تمام کے تمام سوال دینی مسائل اور صوفیانہ عقائد سے متعلق ہیں۔ شیخ نے ان کا جواب ترتیب اور مناسبت کے ساتھ دیا، پھر مریدوں کی خواہش پر تھوڑی مدت میں اس کو مکمل کیا اور اس میں اضافہ کیا۔ اس کا نام انھوں نے گلشن راز رکھا۔

شیخ شبستری کوئی پیشہ ور شاعر نہ تھے اور خود ان کی تصریح کے مطابق گلشن راز کو نظم کرنے سے پہلے کبھی شعر نہیں کہے تھے۔ لیکن ان ہی موضوعوں پر وہ نثر میں رسالے اور کتابیں تصنیف کر چکے تھے۔ شاید اس موقع پر سوالات بھی منظوم تھے، اس لیے مجبوراً ان کے جواب بھی منظوم دئے۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

بدو گفتم چہ حاجت کایں مسائل نوشتم بارہا اندر رسائل

اس کے بعد پھر اپنی تصانیف کے بارے میں کہتے ہیں:

بہ نثر ار چہ کتب بسیار می ساخت بہ نظم و مثنوی ہرگز نپرداخت

ایک اور مثنوی میں جو "سعادت نامہ" کے نام سے موسوم اور ان سے منسوب ہے شیخ نے کلام منظوم سے اپنے بے تعلق ہونے کا ذکر کیا ہے اس کے باوجود شیخ نے شاعری میں کوئی قباحت نہیں دیکھی اور شیخ عطار (جن سے وہ خاص طور پر اعتقاد رکھتے تھے) کے شاعر ہونے کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ گلشن راز میں فرماتے ہیں:

مرا از شاعری خود عار ناید کہ در صد قرن چوں عطار ناید

اس میں کوئی شک نہیں کہ طرزِ سخن اور سبک نظم کے اعتبار سے گلشن راز ہرگز کوئی اوسط درجے کی چیز نہیں۔ اس کے برخلاف یہ شیخ کی شاعرانہ مہارت پر دال ہے۔ اس میں تصوف کے عمیق مسائل اور مطالب کو نہایت واضح اور خوش نما اشعار میں ادا کیا ہے اور بعض مقامات پر تو واقعتاً ایک دو مصرعوں میں صوفیانہ معانی کے سمندروں کو بند کر دیا ہے۔

شیخ کی منثور تصانیف میں جو تصنیف سب سے زیادہ مشہور ہے وہ حق الیقین ہے۔ یہ کتاب دینی مسائل پر ہے۔ اس کے سوا شاہد نامہ بھی ایک کتاب انکی تصنیف ہے۔

شیخ شبستری نے ۷۲۰ھ میں وفات پائی اور ان کا مزار شبستر میں واقع ہے۔

یہاں صرف نمونے کے طور پر چند سوال اور جواب اختصار کے ساتھ نقل کئے جاتے ہیں تاکہ محتویات گلشن راز کے صوفیانہ افکار اور شیخ شبستری کے مذاق اور عقائد کا کچھ اندازہ ہو سکے:

سوال: تفکر کیا ہے؟

جواب

تفکر رفتن از باطل سوی حق — بجزو اندر بدیدن کل مطلق
محقق را کہ وحدت در شہود است — نخستین نظرہ بر نور وجود است
دلی کز معرفت نور و صفا دید — ز ہر چیزی کہ دید اول خدا دید
بود فکر نکو را شرط تجرید — پس آنگہ لمعۂ از برق تائید

مطلب یہ ہے کہ عمل حق اور باطل میں تمیز کا نام ہے لیکن اہل تحقیق مقام فکر کے استدلال سے بھی آگے جاتے ہیں اور حقیقتِ عالم اور اشیاء کی وحدت کو نور شہود کے ذریعہ دیکھتے ہیں، جزئیات میں عالم کلی کو پاتے ہیں، اجزا ان کی نظر سے غائب ہو جاتے ہیں اور کل نمایاں ہو جاتا ہے۔ پس جس جگہ دیکھتے ہیں خدا کا مشاہدہ کرتے ہیں اور وہی زدح کل ہے۔

سوال: سالک کے سلوک کے لئے کیسی فکر لازم ہے؟ کونسی فکر عبادت اور کونسی گناہ ہے؟

جواب

در آلا فکر کردن شرط راہست ... ولے در ذاتِ حق محض گناہست

ہمہ عالم ز نورِ اوست پیدا ... کجا او گردد از عالم ہویدا

رہا کن عقل را با حق ہمی باش ... کہ تابِ خور ندارد چشمِ خفاش

بود نورِ خرد در ذاتِ انور ... بسانِ چشمِ سر در چشمۂ نور

یعنی خداوند تعالےٰ کو جو نورِ مطلق اور محیطِ جہان ہے، ضعیف عقل کے ذریعہ دُرک نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس کی ذات کمزور خرد کے ذریعہ پہچانی نہیں جاسکتی۔ اس کی ذات کے لئے دلیل ڈھونڈنا ایسا ہی ہے جیسے چمگادڑ آفتاب کو دیکھ نہیں سکتی۔ ہماری چشمِ ضعیف چشمۂ آفتاب کو دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتی۔ صرف مشاہدۂ عالم سے ——— کیونکہ عالم اس کا مظہر ہے ——— رجوعِ قلب سے، اور ایمان کے وسیلہ سے ہم حق تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔

سوال: "میں" کیا اور آدمی کے نفس کی حقیقت کونسی ہے؟

جواب

چو ہستِ مطلق آید در اشارت ... بلفظِ من کنند از وے عبارت

حقیقت کز تعیّن شد معیّن ... تو او را در عبارت گفتۂ من

برو اے خواجہ خود را نیک بشناس ... کہ نبود فربہی مانند آماس

یکے رہ برتر از کون و مکاں شو ... جہاں بگذار، خود در خود جہاں شو

من و تو چوں نماند در میانہ ... چہ کعبہ چہ کنش چہ دیر خانہ

دریں خانہ یکے شد جمع افراد ... چو واحد سازی اندر عین اعداد

یعنی اگر کوئی شخص تھوڑی دیر کے لئے نظر عرفان سے اپنے آپ کو دیکھے اور ظاہری اور جسمانی حدود کو فراموش کر دے تو دیکھے گا کہ اس میں اور عالم میں کوئی فرق نہیں۔ ہر چیز کی اصل ایک ہی حقیقت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ وہی حقیقت کل ہے جس نے تعین اختیار کیا ہے اور از راہ ظاہر بینی وجودِ ظاہر کو حقیقت تصور کرتا ہے یعنی آماس کو دیکھ کر فربہی خیال کرتا ہے۔ جہان محسوس کو تو جو جہان کثرت ہے دیکھتا ہے اور جہان واقعی کو جو جہان وحدت ہے اور جس میں نفس حقیقت اور خدا ایک ہیں نہیں دیکھتا۔ وحدت کی حقیقت ایک کی طرح ہے کہ جس سے تمام اعداد وجود میں آتے ہیں اور در حقیقت وہی ایک ہے جو مکرر دکھائی دیتا رہے

سوال: راہ حق کا سالک کون ہے اور سچا اور پکا عارف کسے کہتے ہیں؟

جواب

مسافر آن بود کو بگذرد زود — ز خود صافی شود چون آتش از دود

سلوکش سیر کشفی دان ز امکان — سوی واجب بترک شین و نقصان

باخلاق حمیده گشته موصوف — بعلم و زهد و تقویٰ بوده معروف

همه با او ولی او از همه دور! — بزیر قبه های ستر مستور!

تبه گردد سراسر مغز بادام — گرش از پوست بخراشی گه خام

ولی چون پخته شد بی پوست نیکوست — اگر مغزش براری برکنی پوست

شریعت پوست مغز آمد حقیقت — میان این و آن باشد طریقت

خلل در راه عارف نقص مغزاست — چو مغزش پخته شد بی پوست نغزاست

چو عارف با یقین خویش پیوست — رسیده گشت مغز و پوست بشکست

بود از سر وحدت واقف حق — درو پیدا نماید وجه مطلق

دل عارف شناسای وجود است — وجود مطلق او را در شهود است

(۲۳) سلوک کا راستہ طے کرنے والا اور عارف وہ ہے جو ابتدائے سلوک ہی سے اپنے

عیبوں اور برائیوں کی اصلاح کرے اور اپنی ہستی کو ہر نقص سے پاک کرے۔ یہ تخلیہ کا مرتبہ ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو اخلاقِ حمیدہ کے زیور سے آراستہ کرتا اور دانش زہد اور پرہیزگاری کا حامل بنتا ہے یہ تحلیہ کا مرتبہ ہے۔ ان مراحل سے گذر کر وہ شریعت کے ظاہری احکام پر کاربند ہوتا ہے عبادت اور خدمت میں سختیاں اٹھاتا ہے جس طرح آگ دھویں سے الگ ہو جاتی ہے اسی طرح وہ خود پرستی سے الگ ہو جاتا ہے خوبی اور نیکی کے لئے کوشش شروع ہوتی ہے۔ اب اس کا نفس ذرا ذرا روشن ہونے لگتا ہے۔ وہ مقام علم سے گذر کر مقام عرفان یعنی کشف و شہود میں قدم رکھتا ہے۔ اس طریقہ پر بتدریج سلوک کی منزلیں طے کرتا ترقی کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ مبدار شریعت سے سلوک کے ذریعہ طریقت میں پہنچتا ہے اور آخر کار اصل وحقیقت سے قریب ہو جاتا ہے اس وقت جہان کی وحدت اس کی نظر میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ تجلیہ کا مرتبہ ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر اس کی دانش منتہی ہوتی ہے بنیش پر اور دانائی مبدل ہو جاتی ہے شناسائی سے، اور جو چیز اسے صاف سمجھ میں نہ آتی تھی، اب تمام وکمال نظر آتی ہے۔ اب وہ سچا عارف ہو جاتا ہے اور اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں نفس اور عالم، من وتو، عالم ومعلوم اور عارف ومعروف کا فرق اس کی نظر میں باقی نہیں رہتا اور وہ خود آئینہ حق بن جاتا ہے یعنی اس کی جسمانی، زمینی اور شہوانی خودی زایل ہو جاتی ہے اور اس کی روحانی خودی جو حقیقت عالم ہے اس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اسی لحاظ سے وہ انا الحق کا نعرہ لگا سکتا ہے، کیونکہ اس کے وجود میں صرف حق ہی حق رہ گیا ہے:

انا الحق کشف اسرار است مطلق — بجز حق کیست تا گوید انا الحق!
روا باشد انا اللہ از درختی — چرا نبود روا از نیک بختی
ہر آں کس را کہ اندر دل شکی نیست — یقیں داند کہ ہستی جز یکی نیست
جناب حضرت حق را دوئی نیست — درآں حضرت من وما وتوئی نیست

من وما و تو و او ہست یک چیز — کہ در وحدت نباشد ہیچ تمیز

اسی انداز میں شیخ عرفان کے دوسرے مسائل پر بحث کرتے ہیں، مثلاً دنیا میں خدا کا جلوہ، حق سے عارف کا وصال، انسانی نطق کا حرف اور اس کے حدود، مسئلہ جزو کل حادث اور قدیم اصطلاحات اور اشارات کے معنی صوفیانہ اشعار میں بیان کئے ہیں مثلاً رخ، زلف، خط و خال، چشم، لب، شراب، شمع، شاہد اور خرابات سے عارف مخصوص معنیٰ لیتے ہیں۔ چنانچہ شراب کے بارے میں کہتے ہیں:

شراب بی خودی درکش زمانی — مگر از دست خود یابی امانی!

طہور آں می بود کز لوث ہستی — ترا پاکی دہد در وقت مستی

خراباتی شدن از خود رہائیست — خودی کفر است اگر خود پارسائیست

مطلب یہ ہے کہ شراب پینا اور خراباتی ہونا عارفوں کی اصطلاح میں بے خود ہونا ہے اور خود پرستی سے جو لوگوں کے اغراض کی اصل اور دنیا کی خرابی کی اصل علت ہے گذر جانا ہے اور تصوف سے مراد فداکاری، عصمت اور پاک دلی سے متصف ہونا ہے غرض یہ کہ بہ حیثیت مجموعی گلشن راز میں صوفیانہ مضامین اور مطالب کو ایک ہزار اشعار کی ایک شیریں مثنوی میں نہایت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور اس میں انسان کو ترک عادت، درک وحدت اور حقیقت کی جستجو کی طرف رہبری کی گئی ہے۔

مولانا جلال الدین رومی

ایران کے سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا جلال الدین فرزند سلطان العلماء بہاء الدین محمد بن حسین الخطیبی ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے بلخ ایک عرصہ دراز سے ایرانی ادبیات، لغت اور عقائد کے مراکز میں شمار کیا جاتا تھا۔ آپ کے والد محمد بن حسین ملقب بہ بہاء الدین ولد حسب روایت علاء الدین خوارزم شاہ کے داماد تھے، اپنے زمانے کے بہت بڑے عارفوں اور علماء

میں شمار ہوتے تھے اور شیخ نجم الدین کبریٰ کے خلیفہ تھے۔ خوارزم شاہ کے پاس آپ کو بڑا تقرب حاصل تھا، لیکن کہتے ہیں کہ آپ کے مواعظ، شہرت اور اثر و نفوذ کی وجہ سے وہ آپ کا دشمن ہوگیا۔ تصوف کے مخالف بھی آپ کو تکلیف دینے لگے اور بلخ کے باشندے بھی آپ کے درپے آزار ہوگئے۔ مجبوراً آپ نے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے صاحبزادے جلال الدین کے ساتھ بغداد کے راستے حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد کی تصنیف کی ہوئی مثنوی کے بعض اشعار کی رو سے یہ سفر فتنۂ مغول کے ظہور کے وقت اختیار کیا گیا تھا۔ غالباً یہ فتنہ کافی رنگ لاچکا تھا اس لئے ممکن ہے یہ سفر ۶۱۷ھ کے قریب اختیار کیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے اس وقت مولانا جلال الدین کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔

کہتے ہیں کہ مولانا بہاء الدین ولد نے نیشاپور میں شیخ فریدالدین عطار کی بھی زیارت کی اور انھوں نے جلال الدین کو اپنے سینے سے لگایا، دعا دی اور انھیں مثنوی اسرار نامہ تحفتہً عطا کی۔ بغداد سے روانہ ہوئے اور حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کے بعد آپ ملاطیہ پہنچے اور اس شہر میں چار سال تک اقامت گزیں رہے۔ اس کے بعد لارندہ آئے۔ جو اس زمانے میں سلاجقہ ایشائے کوچک کا حکومتی مرکز تھا۔ اس شہر میں بھی آپ سات سال تک مقیم رہے۔ اس کے بعد آپ سلاجقۂ ایشیائے کوچک کے بارہویں بادشاہ سلطان علاؤ الدین کیقباد (۶۱۷-۶۳۴) کی دعوت پر اس کے پایۂ تخت قونیہ پہنچے۔ یہ بادشاہ بڑا زبردست علم پرور بادشاہ گذرا ہے۔ یہاں بہاء الدین ولد جو ظاہری اور باطنی علوم میں بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے، لوگوں میں رشد و ہدایت اور علوم و فضائل کی نشر و اشاعت میں مشغول ہوگئے۔ خود علاء الدین کیقباد آپ سے غیر معمولی ارادت رکھتا تھا۔

مولانا جلال الدین نے ابتدائی تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت کی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ ان کی وفات کے ایک سال بعد (جو ۶۲۸ھ میں واقع ہوئی) سید برہان الدین محقق ترمذی جو بہاء الدین ولد کے شاگرد تھے اور زمرۂ خواص اور اولیاء اہلِ طریقت میں شمار

کیے جاتے تھے، قونیہ آئے۔ جلال الدین نے ان کی مجالسِ درس سے کسبِ فیض کیا اور پورے نو سال تک اس مردِ عارف کے ارشاد کے تحت زندگی بسر کی۔ اس کے بعد سیاحت، اخذِ معرفت اور اصحابِ طریقت کا فیضِ صحبت اٹھانے کے لئے شام کا سفر اختیار کیا۔ عرصے تک حلب اور دمشق میں اقامت گزین رہے۔ مقاماتِ بلند حاصل کئے اور معنوی تجارب اور علمی اکتسابات کی منزلیں طے کرنے کے لئے بعد قونیہ لوٹے۔ یہاں آپ سلطان کے حکم پر اپنے والد کی طرح علومِ شرعی کی تعلیم اور تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اسی طرح وہ اپنے اس مبارک کام میں مشغول تھے کہ گردشِ روزگار سے ایک روز ایک اوتادِ زمانہ اور نوادرِ دوران سے آپ کی ملاقات ہو گئی۔ اس ملاقات نے مولانا جلال الدین کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا، یہ شمس الدین بن علی بن ملک داد تبریزی کی ذات تھی جو اپنے وقت کے صوفی پیروں میں ایک مجذوب پیر تھے اور اپنے سانس میں گرمی، اپنی ذات میں ایک زبردست کشش اور اپنے بیان میں غیر معمولی اثر رکھتے تھے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک راہ پیمائی کرتے درویشوں، عارفوں اور صاحبانِ راز سے اُنس و محبت رکھتے تھے۔ تاآں کہ ۶۴۲ھ کا سال ہو گا کہ آپ جلال الدین کی تلاش میں قونیہ تشریف لائے۔ ایک ہی نظر میں جلال الدین کے دل میں عشق و حقیقت کا شعلہ بھڑکا اور انھیں اپنا معنوی شیفتہ بنا لیا اور وہ آخر عمر تک ان کے روحانی پیشوا اور مرشد بن گئے۔ جس ادب اور احترام کے ساتھ اپنے اشعار اور اقوال میں مولانا جلال الدین اپنے آپ کو شمس تبریز سے نسبت دیتے ہیں ان سے بالکل ظاہر ہے کہ ان کی صحبت نے مولانا جلال الدین کے جہانگیر دل پر کتنا گہرا اثر کیا تھا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار جو مثنوی کے دفترِ اول سے انتخاب کئے گئے ہیں، اس دعوی کے بہترین شاہد ہیں:

شمس تبریزی کہ نورِ مطلق است	آفتاب است وز انوارِ حق است
این نفس جان دامنم بر تافتست	بوی پیراہان یوسف یافتست
کز برای حق صحبت سالہا	باز گو رمزی از آن خوش حالہا

من چہ گویم یک رگم ہشیار نیست — شرح آں یاری کہ آں را یار نیست

خودثنا گفتن زمن ترک ثناست — کایں دلیل ہستی و ہستی خطاست

شرح ایں ہجران و ایں خونِ جگر — ایں زماں بگذار تا وقت دگر

گفتمش پوشیدہ خوش تر سرِ یار — خود تو در ضمن حکایت گوش دار

خوش تر آں باشد کہ سرِ دلبراں — گفتہ آید در حدیث دیگراں!

جیسا کہ ان اشعار میں بیان کیا گیا ہے مولانا جلال الدین نے مثنوی کی حکایتوں کی شرح اور تصوف کے معانی کے بیان میں اپنے اس پیر مرشد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان کی یاد سے ایک جوش اور ایک وجد و طرب کی کیفیت ان پر طاری ہو گئی ہے۔ ان کا نام کہیں نہیں لیا ہے اور اسرارِ عرفان اور رازِ ایمان کو حدیثِ دیگراں کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مولانا نے ایک مدت اس عارفِ سوختہ و سوزندہ کے ساتھ خلوت اور ان کے فیضِ صحبت میں بسر کی۔ کچھ دنوں کے لئے آپ کے مرشد نے دمشق کا سفر اختیار کیا، لیکن وہ پھر قونیہ واپس آ کر ارشاد و تحریک اور مولانا کی آتش عشق کو شعلہ ور بنانے میں مشغول ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ شمس تبریزی نے مقامِ وجد و شوق میں عنانِ اختیار اپنے ہاتھ سے دے دی تھی اور مضمراتِ درون کو برملا کہنے لگے تھے۔ عوام کے سطحی عقائد پر تنقید کرنے میں بے باک ہو گئے تھے اور اسرارِ درون فاش کرنے لگے تھے۔ ان کی سماع و طرب کی محفلیں بے باکانہ منعقد ہونے لگی تھیں۔ اس لئے روایت ہے کہ ان کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔ ایک دن قونیہ کے عوام نے شورش کر کے ان کو مجمع عام میں قتل کر ڈالا (۶۴۵ھ) اس حادثہ میں مولانا کے سب سے بڑے فرزند بھی سخت زخمی ہو گئے اور زخموں سے جان بر نہ ہو سکے۔

لیکن غزلیات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شمس ایک روز غائب ہو گئے

اور مولانا دو سال تک شب و روز اپنے کعبۂ مقصود کے فراق میں گھلتے رہے، ان کی تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن ان کا پتہ نہ پا سکے۔

اس واقعہ کے بعد سے مولانا جلال الدین نے ریاضت اور عالمِ عرفان کے تجارب میں بہت ہی اونچا مرتبہ حاصل کیا اور اس مسلک کے سالکوں کے قطب مانے گئے۔ اس گروہ کے مشائخوں کی رسم کے مطابق آپ نے بھی اپنے خلیفہ مقرر فرمائے۔ آپ کے پہلے خلیفہ صلاح الدین فریدون زرکوب ہوئے۔ مولانا نے ان کی طرف خاص توجہ فرمائی اور ان سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کی اس توجہ کی وجہ سے صلاح الدین زرکوب مولانا کے تمام مریدوں کے محسود بن گئے تھے۔ اس طرح زرکوب دس سال تک اس خدمت پر مامور رہے۔ ان کے بعد مولانا نے ۶۵۷ھ نے حسام الدین حسن بن محمد بن حسن کو اپنی خلافت عطا فرمائی۔ آپ مولانا کی زندگی میں گیارہ سال تک مولانا کے خلیفہ رہے اور مولانا کی وفات کے بعد بارہ سال تک آپ کے جانشین رہے۔

حسام الدین مولانا کے خاص مریدوں اور پیروؤں میں تھے اور آپ نے ان کی طرف خاص توجہ فرمائی تھی۔ مولانا نے ان کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اس سے ظاہر ہے کہ آپ طریقت کے تمام مراحل طے کر چکے تھے اور علم و تقویٰ اور معرفت میں بہت اونچے اور رفیع مرتبہ پر فائز ہو چکے تھے۔ ان کا قول اپنے پیر و مرشد کے حضور میں نہایت مقبول اور اثر پذیر تھا۔ چنانچہ یہ انھیں کی تشویق اور تحریک کا نتیجہ تھا کہ کتاب مثنوی جو ایران کے ذوقِ عرفان کا شاہکار رہی ہے، عالمِ وجود میں آئی۔ حسام الدین نے ۶۸۳ھ میں وفات پائی۔ آپ کی وفات کے بعد خلافت مولانا کے فرزند سلطان ولد کو ملی اور وہ تیس سال تک یارانِ طریقت کے پیشوا رہے۔

مثنوی معنوی مولانا جلال الدین کے افکار کا گراں بہا ثمرہ اور ان کے اشعار کا بہترین مجموعہ ہے۔ بلکہ یہ فارسی زبان میں تصوف کا مکمل ترین دیوان ہے۔ اس میں چھ دفتر

ہیں اور اشعار کی تعداد چھبیس ہزار ہے جو بحر رمل میں کہے گئے ہیں۔
دفتر اول کی ابتدا کس تاریخ سے ہوئی یہ ٹھیک طور پر معلوم نہیں لیکن اس دفتر کے اختتام کے کوئی دو سال بعد دوسرا دفتر شروع ہوا اور اس کی تاریخ ۶۶۲ھ ہے اس لحاظ سے دفتر اول کی ابتدا کی تاریخ ۶۵۷ھ اور ۶۶۰ھ کے درمیانی سالوں میں آتی ہے کیونکہ حسام الدین ۶۵۷ھ میں منصب خلافت پر فائز ہوئے ہیں۔ اس دو سالہ وقفہ کی وجہ مولانا کے ملہم اور مشوق حسام الدین کی بیوی کی وفات کا اندوہ و غم تھا۔ اس غم نے استاد اور شاگرد دونوں کو دل گرفتہ کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ناگہانی مصیبت کی وجہ سے حسام الدین نے گوشہ نشین ہو کر سکوت و ریاضت اور اعتکاف کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ دفتر دوم کے ابتدائی اشعار جو ذیل میں درج کئے گئے ہیں۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

مدتی این مثنوی تاخیر شد — مہلتی بایست تا خون شیر شد
چوں ضیاء الحق حسام الدین عنان — باز گردانید ز اوجِ آسمان!
چوں بہ معراجِ حقایق رفتہ بود — بی بہارش غنچہ ہا ناشگفتہ بود
چوں ز دریا سوی ساحل بازگشت — چنگ شعر مثنوی باساز گشت
مطلع تاریخ این سودا و سود! — سال ہجرت شش صد و شصت و دو بود

ان اشعار سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حسام الدین اپنے پیر و مرشد کے دل میں ذوق اور شور و شوق کی تحریک پیدا کرنے میں کتنا زبردست اثر رکھتے تھے۔ مثنوی کا دفتر سوم بھی مولانا اسی طرح حسام الدین کے نام سے شروع کرتے ہیں ؎

ای ضیاء الحق حسام الدین بیار — این سیوم دفتر کہ سنت شد سہ بار

دفتر چہارم کے آغاز پر پھر ایک بار مولانا جلال الدین اپنے شاگرد رشید اور مرید سعید حسام الدین کی معنوی تاثیر کو اس طرح بیان فرماتے ہیں :

ای ضیاء الحق حسام الدین توئی — کہ گذشت از مہ بنورت مثنوی

همت عالی تو ای مرتجیٰ — می کشد این را خدا داند کجا!
گردن این مثنوی را بستهٔ — می کشی آنجا که تو دانستهٔ
مثنوی را چوں تو مبدء بودهٔ — گر فزوں گردد تواش افزودهٔ

دفتر پنجم کے مطلع میں ایسے ہی خیالات کی تکرار یوں فرماتے ہیں:

شہ حسام الدین کہ نور انجم است — طالب آغاز سفر پنجم است
ای ضیاء الحق حسام الدین راد — اوستاداں صفا را اوستاد
گر نبودی خلق محجوب وکثیف — ور نبودی خلقہا تنگ وضعیف
در مدیحت داد معنی دادمی — غیر این منطق لبے بکشادمی

دفتر ششم مثنوی کا آخری دفتر ہے۔ اس کی ابتدا بھی حسام الدین ہی کے نام سے فرماتے ہیں:

ای حیات دل حسام الدین بسی — میل می جوشد بقسم سادسی!
گشت از جذب چو تو علامۂ — در دہاں گرداں حسامی نامۂ

اس کے سوا بلند مرتبت مرشد کو جو معنوی ربط اور جو عارفانہ عشق اور جو محبت حسام الدین سے تھی اس کا اظہار اس دفتر میں متعدد بار ہوا ہے۔ منجملہ ان کے وہ اشعار بھی ہیں جن کی ابتدا میں فرماتے ہیں:

ای ضیاء الحق حسام الدین بیا — ای صقالِ روح وسلطان الہدیٰ

پھر ان کی تاثیر اور ان کی تشویق کا ذکر فرمایا ہے۔

مثنوی کی محتویات مسلسل منظوم حکایتیں ہیں اور ان حکایتوں کو بیان کر کے مولانا دینی اور عرفانی نتائج اخذ کرتے اور حقائقِ معنوی کو سیدھی سادی زبان میں از راہِ تمثیل بیان فرماتے ہیں۔ اسی ترتیب سے وہ قرآن شریف کی بہت سی آیتوں اور اخبار واحادیثِ نبوی کی شرح صوفیانہ طرز پر کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مثنوی شریف تصوف میں اولین مثنوی نہیں۔ اس سے پہلے سنائی اور شیخ عطار جیسے عارف شاعروں نے

صوفیانہ عقائد کی شرح میں مثنویاں تصنیف کی تھیں اور گوی سبقت یہی لے گئے تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عارفانہ مثنویاں اور ان کے مصنف دونوں مولانا جلال الدین کے پیش نظر تھے اور انھیں وہ اپنا استاد سمجھتے تھے اسی لئے تو فرماتے ہیں :

هفت شهر عشق را عطار گشت　　ما هنوز اندر خم یک کوچه ایم

لیکن حق یہ ہے کہ مولانا خود اپنا ایک مستقل رنگ اور اپنی ایک مستقل آواز رکھتے ہیں انھوں نے شعر تصوف میں اپنا دلکش و بلند و بالا قصر الگ ہی تعمیر کیا ہے اور اس پر اپنا پرچم لہرایا ہے۔

مثنوی کے بعد مولانا کی سب سے اہم تصنیف ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے جو دیوان شمس تبریزی کے نام سے جمع کیا گیا ہے۔ یعنی اس دیوان کو انھوں نے اپنے مرشد اور روحانی قائد کے نام منتسب کیا ہے۔ اس دیوان کے اشعار کی تعداد تیس ہزار بتائی گئی ہے، لیکن چھپے ہوئے دیوان میں پچاس ہزار شعر ہیں۔ غالبًا بعد کے لوگوں نے اپنی طرف سے اس میں اضافہ کر دیا ہے۔

مثنوی اور دیوان کے سوا نثر میں مولانا کی ایک کتاب فیہ ما فیہ بھی موجود ہے۔ یہ کتاب مولانا کے اقوال کا مجموعہ ہے جو معین الدین پروانہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ معین الدین پروانہ اپنے استاد کے حلقۂ درس اور ان کی صحبت کے پروانے تھے۔ اس کتاب میں بھی عرفانی مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے سوا مولانا کے بعض مراسلات اور مقالات بھی باقی ہیں۔

مولانا جلال الدین نے افکار و اذہان پر بڑا زبردست اثر ڈالا ہے، ان کے پیرو اور مقلد بے شمار ہیں۔ آپ کا معنوی اور ادبی اثر نہ صرف ہندستان اور ایشیائے کوچک میں اپنے انتہائی عروج پر رہا ہے بلکہ آپ کی شہرت مغربی ملکوں میں بھی پھیل چکی ہے اور ان ملکوں کی مختلف زبانوں میں مثنوی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ مثنوی کی متعدد شرحیں اور تفسیریں بھی لکھی ہیں۔ ان میں کمال الدین حسین خوارزمی کی فارسی شرح اور ترکی میں اسماعیل بن

احمد کی شرح بہت مشہور ہیں۔ مشہور حکیم ملا ہادی سبزواری نے بھی اس کی شرح و تفسیر لکھی ہے۔

مولانا نے ۶۷۲ھ میں قونیہ ہی میں وفات پائی اور اپنے والد کے اس مقبرہ میں دفن ہوئے جو بادشاہِ وقت کے حکم سے تیار کیا گیا تھا۔

مولانا کے فرزند سلطان ولد جو بعد میں مولویوں کے پیشوا ہوئے، خود بھی عارفانہ اور شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ آپ نے تین مثنویاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور مثنوی ولدی یا ولد نامہ ہے۔ اس میں آپ نے اپنے والد اور دوسرے اولیا کے حالات بیان کئے ہیں اور عرفانی مطالب و مقالات کی تفسیر کی ہے۔

سلطان ولد ترکی زبان سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے ترکی زبان میں شاعری بھی کی ہے اور ترکی ادبیات پر ان کا اثر بہت گہرا ہے۔ ترکی میں فارسی ادبیات سے ذوق پیدا کرنے والے مختلف عوامل میں ایک عامل آپ کی ذات کو بھی سمجھنا چاہیے۔ آپ نے ۷۱۲ھ میں بمقام قونیہ وفات پائی اور اپنے والد کے مزار کے بازو دفن ہوئے۔

سبک و افکار مولانا جلال الدین کی شاعری رسائیِ مقصود، اتقانِ مطلب، لطافتِ معنی، باریکیِ خیال، عرفانی فکر کی صفائی اور پختگی کی شاعری ہے۔ گویا سنائی نے عرفانی شاعری کا قوام اور اس میں موزونیتِ تام پیدا کی، شیخ عطار نے اسے لطیف معانی اور شور و شوق کا مظہر بنایا اور مولانا جلال الدین نے اسے اوجِ کمال پر پہنچایا۔ اگر کوئی ایرانی شاعروں کے کاروان پر ذرا گہری نظر ڈالے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا کہ فردوسی داستانی اور رزمیہ شاعری کا اُستاد ہے۔ خیام حکیمانہ رباعی کا ماہر ہے، انوری کی شاعری فنی قصیدہ کا مکمل نمونہ ہے، نظامی بزمیہ اور عشقیہ داستان بیان کرنے پر قادر ہیں۔ سعدی اچھوتی نثر اور دلکش غزل کے مالک ہیں، مولانا جلال الدین عرفانی مثنوی میں بے مثال ہیں اور حافظ عرفانی غزل کے آقا ہیں۔

مولانا جلال الدین نے معانی کا رشتہ فکرِ دقیق اور حسنِ رقیق سے باندھ دیا ہے اور الفاظ

میں ان کو نہایت اچھی طرح واضح کیا ہے۔ آپ نے اپنی مثنوی کا بیشتر حصہ املا کرایا ہے اور
حسام الدین اسے ضبط تحریر میں لاتے گئے ہیں اسی طرح چھے دفتر عالم وجود میں آئے جن
میں (۲۶) ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ ان میں آپ نے عبارت آرائی، الفاظ کے موزوں
استعمال اور لغت پر اپنی پوری پوری قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ اس پر کمال یہ ہے کہ دوسرے
تمام شاعروں کے بر خلاف استاد کی توجہ الفاظ کی زینت کی طرف بالکل نہیں رہی ہے
انھوں نے مثنوی کا وزن بھی اپنے مقصد کی ادائی میں آسانی کے لئے اختیار کیا ہے تاکہ
معنوی شاعری پر گرانی محسوس نہ ہوں۔ عرفانی حقایق اور معانی بیان کرنے کا شوق مولانا
پر کچھ اس درجہ غالب تھا کہ انھوں نے لفظی آرائش کی بندش اور عروض و قوانی کی قید و
بند پر کچھ ایسی توجہ نہیں کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں مثنوی میں بعض ایسے اشعار بھی ملتے
ہیں جو فصاحت لفظی اور بعض ترکیبوں، قافیوں اور لفظوں کے اعتبار سے جاذب و دلکش
نہیں۔ اسی لئے آپ نے اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے فرمایا ہے:-

غیر نطق و غیر ایما و سجل   صد ہزاران ترجمان خیزد ز دل

اور جہاں لطائف معارف بیان کرنے کے لیے آپ نے حال پیدا کر کے قال کی قید و بند
کو اٹھا دیا ہے وہاں قافیوں میں ہم آہنگی باقی نہیں رہی ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں:

قافیہ اندیشم و دلدار من   گویدم مندیش جز دیدار من

حرف و صوت و گفت را برہم زنم   تاکہ بے ایں ہر سہ با تو دم زنم

عارفوں کے لطائف سخن سمجھنے کے لئے عموماً اور مولانا کی تصانیف سمجھنے کے
لئے خصوصاً اسلامی علوم سے شیفتگی اور صفائے ضمیر، شوق معرفت اور ذوق وحدت
کی صوفیانہ اصطلاحوں سے واقف ہونا ضروری ہے اور اسی صورت میں ان کی تصانیف
پر سے راز کا پردہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس مختصر سی کتاب میں مثنوی معنوی کے مطالب و افکار کی شرح و تفصیل ممکن

نہیں۔ کیونکہ دریا کوزہ میں نہیں سماتا:

گر بریزی بحر را در کوزۂ ۔۔۔ چند گنجد قسمت یک روزہ ای

اس لئے یہاں صرف چند اشارے کئے جاتے ہیں کیونکہ العاقل یکفیہ الاشارہ کے مصداق عاقل کے لئے بس اشارہ کافی ہے۔

گر بگویم شرح ایں بے حد شود ۔۔۔ مثنوی ہفتاد من کاغذ شود

دنیا کی ہستی ایک ہے اور وہ خدائے تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے سوا کوئی موجود نہیں جو کچھ ہے درحقیقت اسی کی ذات ہے اور دنیا تمام اس کی جلوہ گاہ ہے۔ ہماری روح بھی اسی کی ہستی کی ایک شعاع ہے جو اپنے مبدا نور سے جدا ہو کر اس جہان ظاہر و کثرت تعین میں آئی ہے۔ اسی لئے یہ اپنے دلدار کے شوق و عشق اور اس کی حسرت دیدار میں اپنی مدت بسر کرتی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ ظلم کے ظلمانی حجابات کو چاک کر کے اپنی اصل سے جا ملے۔ اس کے ہجر کے نالے ایسے ہی ہیں جیسے نئے کو نیستاں سے کاٹ لینے کے بعد اس کے اندر سے نکلتے سنائی دیتے ہیں۔ ظاہر بینوں اور کور دلوں نے اپنے اصلی مبدا کو فراموش کر دیا ہے اور وہ روح کی پکار کا جواب دینے سے معذور ہیں:

بشنو از نے چوں حکایت می کند ۔۔۔ وز جدائی ہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند! ۔۔۔ از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق ۔۔۔ تا نمایم شرح درد اشتیاق

ہر کسی کو دور ماند از اصل خویش ۔۔۔ باز جوید روزگار وصل خویش

من بہر جمعیتی نالاں شدم ۔۔۔ جفت خوش حالاں و بدحالاں شدم

ہر کسی از ظن خود شد یار من ۔۔۔ از درون من نجست اسرار من

آتش است ایں بانگ نائے نیست باد ۔۔۔ ہر کہ ایں آتش ندارد نیست باد

آتش عشق است کاندر نے فتاد ۔۔۔ جوشش عشق است کاندر مے فتاد

وحدت کی یافت اور حقیقت کے ادراک کے لئے سوزندہ عشق چاہیئے۔ ایسا عشق جس کی آگ ظاہر کی تمام ہستی اور تمام جسمانی غرور کو جلا کر خاکستر کر دے، فرماتے ہیں:

عشق ہائی کز پی رنگی بود! عشق نبود عاقبت ننگی بود

خام را جز آتش ہجر و فراق کہ پزد کہ وارہاند از فراق

چوں توئی تو ہنوز از تو نرفت سوختنی باید تو را در نار تفت

جو ذات خداوندی کے عشق سے سرفراز ہو وہ بتوں کی، اوہام کی اور نقش ظاہر کی پرستش کیسے کر سکتا ہے:

عاشق تصویر و وہم خویشتن کی بود از عاشقان ذالمنن!

عاشق آن وہم اگر صادق بود آن مجازش تا حقیقت می کشد

عاشق صادق کو اپنے آپ سے گذر جانا چاہیئے، یعنی اپنی تمام شہوتوں اور اپنی ساری غرضوں کو ختم کر دینا چاہیئے، کیونکہ:

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد صد حجاب از دل بسوی دیدہ شد

اسے چاہیئے کہ خود پسندی اور غرور جاہ سے باز آئے، حتیٰ کہ اپنے علم کے فریب سے بھی بچے اور واقعتاً اپنی ذات یعنی شہوانی ذات کو درمیان سے اٹھا دے اور مر جائے، تاکہ زندہ ہو سکے۔ ورنہ جب تک وہ ظاہر پرستی کے چکر میں پڑا رہے گا، زندہ نہ ہو سکے گا اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نحوی قواعد نحو کے لحاظ سے دوسروں کو جاہل بتاتا اور انھیں برا بھلا کہتا تھا، لیکن ایک دفعہ جب جانبازی کا موقع آیا تو لوگوں نے اس سے کہا نحوی ہونے سے کام نہیں چلے گا، یہاں تو "محوی" کی ضرورت ہے یعنی ایسے مرد حقیقت پرست اور شہوت کش کی ضرورت ہے جو گرداب حوادث اور آزمائش زندگی سے اپنے آپ کو سلامت نکال لے جائے بلکہ دوسروں کو بھی ان حوادث سے رہائی دلائے:

آن یکی نحوی بکشتی در نشست رو بکشتیبان نہاد آن خود پرست

گفت ہیچ از نحو خواندی گفت لا | گفت نیم عمر تو شد در فنا
دل شکستہ گشت کشتیبان ز تاب | لیک آندم گشت خامش از جواب
باد کشتی را بگردابی فگند | گفت کشتیبان بدان نحوی بلند
ہیچ دانی آشنا کردن بگو | گفت نی از من تو سباحی مجو
گفت کل عمرت ای نحوی فناست | زانکہ کشتی غرق این گردابہاست
محو می باید نہ نحو این جا بدان | گر تو محوی بی خطر در آب ران
آب دریا مردہ را بر سر نہد | ور بود زندہ ز دریا کی رہد
چوں بمردی تو ز اوصاف بشر | بحر اسرارت نہد بر فرق سر
مرد نحوی را ازآں در دوختیم | تا شما را نحو محو آموختیم

عارفوں کے گروہ نے ظاہر پرستی، ریا اور خود فریبی کے خلاف جتنا جہاد کیا ہے، شاید ہی کسی اور گروہ نے اتنا جہاد کیا ہو۔ چونکہ ان کی نظر میں ساری دنیا ایک حقیقت کی مظہر اور ایک مشیت کی جلوہ گاہ ہے، اس لئے اختلاف امم اور فرزندان بنی آدم کی دشمنیاں ان کے جہل اور ان کے غرور کا نتیجہ ہیں۔ اس غرور کا منشا وہی ظاہر پرستی اور وہی ان کے غلط قیاسات ہیں ان لوگوں کا حال اس طوطی کا سا ہے جس نے روغن بادام کا شیشہ توڑ دیا اور بقال نے اس کے سر پر شیشہ دے مارا۔ بیچاری طوطی کے سر کے بال جھڑ گئے اور وہ گنجی اور گونگی ہو گئی۔ اتفاق سے ایک پریشان حال گنجے درویش کا ادھر سے گذر ہوا۔ اسے دیکھ کر طوطی کی قوت گویائی واپس آگئی اور اس نے صدا لگائی، افسوس تو نے بھی روغن بادام کا شیشہ توڑا ہے، اسی لئے تو گنجا بنا پھرتا ہے نادان لوگ بھی طوطی کی طرح دوسروں کو اپنے آپ پر قیاس کرتے ہیں:

بود بقالی و او را طوطئی | خوش نوا و سبز و گویا طوطئی
بر دکان بودی نگہبان دکان | نکتہ گفتی با ہمہ سوداگران
در خطاب آدمی ناطق بدی | در نوای طوطیاں حاذق بدی

گربہ برجست ناگہ در دکان ! — بہر موشی طوطیک از بہر بیم جان
جست از صدر دکان سوئی گریخت — شیشہ ہای روغن بادام ریخت
از سوی خانہ بیامد خواجہ اش — بر دکان بنشست فارغ خواجہ وش
دید پر روغن دکان و جامش چرب — بر سرش زد گشت طوطی کل ز ضرب
روزک چندی سخن کوتاہ کرد — مرد بقال از ندامت آہ کرد
ریش بر میکند می گفت ای دریغ — کافتاب نعمتم شد زیر میغ !
دست من بشکستہ بودی آں زماں — چوں زدم من بر سر آں خوش زباں
ہدیہا می داد ہر درویش را — تا بیابد نطق مرغ خویش را
بعد سہ روز و سہ شب حیران و زار — بر دکان بنشستہ بود نومید وار
می نمود آں مرغ را ہر گوں شگفت — تا کہ باشد کاندر آید او بگفت
جولقی سر برہنہ می گذشت — با سر بی مو چو پشت طاس و طشت
طوطی اندر گفت آمد در زماں ! — بانگ بر درویش زد کہ ہی فلاں
از چہ ای کل با کلاں آمیختی ! — تو مگر از شیشہ روغن ریختی
از قیاسش خندہ آمد خلق را — کو چو خود پنداشت صاحب دلق را
کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ باشد در نبشتن شیر شیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسی ز ابدال حق آگاہ شد

ہر جماعت کا یہی خیال ہے کہ اس کی فکر ہی الصحیح ہے "کل حزب بما لدیھم فرحون" انسانی گمراہی بس یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یہیں سے اختلاف رونما ہوتے ہیں اور یہیں سے لڑائی جھگڑے کی ابتدائی ہوتی ہے اسی لطیف نکتہ کو ایران کے عارف شاعر نے آج سے سات سو سال پہلے جب کہ انسانیت بڑی حد تک جہل کی اندھیریوں میں بھٹک رہی تھی بڑے دلنشین پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اور ایرانی تفکر کی ہمہ گیری اور توانائی کا

خوب مظاہرہ کیا ہے۔

انسانیت کی رہنمائی اور اس کی نجات کے لئے ضروری ہے کہ ظاہر سے گذر کر حقیقت کا مشاہدہ کیا جائے۔ حقیقت کو صرف حقیقت بین آنکھ ہی سے دیکھا جا سکتا ہے اور ایسی نظر حاصل کرنے کے لئے ریاضت، تہذیب نفس اور کسب فضائل لازمی ہے ورنہ انسان سایہ کو حقیقت اور سراب کو آب سمجھنے لگے گا۔ لیلیٰ کی دید کے لئے مجنوں بننا ضروری ہے۔ نادان خیال کے پیچھے دوڑتے ہیں، سایہ کو پکڑنا چاہتے ہیں اور حق و باطل میں تمیز نہیں کرتے:

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی — کز تو مجنوں شد پریشان و غوی
از دگر خوباں تو افزوں نیستی — گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی
ہر کہ بیدارست او در خواب تر — ہست بیداریش از خوابش بتر
چوں بحق بیدار نبود جانِ ما — ہست بیداری چو در بندان ما
جاں ہمہ روزہ از لگد کوب خیال — وز زیان و سود وز خوف زوال
نی صفا می ماندش نی لطف و فر — نی بسوی آسمان راہ سفر!
خفتہ آں باشد کہ او از ہر خیال — دارد امید و کند با او مقال
مرغ بر بالا پراں و سایہ اش — می دود بر خاک پراں مرغ وش
ابلہی صیاد آں سایہ شود — می دود چندانکہ بی مایہ شود
تیر اندازد بسوی سایہ او — ترکشش خالی شود در جست و جو

حقیقی بیداری کے لئے طاعت، عبادت، حق پرستی، تربیتِ نفس اور دردمندی لازم ہے۔ ظاہر بین بے درد کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوتا ہے اس لئے وہ حق جوئی کا دردہی نہیں رکھتا

ہر کہ او بیدار تر پُر درد تر — ہر کہ او آگاہ تر رخ زرد تر

ظاہر ہے اس دردمندی اور ریاضت سے مقصد وظائفِ زندگی سے دست

(۲) تاریخ ادبیات ایران

کشی، بے کار توکل اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا نہیں۔ اس دنیا میں اسباب وعلل کا پتہ لگانا چاہیے، تاکہ حیات جاوید کے مقدمہ یعنی اس حیات مستعار کے کام میں تعطل پیدا ہونے نہ پائے

گفت پیغمبر بآوازہ ملبند ۔۔۔ با توکل زانوی اشتر ببند

رمز الکاسب حبیب اللہ شنو ۔۔۔ از توکل در سبب کاہل مشو

در توکل جہد کسب اولیٰ تر است ۔۔۔ زانکہ در ضمن محبت مضمر است

گر توکل می کنی در کار کن! ۔۔۔ گشت کن پس تکیہ بر جبار کن

پس درویشی اور عبادت افلاس ونا داری، دریوزہ گری اور بے اسبابی کا نام نہیں بلکہ غرور وخود پرستی سے رہائی ہے اور ظاہر سے گذر کر خدا سے وابستہ ہو جانا ہے۔ مال دنیا وسیلہ ہے اور اسے جائز طور پر حاصل کرنا چاہیے۔ انسان کو چاہیے کہ خود مال پر مسلط رہے نہ یہ کہ مال اس کی جان پر مسلط ہو جائے۔ اسی طرح خدا کے راستے میں زن وفرزند رکاوٹ نہیں ہیں۔ درویشی استغنا اور بے نیازی کا نام ہے، احتیاج اور ناداری کا نہیں:

چیست دنیا از خدا غافل بدن ۔۔۔ نی قماش ونی زر وفرزند وزن

مال را کز بہر دین باشی حمول ۔۔۔ نعم مال صالح خواندش رسول

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است ۔۔۔ آب اندر زیر کشتی پشتی است

سچا صوفی ہر چیز کا مقصد اور اس کا محل جانتا ہے وہ عالم باطن کے معنی، جہاں ظاہر کا مطلب اور اسباب وعلل جاننے کی کوشش کرتا ہے اور شیخ شبستری کے قول کے مطابق یہ سمجھتا ہے کہ:

جہاں مانند خط وخال وابروست ۔۔۔ کہ ہر چیزی بجائے خویش نیکوست

اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ خدمت خلق میں بسر کرتا ہے، امور میں تامل کرتا ہے، اور آزمائش سے پہلے اپنے پیر وپیشوا کے آگے دم نہیں مارتا اور کوئی ادعا نہیں کرتا۔ کیونکہ پرگوئی اور دانش کا دعویٰ خام کاری کی علامت ہے۔ جو بات زبان سے نکل گئی گویا تیر ہے جو کمان سے نکل گیا، اس کے

بعد پشیمانی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا:

کودک اول چوں بزاید شیر نوش ۔۔۔ مدتی خاموش باشد جملہ گوش!

مدتی می بایدش لب دوختن !! ۔۔۔ از سخن تا او سخن آموختن

نکتۂ کان جست ناگہ از زبان ۔۔۔ ہم چو تیری دان کہ جست آن از کمان!

وانگردد از رہ آن تیر ای پسر ۔۔۔ بند باید کرد سیلی را ز سر

پس تامل و خاموشی اختیار کرنا اور نصیحت سننا ہی عارفوں کا آئین ہے کیونکہ پر گوئی، خودستائی اور دانش فروشی صاحبِ دل عارف کا شعار نہیں۔ وہ دل کو زبان پر ترجیح دیتا ہے کیونکہ دل خدا کی جلوہ گاہ ہے اور جب خدا کے ساتھ بندے کا تعلق الفاظ کی دنیا سے گذر کر قلبی ہو جاتا ہے تو اس میں یگانگی اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ ظاہر کا رنگ اور نیرنگی ناپید ہو جاتی ہے۔ کیونکہ آدمی کی لڑائی اور جھگڑا اس کی منافقت اور زبان درازی کا نتیجہ ہے:

چونکہ بی رنگی اسیرِ رنگ شد ۔۔۔ موسیٰ با موسیٰ در جنگ شد

دل اور دلجمعی کا راستہ وحدت ہے۔ یہی چیز اقوام کو بے گانگی کی جگہ یگانگت سکھاتی ہے زبان اور ظاہر میں یہ بات کہاں:

ای بسا ہندو و ترک ہم زبان ۔۔۔ ای بسا دو ترک چوں بیگانگاں

پس زبان ہمدلی خود دیگر است ۔۔۔ ہمدلی از ہم زبانی بہتر است

سِرّ وحدت سے اتنی آشنائی اور عواملِ جمعیت سے اتنی آگاہی کہ انسان کثرات سے نکل کر جمع الجمع کے مقام پر پہنچ جائے۔ بہت دشوار ہے۔ جب کسی کو یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو وہ ہر شخص کے آگے اس مقام کا راز بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے لئے بڑی تربیت اور بہت زیادہ تہذیبِ نفس کی ضرورت ہے۔ اسی لئے تو صوفیوں کو اہلِ راز کہا گیا ہے:

گفت پیغمبر کہ ہر کو سر نہفت　　زود باشد با مرادِ خویش جفت

دانہ چوں اندر زمیں پنہاں شود　　سرِّ آں سرسبزیِ بستان شود

رازِ عرفانی کے افشا میں دو برائیاں ہیں ایک تو اہل ظاہر اور بے مغز پوست پرستوں کی طرف سے اور دوسرے اپنے آپ کو عالم ظاہر کرنے والوں کی طرف سے۔ یہ لوگ جدل کے زور پر استدلال کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک عقل کا قیاس نورِ عرفان سے منور نہ ہو جائے لاکھ عقل سر پٹکے حق تک اس کی رسائی ممکن نہیں:

پای استدلالیان چوبیں بود　　پای چوبیں سخت بی تمکیں بود

یہی سرِّ عرفان اور رازِ ایمان ہے جو دیوان شمس تبریز میں شور انگیز غزلوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

اگر مثنوی میں شمس تبریز کا نام شاذ و نادر آیا ہے اور ان کی طرف مولانا کی نظر بالراست نہیں رہی ہے تو غزلیات میں راست شمس تبریزی ہی ان کی بے درد و بے تاب اشعار کے مقصود و مخاطب رہے ہیں۔ چند ایک غزلوں کے سوا ہر غزل اس کے نام پر ختم ہوتی ہے جو مولانا کا معنوی محبوب اور کعبۂ عرفان تھا۔

غزلیات میں مولانا کی خاص خصوصیت وہ عاشقانہ جوش و خروش ہے جو ہر پڑھنے والے کے دل کو تڑپا دیتا اور اس کے احساسات کو گرما دیتا ہے۔ بے شبہ ہر غزل محسوسات کی آگ، اس کی بھڑک اور جذبہ و حال کی زندہ تصویر ہے۔ ان کی بیشتر غزلیں روحِ سماع اور رقصِ عارفانہ سے لبریز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سر تا سر شور و شوق، جوش و خروش اور سوزِ عشق کی آگ بھڑک رہی ہے۔ بے شبہ مولانا جلال الدین سے پہلے ایسا شوریدہ اور تڑپانے والا کلام شیخ عطار اور ان کے بعد سنائی کے سوا کسی کے پاس نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی کی طرح غزلیات میں بھی مولانا صوفیانہ شاعری کے ان پیشواؤں کو یاد کرتے ہیں، ایک غزل میں فرماتے ہیں:

اگر عطار عاشق بُد سنائی شاہ وفائق بود   نہ آنم من نہ اینم من کہ گم کردم سر و پا را

ایک اور غزل میں سنائی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

گفت کسی خواجہ سنائی بمرد   مردن ایں خواجہ نہ کاریست خرد

کاہ نبود او کہ بباد ی رود   آب نبود او کہ زسرما فسرد

شانہ نبود او کہ زموئی شکست   دانہ نبود او کہ زمینش فشرد

گنج زری بود دریں خاکدان   کو دو جہان را بجوی می شمرد

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار لکھتے وقت مولانا کے پیش نظر رودکی کا وہ قطعہ تھا جو اس نے بخارا کے شاعر ابوالحسن مرادی کے مرثیہ میں لکھا تھا :

مرد مرادی نہ ہمانا کہ مرد   مرگ چناں خواجہ نہ کاریست خرد

جاں گرامی بپدر باز داد!   کالبد تیرہ بماد ر سپرد

مولانا کی شورانگیز غزلیات کا موضوع بھی وہی وصالِ حق اور وجودِ مطلق کا درک ہے۔ ان کے ہر شعر سے یار کا ہجر اور دلدار کا عشق ہویدا ہے جس کے مظہر آپ کے پیر و مرشد بزرگ شمس تبریز ہیں۔ یعنی ان کے اس کلام میں کبھی تو نشاط اور شوق دیدار ٹپکا پڑتا ہے تو کبھی ہجران یار کا سوز و گداز۔ کبھی تو اس پیرِ معنوی کی مجلس انس کا وجد آفریں ساز چھیڑا جاتا ہے تو کبھی اس سے دوری اور اس کے فراق کا دلگداز نالہ بلند کیا جاتا ہے۔ ان کے جذبات کی صداقت اور ان کی گہرائی نے کلام کو نہایت درجہ مؤثر بنا دیا ہے۔ ہر غزل کے دلکش وزن، ندائے پیہم اور جوشش دمادم سے روح کی آشفتگی کا اظہار ہو رہا ہے۔ مثلاً یہ غزلیں ملاحظہ ہوں :

بیائید بیائید کہ گلزار دمید ست   بیائید بیائید کہ دلدار رسید ست

ای عاشقان ای عاشقان من خاک را گوہر کنم   ای مطربان ای مطربان دف شما پر زر کنم

مردہ بدم زندہ شدم گریہ بدم خندہ شدم — دولت عشق آمد و من دولت پاینده شدم

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم — چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

ای عاشقان ای عاشقان یک لولیٔ دیوانہ شد — طشتش فتاد از بام ما نک سوی مجنون خانہ شد

عشق کی اس گیرودار میں عارف کی سب سے بڑی پناہ دل کا کعبہ، اور وصالِ دوست کا قریب ترین راستہ دل کا راستہ ہے، کیونکہ دل خدا کی جلوہ گاہ ہے، اسی لئے فرماتے ہیں

طواف کعبۂ دل کن اگر دلی داری — دلست کعبہ معنی تو گل چہ پنداری

طواف کعبہ صورت حقت ازاں فرمود — کہ تا بواسطہ آن دلی بدست آری

ہزار بار پیادہ طواف کعبہ کنی — قبولِ حق نشود گر دلی بیازاری

ہزار بدرہ زر گر بری بحضرت حق — حقت بگوید دل آر گر بما آری

ز عرش و کرسی و لوح و قلم فزوں باشد — دل خراب کہ او را بہیچ نشماری

جو دل نہیں رکھتے اور صفائے دروں سے محروم ہیں، نزدیک ترین راستے گم کر کے دور کے راستے جاتے ہیں، یار کو گھر میں چھوڑ کر دنیا کے گرد گھومتے ہیں:

آنہا کہ طلب گار خدائید خدائید — بیرون ز شما نیست شمائید شمائید

چیزی کہ نکردید گم از بہر چہ جوئید — کس غیر شما نیست کجائید کجائید

در خانہ نشینید نگردید بہر کوئی — زیرا کہ شما خانہ و ہم خانہ خدائید

اسی طرح جو کعبۂ دل کو فراموش کر دیتے ہیں یعنی جو حضور قلب، حال اور روحانیت سے محروم ہیں، ظاہری عمل کرتے ہیں اور بے خبرانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں وہ یار کو کیسے پا سکتے ہیں:

ای قوم بہ حج رفتہ کجائید کجائید — معشوق ہمیں جاست بیائید بیائید

معشوق تو ہمسایۂ دیوار بدیوار — در وادیہ سرگشتہ شما در چہ ہوائید

گر صورت بی صورت معشوق ببینید — ہم خواجہ و ہم بندہ و ہم قبلہ شمائید

گر قصد شما دیدن آن کعبۂ جانست — اول رخ آئینہ بصیقل بزدائید

اسی طرح یہی حال ان لوگوں کا ہے جو آلودہ قلب رکھتے ہیں جو حلال و حرام میں فرق نہیں کرتے، جو کبھی حق کی تائید میں ایک قدم نہیں اٹھاتے، جو عشق الٰہی سے محروم ہیں۔ لیکن بظاہر نماز پڑھتے ہیں اور پوست پرستی کرتے ہیں۔ بے دلوں کی نماز کی قیمت چند حرکات سے زیادہ نہیں تو پھر وہ لوگ جو ریاکاری سے نماز پڑھتے ہیں بظاہر زاہد اور باطن میں مردم آزار ہیں، ان کی نماز کس شمار میں آسکتی ہے :

اگر نہ روی دل اندر برابرت دارم — من این نماز حساب نماز نشمارم

ز عشق روی تو من رو بقبلہ آوردم — وگرنہ من ز نماز و ز قبلہ بیزارم

مراغرض ز نماز آں بود کہ پنہانی — حدیث درد فراق تو با تو بگذارم

وگرنہ این چہ نمازی بود کہ من با تو — نشستہ روی بمحراب و دل ببازارم

نماز کن بصفت چوں فرشتہ ماند من — ہنوز در صفت دیو و دد گرفتارم

کسیکہ جامہ بسک برزند نمازی نیست — نماز من بچہ ارزد کہ در بغل دارم

ازیں نماز نباشد بجز کہ آزارت — ہماں بہ آنکہ ترا بیش ازیں نیازارم

ازیں نماز ریائی چناں خجل شدہ ام — کہ در برابر رویت نظر نمی آرم

اشارتی کہ نمودی بہ شمس تبریزی — نظر بجانب ما کن غفور و غفارم

خلاصہ یہ کہ اس عارف کامل کے کلام کا موضوع وحدت پر نظر، رجوع بباطن ظاہر سے روگردانی، خلوص و صفا کی تعلیم، ظاہر پرستی اور ریاکارانہ اور بیرونی نمائش سے گذر کر کشایش درون سے ربط، تجلی آفاق سے ضرب نظر اور نور اشراق کے نظارہ کی دعوت ہے۔ فرماتے ہیں :

ما دل اندر راه مردان باختیم — غلغلی اندر جہاں انداختیم
آتشی اندر دل خلقاں زدیم — شورشی در عاشقاں انداختیم
خرقہ و سجادہ و تسبیح را — در خرابات مغاں انداختیم
داشتیم بر پشت خود بار گراں — شکر کاں بار گراں انداختیم
جبہ و دستار و علم و قیل و قال — جملہ در آب رواں انداختیم
از کمان شوق تیر معرفت — راستی سوی نشاں انداختیم
دست شستیم از ہمہ اسباب خود — آتش اندر خانماں انداختیم
دینی دوں نزد دانا جیفہ است — جیفہ را پیش سگاں انداختیم
ما ز قرآں برگزیدہ مغز را — پوست را پیش خساں انداختیم
ما بساط عشرت و ذوق و صفا — در سرای لامکاں انداختیم
بہر عشق شمس تبریزی لقب — غلغلی در آسماں انداختیم

مغز قرآن کے حاصل کر لینے اور آیات قرآنی سے اپنے اصلی مقصود کو پا لینے کے بارے میں مثنوی معنوی میں حسب ذیل اشعار ملتے ہیں۔ اسی کے ضمن میں پھر ایک بار سنائی کا ذکر آ جاتا ہے:

خوش بیاں کرد آں حکیم غزنوی — بہر محجوباں مثال معنوی
کہ ز قرآں گر نہ بیند غیر قال — ایں عجب نبود ز اصحاب ضلال
کز شعاع آفتاب پر ز نور — غیر گرمی می نیابد چشم کور
حرف قرآں را بداں کہ ظاہر یست — زیر ظاہر باطنی بس قاہر یست
تو ز قرآں ای پسر ظاہر مبیں — دیو آدم را نہ بیند جز کہ طین
ظاہر قرآں چو شخص آدمیست — کہ نقوشش ظاہر و جانش خفیست

مولانا نے اپنی کتاب فیہ ما فیہ میں بھی وہی افکار اور وہی خیالات ظاہر کئے ہیں جو

آپ نے مثنوی میں بیان کئے ہیں۔ اس کے سوا ترجیع بندوں، رباعیوں اور مکاتیب میں بھی اسی پیمانہ پر یہی سودا نظر آتا ہے اور یہاں بھی وہ اپنے شمع مقصود کے پروانے نظر آتے ہیں۔

کمال الدین اسماعیل خلاق المعانی کمال الدین اسماعیل ابن جمال الدین محمد عبدالرزاق اصفہانی ساتویں صدی ہجری کے مشہور شاعروں اور قصیدہ گویوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا باپ جس کا ذکر ہو چکا ہے، اپنے زمانے کے مشہور شاعروں میں گنا جاتا تھا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی آل صاعد اور آل خجند کا مداح تھا۔ یہ دو خاندان اصفہان کے مشہور مذہبی خانوادے تھے۔ اسی طرح کمال الدین نے خوارزم شاہوں، فارس کے اتابکوں اور طبرستان کے سپہداروں کی مدح سرائی کی ہے۔ اس شاعر کی زندگی میں خونخوار مغلوں کے ہاتھوں اصفہان کے باشندوں کے قتل عام کا خونین واقعہ پیش آیا بہت سے بزرگوں اور دانش مندوں کی طرح کمال الدین بھی اس ہنگامے میں اصفہان سے فرار ہو گیا اور دنیا بھر کی مصیبتیں اور زمانے کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں اٹھاتا آخر کار ۶۳۵ھ میں مغلوں کی بے پناہ شمشیر کا شکار ہو ہی گیا۔

کمال الدین عام طور پر اپنے قصیدے تغزل کے بغیر شروع کرتا ہے اور کبھی ممدوح کی مدح کی طرف گریز کے بعد پند آمیز اشعار شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً خواجہ رکن الدین صاعد بن مسعود کے مدحیہ قصیدے میں کہتا ہے:

ای آنکہ لاف می زنی از دل کہ عاشقست ... طوبی لک ار زبان تو با دل موافقست

بگذار سازوالت حس و خیال و وہم! ... تنہا جریدہ رو کہ گذر پر مضایقست

از عقل پر پس راہ کہ پیری مواحد است ... مسپر پی خیال کہ دزدی منافق است

ز افلاک بر گذر اگرت میل نزہتست ... کیں گرد خیمہ نیز محل طوارقست

چون غنچہ دل درین تن دہ روی بستہ ... بس لاف یکدلی زنی آنہم نہ لایقست

خورشید حق ز سایہ تو در حجاب شد ... ورنہ ہمہ سراسر عالم مشارقست

کمال الدین نے اپنے قصیدوں میں اپنے مولد اصفہان کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ اس کی سرسبزی و شادابی اور اس کی ویرانی و بربادی کو دل سے یاد کرتا ہے اور یارانِ اصفہان کی صحبتوں میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے وہ قصیدے ملاحظہ ہوں جو ذیل کے مطلعوں سے شروع ہوتے ہیں:

دل و دامن از جنگ محنت رہا — منم این کہ گشتہ است ناگہ مرا

این چنین عہد کس ندارد یاد! — اصفہان خرم است و مردم شاد

ہوایش عنبر افشاند زمینش گلستاں گردد — صفاہاں را بہر یک چند دولتہا جوان گردد

شاعر نے گذری ہوئی عمر، روزگار کی شکایت اور پند و نصیحت پر نہایت پر اثر قصیدے بھی لکھے ہیں، مثلاً یہ قصیدہ ملاحظہ ہو:

جہاں بگشتم و آفاق سربسر دیدم — بمردی اگر از مردمی اثر دیدم!
دریں زمانہ کہ دلتنگی است حاصل او — ہمہ کشایشی از چشمہ جگر دیدم
بنالم ار کسی از بد ہمی بنالد از آنک — ز روزگار من از بد بسی بتر دیدم

ایک قصیدہ میں جس کو

بچشم عقل نظر می کنم یمین و یسار — نہ شاعری بتر اندر جہاں ندیدم کار

کے مطلع سے شروع کرتا ہے شعر کی کساد بازاری، لوگوں کی وحشت اور بے مہری کا شکوہ کرتے ہوئے اپنی علوِ طبع کے بارے میں کہتا ہے:

ہزار شکر و سپاس از خدای عز و جل — کہ من نہ حرص و طمع نیستم بر این ہنجار
وجود کسب خود از شعر و شاعری نہ کنم — چو من اگرچہ کم افتند ناظم اشعار
نشستہ بر سر گنج قناعتم شب و روز — نہ من ز کس نہ کس از من ہمی برد تیمار

بعض اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو اس معنوی درد و غم کے سوا جسمانی تکلیفیں بھی ستایا کرتی تھیں اور وہ اپنے باپ کی طرح درد چشم کی وجہ سے راتوں کو سو نہیں سکتا تھا، چنانچہ کہتا ہے:

جانم ز درد چشم بجان آمد از عذاب — یارب چہ دید خواہم ازین چشم در زباب
گوبند مشک ناب شود خون بروزگار — دیدیم بچشم خویش کہ شد مشک خون ناب

کمال الدین نے اپنے باپ کا نہایت پر درد اور موثر مرثیہ بھی لکھا ہے اور یہ قصیدہ مطلع ذیل سے شروع ہوتا ہے:

من سر بآفتاب د فلک در نیاورم — گر تیغ آفتاب نہ ند چرخ بر سرم

ہمام تبریزی خواجہ ہمام الدین بن علائی تبریزی کا شمار آذربائجان کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس نے اصناف نظم میں خاص کر غزل سرائی میں بڑی استادی سے کام لیا ہے اور سعدی کی طرز کی خوب پیروی کی ہے۔ اسے خود اپنے کلام کی لطافت کا احساس تھا، کہتا ہے:

ہمام را سخن دل فریب و شیرین است — ولی چہ سود کہ بیچارہ نیست شیرازی

اس شعر میں "شیرازی" سے اپنے ہم عصر بلند پایہ شاعر سعدی شیرازی کی طرف اشارہ ہے۔ ہمام کے دیوان غزلیات میں دو ہزار شعر ہیں۔ اس کے سوا ہمام نے "صحبت نامہ" کے نام سے ایک نظم بھی لکھی ہے۔ صحبت نامہ شمس الدین محمد صاحب دیوان کے بیٹے خواجہ شرف الدین کے نام معنون کیا گیا ہے۔ صاحب دیوان اپنے زمانے کا بڑا زبردست ادب پرور تھا، اور اس بزرگ کی خدمت ہمام نے اپنے آپ پہ لازم کر لی تھی۔ ہمام عاشق کی محبت اور صفائے قلب کے اثر کو نہایت دلفریب زبان میں ادا کرتا ہے، مثلاً کہتا ہے:

دانی چگونہ باشد از دوستان جدائی — چون دیدہ ای کہ ماند خالی زروشنائی
سہلست عاشقان را از جان خود بریدن — لیکن ز روی جانان مشکل بود جدائی

در دوستی نباید هرگز خلل زدوری　　گر در میان یاران مهری بود خدائی
هر زر که خالص آید بر یک عیار باشد　　صد بار اگر در آتش آن را بیازمائی

آثار عشق گل و بلبل میں بھی پیدا ہیں، جس کے دل میں ایک بار محبت کی آگ بھڑکی وہ ملامت کرنے والوں سے نہیں ڈرتا:

بلبلان را ہمہ شب خواب نباید از بیم　　کہ مبادا ببرد برگ گلی باد نسیم
شب مہتاب و گل و بلبل سرمست بہم　　مجلس آن نیست کہ در خواب رود چشم ندیم
باد را گر خبر از غیرت بلبل بودی　　ہیچ وقتی نگذشتی ز گلستان از بیم
اثری عشق نگر در ہمہ جنبندہ ای در نی　　مرغ را نغمہ داؤد کہ کردی تعلیم!
عشق می ورزم و گو خصم ملامت می کن　　نہ من آوردہ ام این شیوہ کہ رسمیست قدیم
گر نمایم بہ ملامت گر خود صورت دوست　　دہد انصاف و کند مسئلہ با ما تسلیم

ایسے ہی چند اشعار سے ظاہر ہے کہ ہمام نے اپنے اشعار میں صرف متداول اور مشہور مضامین ہی نہیں باندھے ہیں یا ان میں تصرف کیا ہے۔ مثلاً اوپر کی غزل میں باد و برگ اور بیم بلبل کا مضمون کچھ ایسا مشہور نہیں۔ غالباً یہ شاعر کی اور جدتوں میں سے ایک جدت ہے۔

اوحدی مراغہ ای

رکن الدین اوحدی آذربایجان کے صوفی شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ ۶۷۰ھ کے قریب مراغہ میں پیدا ہوا اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ اصفہان میں گذارا۔ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر علوم دینی، تصوف و عرفان اور اخلاقی اور اجتماعی مسائل پر گہری نظر رکھتا تھا۔

اوحدی عرفان اور تصوف میں مشہور عارف ابو حامد اوحد الدین کرمانی (متوفی ۶۳۵ھ) سے بیعت تھا اور اسی نسبت سے اس نے اوحدی تخلص اختیار کیا تھا۔ اوحدی کو آخری مغل ایلخان یعنی ابو سعید (۷۱۶ - ۷۳۶) کے دور حکومت میں خاص شہرت حاصل ہوئی۔ اوحدی نے اس بادشاہ اور اس بادشاہ کے وزیر غیاث الدین محمد ابن خواجہ رشید الدین

فضل اللہ کی اپنے اشعار میں مدح کی ہے۔

اوحدی کا دیوان قصائد، غزلیات، قطعات، ترجیع بند اور رباعیات پر مشتمل ہے۔ عرفانی غزلیں بلند پایہ ہیں اس کے قصائد میں عرفانی اشعار اور لطیف مراثی ملتے ہیں۔ اس کی اور منظومات میں مثنوی دہ نامہ یا منطق العشاق ہے جو خواجہ نصیر الدین طوسی کے پوتے وجیہ الدین شاہ یوسف کے نام لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی میں ایک جگہ کہتا ہے:

وجیہ دولت و دین شاہ یوسف — کہ دارد رتبت پنجاہ یوسف

نصیر الدین طوسی را نبیرہ — کہ عقل از فطنت او گشت خیرہ

دہ نامہ کی نظم کی تاریخ ۷۰۶ھ ہے، چنانچہ خود کہتا ہے:

بسال ذال و واو از سال ہجرت — بپایاں بردم ایں در حال ہجرت

اس کی دوسری مشہور مثنوی جام جم ہے۔ اس میں شاعر نے سلطان ابوسعید کی مدح کی ہے اور خود مثنوی کو سلطان کے وزیر غیاث الدین محمد کے نام معنون کیا ہے۔ اس مثنوی میں پچاس ہزار شعر ہیں اور یہی شاعر کا شاہ کار ہے یہ ۷۳۳ھ میں نظم ہوئی، خود کہتا ہے:

چو بتاریخ بر گرفتم فال — ہفت صد رفتہ بود وسی وسہ سال

اوحدی نے ۷۳۸ھ میں وفات پائی اور اپنے وطن مراغہ میں دفن ہوا۔ اس کی قبر کا تعویذ آج تک اس کی خاک پر محفوظ چلا آرہا ہے۔

ذیل کا قصیدہ جیسا کہ ظاہر ہے صوفیانہ لحن کا حامل اور سنائی، شیخ عطار اور مولانا روم کے سبک کی یاد دلانے والا اور متاخر شعرا میں ہاتف کے ترجیع بند سے مشابہت رکھتا ہے

سر پیوند ماندارد یار! — چوں توانشد ز وصل برخوردار

ہمدمی نیست تا بگویم راز — خلوتی نیست تا بگریم زار

در خرد و شتم ز صیت آں معشوق — در سماعم ز صوت آں مزمار

مطربم پردہ یا ہمی سازد — کہ درآں پردہ نیست کس را بار

همه مستان درآمدند بهوش | مست ما خود نمی شود هشیار

چیست این ناله وفغاں در شهر | چیست این شور وفتنه در بازار

تو گمانی که میرسد معشوق | او نشانی که میرود دلدار

همه در جستجوی واو غافل | همه در گفتگوی واو بیزار

نار در زن بجز من تشویش | پای در نه ز ممکن انکار!

خانه در بیشهٔ الهی بر! | سنگ در شیشه ملاهی بار

در سواد سه نقش کش خامه | بر در چار طبع زن مسمار

این مثلث بنه بر آتش شک | وان مربع بریز در مضمار!

با غبار اند شاه ولشکر باش | تا برون آید آں علم ز غبار

جز یکی نیست صورت خواجه | کثرت از آئینه است وآئینه دار

آب وآئینه پیش گیر و ببیں | که یکی چوں دو می شود بشمار

سکه شاه ونقش سکه یکیست | عدد از درهم است واز دینار

هم بدریاست بازگشت نمی | که ز دریا جدا شود به بخار

به نهایت رسان تو خط وجود | نقطه اصل از انتها بردار

همه عالم نشان صورت اوست | باز جوئید یا اولی الابصار

ظاہر ہے اس قصیدہ میں شاعر کی نظر وحدت عالم اور کثرت میں وحدت کی تجلی ہے جس طرح قطرہ دریا سے جدا ہو کر بھی دریا کا ایک جزو رہتا ہے، اسی طرح اجزای وجود ایک ہی ہستی کے حصے ہیں، ایک ہی اصل پر منتہی ہوتے ہیں۔

اوحدی نے اس قصیدے کے سوا اور بھی استادانہ شعر کہے ہیں، پھر بھی کلام کی بندش اور معنی کی گہرائی کے لحاظ سے وہ درجہ اول کے استادوں کے درجہ کو نہیں پہنچتا۔ مثلاً اسی قصیدے کا مقابلہ ہاتف کے ترجیع بند کے ساتھ کیا جائے جو اسی یا ایسے ہی قصیدوں

سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے تو ہاتف کا کلام زیادہ استوار اور محکم نظر آئے گا۔ حتیٰ کہ ایسے اشعار میں جیسے :

"تو گمانی کہ می رسد معشوق"..... "خانہ در بہشیشۂ الہیٰ بر"..... "تو بہ نہایت رسان تو خط وجود"..... میں عبارت اور معنی کی سستی نمایاں ہے۔

اوحدی نے مثنوی جام جم میں بھی عرفانی افکار پیش کئے ہیں۔ ضمناً اخلاقی اور اجتماعی مسائل بیان کئے ہیں اور حاکموں اور قوی دستوں کو پند و نصیحت کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتا ہے :

ای کہ بر ملک و مملکت شاہی	عدل کن گر ز ایزد آگاہی !
عدل بے علم بیخ و بر نکند	حکم بے عدل و علم اثر نکند
شاہ کو عدل و داد پیشہ کند	پادشاہش بیخ و ریشہ کند
بر قوی پنجہ دست کیں مگشای	بر ضعیف و زبوں کمین مگشای
رفت کسری ز خط شہر بدشت	باسواران ز ہر طرف می گشت
گلشنی دید تازہ و خندان	تر و نازک چو خط دلبندان
پر ز نار بیخ و نار باغی خوش	زیر ہر برگ او چراغی خوش !
گفت آب از کدام جو یستش	کہ بدین گونہ رنگ و بویستش !
باغبانش ز دور ناظر بود	داد پاسخ کہ نیک حاضر بود
گفت عدل تو داد آب او را	زاں نبینہ کسی خراب او را

سچ تو یہ ہے کہ جام جم جیسی مثنوی فارسی زبان میں شاید ہی ملے۔ اس میں اجتماعی اور تربیتی مسائل اور نہایت عبرت انگیز مضامین سے بحث کی گئی ہے۔ مثلاً اس میں آداب رسوم، انسانی مراتب، شہر اور عمارت بنانے کی شرطیں، اولاد کی تربیت کے اصول، پیشہ ورون کی حالت، قاضیوں کو نصیحت، مروی اور مردمی کی راہ اور اس کی نظیریں پیش کی ہیں۔ اور مطالب کو

بڑی خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے، مثلاً "تربیت فرزندان" میں کہتا ہے:

شرم دارای پدر ز فرزندان! | ناپسندیده هیچ مپسندان
با پسر قول زشت و فحش مگوی | تا نگردد لئیم و فاحشه گوی
تو بدارش بگفتها آزرم | تا بدارد نه کرده های تو شرم
بچه خویش را بناز مدار | نظرش هم ز کار باز مدار
چون بخواری برآید و سختی | نکشد محنت او ز بدبختی

ظاہر ہے بچوں کو بچپن ہی سے کام، محنت اور کوشش کا عادی بنانا چاہیے، تاکہ بڑے ہونے کے بعد وہ سست، بے کار اور کاہل نہ بنے پائیں۔ یہی اصول عصر حاضر کی تربیت نے بھی تسلیم کیا ہے:

خنک آں پیشہ کار حاجت مند | ہم دلیش از ایں جہاں خرسند
گشتہ قانع بہ رزق و روزیِ خویش | دست در کار کردہ سرور پیش
چند سال از برای کار و ہنر! | خوردہ سیلی ز استاد و پدر!
دل او دارد از امانت نور!! | دست او باشد از خیانت دور
شب شود سر بسوی خانہ نہد | ہر چہ حق داد در میانہ نہد

جام جم کے آخری حصہ میں شاعر نے مرشد کے صفات، سالک کے مقامات اور عارفانہ اصطلاحات جیسے دل، نفس، عشق، سماع وغیرہ کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔

امیر خسرو جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، ہندوستان کی قدیم ادبی زبان یعنی سنسکرت، ایران باستان کی فارسی کی رشتہ دار ہے اور اہلِ ہند اور اہلِ ایران ہم نژاد ہیں۔ موجودہ فارسی کا رواج ہندوستان میں بعد اسلام اور خاص کر غزنویوں کی سلطنت کے بعد ہوا ہے۔ مغلوں کے عہد میں یہ زبان ہندوستان میں خوب پھلی پھولی اور فارسی زبان میں شعر کہنے والے شاعر اور علماء و فضلاء پیدا ہونے لگے ان میں سے ایک مشہور

ترین شاعر امیر خسرو ابن امیر سیف الدین محمود دہلوی ہیں جو اس عہد کے بعض مشہور ایرانی شاعروں کے ہم عصر ہیں۔ آپ کے والد ترکستان کے شہر کش کے رہنے والے تھے۔ یہ مغلوں کے ہنگامے میں ہندوستان فرار ہو گئے اور یہاں قصبہ پٹیالی میں سکونت اختیار کر لی تھی ... یہیں ۶۵۱ھ کے لگ بھگ امیر خسرو تولد ہوئے۔ چونکہ آپ کے والد عالم اور اہلِ فضل تھے، اس لئے امیر خسرو نے بھی علوم وفنون کی تحصیل شروع کی اور اپنی قومی زبان فارسی کے آثار اور اشعار کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس زبان پر آپ نے کامل عبور حاصل کر لیا اور ایامِ جوانی سے شعر کہنا شروع کر دیا۔ آپ نے بڑی کثرت سے شعر کہے ہیں اور آپ کا جو کچھ کلام باقی رہ گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ درجہ اول کے شاعر تھے۔

امیر خسرو کی اقامت گاہ دہلی تھی، دہلی کے سلاطین کے یہاں آپ کی بڑی عزت تھی۔ ان میں سے بعض سلاطین کی آپ نے اپنے اشعار میں مدح کی ہے اور ان کا نام لیا ہے امیر خسرو ہندوستان کے ایک مشہور صوفی بزرگ اور مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ خسرو نے آپ ہی سے سلوک، طریقت، ریاضت اور درویشی کی تعلیم حاصل کی۔ الفاظ ومعنی کے لحاظ سے اپنی شاعری میں انھوں نے ایران کے مشہور شعرا خاص کر خاقانی، نظامی اور سعدی کو اپنے پیشِ نظر رکھا۔ خصوصاً غزل میں سعدی کے سبک کی پیروی کی، چنانچہ خود کہتے ہیں:

جلدِ سخنم دارد شیرازۂ شیرازی

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ امیر خسرو اپنے ایک جداگانہ ہی لحن کے مالک ہیں اور یہ لحن ایسا ہے جو تفاوتِ مراتب کے ساتھ ہندوستان کے دوسرے فارسی شاعروں کے پاس بھی نظر آتا ہے۔ اس سبک نے بتدریج وہ صورت اختیار کی جو "ہندی سبک" کے نام سے مشہور ہوا۔

تاریخ ادبیات ایران

امیر خسرو کا دیوان جس میں بیشتر مدحیہ قصیدے سلاطینِ دہلی کے نام ہیں، پانچ حصوں میں منقسم ہے :

۱۔ تحفتہ الصغر: یہ شاعر کی جوانی کا کلام ہے۔ اس میں زیادہ تر قصیدے، غزلیں اور ترجیع بند ہیں۔ قصیدوں میں سلطان غیاث الدین بلبن، اس کے بیٹے اور حضرت نظام الدین اولیاء کی مدح کی ہے۔

۲۔ وسط الحیٰوۃ: یہ شاعر کی بیس اور تیس سال کی عمر کے کلام کا مجموعہ ہے قصیدوں میں حضرت نظام الدین اولیاء، بلبن اعظم کے بیٹے اور شاعر کے سرپرست نصرت الدین سلطان محمد (مقتول ۶۸۳ھ) اور سلطان معز الدین کیقباد کی مدح کی ہے۔

۳۔ غرۃ الکمال: یہ شاعر کی تیس اور چالیس سالہ عمر کا کلام ہے۔ اس کے مقدمہ میں فارسی شعر کے محاسن گنائے ہیں اور عربی شعر پر اس کی فوقیت ثابت کی ہے اور ایران کے عظیم المرتبت شعرا، جیسے سنائی، خاقانی، سعدی اور نظامی کا نام لیا ہے۔ اس دیوان کے قصیدوں میں حضرت نظام الدین اولیاء، سلطان معز الدین کیقباد، جلال الدین فیروز شاہ (۶۸۹ - ۶۹۵) اور اس کے جانشینوں یعنی رکن الدین اور علاء الدین وغیرہ کی مدح کی ہے۔

یہ دیوان پچھلے دو دیوانوں سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں قصیدے، ترجیع بند اور قطعے ہیں۔

۴۔ بقیہ بقیہ: یہ شاعر کے بڑھاپے کا کلام ہے۔ اس کا ایک حصہ علاء الدین محمد شاہ (۶۹۵ - ۷۱۵) اور اس کے بیٹے اور دوسرے امیروں کی مدح میں ہے۔

۵۔ نہایۃ الکمال: یہ شاعر کی زندگی کے آخری دنوں کا کلام ہے۔ اس میں جتنے قصیدے ہیں وہ سلطان غیاث الدین تغلق (۷۲۰ - ۷۲۰) کی مدح میں ہیں۔ اس میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ (متوفی ۷۲۰) کا ایک مرثیہ بھی شامل ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ شاعر کے قصیدوں سے اس کی غزلیں زیادہ بہتر ہیں اور اس بارے میں جیساکہ اوپر ہم بتا چکے ہیں شاعر نے بڑے بڑے استادوں کی پیروی کی ہے۔

بعض اوقات امیر خسرو اپنے قصیدوں کی ابتدا نہایت دلنشین تغزل سے کرتے ہیں، مثلاً ان کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

صبا را گاہ آن آمد کہ راہِ بوستاں گیرد — زمیں را سبزہ در دیبا و گل در پرنیاں گیرد

جہد از چشمہ موج آب دلہ زاں در زمیں افتد — زند بر لالہ باد تند و آتش در زباں گیرد

زباں از گفتن آتش بسوزد لیکن از سوسن — حدیث لالہ گوید تر سم آتش در جہاں گیرد

تماشا کن کہ چوں بگرفت لالہ کوہ را دامن — کسی کو تیغ بے موجب کشد خونش چناں گیرد

نہ باد غنچہ مرغاں را نوا بستہ شود تا گل! — بسازد پردہ نو روز و بلبل خود ہماں گیرد

خاقانی کی طرح امیر خسرو نے بھی نہایت طول طویل قصیدے لکھے ہیں، ان میں سے ایک قصیدہ خاقانی اس قصیدے پر لکھا ہے جس کا مطلع ہے:

دل من پیر تعلیم است و من طفل زباں دانش

امیر خسرو کے قصیدے کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے

دلم طفلست و پیر عشق استاد زباں دانش — سواد لوحہ سبق و مسکنت گنج دبستانش

اس قصیدے میں شاعر نے تقوی اور اخلاقیات کے مضامین کے سوا صوفیانہ نکات بھی بیان کئے ہیں ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے:

مشو بینا بچشم سر کہ نارد دیدہ خود را ہم — بدل بین تا ببینی ہر چہ خواہی ماہ تابانش

امیر خسرو کی غزلیں غزل کی حد سے آگے نہیں بڑھی ہیں، اور ان کا موضوع بیشتر عاشقانہ مضامین ہی ہیں ان میں آرزوئے دیدار، ہجرانِ یار، نرگس بیمار، سوزش شمع وار، کے مضامین باندھے ہیں، یار کرشمہ ساز، زلف کمند انداز، سیل اشک، خدنگ نرگس مست، ابروئے چوگان اور کبک خوش گام وغیرہ سے بحث کی ہے، زہد خرقہ پوشان اور دیر در دنوشان کا آپس

میں مقابلہ کیا ہے، چشم زیبا اور اس کے احوال و اشکالِ فرواں کی خوب داد دی ہے۔
امیر خسرو حکیم نظامی سے خاص اعتقاد رکھتے تھے اور اس استاد کی تقلید میں خمسہ کہا ہے۔ ان کے خمسہ کو ذیل کے عنوان میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مطلع الانوار: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار کے جواب میں لکھی ہے۔ اس میں بیشتر دینی اور اخلاقی اشعار ہیں، یہ مثنوی ۶۹۸ھ میں اختتام کو پہنچی اور علاء الدین محمد شاہ کے نام معنون کی گئی۔

۲۔ شیریں و خسرو: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی خسرو شیریں کے مقابل لکھی ہے، اور یہ بھی ۶۹۸ھ میں اتمام کو پہنچی ہے۔ اس نظم کے آخر میں شاعر نے اپنے صاحبزادے مسعود سے خطاب کیا ہے اور اس مثنوی کو بھی علاء الدین محمد شاہ کے نام معنون کیا ہے۔

۳۔ مجنوں و لیلیٰ: یہ نظامی کی مثنوی لیلیٰ و مجنوں کے جواب میں لکھی گئی ہے اس کا سنہ تصنیف بھی متذکرہ بالا سال ہے اور اسی حکمران کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس مثنوی کا سب سے پُراثر حصہ وہ اشعار ہیں جن میں شاعر نے اپنی ماں اور اپنے بھائی کی وفات کا ماتم کیا ہے۔ اس کا مطلع ہے:

امسال دو نور ز اختر م رفت   ہم مادرم و ہم برادرم رفت

۴۔ آئینہ سکندری: یہ نظامی کے سکندر نامہ کا جواب ہے اور ۶۹۹ھ میں نظم ہوئی ہے اور یہ بھی علاء الدین کے نام معنون کی گئی ہے۔

۵۔ ہشت بہشت: یہ مثنوی نظامی کی مثنوی ہفت پیکر کا جواب ہے اور اس میں بہرام کی حکایت بیان کی گئی ہے۔ یہ مثنوی ۷۰۱ھ میں نظم ہوئی ہے اور اس کے خاتمہ پر شاعر نے بیان کیا ہے کہ پورا خمسہ تین سال کی مدت میں کہا گیا ہے اور اس زمانے کے ایک عالم و فاضل مولانا شہاب الدین نے ان کا مطالعہ کر کے ان کی تصحیح کی ہے۔

مذکورہ بالا تصانیف کے سوا امیر خسرو کی اور بھی تصانیف اور منظومات ہیں۔

جیسے قِرآن السعدین، نہ سپہر، مفتاح الفتوح۔ یہ سب کتابیں سلاطینِ ہند کے حالات اوران کے اوصاف پر لکھی گئی ہیں۔ یہ ادبی قیمت سے زیادہ تاریخی اہمیت کی حامل ہیں، منثور تصانیف میں ایک تصنیف خزائن الفتوح بھی تاریخ پر لکھی ہے۔ ہزل، مطائبہ تنقید اور شکوائی قصیدے پر بھی خسرو نے قلم اٹھایا ہے۔

امیر خسرو نے نہ صرف پچھلے قصے نظم کئے ہیں بلکہ اپنے زمانے کے قصے بھی نظم کئے ہیں .... چنانچہ اپنے ہم عصر اور ممدوح علاء الدین محمد کے بیٹے خضر خاں کی سرگذشت کو ایک نہایت پُر اثر انداز میں مثنوی خضر خاں دول رانی میں بیان کیا ہے۔ امیر خسرو موسیقی میں بھی استاد تھے، چنانچہ شعر و موسیقی کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا ہے:

پاسخش گفتم کہ من در ہر دو معنیٰ کاملم

امیر خسرو کو فنِ انشاء میں بھی درک حاصل تھا، چنانچہ اس موضوع پر انھوں نے رسائل الاعجاز[۱] کے نام سے ایک کتاب یادگار چھوڑی ہے۔

فی الجملہ امیر خسرو کو ہندوستان میں مقیم سب سے بڑا ایرانی شاعر کہا جا سکتا ہے ان کا امتیازی وصف کلام کی روانی ہے۔ وہ نظمِ سخن میں سرعتِ خیال اور جودتِ طبع کے حامل تھے۔ چنانچہ صرف خمسہ جس میں تقریباً آٹھ سو شعر ہیں صرف تین سال کی مدت میں نظم کیا ہے وہ ہندوستان کے دوسرے شاعروں کی طرح ایک خاص لحن اور ایک خاص لطافت رکھتے ہیں وہ بعض الفاظ اور ترکیبوں کے استعمال میں ایرانی شاعروں کے محلِ استعمال سے اتنے دور ہو گئے ہیں کہ اپنی طبیعت کی روانی، اعلیٰ ذوق اور اپنے ایجاد پسند ذہن رسا کے باوجود اپنے متقدا نظامی کے درجہ کو نہ پہنچ سکے۔

امیر خسرو نے ۷۲۵ھ بہ مقام دہلی وفات پائی۔

خواجوی کرمانی کمال الدین ابو العطاء محمود بن علی کرمانی متخلص بہ خواجو خود اپنے

---

[۱] صحیح نام غالباً اعجازِ خسروی ہے۔

قول کے مطابق یعنی مثنوی گل و نوروز کے ایک قلمی نسخہ کے ایک شعر کے مطابق ۱۵ شوال ۶۷۹ھ میں بہ مقام کرمان پیدا ہوئے۔ پہلے اپنے وطن ہی میں علوم و فضائل کی تحصیل کی، پھر سفر اختیار کیا، مختلف ملتوں اور مختلف گروہوں سے آشنائی پیدا کی اور دنیا اور اہل دنیا کو خوب آزمایا، خود کہتے ہیں:

من کہ گل از باغ فلک چیدہ ام چار حد ملک و ملک دیدہ ام!

اس سفر کے ضمن میں خواجو کی ملاقات اپنے زمانے کے ایک مشہور صوفی بزرگ علاء الدولہ سمنانی (متوفی ۷۳۶) سے ہوئی۔ خواجو نے ان سے کسب فیض کیا اور ان کے ارادت مندوں میں شامل ہوگئے، اپنے روحانی مرشد کے بارے میں کہتے ہیں:

ہر کو بہ رہ علی عمرانی شد چوں خضر بسر چشمہ حیوانی شد

از وسوسہ و غارت شیطاں وارست مانند علاء دولہ سمنانی شد

خواجو، سلطان ابو سعید بہادر (۷۱۶-۷۳۶) کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے اپنے قصائد میں اس سلطان کی اور اس کے وزیر غیاث الدین محمد کی مدح کی ہے اسی طرح خواجو نے آل منظفر کے بعض بادشاہوں کی مدح بھی کی ہے اور شیراز کے دوران قیام میں اس شہر کے تمام اکابر علماء اور فضلاء سے شناسائی پیدا کی تھی ان میں خواجہ حافظ بھی شامل تھے شیخ ابو اسحاق اینجو (۷۴۲-۷۵۸) نے خواجو کی سرپرستی کی اور خواجو نے اپنے قصیدوں میں اسکی مدح کی ہے۔

خواجو کے دوسرے ممدوحوں میں شمس الدین محمود صاین بھی تھا۔ یہ امیر پہلے چوپانی امرا کی خدمت میں منسلک تھا، پھر آل منظفر کے امیر مبارز الدین محمد (۷۱۳-۷۵۹) کی خدمت اختیار کرلی پھر شیخ ابو اسحاق اینجو کی ملازمت اختیار کی اور اس کی وزارت پر مامور کیا گیا۔ یہ امیر ۷۴۶ھ میں امیر مبارز الدین محمد کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔

خواجو کے دوسرے قصیدے عرفانی ہیں۔ یہ شاعر کے صوفیانہ ذوق و مشرب کا نمونہ ہیں اور سنائی کے قصائد کے ہم رتبہ ہیں۔

قصائد اور مدائح کے سوا خواجو نے نہایت دلکش غزلیں بھی لکھی ہیں۔ اس صنف میں انھوں نے شیخ سعدی کے سبک کی پیروی کی ہے۔ ان غزلوں میں شاعرانہ بلندی اور اپج پائی جاتی ہے اسی لئے وہ اپنے زمانے میں غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور رہے ہیں۔ اس عہد کے زبردست شاعر حافظ ان کے شعر پسند کرتے تھے۔ حافظ نے ان کی پیروی بھی کی ہے، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما ـ دارد سخن حافظ طرز سخن خواجوی

یہ واقعہ ہے کہ ایک طرف خواجو کی غزل سنائی، شیخ عطار اور مولانا روم سے اور دوسری طرف حافظ سے مشابہ ہے۔ مثلاً ذیل کی غزل ان پچھلے شاعروں کی یاد تازہ کر دیتی ہے:

بانوائی خویش را در بی نوائی یافتیم ـ فخر بر شاہان عالم در گدائی یافتیم

زآشنائی بیگانہ گشتیم از جہان و جان علیل ـ در جوار قرب جاناں آشنائی یافتیم

سالہا بانگ گدائی بر دل لہا زدیم ـ لاجرم بر بادشاہان پادشائی یافتیم

ای بساشب کاندریں وادی بروز آوردیم ـ تا کنوں از صبح وصلش روشنائی یافتیم

چوں ازآں ظلمت ازیں خاکداں بیروں شدیم ـ ہر دو عالم روشن از نور خدائی یافتیم

خواجو کی ایسی غزلیں بھی ہیں جو حافظ کی طرز کی یاد دلاتی ہیں۔ ذیل میں ایک ایسی ہی غزل نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہے:

پیش صاحب نظراں ملک سلیمان بادست ـ بلکہ آنست سلیمان کہ زملک آزادست

آنکہ گویند کہ برآب نہادست جہاں ! ـ مشنوای خواجہ کہ تا در نگری بر بادست

ہمچو نرگس بگشا چشم و ببیں کاندر خاک ـ چند روی چو گل و قامت چوں شمشادست

خیمہ انس مزن بر در ایں کہنہ رباط ـ کہ اساسش ہمہ بی موقع و بی بنیادست

ہر زماں مہر فلک بر دگری می تابد ! ـ چہ تواں کرد کہ ایں شعلہ چنیں افتادست

دیوان اشعار کے سوا خواجو نے استاد نظامی کی طرز پر مثنویاں بھی لکھی ہیں اور

خمسہ کی تکمیل کی ہے۔ ان کے خمسہ کی مثنویوں کے نام یہ ہیں :

۱۔ ہمای وہمایوں : یہ عاشقانہ داستان ہے، بحر تقارب میں کہی گئی ہے اور ذیل کے شعر سے شروع ہوتی ہے :

بنام خداوند بالا و پست   کہ از ہستیش ہست شد ہر چہ ہست

یہ مثنوی بہ مقام بغداد ۷۳۲ھ میں ختم ہوئی اور شاعر نے اس کے مقدمہ میں سلطان ابوسعید اور اس کے وزیر غیاث الدین محمد (مقتول ۷۳۶ھ) کی مدح کی ہے۔ شاعر نے اس مثنوی کی تالیف کی تاریخ حرف "بذل" سے نکالی ہے۔ کہتے ہیں :

کنم بذل بر ہر کہ دارد ہوی   کہ تاریخ آں نامہ بذل است وبس

اس مثنوی میں نظامی کے اثر کے سوا شاہنامہ کا سبک بھی نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے

۲۔ گل و نوروز : یہ مثنوی بھی عاشقانہ ہے۔ یہ نظامی کی مثنوی خسرو شیریں کے وزن پر لکھی گئی ہے اور بے شبہ یہی خواجو کی بہترین مثنوی ہے۔ اس مثنوی کا پہلا شعر ہے :

بنام نقش بند صفحۂ خاک   عذار افروز مہرویان افلاک

یہ مثنوی تاج الدین عراقی (اس کا ذکر پیچھے آچکا ہے) کے نام معنون کی گئی ہے اور ۷۴۲ھ میں اختتام کو پہنچی ہے۔ کہتے ہیں :

دو شش بر ہفت صد و سی گشتہ افزوں   بپایان آمد ایں نظم ہمایوں !

۳۔ کمال نامہ : یہ عرفانی مثنوی ہے ہفت پیکر کے مقابل، اس کا آغاز ہوتا ہے :

بسم من لا الٰہ الا اللہ

اس مثنوی کی ابتدا میں شاعر نے پیردان طریقت اور مراحل معرفت سے بحث کی ہے اور اسے ابو اسحاق اینجو کے نام معنون کیا ہے۔ اس مثنوی کے نظم کی تاریخ کہی ہے :

شد بتاریخ ہفت صد و چل و چار   کار ایں نقش آذری چو نگار !

یہاں چند ایسے شعر نقل کیے جاتے ہیں جن کی روح عرفانی ہے اور ان میں چشم ظاہر

کو بند کرنے، باطنی بصیرت اور معنوی صفات کے کسب کرنے کے مضامین باندھے گئے ہیں:

ای خوشا بر میان کمر بستن — دیدہ بگشودن و نظر بستن
دست شستن ز جام و مست شدن — سر بر آوردن و ز دست شدن
بی زبان حال دوستان گفتن — دست نگشادن و سمن دیدن
بی قدم سوی بوستان رفتن! — چشم در بستن و چمن دیدن
پای ننہادہ در جہاں گشتن — آمدہ ظاہر و نہاں گشتن
ترک خود کردن و خدا جستن — مہر پروردن و وفا جستن
زندگی یافت آں کہ جاں در باخت — از برای دلی رواں در باخت
ہر کہ جاں بازنیست جانش نیست — آں کہ ایں در نیافت آنش نیست

۴۔ روضۃ الانوار: خواجو نے یہ مثنوی نظامی کی مخزن الاسرار کے جواب میں لکھی اور اسے شیخ ابو اسحاق کے وزیر شمس الدین محمود صاین کے نام معنون کیا ہے۔

روضۃ الانوار کی نظم کی تاریخ ۷۴۳ھ ہے، جیساکہ شاعر نے اس شعر میں

جیم زیادت شدہ بر میم و دال

اس تاریخ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ روضۃ الانوار میں بیس مقالے ہیں یہ مخزن الاسرار کی طرز پر لکھی گئی ہے اور اس میں عرفانی، دینی اور اخلاقی حکایتیں نظم کی ہیں۔

شاعر نے نظامی سے اپنی نسبت اور مخزن الاسرار کے بارے میں لکھا ہے:

گرچہ سخن پرور نامی توئی — معتقد نظم نظامی توئی!
در گذر از مخزن اسرار او — بر گذر از جدول و پرگار او
خازن مخزن دل دانای تست — محرم اسرار خرد رای تست

پہلا مقالہ حقیقت سخن پر لکھا ہے اور اس کے ضمن میں کہتے ہیں:

عقل کہ اقلیم سعادت گشود! — بر در دل چشم فراست گشود

شد بسخن تیغ زباں درفشاں   گشت سخن گوہر تیغ زبان

جان نگر از دل بزبان آمدہ   واب حیات از لب جان آمدہ

دوسرا مقالہ مقامات اولیاء پر لکھا ہے۔ اس میں اولیاء کے صفات کے بارے میں کہتے ہیں:

ہم رہ و ہم رہرو و ہم رہبرند   ہم می و ہم ساقی و ہم ساغرند

روی دل از کون و مکاں تافتہ   وز در دل نقد رواں یافتہ

راہبر خلق جہاں آمدہ   وز نظر خلق نہاں آمدہ

تیسرا مقالہ مراتب انسانی کے کمال پر لکھا ہے، اس میں انسان کے بلند مقام کے بارے میں کہتے ہیں:

ای بخرد ناظر نہ بارگاہ   وی بنظر مشرف تنش گامگاہ

گلبن جاں خوش نظر باغ تو   لالہ دل سوختہ داغ تو

ہیکل دل در برت افگندہ اند   شور خرد در سرت افگندہ اند

چوتھا مقالہ تنبیہ و تہدید پر ہے، اس میں فرماتے ہیں:

دم نگشا تا بکی این بستگی   گرم در آ تا بکی آہستگی

جہد بکن تو کہ بمنزل رسی   در نشوی غرقہ بساحل رسی

پادشہی پاس فقیران بدار   پیر نہ ای عزت پیراں بدار

گل نگر از خار بچشم آیدت   رنج کن از آنکہ شفا بایدت

مردمک دیدہ شو و خود مبین   نیک نظر باز کن و بد مبین

پانچواں مقالہ انقلاب امور پر لکھا ہے، اس میں یہ اشعار آئے ہیں:

چند شوی ای دل سودا پرست   از می نوشین ہوی نیمہ مست

خواب زحد رفت تو مست و خراب   وقت بیامد کہ در آئی ز خواب۔

دست خوش فکر سبکسر مباش   پی سپر وہم گراں سر مباش

چھٹا مقالہ بھی عقل و خرد، انتباہ اور انسان شناسی پر لکھا ہے، فرماتے ہیں:

ای کہ دم از نہ پیر خرد می زنی — شرط خرد نیست کہ خود می زنی
راہ خرد گیر وز خود درگذر! — زآنکہ بخود راہ نیابد بشر
آتش طبیعت ز چراغ دلست — وآب روان تو ز داغ دلست

ساتواں مقالہ نفس متکلم کے احوال پر ہے اور اس میں حق کے ساتھ حقیقتِ نفس کے اتحاد کے بارے میں فرماتے ہیں:

نیست درایں خانہ بروں از تو کس — بوی تو یا بیم درایں کوی و بس
گر تو نئی یار بگو یار کہ — جز تو درایں دایرہ دیار کو
غیر تو کس رہ نبرد سوی تو — ای دو جہان آینہ روی تو

آٹھواں مقالہ آیت عشق کی شرح پر ہے، اس میں کہتے ہیں:

ایدل اگر اہل دلی جاں بباز — ہر دو جہاں در رہ جاناں بباز
دست بشوی از قدح و مست باش — محو شو از نیستی و ہست باش
زندہ بجاناں شو و از جاں بمیر — جان بدہ و دامن جاناں مگیر

نواں مقالہ عالم ظاہر سے اعراض اور رجوع بباطن پر ہے۔ اس باب میں کہتے ہیں:

از تو غریبست کہ چوں مرغ کور — ساختہ برلب ایں آب شور
حیف بود رخت تو دیں رختگاہ — زشت بود تخت تو دیں تختگاہ
بار تو در بارگہی دیگر است — کار تو در کارگہی دیگر است

دسواں مقالہ صفت پیری اور غنیمت جوانی پر ہے اور اس میں یہ شعر آئے ہیں:

مست شو و بادہ پرستی مکن — ترک بلندی کن و پستی مکن
شادی او خور کہ غم ناں نخورد — دل بکسی دہ کہ غم جاں نخورد
ہمدم او باش کہ ہمدم نیافت — مونس غم خوار بجز غم نیافت

گیارھواں مقالہ مادہ پرستی اور شہوت شعاری پر ہے۔ اس میں کہتے ہیں:

هر که رخ از جان جهان برنتافت
در ره دل گم شد و خود را نیافت

کعبهٔ دل در حرم بی خودیست
پیک روانرا قدم سرمدیست

هر که جهان داد درین ره بباد
خاتم جمشید بدستش فتاد

بارھواں مقالہ عقل وحیاء پر ہے:

عقل و حیا جان و دل آدمند
مشعله افروز ره آدمند

نفحه گل دستهٔ روحانیند
فاتحه باب مسلمانیند

آن چه بود مرهم آزار تو
وین چه بود شحنه بازار تو

تیرھواں مقالہ کبر کی مذمت پر ہے:

ای شده مغرور باقبال و جاه
چند کنی تکیه بر ایوان گاه

سر چه فرازی بسریر بلند
زانکه سریرت همه دارست و بند

گر تو فرامرز تهمتن تنی
بفکندت چرخ بروئین تنی

چودھواں مقالہ جود وسخا کی ستائش پر ہے یہ چند شعر اسی مقالہ کا نمونہ ہیں:

ایکه دم از جود و کرم می زنی
چون کرمت نیست چه دم می زنی

مایه توفیق کرم کردنست
گنج یقین ترک درم کردنست

باده پرستان که درین خانه اند
بی خبر از باده و پیمانه اند

پندرھواں مقالہ عالم وحدت کی صفت پر ہے۔ اس مقالے سے یہ چند شعر نمو
کے طور پر نقل کئے جاتے ہیں:

هر که ز طوفان بلا رخ نتافت
آب رخ نوح پیمبر بیافت

هر که درین ره شد و خود را ندید
راه بدر برده بمنزل رسید

وانکه در خانه کثرت ببست
در حرم کعبه وحدت نشست

راہِ طریقت زشریعت بجوی　　دستِ حقیقت ز طریقت بشوی

سولھواں مقالہ تصفیۂ خاطر پر لکھا ہے اور اس کے ضمن میں کہتے ہیں :

بگذر ازین چشم کدورت نمای　　چشمہ مصفا کن و صافی برای
صیقلی آیینہ روح باشش　　داروی درد دل مجروح باش
دست برافشان دز جان درگذر　　وز سرہمت ز جہان درگذر

سترھواں مقالہ صفت غرور پر لکھا ہے، اس میں کہتے ہیں :

زنگ تصوف نہ بصوفست و بس　　صوفی ازین زنگ ندیدست کس
صاف برای ہمہ صوف از کجاست　　کار نگرد و لصیف و صوف راست
جامہ ازرق چہ واین زرق چیست　　ہمچو تو در بحر ریا غرق نیست

اٹھارھواں مقالہ صفت آفرینش پر ہے۔ اس میں کہتے ہیں :

واجب مطلق چو وجود آفرید　　وز عدم آورد جہاں را پدید
سنبلِ جاں را بخرد تاب داد　　گلشنِ دل را ز جگر آب داد
اطلسِ افلاک گہر دور کرد　　گوہرِ سیارہ شب افروز کرد

انیسواں مقالہ صفت توحید موحد پر ہے۔ اس میں کہتے ہیں :

آنکہ قدم در رہِ توحید زد　　کوس قدم در رہِ تجرید زد
باطنِ او صورتِ ظاہر گرفت　　داول او گونہ آخر گرفت
علمِ ازل خواند ز لوح ابد!　　عالم جان دید بچشمِ خرد

بیسواں مقالہ صفتِ انسان پر ہے۔ اس میں کہتے ہیں :

ایکہ دم از ملک معانی زنی!　　نوبت ما اعظم شانی زنی
سر ز گریبان طریقت بدار　　روی بایوان حقیقت درار
درگذر از روضہ رضوان نگر　　برگذر از حجت و برہان نگر

چون رود از عشق حقیقی سخن   باز دم از عشق مجازی مزن

ان چند مثالوں سے خواجو کے ذوقِ عرفانی اور افکارِ روحانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور عارفانہ مثنوی کے میدان میں نظامی، شیخ عطار اور مولانا روم کی پیروی صاف ظاہر ہے۔

۵۔ گوہر نامہ: یہ خسرو شیریں کے جواب میں لکھی گئی ہے اس کا موضوع اخلاق و تصوف ہے۔ اس کے مقدمہ میں خواجو نے امیر مبارز الدین محمد مظفر فاتح کرمان اور اس کے وزیر بہاء الدین محمود کی مدح کی ہے۔ یہ بہاء الدین محمود وہی ہے جس کا سلسلۂ نسب چھے واسطوں سے خواجہ نظام الدین طوسی سے جا ملتا ہے۔ اس مثنوی کا مطلع ہے:

بنام نامِ دارِ نامداران!   گدای درگہِ او شہریاران

خواجو نے ۷۵۳ھ میں وفات پائی۔

ابن یمین امیر محمود بن امیر یمین الدین طغرائی ۶۸۵ھ کے قریب قصبۂ فریومد میں جو خراسان کی ولایت جوین میں واقع ہے، پیدا ہوئے۔

امیر محمود کے والد امیر یمین الدین طغرائی خود بھی شاعر تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ شعر میں مراسلت کرتے تھے۔ سلطان ابو سعید بہادر کی طرف سے خراسان پر خواجہ علاء الدین محمد مستوفی (والی) مقرر کیا گیا تھا۔ طغرائی اُسی کی دیوانی کے عہدے پر فائز تھے۔ ایران کے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جسے ابن یمین کی طرح اتنے انقلاباتِ زمانہ سے گذرنا، حوادثِ دوران سے دوچار ہونا اور ملک ملک اور در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑی ہوں۔ ابو سعید کی وفات اور خراسان میں سربداریوں، ہرات میں آلِ کرت، گرگان میں طغا تیموریوں کے ظہور، ان کی اور دوسرے امیروں اور سرداروں کی آپس کی لڑائیوں اور شورشوں کی وجہ سے ایران کا ایک بڑا حصہ اور نواحِ خراسان خاص طور پر قتل و غارت گری اور تباہ کاریوں کا شکار بنے رہے۔ ابن یمین کو ان تمام حادثوں سے دوچار ہونا پڑا اور وہ ایک دربار سے دوسرے دربار میں پناہ ڈھونڈتا پھرتا رہا۔

ابتدا میں ابن یمین مذکورہ خواجہ علاء الدین محمد اور بعد میں اس کے بھائی خواجہ غیاث الدین ہندو کی مدح کرتا رہا۔ سربداریوں کے ظہور کے بعد وہ علاء الدین کے ساتھ گرگان چلا گیا اور ان ولایتوں کے حکمران طغا تیمور کی مدح کی۔ اس کے بعد وہ خراسان گیا اور سربداری امراء میں خاص کر وجیہ الدین مسعود کی اپنے قصیدوں میں مدح کی۔ اس کے بعد وہ ہرات گیا اور امرائے آل کرت کی مدح کی اور خاص طور پر معز الدین کے اکرام و انعام کا مورد بنا رہا۔

اس شاعر کی زندگی کا ایک اہم حادثہ یہ ہے کہ ۷۴۳ھ میں امیر وجیہ الدین مسعود سربداری (۷۳۸ - ۷۴۴) اور ملک معز الدین حسن کرت (۷۳۲ - ۷۷۱ھ) کے درمیان خاف کے قریب زاوہ میں جو جنگ ہوئی اس میں شاعر کے اشعار کا دیوان گم ہو گیا اور خود اسے گرفتار کر کے ہرات لایا گیا۔ لیکن یہاں امیر حسین کے حکم پر اسے رہا کیا گیا۔ اس امیر نے اس سے بڑی مہربانی اور لطف و کرم کا برتاؤ کیا۔ بظاہر یہ اشعار اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

گر بدستاں بستد از دستم فلک دیوان من | شکر ایزد کانک او می ساخت دیوان با منست
ور ربود از من زمانہ سلک دُرِ شاہوار | زآن چہ غم دارم چو طبع خاطر افشاں با منست
ور ز شاخِ گلبن فضلم گلی بر بود باد! | گلشنی پر لالہ و نسرین و ریحان با منست

شاعر کی عمر کا آخری زمانہ اپنی زادگاہ فریومد میں بسر ہوا۔ اس نے ۷۶۹ھ میں وفات پائی اور اپنے باپ کے مقبرہ میں دفن ہوا۔

ابن یمین علمی فضائل اور بڑے اچھے اخلاق کا حامل تھا، نہایت متقی اور پرہیزگار تھا، خود کہتا ہے:

من اندر کسب اسباب فضائل | نکردم ہیچ تقصیر و توانی
ہنر پروردہ ام زینساں کہ بینی | بیا انکار کن گر میتوانی!

شاعر نے اپنے واقعات اور مختلف تجربوں کو نہایت پُرمعنی قطعات میں نظم کیا ہے

ان کے سوا اس کے قصیدے بھی ہیں جو بادشاہوں کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ اخلاقی اور اجتماعی مسائل پر قطعے لکھے اور بہترین غزلیں بھی اس کی یادگار باقی ہیں۔ اس کے اشعار کا مجموعہ پندرہ ہزار.. کے قریب پہنچتا ہے۔

ابن یمین کے قطعات کی نظیر ایرانی ادب میں بہت کم ملتی ہے ان قطعات میں شاعر نے سعی وعمل، اپنے دست وبازو اور اپنے عرقِ جبین سے روزی کمانے کی ستائش کی ہے اور مستقل مزاجی کی تشویش وتحریص دلائی ہے۔ وہ خود بھی زمین اور جائداد رکھتا تھا۔ ہنگامے فرو ہونے کے بعد اس نے اپنی جائداد بیچی اور زمین داری اور زراعت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ جو کچھ اس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آخری عمر میں اس نے دنیا اور دنیا والوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ حتیٰ کہ اپنے دوستوں سے تک دور ہو گیا تھا، چنانچہ خود کہتا ہے:

گوشہ ای گیر وکناری زہمہ خلق جہاں   تامیاں تو وغیری نبود داد وستد

زانکہ باہر کہ ترا داد وستد پیدا شد   گفتہ آید ہمہ نوع سخن از نیک وزبد

بگذر از صحبت ہمدم کہ ترا ہست دلی   ہمچو آئینہ وآئینہ زدم تیرہ شود

ابن یمین شیعی مذہب کا پیرو تھا اور صوفیانہ ذوق رکھتا تھا۔ اس ذوق کے مطابق اس نے اشعار کہے ہیں اور ان قدیم ترین شاعروں میں اس کا شمار ہوتا ہے جنھوں نے تصریح کے ساتھ ائمہ اور شہیدانِ کربلا کا ذکر کیا ہے یہ واقعہ ہے کہ ابن یمین کو اول تو قطعہ میں، پھر قصیدہ اور غزل میں کمال حاصل تھا۔ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے کہ فنِ شاعری کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی اسے درک حاصل تھا:

خداوندا مرا در علم منقول   زبان ودیدہ گویا گشت وبینا

بمعقولات نیزم دسترس ہست   اگرچہ نیستم چوں ابن سینا

ابن یمین کا شمار نامی ترین قطعہ گو شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے یہ فن

اس قدر مورد توجہ نہ تھا۔ شاعر نے ہر قطعہ میں فکر و نظر کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً خسّت، مال پرستی اور دنیا گیری کی برائی کی ہے تملق اور ناکسوں کے آگے مداہنت کو برا ٹھیرایا ہے۔ نیکی، شرافت اور اصالت کی مدح کی ہے بد اصل، دون ہمت اور رذیل طبیعت لوگوں کی مذمت کی ہے جتنی کہ ایسے لوگوں سے تعلق رکھنے کی بہ نسبت تجرد اور مردم گریزی کو ترجیح دی ہے اس کی نظر میں روزی مقسوم و مقدر کر دی گئی ہے اور پانی کے ایک گھونٹ اور روٹی کے ایک لقمہ کے لیے ناکسوں کی منت نہیں کرنی چاہیے۔ اس سلسلہ میں وہ ہمیں کوشش عمل، بردباری اور قناعت کی دعوت دیتا ہے عام طور پر وہ اپنے قطعات میں عقل کی تعریف کرتا ہے، امور میں اسے قاضی قرار دیتا ہے اور لوگوں کو اسی سے رجوع کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعض قطعوں سے تقدیر کی قدرت، ستاروں کی تاثیر اور انسان کا عجز ظاہر ہوتا ہے پھر بھی وہ ہمت اور عزم داراد ے کی تحریص دلانے سے باز نہیں رہتا۔ حد یہ کہ بے چارگی کے مواقع پر بھی خود داری اور بے باکی کی تشویق دلاتا ہے:

روزی دوگر بود بتو ایام بدکنش ہم عاقبت نکو شود ار باشدت حیات
تا زندہ ای مدار از احداث دہر باک بیر دل زمرگ سہل بود جملہ حادثات

ایک قطعہ میں کہتا ہے کہ مرد وہی ہے جو عین احتیاج و زبونی میں ہمت و توانائی سے کام لے:

بگاہ فقر تو انگر نمائی ہمت باش کہ گرچہ ہیچ نداری بزرگ دارندت
نہ آں کہ باہمہ ہستی شوی خسیس مزاج شوی اگرچہ تو قارون گدا شمارندت

نادار مگر باہمت مرد صاحب مال و دولت مگر بے ہمت مرد سے کہیں ارجمند تر و عزیز تر ہے۔

اصولی اور بنیادی طور پر جاہ و دولت دانش و حکمت کے مقابلہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی۔ مال سے کمال بہتر ہے کیونکہ کمال سے کام لیجئے تو ہمیشہ اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور

مال کو استعمال کیجیے تو اس میں ہمیشہ کمی ہی ہوتی جاتی ہے:

حالتِ مال و علم اگر خواہی! | کہ بدانی کہ ہر یکی چونست
مال دارد چو بدر روی بکاست | علم چون ماہ نو در افزونست

اگر کوئی مالدار ہو بھی تو اُسے چاہیئے اس مال کے ذریعہ لوگوں کے حق میں نیکی کرے اور جہاں تک ہو سکے بخشش سے کام لے ورنہ مال جمع کرنے اور چھوڑ جانے سے کیا حاصل:

سود دنیا و دین اگر خواہی | مایہ ہر دوشان نکو کاریست
گر در خلد را کلیدی ہست | بیش بخشیدن و کم آزاریست

مردانگی کی شرطِ اول یہ ہے کہ انسان دوسروں کو آزار نہ دے، اس کے بعد کسبِ ہنر کرے، ورنہ درہم و دینار سخت دل اور دل آزار آدمی کے ہاتھ میں ہوں تو کچھ فائدہ نہیں ہوتا:

ہنر بباید و مردی و مردمی و خرد | بزرگ زادہ نہ آنست کہ درم دارد
زمال و جاہ ندارد تمتعی ہرگز | کسیکہ بازوی ظلم و سر ستم دارد
خوشا کسی کہ از و ہیچ بد بکس نرسد | غلام ہمت آنم کہ این قدم دارد

خود پسندی، غرور اور دوسروں کو حقیر سمجھنا ابلہی ہے:

مرد باید کہ ہر کجا باشد | عزت خویش را نگہ دارد
خود پسندی و ابلہی نکند | ہر چہ کبر و منیت بگذارد
ہمہ کس را ز خویش بہ داند | ہیچ کس را حقیر نشمارد

ابن یمین کے بعض قطعات عرفانی ہیں اور ان میں ایمانی نکات بیان کئے گئے ہیں۔ ایسا ہی ذیل کا قطعہ ہے۔ اس میں عرفانی ذوق کے مطابق روحانی ترقی کے مراحل اور مقام وحدت تک رسائی کی منزلیں بیان کی گئی ہیں:

زدم از کتم عدم خیمہ بہ صحرای وجود | وز جمادی بنباتی تسفری کردم و رفت (ورفت)
بعد از نیم کشش طبع بحیوانی بود | چوں رسیدم بوی از وی گذری کردم

یا ملایک پس ازاں صومعہ قدسی را — گرد برگشتم و نیکو نظری کردم و رفت

بعد ازاں در صدف سینہ انسان بصفا — قطرۂ ہستی خود را گہری کردم و رفت

بعد ازاں رہ سوی او بردم و بی ابن یمین — ہمہ او گشتم و ترک دگری کردم و رفت

ابن یمین نے اپنے قطعات میں بعض مشہور مثالوں کو پیش کیا اور ان سے تمثل کیا ہے،

مثلاً ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو:

دشمن خود را حقیر مدار — خواہ بیگانہ گیر و خواہی خویش

زانکہ چوں آفتاب مشہور است — انچہ گفتند زیرکان زیں پیش

کہ ز رمح دراز قد ناید — انچہ سوزن کند بہ پستی خویش

ابن یمین کے بعض قطعات میں مطائبات کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ان قطعات میں شاعر نے مطالب کو ہزل کے رنگ میں ادا کیا ہے۔ اس کے سوا بعض قطعات میں اس نے مشہور شعرا، جیسے فردوسی عنصری، انوری، معزی، سعدی اور مجیر وغیرہ کا نام لیا ہے اور ان سے تمثل کیا ہے۔ خاص کر حکیم طوسی کے بارے میں حد درجہ عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے:

سکہ ای کاندر سخن فردوسی طوسی نشاند — کافرم گر ہیچ کس از زمرہ فرسی نشاند

اول از بالای کرسی بر زمین آمد سخن! — او سخن را باز بالا برد و بر کرسی نشاند

حق ناشناسی کی شکایت اور اہل وطن کی ستم رانی کا ذکر کرتے ہوئے سعدی سے تمثل کیا ہے:

چہ کنم ملک خراسان چہ کنم محنت جان — وقت آنست کہ پرسی خبر از بغدادم

گرچہ ایں مولد و منشاست ولی سعدی گفت — "نتوان مرد بسختی کہ من ایں جا زادم"

سعی و کوشش کی ترغیب دلاتے ہوئے معزی سے یوں استشہاد کرتا ہے:

اگرچہ رزق مقسوم ست می جوی — کہ خوش فرمود ایں معنی معزی

کہ ایزد رزق اگر بی سعی دادی — بمریم کہ ندا کردی کہ ہزی[1]

---

[1] اشارہ ہے آیت شریف کی طرف "ھزی الیک بجذع النخلۃ"

بعض قطعات شاعر کی ادبی اور فلسفیانہ معلومات پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے قطعہ میں الفاظ کے آخر میں آنے والے دال یا ذال کے تلفظ کا قاعدہ بیان کیا ہے:

تعیین دال و ذال کہ در مفردی فتد ۔۔۔ زالفاظ فارسی بشنو زانکہ مبہمست
حرف صحیح ساکن اگر پیش او بود ۔۔۔ دالست ورنہ ہرچہ جز این ذال معجمست

اس قطعہ میں مقولات عشرہ بیان کئے ہیں:

ہرچہ موجودست آن را یافتند ۔۔۔ اہل حکمت منحصر در دہ مقال
جوہر و کیف و کم واین و متی ۔۔۔ وضع و ملک و نسبت و فعل انفعال
وانچہ خارج زین مقولات او فتد ۔۔۔ تنگ بینم عقل را در وی مجال
پس ہران موجود کاندر وی خرد ۔۔۔ ہست حیران نیست الا ذو الجلال

ابن یمین کے بعض قطعات بزرگوں کے مرثیہ اور تاریخ وفات پر ہیں اور غالباً اس مضمون کے بعض قطعات جن میں بعد میں مادۂ تاریخ بھی نکالا گیا ہے، ابن یمین ہی کے قطعات ہوں گے۔

سلمان ساوجی خواجہ جمال الدین سلمان ابن خواجہ علاء الدین محمد جو سلمان کے نام سے مشہور ہے آٹھویں صدی ہجری کی ابتدا میں بمقام ساوہ پیدا ہوا۔ اس کے باپ علاء الدین کا شمار علماء میں کیا جاتا تھا اور دیوانی کا پیشہ کرتا تھا۔ سلمان نے پہلے علوم متداولہ کی تکمیل کی پھر شاعری شروع کی لیکن اس کی شاعری صرف اپنے شاعرانہ ذوق پر ہی مبنی نہ تھی۔ ابتدائی عمر میں اس نے سلطان ابو سعید بہادر (۷۱۶-۷۳۶) کے وزیر خواجہ غیاث الدین محمد کی اپنے قصیدوں میں مدح کی۔ اس وزیر کی وفات کے بعد اس نے جلایریوں کے دربار سے انتساب حاصل کیا۔ یہ جلایری یا ایلکانی سلاطین ایران کے مغربی علاقے اور عراق عرب پر حکومت کرتے تھے۔ سلمان نے اس خاندان کے بانی شیخ حسن بزرگ (۷۳۶-۷۵۷) اور اس کی منکوحہ اور سلطان ابو سعید کی سابق زوجہ دلشاد خاتون

اور خاص کر شیخ حسن کے بیٹے یعنی سلطان اویس (۷۵۷ - ۷۷۶) اور اس کے بعد سلطان حسین (۷۷۶ - ۷۸۴) کی مدح کی۔ اسی طرح چالیس سال کی مدت تک سفر و حضر، تبریز اور بغداد میں اس خانوادہ کی مداحی کرتا رہا۔ جب آل مظفر کے دوسرے حکمران شاہ شجاع (۷۶۰ - ۷۸۶) نے ۷۷۶ھ میں تبریز کو جلایریوں کے قبضہ سے چھین لیا تو اس وقت ہمارا شاعر اسی شہر میں موجود تھا۔ اس نے شاہ شجاع کی مدح کی اس لحاظ سے سلمان کے قصیدوں میں تاریخی اشارے بھی ملتے ہیں، جو کافی فائدہ مند ہیں۔

شاعر کے دیوان میں مذہبی قصیدے بھی ہیں جیسے حمد خدا، نعت رسول اور منقبت ائمہ اور اس آخری چیز یعنی حضرت علی کی مدح میں ایسے زوردار قصیدے لکھے کہ اس کے زمانے تک ایسے قصیدے لکھنے کا معمول نہ تھا۔

سلمان بھی خواجو کی طرح مختلف خاندانوں اور امیروں کی سیاسی کشمکش کا شکار رہا اور نتیجۃً ہنگامے، لڑائیاں اور بڑی بڑی جنگیں دیکھیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی اس نے جلایریوں کے سایۂ حمایت اور سرپرستی میں خوش حال زندگی بسر کی اور کافی جائیداد اور املاک بھی پیدا کر لی۔

سلمان درجہ اول کا قصیدہ گو شاعر ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ صفویوں کے عہد سے پہلے کے ایران کا آخری بڑا قصیدہ گو شاعر ہے۔ کیونکہ اپنی ذاتی استعداد اور صلاحیت کے سوا اس نے متقدمین کے سبک اور خاص کر کمال الدین اسماعیل، ظہیر اور انوری کے سبک کا خوب تتبع کیا ہے حتیٰ کہ وہ منوچہری تک اپنے پیش نظر رکھتا تھا۔ مثلاً یہ قصیدہ:

سقی اللہ لیلۃ کصدغ الکواعب　　شبی عنبرین خال و مشکین ذوایب

اور اسی طرح ایک اور قصیدہ:

تا باد خزان رنگرز رنگ رزانست　　گوئی کہ چمن کارگہ رنگرزانست

منوچہری کے رنگ میں کہا گیا ہے ایک اور قصیدہ ہے:

ہر کرا بخت ہم عنان باشد　　در رکاب خدایگان باشد

اس میں انوری کی پیروی کی ہے۔ ایک قصیدہ ہے:

در درج در عقیق لبت نقد جاں نہاد

اس میں ظہیر کے اس قصیدے کو پیش نظر رکھا ہے جس کا مطلع ہے:

تا غمزۂ تو تیر جفا در کماں نہاد

ایک اور قصیدہ ہے:

زہی نہال قدرت سرو جویبار رواں

اس میں کمال الدین کے قصیدہ کی پیروی کی ہے جس کا مطلع ہے:

زہی کشیدہ جلال تو بر فلک دامن

تغزل، تشبیب اور غزل میں بھی سلمان کا درجہ بلند ہے ان سب میں اس نے بڑی استادی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی لحاظ سے حافظ نے اس کی طرف خاص توجہ کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خواجۂ شیراز نے اپنی بہت سی غزلیں اس کی پیروی میں لکھی ہیں۔

یہاں سلمان کے اس قصیدے کی تشبیب کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں جو اس نے سلطان اویس کی مدح میں لکھا تھا:

باد نوروز از کجا ایں بوی جاں می آورد — جان من پی تا بگوی دلستاں می آورد
جنبشی در خاک پیدا می شود ز انفاس باد — باد گوئی از دم عیسیٰ نشاں می آورد
گل نہ بر لب نمی دانم چہ می گوید کہ باز — بلبلان بی نوا را در فغاں می آورد
غنچہ را در دل بسی معنی نازک جمع بود — بلبل اکنوں زاں معانی در بیاں می آورد
غنچہ وقتی خردہ در خرقہ پنہاں کردہ بود — گل کنوں آں خرقہ ہا را درمیاں می آورد
گل صبوحی کردہ پنداری کہ پیش از آفتاب — باغباں گل را بدوش از بوستاں می آورد
کوہ خارا پوش کس یاقوت می بندد مگر — باز سر در حلہ از پرنیاں می آورد
در جہاں ہر جا کہ آزادیست چوں سرو سہی — منزل اکنوں بر لب آب رواں می آورد

وہ چہ خوش میایدم در وقت رقصیدن کہ سرو　　دست ہا بر دوش بید وار غوان می آورد

ان چند شعروں کے مطالعہ اور شعرائے پیشین کے تغزل آمیز اشعار سے ان کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلمان کے پاس مضامین تازہ اور تشبیہات نو کی کمی نہیں اور اس کی اس خصوصیت نے اس کے اشعار کو ایک خاص رتبہ عطا کیا ہے۔

ذیل کی غزل عطار، سنائی اور مولانا روم کی غزل سرائی کی یاد تازہ کر دیتی ہے:

باز بہ زنجیر زلف یار مرا می کشد　　در پی ادمی روم تا بکجا می کشد

نام ہمہ عاشقاں در ورق لطف اوست　　گر قلمی می کشد بر سر ما می کشد

ہر چہ زنیک و بد ست چوں ہمہ دیوست اوست　　بر من مسکیں چرا خط خطا می کشد

بار تو من می کشم جور تو من می برم　　پردہ ز روئیت چرا باد صبا می کشد

حسن تو بین کز برم دل بچہ روئی برد　　دیں دل مسکین نگر کز تو جفا می کشد

بار غمت غیر من کس نتواند کشید　　بر دل سلمان بنہ آں ہمہ تا می کشد

قصائد کے علاوہ سلمان نے ترجیع بند، ترکیب بند، مثنوی اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ بحور اور عروض پر اسے استادانہ عبور حاصل تھا اور اس نے اپنے قصیدے ان فنون میں نہایت کمال کے ساتھ ادا کئے ہیں۔

اسی طرح سلمان تصوف اور عرفان کا ذوق بھی رکھتا تھا۔ اس نے اس مسلک کے عقائد کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ ایسے ہی ذیل کے اشعار ہیں۔ ان میں طبیعت کے استغنا اور خودشناسی کی تعلیم دی ہے:

گر سر و برگ کلاہ فقر داری ای فقیر　　چار ترکت باید ال تا رود کارت ز پیش

ترک اول ترک مال و ترک ثانی ترک جاہ　　ترک ثالث ترک راحت ترک رابع ترک خویش

سلمان کے یہ اشعار ان اشعار کی یاد تازہ کر دیتے ہیں جو شیخ عطار کی طرف منسوب ہیں۔

عطار کہتے ہیں:

در کلاہِ فقر می باشد سہ ترک — ترک دنیا ترک عقبیٰ ترک ترک

مداحی کے باوجود سلمان بادشاہوں کو نصیحت کرنے سے نہیں چوکتا اور اس لحاظ سے اس نے حق کی پیروی کی ہے۔ سلمان نے عاشقانہ مثنویاں بھی لکھی ہیں ایک مثنوی "جمشید و خورشید" کے نام سے موسوم ہے یہ سلطان اویس کے حکم سے ۷۶۳ھ میں لکھی۔ ایک مثنوی کا نام "فراق نامہ" ہے۔ یہ مثنوی بھی سلطان اویس ہی کے حکم کی مطابقت میں ۷۷۰ھ میں تصنیف کی۔

سلمان کے کلام میں بعض اشعار خاص اہمیت کے حامل ہیں اور ادبیاتِ ایران میں ان کی نظیر کم ملتی ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار جو شاعر نے بغداد کے قیام کے زمانہ میں دجلہ کی سیر اور اس کی زیبائی و دلکشی پر لکھے ہیں۔ کہتا ہے:

دجلہ را امسال رفتاری عجب مستانہ است — پای در زنجیر و کف بر لب مگر دیوانہ است

ایک قصیدے میں کشتی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

پیکر این زورق رخشندہ بر آب روان — می درخشد چون دو پیکر در محیط آسمان
دجلہ چون دریا و کشتی کوہ و در بالائی کوہ — سایبان ابر است و خورشیدش بزیر سایبان

بغداد میں شیخ حسن کے محل کی تعریف میں کہتا ہے:

در تیرہ شب ز بس لمعان چراغ و شمع — بر صبح روی دجلہ زند خندہ از ضیا

سلمان کی شہرت اپنے زمانے ہی میں درجۂ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور شاعروں اور بزرگوں سے خط و کتابت رکھتا تھا اور بادشاہوں کے پاس اسے تقرب حاصل تھا۔ ذیل میں خواجہ حافظ کے دو شعر نقل کئے جاتے ہیں۔ حافظ نے سلمان کے سبک کی پیروی کی ہے اور یہ اشعار اس کے مرتبہ کو متعین کرنے کے لئے کافی ہیں۔

سر آمد فضلای زمانہ دانی کیست — ز راہِ صدق و یقین نی ز راہِ کذب و گمان
شہنشہ فضلا پادشاہ ملک سخن — جمال ملت و دین خواجۂ جہان سلمان

آخری عمر میں سلمان جلایری حکمرانوں کی نظر سے گر گیا اور اس نے سادہ میں گوشہ گیری اختیار کی اور زندگی کے آخری دن پریشانی میں گذارے۔ آخر کار ۷۷۸ھ میں یہیں انتقال کیا۔

حافظ

شمس الدین محمد حافظ جنھیں لسان الغیب کا لقب دیا گیا ہے، آٹھویں صدی ہجری کے اوایل میں ۷۲۶ھ کے قریب شیراز میں پیدا ہوئے۔ تذکروں میں ان کے والد کا نام بہاء الدین لکھا ہے جو فارس کے سلغری اتابکوں کے عہد میں اصفہان سے ہجرت کر کے شیراز چلے آئے تھے۔ خواجہ حافظ کی والدہ کازرون کی رہنے والی تھیں۔

حافظ نے متداول علوم کی تحصیل اپنے وطن ہی میں کی۔ اپنے زمانے کے بڑے بڑے علماء کی مجلسِ درس سے استفادہ کیا اور ان علوم میں ایک بلند مقام پر پہنچ گئے۔ ان علماء میں ایک قوام الدین عبداللہ (متوفی ۷۷۲ھ) بھی تھے۔ محمد گلندام جو حافظ کے ہم عصر اہل فضل اور تذکرہ قوام الدین عبداللہ کے حلقۂ درس میں ہمیشہ شریک رہنے والوں میں تھے۔ کی شہادت موجود ہے کہ ہمارا بلند پایہ شاعر "تحشیہ کشاف و مصباح، و مطالعہ مطالع و مفتاح، و تحصیل قوانین ادب و تحسین دواوین عرب" پر قدرت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کشاف سے مراد تفسیر میں زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی کشاف، نحو میں مطرزی (متوفی ۶۱۰ھ) کی مصباح، حکمت میں بیضاوی (وفات در آخر قرن ہفتم) کی طوالع الانوار من مطالع الانظار یا منطق میں قطب الدین رازی کی شرح مطالع اور ادب میں سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) کی مفتاح العلوم ہے۔

حافظ نے قرآن شریف کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اسے حفظ کر لیا تھا۔ انھوں نے تخلص بھی اسی رعایت سے اختیار کیا تھا۔ ان کے بعض اشعار سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

ندیدم خوش‌تر از شعرِ تو حافظ　　　بقرآنی کہ تو در سینہ داری

اور عرفان کے لطیف ذوق کے ساتھ وہ حکمت کی تعلیم قرآنی آیات کے ساتھ دیتے ہیں، خود فرماتے ہیں:

ز حافظانِ جہان کس چو بندہ جمع نکرد　　لطایفِ حکما با کتاب قرآنی

حافظ کی جوانی کے زمانے میں فارس کے سلغری اتابکوں کے دورِ حکومت کو ختم ہوئے عرصہ ہو چکا تھا اور فارس مستقل طور پر مغلوں کے عاملوں کے تحت آ گیا تھا اُس زمانے میں چوپانیوں کے آخری فرمان روا امیر پیر حسین کے مغلوب ہونے کے بعد اینجو خاندان کا محمود شاہ فارس کی حکومت پہ فائز کیا گیا تھا۔ ۷۴۲ھ کا سال تھا کہ محمود شاہ کے بیٹے شاہ شیخ جمال الدین ابو اسحاق اینجو جو بڑے لائق اور قابل تھا، پیر حسین اور ملک اشرف چوپانی کو شیراز سے نکال دیا، فارس کی حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور ۷۵۴ھ تک نہایت خوبی کے ساتھ اس صوبہ پر حکومت کرتا رہا۔ ابو اسحاق نہایت عدل پرور اور داد رس تھا۔ اس نے شیراز کو آباد اور پُر رونق بنایا۔ وہ خود بھی پاکیزہ ادبی ذوق رکھتا تھا۔ اسی لئے وہ حافظ کی بڑی عزت کرتا تھا اور اس کے یہاں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ امرا میں یہ پہلا امیر تھا جس نے شاعرِ شیراز کی نظر اپنی طرف پھیر لی تھی۔ حافظ نے بھی کئی جگہ اس کی مدح کی ہے اور اسے "جمال چہرۂ اسلام" اور "سپہر علم و حیا" اور ایسے ہی دوسرے القاب کے ساتھ یاد کیا ہے۔ اس کے زمانے کے علما و فضلا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

بعہد سلطنت شاہ شیخ ابو اسحٰق　　بپنج شخص عجب ملک فارس بود آباد

نخست پادشہی ہمچو او ولایت بخش　　کہ جان خلق بپرورد و داد عیش بداد

دگر بقیہ ابدال شیخ امین الدین　　کہ یمن ہمت او کار ہای بستہ گشاد

دگر شہنشہ دانش عضد کہ در تصنیف　　بنای کار مواقف بنام شاہ نہاد

دگر کریم چو حاجی قوام دریا دل!　　کہ نام نیک ببرد از جہاں بدانش وداد

دگر مربی اسلام مجد دولت و دین	که قاضی به از و آسماں ندارد یاد!
نظیر خویش نبگذاشتند و بگذشتند	خدای عز و جل جملہ را بیامرزاد

شیخ امین الدین صوفیوں کے ابدال تھے، قاضی عضد الدین عبد الرحمان یحیی (متوفی ۷۵٦ھ) اس عہد کے علماء اور حکماء میں شمار ہوتے تھے اور جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، علم کلام میں کتاب مواقف ان کی تصانیف میں یادگار ہے۔ حاجی قوام الدین حسن اس زمانے کے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے اور دیوانی مالیات کی محصلی کے عہدہ پر فائز تھے۔ حافظ نے ایک اور جگہ بھی ان کی تعریف کی ہے۔ مجد الدین اسماعیل (متوفی ۷۵٦ھ) شیراز کے قاضی تھے اور مدرسہ مجدیہ میں جو خود ان کے نام سے منسوب تھا، درس دیا کرتے تھے۔

حافظ کا زمانہ بڑے انقلاب اور خوں ریزی کا زمانہ تھا لیکن اس کے باوجود اس زمانے میں علماء و فضلاء، صوفیا و اولیاء اور شعراء و ادبا فارس میں بکثرت موجود تھے۔ اسی وجہ سے حافظ کی سخن فہمی کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ حافظ نے ابو اسحاق کی حکومت کے زوال پر بہت سے دردناک شعر لکھے ہیں۔ شیخ ابو اسحاق کی سلطنت کا خاتمہ آل مظفر کے بانی محمد مبارز الدین کے ہاتھوں ہوا تھا۔ پھر اس کے بیٹوں نے یعنی شاہ محمود اور شاہ شجاع نے اس کے خلاف بغاوت کر کے اسے مغلوب کر لیا اور شاہ شجاع کے حکم سے اس کی آنکھوں میں نیل کی سلائی پھیر دی گئی۔ حافظ نے اپنے ایک قصیدہ میں جس کا مطلع ہے:

دل منہ بر دینی و اسباب او	زانکہ از او کس وفاداری ندید

اس کی ستم گاری کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کے مظالم کا حال یوں بیان کیا ہے:

آنکہ روشن شد جہاں بینش بدو	میل در چشم جہاں بینش کشید

آل مظفر میں مبارز الدین کا بیٹا شاہ شجاع (۷۵۹ - ۷۸٦) اور اس خاندان کا آخری حکمراں شاہ منصور (۷۸۹ - ۷۹۵) خاص طور پر حافظ کے ممدوح رہے ہیں۔ جلال الدین شاہ شجاع خود بھی ادبی ذوق اور شاعرانہ مزاج رکھتا تھا۔ اسی بادشاہ کے زمانہ میں شیراز کو ظاہر

پرست خشک متعصبوں کے پنجہ سے رہائی ملی۔ حافظ نے کئی جگہ اپنے اشعار میں اس بادشاہ کا نام لیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں :

مظہرِ لطفِ ازل روشنیِ چشمِ اَمل   جامع علم و عمل جانِ جہاں شاہ شجاع

جیساکہ اس شعر سے ظاہر ہے شاہ شجاع ادبیات اور علوم سے بہرہ مند تھا اور عربی اور فارسی کا سخن شناس تھا۔

شاہ منصور بن شرف الدین مظفر بن مبارز الدین شاعر کا آخری ممدوح ہے کیونکہ حافظ کی زندگی کے آخری سالوں میں یہی شیراز کا حاکم تھا۔ حافظ نے اس بادشاہ کا نام بھی اپنے کلام میں کئی بار لیا ہے۔ اسی طرح اپنے مشہور قصیدے :

چو زاسحر نہاد حمایل بر ابرم

میں کہتے ہیں :

منصور بن محمد غازی است حرز من   از این خجستہ نام اعدا مظفرم

شاعر کے کلام کے انداز سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس بادشاہ نے حافظ کی خاص طور پر سرپرستی کی تھی اور اسی کے زمانے میں شاعر اور اس کے کلام کی شہرت اپنے انتہائی عروج کو پہونچ چکی تھی، چنانچہ فرماتے ہیں :

بیمنِ دولت منصور شاہی   علم شد حافظ اندر نظم اشعار

ایران سے باہر کے جن بادشاہوں کا نام حافظ نے اپنے کلام میں لیا ہے، ان میں ایک جلایریوں یا ایل کانی سلاطین کے پانچویں حکمران سلطان احمد بن شیخ اویس بن حسن (۷۸۴ - ۸۱۳) کا نام بھی شامل ہے یہ خاندان ۷۳۶ھ سے لے کر ۸۱۴ھ تک ایران کے مغرب میں بغداد سے لے کر آذربایجان کے علاقہ پر حکومت کرتا تھا۔ حافظ کے سوا سلمان ساوجی، عبید زاکانی اور دوسرے شاعروں نے بھی ان کی مدح کی ہے۔

مشہور ہے کہ سلطان احمد نے خواجہ کو شیراز سے بغداد آنے کی دعوت دی تھی لیکن

شاعر نے کسی وجہ سے یہ دعوت قبول نہیں کی اور ایک غزل لکھ کر اس کے پاس بھیج دی جس کا مطلع یہ ہے:

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان   احمد شیخ اویس حسن ایل کانی!

تاریخ فرشتہ کے مصنف کی روایت ہے کہ دکن کے بہمنی سلاطین کے پانچویں حکمران محمود شاہ بن حسن (۷۷۹ - ۸۰۰ھ) نے جو علم دوست اور ادب پرور تھا، حافظ کو اپنے ملک میں بلانا چاہا۔ محمود شاہ نے اس کی دعوت دیتے ہوئے زادِ راہ بھی روانہ کیا۔ حافظ دکن کے ارادے سے کشتی میں سوار ہوئے اور کشتی طوفان میں پھنس گئی۔ شاعرِ شیراز نے خشکی پر جو ہنگامے اور حادثے دیکھے تھے وہ خود ہی کچھ کم نہ تھے اب اس نے دریا کی بلائیں مبتلا ہونے سے احتراز کیا اور واپس ہو کر ساحل پر اتر گئے۔ اس مسافرت پر پشیمان ہوئے اور ایک غزل لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دی جس کا مطلع یہ ہے:

دمی با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد   بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

فارسی شعر کی تاریخ پر اردو زبان میں شعر العجم کے نام سے ایک کتاب لکھی گئی ہے اس کے مصنف مولانا شبلی نعمانی کا بیان ہے کہ بنگالہ کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ غیاث الدین بن اسکندر نے بھی خواجہ صاحب کو بنگالہ آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن غیاث الدین کی تخت نشینی کا سال ۷۹۲ لکھا ہے۔ اس لئے اگر یہ دعوت خواجہ صاحب کو دی گئی ہوگی تو اس کے جلوس سے پہلے کی بات ہوگی کیونکہ اس تاریخ تک حافظ کا انتقال ہو چکا تھا۔

سعدی کے برخلاف حافظ نے لمبے لمبے سفر نہیں کئے۔ عمر بھر میں ایک مختصر سا سفر تو انھوں نے بندر ہرمز تک اور ایک سفر یزد تک کیا تھا۔ باقی عمر وہ شیراز ہی میں مقیم رہے اور اس شہر کی صفائی، حسن و زیبائی اور اس کے مقام گلگشت اور دریائے رکنا آباد کے ساحل سے ہمیشہ لطف اندوز ہوتے رہے، چنانچہ کہتے ہیں:

نمی دہند اجازت مرا بسیر وسفر نسیم بادِ مصلیٰ و آبِ رکن آباد

حافظ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ ان کے فرزندِ عزیز نے جوانی میں انتقال کیا اور اپنے باپ کے دل پہ داغ دیا، چنانچہ خود کہتے ہیں:

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند چہ دید اندر خم ایں طاق رنگین
بجای لوح سیمیں در کنارش فلک بر سر نہادش لوح سنگین

خواجہ حافظ نے ۷۹۱ھ میں شیراز میں وفات پائی اور شہر کے اسی حصے میں جسکی سیر و تفریح سے وہ اپنا دل بہلاتے تھے اور اس کی گل گشت ان کی محبوب تفریح گاہ تھی۔ اور جس کا نام مصلیٰ تھا، سپردِ خاک کئے گئے۔ اب اسی مقام پر اس بلند مرتبہ شاعر کے شایاں شان مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے۔ کسی شاعر نے "خاک مصلیٰ" ہی سے شاعر کی وفات کی تاریخ نکالی ہے، کہتا ہے:

چراغِ اہلِ معنیٰ خواجہ حافظ کہ شمعی بود از نورِ تجلیٰ
چو در خاکِ مصلیٰ ساخت منزل بجو تاریخش از خاکِ مصلیٰ

سبکِ شاعری حافظ کے اشعار ان کے احساس کی لطافت اور تاثیر پذیری کے گواہ ہیں۔ دریا دل شاعر نے اپنے زمانے کے ایسے خونی واقعات میں زندگی بسر کی ہے جب ایران کا پورا ملک اشرار اور ان کی ہنگامہ آرائیوں سے دوچار تھا اور خود صوبہ فارس اور شہر شیراز بھی ان سے اپنا دامن نہ بچا سکا تھا۔ خود حافظ نے اپنی آنکھوں سے بادشاہوں کو قتل اور خاندانوں کے افراد میں کشمکش ہوتے دیکھی جیسی کہ آل مظفر میں ہوئی تھی۔ لیکن ان سب واقعات کے باوجود عجیب بات ہے کہ شاعر نے اپنی قوتِ فکر اور یکسوئیِ خیال کو کس طرح برقرار رکھا گویا معنوی بلندی سے شاعر نے ان تمام حوادث کو سمندر کی چھوٹی موجوں کی طرح حقیر دیکھا ہے اور اس کی نظر سمندر کی وحدت خلقت اور اس کی توجہ عالم کی تخلیق کی طرف ہی رہی ہے۔ کبھی کبھار اس کی فکر پریشان ہوئی ہے

اور ادھر ادھر بھٹکی بھی ہے تو دنیا کے حوادث سے متاثر ہو کر کہا ہے :

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم　　ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

لیکن ایسے لمحات بہت کم آتے ہیں اور وہ فوراً اپنے مطالعۂ باطن میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ایک پُر آشوب دنیا میں رہتے ہوئے بھی آسمانوں سے بھی زیادہ وسیع اپنے افکار کی دنیا میں فارغ البال زندگی بسر کی ہے۔ حافظ کی یہی عارفانہ متانت ان کے قصائد سے بھی بالکل ہویدا ہے۔ اس کے سوا حافظ کا شمار ایسے شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے شاذ و نادر ہی مدح کی ہے اور اس میں بھی غلو اور چاپلوسی سے کام نہیں لیا ہے اور متانت کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ حالانکہ ہر امیر اپنے زمانہ میں قادر اور قاہر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود حافظ نے اپنے کلام کو زبون و خراب نہیں کیا اور اس کی تعریف میں حد سے تجاوز نہیں کیا بلکہ وہ پند گوئی اور نصیحت سے بھی باز نہیں رہے ہیں اور ان کو اس حقیقت سے کہ ہر شخص آخر کار اپنی سزا کو پہنچتا ہے، اسی دنیا میں ہر شخص کو اپنے کیے کا بدلہ مل جاتا ہے اور قدرت بادشاہ و گدا کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے آگاہ کیا ہے اس موضوع پر انھوں نے بڑے موثر اور دل پذیر اشعار لکھے ہیں :-

حافظ کی روح بزرگ اور فکر توانا وہی عرفانی ذوق تھا جو ان کی ذات میں کمال کو پہنچا۔ وہ مسلک جسے سنائی، شیخ عطار، مولانا جلال الدین رومی اور سعدی نے اپنی زبان اور اپنے بیان میں مختلف طریقوں سے تعبیر کیا تھا، حافظ کی ذات میں اپنی انتہائی گہرائی اور تعبیر کے اوجِ کمال پر پہنچا۔ وہ مطالب جو محاوروں نے تفصیل کے ساتھ ادا کیے تھے حافظ نے انھیں مختصر سہی لیکن بہترین اور شیریں تر غزلوں میں ادا کر دیا۔ وہ توحید اور تصوف میں ایسے ڈوبے کہ ہر قصیدے اور ہر غزل میں ہر عنوان سے اسی ایک مطالب اور اسی ایک مقصودِ بلند کو ادا کیا۔ شاید شعر حافظ کی سب سے بڑی خصوصیت بھی یہی ہے۔ وحدت میں یہی استغراق ہے جس کی وجہ سے وہ کثرتِ عالم، اختلافِ ادیان، جنگ و جدل اور بیہودہ

بحثوں کے قائل نہ ہو سکے، اسی لئے کہتے ہیں :

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ　　چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

حافظ حقیقت، وحدت اور یک روئی کے عاشق تھے، اسی لئے وہ ہر طرح کے اختلاف اور نفاق کی برائی کرتے ہیں۔ خاص کر سطحی جھگڑوں اور ظاہری اختلاف سے انھیں بڑا دکھ اور جھوٹے زاہدوں کی ریا اور تذویر سے بڑا رنج ہوتا تھا۔ حد یہ کہ حافظ نے ایسے ریاکار صوفیوں کی خوب خبر لی ہے جو حافظ کی طریقت سے انتساب رکھتے تھے لیکن اصل میں اہلِ ظاہر تھے اور ظاہر میں کمبل پوشی اور قلندری اختیار کئے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے وہ ایسے لوگوں کو صوفیوں میں شمار کرنے کے لئے تیار نہیں، کہتے ہیں :

آتش زرق و ریا خرمنِ دیں خواہد سوخت　　حافظ ایں خرقۂ پشمینہ بینداز و برو

شاید یہی وجہ ہے کہ ریاکاری اور سالوسی پر شعراء ایران میں کسی کو اتنا غصہ نہیں آیا ہے جتنا کہ حافظ اس سے برہم نظر آتے ہیں۔

حافظ کی ساری استادی غزل کی استادی ہے۔ عارفانہ غزل نے حافظ کے ہاتھوں میں پہونچ کر ایک طرف فصاحت اور ملاحت کا درجۂ کمال حاصل کیا تو دوسری طرف ایک مخصوص سادگی اختیار کی۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، حافظ نے اپنے اشعار میں مختصر سے الفاظ میں بڑے بڑے مطالب اور لطیف ترین معانی ادا کردئے ہیں۔ شیرینی، سادگی، اور ایجاز حافظ کی غزل کی امتیازی خصوصیات ہیں اور ان کی روح کی پاکیزگی اور حکمت ان کے ہر شعر سے ہویدا ہے اس سے ظاہر ہے کہ استاد کی غزلیں دل سے نکلی ہیں اور ہر غزل اس کے کہنے والے کے ضمیر کی لطیف تعبیر ہے۔ یہ تو بالکل ہی واضح ہے کہ شاعر نے ہر طرح کی ظاہر پرستی سے اعراض کیا ہے، حیلہ و تذویر کے دام کو پارہ پارہ کر دیا ہے، مذاہب اور فرقوں کی ظاہری باتوں کو رد کر دیا ہے اور اپنے اشعار میں شیخ زاہد اور صوفی جیسے ریاکاروں کی خوب خبر لی ہے۔

حافظ نے غزل میں ایک طرف شیخ عطار اور مولانا روم کی آتش نوائیوں سے استفادہ کیا ہے تو دوسری طرف وہ خود اپنے ہم عصروں کے سبک سے بھی متاثر ہوئے ہیں بنیادی طور پر متقدمین کی پیروی کرتے ہوئے انھوں نے اپنے معاصرین میں خاص کر سعدی، خواجو، سلمان ساوجی، اوحدی اور عماد فقیہ کے سبک کی پیروی کی ہے۔ ان کی بہت سی غزلیں اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہاں چند شعر اندازہ کے لئے نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں

خواجو (متوفی ۷۵۳ھ) :

بادہ می نوشم و از آتش دل می جوشم　　مگر آن آب چو آتش بنشاند جوشم

حافظ :

گرچہ از آتش دل چون خم می در جوشم　　مہر بر لب زدہ خون می خورم و خاموشم

عماد فقیہ :

امید بلبل بیدل زگل وفاداریست　　دلی وفا نکند شاہدی کہ بازاریست

حافظ :

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست　　کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

سلمان ساوجی (متوفی ۷۷۸ھ)

خواہی کہ روشنت شود احوال درد من　　در گیر شمع را و زسر تا بپا بپرس !!

حافظ :

خواہی کہ روشنت شود احوال سرّ عشق　　از شمع پرس قصہ ز باد صبا مپرس

اس کے باوجود حافظ نے صرف تقلید پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ وہ خود اپنا ایک مستقل رنگ رکھتے ہیں اور اسی رنگ سے انھوں نے بزم سخن کو ایک رونقِ تازہ بخشی ہے۔ ان کے اشعار خواجو اور سلمان کے اشعار سے زیادہ لوگوں کے وردِ زبان ہیں۔ اس کی وجہ صرف ان کا معنوی مقام، ان کی عظمت اور عرفانی ذوق ہی نہیں بلکہ اس میں ان کے شیریں لحن، متانت

(۲) (تاریخ ادبیات ایران)

اور کلام کی روانی کا بھی بہت بڑا حصہ ہے خود شاعر بھی اپنے طبیعت کے حسن، ذوق کی لطافت
اور عطیۂ کشف سے واقف ہے اور اسے اپنی نظم کے مقام کی بلندی کا اندازہ ہے اسی لئے
تو نہایت اعتماد اور اعتقاد کے ساتھ کہتے ہیں:

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ　　بقرآنی که تو در سینه داری

یہ واقعہ ہے کہ حافظ نے اپنی طبع عالی، روحِ لطیف، طبع گویا، فکرِ دقیق، ذوقِ عارفانہ
اور عرفانِ عاشقانہ کے ذریعہ ایسی طرحِ سخن ڈالی اور مختلف عبارتوں اور مطالب کو آپس میں
اس طرح ملایا ہے کہ ان کی وجہ سے عرفانی غزل میں ایک مستقل سبک اور خاص طرز ہی وجود
میں آگیا۔ چنانچہ جو لوگ فارسی ادبیات سے واقف ہیں وہ بے تامل ان کے شعر کو پہچان
اور ان کے طرز کو پا لیتے ہیں۔

اچھوتے تخیل کے سوا حافظ نے الفاظ کے استعمال اور معنی کی تعبیر کے سلسلہ میں مخصوص
الفاظ اور اصطلاحات بھی وضع کی ہیں۔ یہ خود ہی ان اصطلاحوں کے موجد ہیں یا اگر ان اصطلاحوں
سے پہلے کسی نے کام بھی لیا تھا تو بہت کم۔ لیکن حافظ نے ان کو اپنے کلام میں کثرت کے ساتھ
استعمال کیا ہے، مثلاً:

"طامات" "خرابات" "مغان" "مغبچہ" "خرقہ" "سالوس" "پیر" "ہاتف" "پیر مغاں"
"گرانان" "رطل گران" "زنار" "صومعہ" "زاہد" "شاہد" "طلسمات" "دیر" "کنشت"

حافظ نے اپنے اشعار میں صنائع و بدائع سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً ایہام، مراعات النظیر،
تجنیس وغیرہ۔ خاص کر صنعتِ ایہام سے انھیں زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار:

شراب خوردہ و خوی کردہ می روی بچمن!　　کہ آب روی تو آتش در ارغوان انداخت (ایہام)
خرقہ زہد مرا آب خرابات ببرد　　خانۂ عقل مرا آتش میخانہ بسوخت (مراعات النظیر)
دلم ز پردہ برون شد کجائی ای مطرب　　بنال ہاں کہ ازین پردہ کار ما بنوست (تجنیس کامل)
لعل سیراب بخون تشنہ لب یار من است　　وز پی دیدن او دادن جان کار منست (تشبیہ)

حافظ نے شاعروں کی عام تشبیہوں سے بھی کام لیا ہے، جیسے زلف کے لئے کفر، زنجیر، سنبل، دام، کمند، مار کی تشبیہ، ابرو کے لئے کمان کی تشبیہ، قد کے لئے سروکی، صورت کے لئے چراغ، گل اور ماہ کی، دہن کے لئے غنچہ اور پستہ کی تشبیہ استعمال کی ہے۔ لیکن ان ظاہری صنائع نے حافظ کے کلام کی فطری تاثیر کو کسی طرح کم نہیں کیا ہے۔ فارسی زبان کی مثالیں اور کنائے بھی حافظ کے کلام میں ملتی ہیں۔ مثلاً "طبل زیر گلیم زدن" کنایہ ہے کسی ایسی چیز کے چھپانے سے جو چھپائی نہ جا سکے۔ ذیل کے شعر میں کہتے ہیں:

دلم گرفت ز سالوس و طبل زیر گلیم خوشا دمی کہ بہ میخانہ برکشم علمی

حافظ کی غزل کے نہایت روشن اور رواں ہونے کے باوجود ان کے دیوان میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن کے مضامین میں ایہام اور استعارات سے کام لیا گیا ہے اور صرف فکر و نظر کے ذریعہ مضامین پیدا کئے گئے ہیں، مثلاً یہ شعر:

کس بدورِ نرگست طرفی نبست از عافیت بہ کہ نفروشند مستوری بمستانِ شما

شعرِ حافظ کی ایک معنوی خصوصیت یہ ہے کہ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک غزل کے اشعار میں مطلب کے لحاظ سے تنوع اور اختلاف دیکھنے میں آتا ہے اور اس اختلاف کا ایک بڑا سبب وہی قافیہ کا التزام ہے، مثلاً اس نفیس و زیبا غزل یعنی:

ساقی بنور بادہ بر افروز جام ما مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکام ما

میں یکایک حاجی قوام کا نام محض قافیہ پیمائی کی وجہ سے آجاتا ہے:

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے خواجہ کی نظر میں ہستی کی حقیقت ایک ہے اور وہ خدا کی ذات ہے جو اس دنیا میں ہر طرف جلوہ گر ہے۔ عالم طبیعی کے بدایع، معنوی عشق اور آدمی کا دل اس کے مظہر ہیں، اور واقعتہً یہ اسی کی ذات ہے جو ہر جگہ بلکہ خود آدمی کے ساتھ موجود ہے، اگرچہ وہ اسے نہیں پہچانتا۔ اس کے سرِ وجود کی یافت کے لئے رجوع بباطن، حقیقتِ نفس کا درک، پیر کی رہبری اور حق کی تائید لازمی ہے:

بارہا دل طلب جام جم از ما می کرد!
آنچہ خود داشت زبیگانہ تمنا می کرد

گوہری کز صدف کون و مکاں بیرون ست
طلب از گمشدگانِ لب دریا می کرد

مشکل خویش بر پیر مغاں بردم دوش
کو بتائید نظر حلِ معما می کرد!

دیدمش خرم و خنداں قدح بادہ بدست
واندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد

گفتم ایں جام جہاں بین بتو کی داد حکیم
گفت آں روز کہ ایں گنبد مینا می کرد

بے دلی در ہمہ احوال خدا با او بود!
او نمیدیدش و از دور خدایا می کرد

خدا کے ساتھ اس وسیع تعلق کے نتیجہ کے طور پر حافظ کی فکر وسیع، نظر جہاں بین، آنکھ دقیقہ رس، ہمت عالی اور فکر بلند ہے۔ وہ معاملات عالم میں آسان گیر، اسرار کے آشنا حوادث سے بے غم، حریم عشق میں خاموش اور اس کے محرم ہیں:

دوش با من گفت پنہاں کاردانی تیز ہوش
کز شما پنہاں نشاید داشت راز می فروش!

گفت آساں گیر بر خود کارہا کز روی طبع
سخت می گیرد جہاں بر مرداں سخت کوش

وانگہم در داد جامی کز فروغش بر فلک
زہرہ در رقص آمد و بربط زناں می گفت نوش

تا نگردی آشنا زیں پردہ بوئی نشنوی
گوش نامحرم نباشد جای پیغام سروش

در حریم عشق نتواں زد دم از گفت و شنید
زانکہ آنجا جملہ اعضا چشم باید بود و گوش

در بساط نکتہ داناں خود فروشی شرط نیست
یا سخن دانستہ گو ای مرد بخرد یا خموش

گوش کن پند ای پسر از بہر دنیا غم مخور
گفتمت چوں دُر حدیثی گر توانی دار گوش

حافظ کے کانوں میں ہاتف کی صدا آتی ہے، پیر دانا کے پند پہنچتے ہیں، اہلِ راز کے پیام آتے ہیں اور وہ چنگ و رباب کے نالوں پر سر دھنتے ہیں۔ ان کی زبان سے حافظ کو حقائق کی تعلیم ملتی ہے اور یہ سب یکزبان ہو کر ایک ہی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں وہ عالمِ حال سے زاہدانِ قیل و قال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور رندانہ سخن سرائی کرتے ہیں۔ وہ دنیا کی ہر چیز میں یگانگت اور یک رنگی اور ذوق و شوق دیکھتے ہیں اور ایسے رنگ میں

دیکھتے ہیں جو کبھی عبرت انگیز ہے تو کبھی تمسخر آمیز۔ جو لوگ اہلِ ظاہر اور اہلِ افتراق ہیں، ان کے بارے میں فرماتے ہیں :

عیب رندان مکن ای زاہد پاکیزہ سرشت   کہ گناہِ دگران بر تو نخواہند نوشت

من اگر نیکم اگر بد تو برو خود را باش   ہر کسی آن درود عاقبت کار کہ کشت

ہمہ کس طالب یارند چہ ہشیار و چہ مست   ہمہ جا خانہ عشقت چہ مسجد چہ کنشت

سر تسلیم من و خشت در میکدہ ھا   مدعی گر نکند فہم سخن گو سر و خشت

ناامیدم مکن از سابقۂ لطف ازل!   تو پس پردہ چہ دانی کہ کہ خوبست وکہ زشت

نہ من از پردۂ تقوی بدرافتادم و بس   پدرم نیز بہشت ابد از دست بہشت

خواجہ صاحب کے کلام میں بادہ و میکدہ کی اصطلاح بڑی کثرت سے استعمال ہوئی ہے اگر بادہ اور مے سے شراب انگور اور میکدے سے رندوں کی عشرت گاہ کے معنی لئے جائیں تو کبھی بلا تردید عرفانی معنی ہی ان کے شعر سے برآمد ہوتے ہیں۔ شاعر نے ہر جگہ اسی مفہوم میں یہی ایک مطلب ادا کیا ہے۔ مثلاً مے اور میخوارگی سے ہر جگہ وہی تازیانہ مراد ہے جس سے وہ ریاکار اور عوام فریب زاہدوں کی پردہ دری کا کام لیتے ہیں۔ اسی لئے میخوارگی سے ہر جگہ عالم صفا اور بے ریائی و بے غروری مراد ہے۔ ظاہر ہے ایسی شرات سے مسنی کچھ آسان کام نہیں، اس کے لئے محنت اور ریاضت لازمی ہے :

صبح دم مرغِ چمن باگلِ نوخاستہ گفت   ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چون تو شگفت

گل نخندید کہ از راست نرنجیم ولی   ہیچ عاشق سخن سخت بمعشوق نگفت

گر طمع داری از آن جام مرصع می لعل   ای بسا در کہ بنوک مژہ ات باید سفت

تا ابد بوی محبت بمشامش نرسد   ہر کہ خاک در میخانہ برخسارہ نرفت

در گلستان ارم دوش چو از لطف ہوا   زلف سنبل بہ نسیم سحری می آشفت

گفتم ای مسند جم جام جہاں بینت کو   گفت افسوس کہ آں دولت بیدار بخفت

سخن عشق نہ آنست کہ آید بزباں   ساقیا می دہ وکوتاہ کن ایں گفت و شنفت

درگاہ حق تک پہنچنے کے لئے جو واقعی میکدہ اور عارفوں کی مستی کا مبدا ہے، نوک مژہ سے بہت سے موتی پرونے پڑتے ہیں، راہِ وصال میں مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں، آنسو بہانے پڑتے ہیں اور راہِ معرفت کی خاک رخسار پر ملنی پڑتی ہے۔ مئے پرستی آدمی کو اپنے آپ سے بے خود کر دیتی ہے اس لئے حافظ اسے خود پرستی کے مقابل استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے عارفوں کی عشق ورزی اور بادہ گساری سے کبھی حق پرستی، حرص وہوس سے دست برداری اور وصال حقیقت کی آرزو کے معنی بھی لئے ہیں یہ لوگ وہ ہیں جو راہِ حق میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں تکلیفیں سہتے ہیں اور شکایت نہیں کرتے:

منم کہ شہرۂ شہرم بعشق ورزیدن   منم کہ چہرہ نیالودہ ام بہ بد دیدن
وفا کنیم و ملامت کشیم وخوش باشیم   کہ در طریقت ما کافریست رنجیدن
مراد دل ز تماشای باغ عالم چیست   بدست مردم چشم از رخ تو گل چیدن
بمی پرستی از آں نقش خود زدم بر آب   کہ تا خراب کنم نقش خود پرستیدن
برحمت سر زلف تو واثقم ورنہ   کشش چو نبود از آنسو چہ سود کوشیدن

عارف کی کوشش عشق معنوی کی کشش کے مقابل ہے یعنی عارف دل کی صفائی اور نزہت حاصل کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ طبیعت کے کنوئیں سے نکل کر عشق حق کے بیکراں سمندر میں غوطے لگالے اور عالم مادی اس کی فطرت کو آلودہ نہ کر سکے:

دوش رفتم بدر میکدہ خواب آلودہ   خرقہ تر دامن وسجادہ شراب آلودہ
آمد افسوس کناں مغبچۂ بادہ فروش   گفت بیدار شو ای رہرو خواب آلودہ
شست وشوئی کن وانگاہ بخرابات خرام   تا نگردد ز تو ایں دیر خراب آلودہ
بطہارت گذراں منزل پیری وکن   خلعت شیب چو تشریف شباب آلودہ
پاک وصافی شو واز چاہ طبیعت بدر آئی   کہ صفائی نہ دہد آب تراب آلودہ

گفتم اے جانِ جہاں دفترِ گل عیبی نیست ۔ کہ شود فصلِ بہار از می ناب آلودہ
آشنایانِ رہ عشق دریں بحرِ عمیق ۔ غرقہ گشتند و نگشتند بآب آلودہ

اسی طرح شاعر معنوی مستی اور شہوات طبیعی سے رستگاری کا ذکر بار بار کرتا ہے کیوں کہ عین وصالِ حق میں طبیعت کا گزر ممکن نہیں۔

بسرِ جامِ جم آنگہ نظر توانی کرد ۔ کہ خاکِ میکدہ کحلِ بصر توانی کرد
مباش بی می و مطرب کہ زیرِ طاقِ سپہر ۔ بدیں ترانہ غم از دل بدر توانی کرد
گلِ مراد تو آنگہ نقاب بگشاید ۔ کہ خدمتش چو نسیمِ سحر توانی کرد
بعزمِ حلۂ عشق پیش نہ قدمی ۔ کہ سودہا کنی ار ایں سفر توانی کرد
تو کز سرای طبیعت نمی روی بیرون ۔ کجا بکوی طریقت گذر توانی کرد
جمالِ یار ندارد نقاب و پردہ دلی ۔ غبارِ رہ بنشان تا نظر توانی کرد
بیا کہ چارہ ذوقِ حضور و نظمِ امور ۔ بفیض بخشی اہلِ نظر توانی کرد
دلی تو تا لبِ معشوق و جامِ جم خواہی ۔ طمع مدار کہ کارِ دگر توانی کرد
دلا ز نورِ ہدایت گر آگہی یابی ۔ چو شمع خندہ زنان ترکِ سر توانی کرد

عارفوں کی طریقت فداکاری، بلند نظری، اہلِ نظر سے فیض یابی، خودی عقل سے رستگاری، خلاصہ یہ کہ از خود گزشتگی اور خود بینی کی جگہ خدا بینی ہے۔ جس نے اپنے خدا کا جلوہ دیکھا اس نے اپنی خودی چھوڑی اور جس نے اپنے اندر اپنے آپ ہی کو دیکھا اس نے خدا کو چھوڑ دیا۔

سحرگاہان کہ مخمورِ شبانہ ۔ گرفتم بادہ با چنگ و چغانہ
نہادم عقل را رہ توشہ از می ۔ ز شہرِ ہستیش کردم روانہ
نگارِ می فروشم جرعۂ داد ۔ کہ ایمن گشتم از مکرِ زمانہ
ز ساقی کمان ابرو شنیدم ۔ کہ ای تیرِ ملامت را نشانہ

نبندی زین میان طرفی کمروار | اگر خود را بہ بینی در میانہ
نہ بندد طرف وصل از حسن شاہی | کہ با خود عشق ورزد جاودانہ
ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست | خیال آب و گل در رہ بہانہ
بدہ کشتی می تا خوش بر انیم | ازیں دریای ناپیدا کرانہ
برو ایں دام بر مرغ دگر نہ | کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اس لئے حافظ ذوق معنوی کے لحاظ سے ایک طرف تو شہوت پرستوں، طبیعت کے بندوں اور ہوس کے غلاموں کے مخالف ہیں تو دوسری طرف ریا، سالوس، زہد فروشی اور عوام فریبی کے بھی دشمن ہیں۔ آخر الذکر گناہ کو وہ اول الذکر گناہ سے زیادہ بُرا سمجھتے ہیں کیوں کہ دوسرے گناہ سے خدا کی مخلوق گمراہ ہوتی ہے اور پہلے گناہ کی بُرائی صرف اس گناہ کے مرتکب کی حد تک ہوتی ہے۔ ذیل کے شعر میں اپنے اسی عقیدہ کا اظہار کیا ہے:

دلا دلالت خیرت کنم براہ نجات | مکن بفسق مباہات و زہد ہم مفروش

زہد ریائی، تقوائے ظاہری اور کورانہ شریعت پرستی کا ساتھ عارفانہ ذوق کے ساتھ کبھی نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف عالم روحانی کو فراموش کر دینا اور جسمانی دنیا میں یکسر غرق ہو جانا اور دنیائے فانی کی محبت اور اُس کی لذت میں اپنے آپ کو گم کر دینا خلافِ عقل و معرفت ہے۔ لیکن اس مقام پر اور خاص کر حافظ کے سلسلہ میں جو نکتہ نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے یہ ہے کہ عرفان سے درویشی، قلندری خانہ بدوشی تمام دنیوی لذائذ سے محرومی اور دنیوی زندگی سے بے خبری ہرگز مقصود نہیں۔ کیونکہ پیدا کرنے والے نے اس دنیا کو اِس دنیا کا مقدمہ قرار دیا ہے۔ جہاں تک عقل و خرد اور آئینِ آفرینش اجازت دیں اِس دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے بہرہ مند ہونا چاہئے۔ اور فرصت کو غنیمت شمار کرنا چاہئے۔ اِس بارے میں یعنی فرصتِ عمر کو غنیمت شمار کرنے اور اِس دنیا کی نعمتوں سے اِستفادہ کے سِلسلہ میں غالباً حافظ کی غزلیں سب سے زیادہ موثر

غزلیں ہیں:

دانی کہ چیست دولت دیدار یار دیدن ۔۔۔ در کوئی او گدائی بر خسروی گزیدن
از جاں طمع بریدن آساں بود و لیکن ۔۔۔ از دوستان جانی مشکل بود بریدن
خواہم شدن ببستاں چوں غنچہ با دل تنگ ۔۔۔ و آنجا بہ نیک نامی پیراہنی دریدن
گہ چوں نسیم با گل راز نہفتہ گفتن ۔۔۔ گہ سر عشق بازی از بلبلاں شنیدن
فرصت شمار صحبت کزایں دو روزہ منزل ۔۔۔ چوں بگذریم دیگر نتواں بہم رسیدن

چاہیے کہ لطائف خلقت اور جمال طبیعت سے استفادہ کیا جائے۔ جب تک یہ عمر کوتاہ تمام ہونے نہ پائے، کامرانی کے دن تمام ہونے نہ پائیں اور جسم خاک میں ملنے نہ پائے اس وقت تک مقصود کے وہ میوے حاصل کرلیں جو خداوند عالم نے اس دنیا کے باغ میں لگائے ہیں۔ چاہیے کہ عالم محسوس، اس کے معنی اور اس کی حقیقت کو سمجھیں، اور چندروزہ زندگی کو ہنسی خوشی سے گذار دیں:

نو بہارست دراں کوش کہ خوش دل باشی ۔۔۔ کہ بسی گل بدمد باز و تو در گل باشی
من نگویم کہ کنوں با کہ نشیں و چہ بنوش ۔۔۔ کہ تو خود دانی اگر زیرک و عاقل باشی
چنگ در پردہ ہمیں می دہدت پند و لے ۔۔۔ وعظت آنگاہ کند سود کہ قابل باشی
در چمن ہر ورقی دفتر حالی دگر است ۔۔۔ حیف باشد کہ ز حال ہمہ غافل باشی
نقد عمرت ببرد غصۂ گیتی بگزاف ۔۔۔ گر شب و روز دریں قصۂ مشکل باشی
گرچہ راہیست پر از بیم ز ما تا بردوست ۔۔۔ رفتن آسان بود ار واقف منزل باشی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے قول کے مطابق فرصت شماری، معنی زندگی کی دریافت، حفظ نشاط، روح قوی کی پرداخت، فکر بلند کے حصول، وفا و مروت کی عادت اور سعی و عمل کی طرف رغبت کی مشق کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اپنے مناسب حال فرماتے ہیں:-

مزرع سبز فلک دیدم و داس مہِ نو — یادم از کشتۂ خویش آمد و ہنگامِ درو

گفتم اے بخت بخسپیدی و خورشید دمید — گفت با این ہمہ از سابقہ نومید مشو

تکیہ بر اخترِ شب گرد مکن کاین عیار — تاج کاؤس ربود و کمرِ کیخسرو

گر روی پاک و مجرد چو مسیحا بفلک — از فروغ تو بخورشید رسد صد پرتو

آسماں گو مفروش این عظمت کاندر عشق — خرمن مہ بجوی خوشۂ پروین بدو جو

گوشوار در و لعل ارچہ گراں دارد گوش — دور خوبی گذرانست نصیحت بشنو

ہر کہ در مزرع دل تخم وفا سبز نکرد — زرد روئی کشد از حاصل خود گاہ درو

رسم دنیا کے مطابق اگر شاعر کبھی دشواریوں اور ناکامیوں سے دوچار بھی ہوا ہے تو اس کے باوجود اس نے اپنے عارفانہ ارادوں اور فیروزمند جولانیوں کو پست ہونے نہیں دیا ہے۔ اس کے عزم میں کبھی فرق نہ آنے پایا۔ شوق حیات اور نورِ اُمید سے اس کا دل محروم نہیں ہونے پایا۔ بلکہ اس نے سینہ سپر ہو کر حوادث کا مقابلہ کیا ہے اور لب پر یہی نعرہ رہا۔ "چرخ برہم زنم ار غیر مرادم باشد"۔ اپنی مستقل مزاجی، اپنی توانائی، اپنی بردباری اور اپنی آزادگی کے بارے میں کیا خوب فرما گئے ہیں :

برسرِ آنم کہ گر ز دست برآید — دست بکاری زنم کہ غصہ سرآید

خلوتِ دل نیست جای صحبت اغیار — دیو چو بیروں رود فرشتہ درآید

صحبت حکام ظلمت شب یلداست — نور ز خورشید خواہ بو کہ برآید

بر در ارباب بیمروت دنیا — چند نشینی کہ خواجہ کی بدر آید

بگذر ایں روزگار تلخ تر از زہر — بار دگر روزگار چوں شکر آید

بلبل عاشق تو عمر خواہ کہ آخر — باغ شود سبز و سُرخ گل بدر آید

صبر و ظفر ہر دو دوستان قدیمند — بر اثر صبر نوبت ظفر آید

جامی۔ نورالدین عبدالرحمٰن جامی نے ۸۱۷ھ میں صوبہ خراساں کی ولایت جام کے

ایک قصبہ خرجرد میں پیدا ہوئے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

بسال ہشت صد و ہفدہ ز ہجرت نبوی — کہ روز مکہ بہ یثرب سرادقات جلال

زاوج قلہ پرواز گاہ عز و قدم — بدیں حضیض ہوا پست کردہ ام پر و بال

آپ کے والد کا نام نظام الدین دشتی اور دادا کا نام شمس الدین دشتی تھا۔ دشتی کی نسبت اصفہان کے محلہ دشت سے ہے جہاں وہ جام سے ہجرت کر کے آ بسے تھے۔

جامی نے اپنا تخلص ایک تو ولایت جام کی نسبت سے اور دوسرے شیخ الاسلام احمد جامی (متوفی ۵۳۶ھ) کی جناب میں ارادت کی وجہ سے جامی اختیار کیا تھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

مولدم جام و رشحۂ قلمم — جرعۂ جام شیخ الاسلامیست

لاجرم در جریدۂ اشعار — بدو معنی تخلصم جامیست

بچپن میں جامی اپنے والد کے ساتھ ہرات آئے۔ اس کے بعد سمرقند تشریف لے گئے یہ مقامات اس زمانہ میں اسلامی علوم اور ایرانی ادب کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ آپ نے یہاں علم و ادب کی تحصیل کی اور دینی علوم اور ادب و تاریخ میں کمال حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ نے عالم عرفان میں قدم رکھا اور سیر و سلوک کی دنیا میں پہنچ گئے۔ سعد الدین محمد کاشغری، خواجہ علی سمرقندی اور قاضی زادہ رومی جیسے استادوں اور مرشدوں کی پیروی شروع کی۔ اسی طرح آپ نے ریاضت کے راستے پر قدم رکھا، روز بروز معنوی مقامات میں ترقی کرتے گئے، یہاں تک کہ طریقۂ نقشبندیہ (جس کے موسس حضرت بہاء الدین نقشبند ہوئے ہیں) کے مرشدانِ کامل میں شمار کیے جانے لگے۔ چنانچہ نقشبندی خلیفہ سعد الدین کاشغری کی وفات کے بعد اس طریقہ کی خلافت آپ کو ملی۔ آپ اپنے زمانے ہی میں مشہور عوام و خواص ہو چکے تھے۔ ہر چھوٹا بڑا آپ کو جانتا اور آپ کا احترام کرتا تھا۔ آپ نے امراء اور عمائدین سلطنت کی کبھی مدح نہ کی۔ اس کے باوجود یہ لوگ آپ کے بڑے معتقد تھے۔ آپ کو

اپنی مجلس میں صدر میں جگہ دیتے تھے اور آپ کی ذات گرامی کا بڑا ادب اور احترام کرتے تھے۔

اس کے بعد جامی نے پھر سفر اختیار کیا۔ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، دمشق کے راستے تبریز واپس ہوئے اور ۸۷۸ھ میں ہرات آئے۔ اس سفر میں بغداد والوں نے آپ کے ساتھ برا سلوک کیا۔ ہمارا شاعر اس شہر سے دل شکستہ لوٹا اور ایک قصیدہ میں ان کی نادانی کی شکایت کی ہے، اس قصیدے کا مطلع ہے:

بگشای ساقیا بلب شط سر سبوی ۔۔۔ وز خاطرم کدورت بغدادیاں بشوی

جامی کے معاصر دولت شاہ سمرقندی کی روایت کے مطابق جامی نے آخری عمر میں شاعری ترک کر دی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے شاذ و نادر ہی شعر کہا۔ وہ دینی مسائل کی تحقیق میں ہمہ تن مصروف ہو گئے چنانچہ کہتے ہیں:

جامی دم گفت گو فرو بند دگر ۔۔۔ دل شیفتہ خیال مپسند دگر

در شعر مدہ عمر گراں مایہ بباد ۔۔۔ انگار سیہ شد ورقی چند دگر

جامی کے زمانہ کے مشہور و معروف سلاطین میں ابو الغازی سلطان حسین بایقرا بھی تھا۔ اس نے ۸۷۲ھ میں سلطان ابو سعید تیموری کو شکست دی، ہرات میں جلوس کیا اور ۹۱۲ھ تک حکومت کی۔ یہ سلطان نہ صرف خود ادبی ذوق رکھتا تھا اور ادیبوں کی سرپرستی کرتا تھا بلکہ اس کا دانشمند وزیر میر علی شیر نوائی اپنے زمانے کے اہل علم و فضل میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس نے فارسی اور ترکی زبان کی نظم و نثر دونوں میں اپنی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں اس صاحب دل وزیر کی جامی کے ساتھ بڑی گہری دوستی تھی۔ علی شیر نے اپنی کتاب خمسۃ المتحیرین میں جامی کا حال تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ جامی نے دوسرے سلاطین میں سلطان ابو سعید تیموری (۸۵۵ - ۸۷۲ھ)، سلطان یعقوب آق قونیلو (۸۸۴ - ۸۹۶ھ)، جہاں شاہ قراقونیلو (۸۴۱ - ۸۷۲ھ) اور عثمانی ترک سلطان محمد فاتح (۸۵۵ - ۸۸۶ھ) کے

کے نام اپنے قصائد اور دوسرے اشعار میں لیے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جامی نویں صدی کے سب سے بڑے ادیب اور شاعر اور ایران کے وہ آخری بڑے صوفی شاعر ہیں جن کا نام انوری، سعدی، مولانا روم، حافظ، خیام اور فردوسی کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ جامی کے بعد ندرت اور جدت رکھنے والے بڑے شاعر سرزمین ایران میں پیدا نہیں ہوئے۔ جامی نے نہ صرف شاعری کی ہے بلکہ وہ دینی علوم، اور ادب و تاریخ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ امیر علی شیر نوائی جو خود بھی اپنے زمانے کا بڑا زبردست ادیب اور عالم تھا، جامی کے کمالات کی تعریف میں کہتا ہے:

عاجز از تعداد اوصاف کمال اوست عقل
انجم گردوں شمردن کی طریق اعورست

جامی کے اشعار میں شعرائے سلف کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے صوفی شاعروں سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے اور ان کے سبک کی پیروی کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود "ہفت اورنگ" نظم میں جامی کے مقتدائے خاص نظامی ہیں۔ غزلیات میں اُنہوں نے سعدی، حافظ، خاقانی اور امیر خسرو کی بھی پیروی کی ہے۔

امیر خسرو کی طرح جامی بھی اپنی بداعت اور تصانیف کی کثرت کے لیے مشہور ہیں بعض مصنفوں کے قول کے مطابق ان کی نظم و نثر کی تصانیف کی تعداد ان کے تخلص "جامی" کے حروف کے اعداد کے مساوی ہے۔ یعنی جملہ (۵۴) دفتر اور رسالے ہیں۔

ان کی منظوم تصانیف میں ایک ان کا دیوان اشعار بھی ہے۔ اس میں قصیدے، غزلیں، مرثیے، ترجیع بند، ترکیب بند، مثنویاں اور رباعیاں ہیں۔ خود جامی نے اپنے دیوان کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کا نام "فاتحۃ الشباب"، "اوسط العقد" اور "خاتمہ الحیات" رکھا ہے۔ اس تقسیم میں کچھ عجب نہیں انہوں نے امیر خسرو کی پیروی کی ہو۔ ان اشعار میں ملمعات بھی ہیں۔ یہ عربی زبان پر جامی کے کامل عبور کے شاہد ہیں۔ یہ قطعی طور پر کہا جا سکتا

ہے کہ جامی کے قصیدے متین، ان کی غزلیں عرفانی، شیریں اور دلکش اوزان کی حامل ہیں۔ شاعر کے قصیدوں میں روحانی اور اسلامی عقائد کے حامل اشعار کی کمی نہیں۔ اور ان کا ہر شعر ان کے ایمان اور ان کی دیانت کی دلیل ہے۔ امیروں کی مدح میں انہوں نے جو قصیدے لکھے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ بالکل واضح ہے کہ انہوں نے شاعرانِ سلف کو اپنے پیش نظر رکھا تھا اس قصیدے میں:

چو پیوند با دوست خواہی ای دل　　ز چیزی کہ جز اوست پیوند بگسل

ایک حد تک منوچہری کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ ان قصیدوں میں:

معلم کیست عشق و کنج خاموشی دبستانش　　سبق نادانی و دانا دلم طفل سبق خوانش

... ٭ ...

کنگر ایوان شہ کز کاخ کیواں برترست　　رخنہ‌ها زاں کش بدیوار حصار دیں درست

خاقانی کا تتبع کیا ہے۔ اسی طرح اور دوسرے شعراء مثلاً امیر خسرو کی پیروی کی۔ ان کی شاعرانہ اور عارفانہ دونوں قسم کی غزلیں نہایت پُر مغز اور بامعنی ہوتی ہیں ان کے اشعار ایک حساس اور پرسوز قلب آتشیں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً ان کی یہ غزل ملاحظہ ہو:

ریزم ز مژہ کوکب بی ماہ رخت شبہا　　تاریک شبی دارم با ایں ہمہ کوکبہا

چوں از دل گرم من بگذشت خدنگ تو　　از بوسہ پیکانش شد آبلہ ام لبہا

از بسکہ گرفتاراں مردند بکوے تو　　بادش ہمہ جاں باشد خاکش ہمہ قالبہا

از تاب و تب ہجراں گفتم سخن وصلت　　بود ایں ہذیاں آری خاصیت آں تبہا

غزل میں جامی نے متقدمین عارفوں کی پیروی کی اور خاص کر حافظ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ اور کبھی ان کی غزلوں پر غزل کہی ہے۔ مثال کے طور پر یہ غزل حافظ کو سامنے رکھ کر لکھی ہے۔

ساقی بیا کہ دور فلک شد بکام ما　　خورشید را فروغ دہ از عکس جام ما

جامی کی ایسی غزلیں جن میں انہوں نے وحدت کا نغمہ الاپا ہے ان میں ایک ذیل کی غزل نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہے:

موثر در وجود الا یکے نیست — دریں حرف شگرف اصلا شکے نیست
ولی جز زیرکاں ایں را نداننػد — دریغا زیر گردوں زیرکے نیست
جمال اوست تاباں ورنہ بیروں — دل مرداں دل ہر کودکے نیست
عطائے عشق بسیار ست دردا — کزآں بسیار مارا اندکے نیست
بارباب عمامہ معنی فقر — مجو کایں تاج بر ہر تارکے نیست

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے مثنویات میں جامی نے نظامی کو اپنا استاد قرار دیا ہے اور خمسۂ نظامی کے جواب میں سات مثنویاں "ہفت اورنگ" کے نام سے لکھی ہیں۔ ان مثنویوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ سلسلۃ الذہب: یہ مثنوی فلسفیانہ، دینی اور اخلاقی مسائل پر لکھی ہے۔ اس میں حکایتیں اور مثالیں بھی آئی ہیں۔ اس میں اسلامی عقائد و اصول، قرآن کی بعض آیتوں کی تفسیر اور بعض فلسفیانہ مسائل جیسے جبر و قدر، عرفان کے معنی، اور حقیقت حق جیسے مسائل پر بھی بحث کی ہے۔ حقیقت حق کی بحث میں فرماتے ہیں:

اوست مغز جہاں جہاں ہمہ پوست — خود چہ مغز و چہ پوست چوں ہمہ اوست
بود کل جہاں در او مستور — کرد در کل بذات خویش ظہور

جامی نے یہ مثنوی سلطان حسین کے نام معنون کی ہے اور اس کے ضمن میں مشہور شعراء جیسے عنصری، رودکی، سنائی، نظامی، معزی اور انوری کا نام لیا ہے۔ یہ مثنوی نظامی کی مثنوی ہفت پیکر کے جواب میں لکھی گئی ہے اور اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

للہ الحمد قبل کل کلام
بصفات الجلال والاکرام

۲۔سلامان وابسال: یہ مثنوی ایک قدیم قصہ سے ماخوذ ہے اور جامی سے پہلے شیخ الرئیس ابو علی سینا نے اسے اقتباس و تصنیف کیا تھا۔ جامی نے اس قصہ میں بھی صوفیانہ مطالب بیان کیے ہیں۔ شاعر نے اسے اوزون حسن آق قونیلو (۸۸۳-۸۹۶ھ) کے بیٹے یعقوب بیگ کے نام معنون کیا ہے۔

۳۔تحفۃ الاحرار: یہ دینی اور عرفانی مثنوی ہے اور نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار کے جواب میں ۸۸۶ھ کے قریب لکھی گئی ہے۔ اس میں بارہ باب ہیں۔ جامی نے یہ مثنوی طریقہ نقشبندیہ کے ہادی خواجہ ناصر الدین عبید اللہ معروف بہ خواجہ احرار کی مدح میں لکھی ہے۔ اس کا مطلع ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم هست صلای سر خوان کریم

۴۔سبحۃ الابرار: یہ مثنوی بھی دینی اور عرفانی معنی کے بیان میں لکھی ہے اور سلطان حسین کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں نہایت لطیف حکایتیں اور نادر تمثیلیں بیان کی گئی ہیں۔ سبحۃ الابرار کے مقدمہ کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے:

ابتدی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم المتوالی الاحسان

پوری مثنوی میں چالیس "عقد" مختلف عرفانی موضوعات پر لکھے ہیں۔ مثلاً وصفِ دل، شرح سخن، آثار سے پروردگار کے وجود پر استدلال کیونکہ حق تعالیٰ حقیقت وجود ہے۔ تصوف کی شرح وغیرہ وغیرہ۔ ہر "عقد" کی شرح کے بعد اس کے ضمن میں دو ایک حکایتیں بطور تمثیل پیش کی ہیں۔ پچھلے شاعروں کی بھی یہی طرز رہی ہے اور شیخ عطار اور مولانا روم اسی اسلوب پر کاربند تھے۔ مثلاً باب اخلاص کے ستائیسویں عقد میں فرماتے ہیں:

چیست اخلاص دل از خود کندن کار خود را بخدا افگندن
نقد دل از ہمہ خالص کردن روی چون زر بخلاص آوردن
دل باسباب جہاں نا دادن دیدہ بر خور جہاں ننہادن

ساختن از دو جہاں قبلہ یکی   تافتن روئے زہر وہم و شکے

اسی مناسبت سے وہ اس حکایت کو پیش کرتے ہیں، تاکہ اس سے اخلاص کی تاثیر اور اس کی اہمیّت واضح ہو سکے۔ بے ریائی اور صفا کے قلب کی خوبی روشن ہو سکے، اور یہ معلوم ہو جائے کہ قلب و نیّت کی اہمیّت زیادہ ہے۔ زبان و بیان کی کوئی اہمیّت نہیں۔

عربے چند ہم ذوق کناں   لب گشادند بنادر سخناں

یکے از نجد حکایت می کرد   یکے از وجد روایت می کرد

یکے از ناقہ و محمل می گفت   یکے از وادی و ساحل می گفت

ناگہاں مخلصے از ملکِ عجم   زد بسر منزل آں قوم قدم

بفنونِ ادبش راہ نبود   در زبانِ عرب آگاہ نبود

شد گمانش کہ دعا می خوانند   سخن از حمد و ثنا می رانند

او ہم آنجا بتواضع بنشست   گریہ و آہ و فغاں در پیوست

ہرچہ آں قوم بیاں می کردند   باہم اسرار عیاں می کردند

او بتقلید ہماں را می گفت   گوہر اشک بمژگاں می سفت

حشو می گفت و دعا می پنداشت   ذم ہمی گفت و ثنا می پنداشت

لیک چوں بر لبش آں خاص کلام   بود در معنیٔ اخلاص تمام

یافت در بارہ وے حکم دعا   داد خاصیّتِ غفران و رضا

شد از آں دعوت از نخوت دور   جرم او عفو و گناہاں مغفور

۵۔ یوسف زلیخا: یہ جامی کی مشہور ترین مثنوی ہے اور نظامی کی مثنوی خسرو شیریں کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۸۸۸ھ ہے اور یہ بھی ابوالغازی سلطان حسین کے نام معنون کی گئی ہے۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

الٰہی غنچۂ امید بکشائے   گلے از روضۂ جاوید بنمائے

۶- لیلیٰ و مجنوں : یہ مثنوی نظامی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں کے جواب میں لکھی ہے اور سنہ ۸۸۹ء میں چار مہینے کے اندر اسے تمام کیا ہے۔ اس مثنوی میں ۳۷۶۰ شعر ہیں، مثنوی کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے :

اے خاکِ تو تاجِ سربلنداں　　مجنونِ تو عقلِ ہوشمنداں

۷- خرد نامۂ اسکندری : یہ نظامی کی مثنوی سکندر نامہ کے جواب میں لکھی ہے اور اسے بھی سلطان حسین کے نام معنون کیا ہے۔ مثنوی کی ابتدا اس شعر سے کی ہے۔

الٰہی کمالِ الٰہی تراست　　جمالِ جہاں پادشاہی تراست

یہاں اس مثنوی سے ایک لطیف بند نقل کیا جاتا ہے جو آپ نے اپنے صاحبزادے کو مخاطب کر کے لکھا ہے :

بیا اے جگر گوشہ فرزندِ من　　بنہ گوش بر گوہرِ پندِ من

صدف وار بنشیں دمے لب خموش　　چو گوہر فشانی بمن دار گوش

شنو پند و دانش بآں یار کن　　چو دانستی آنگہ برو کار کن

زگوش ار نیفتد بدل نورِ ہوش　　چہ سوراخ گوش و چہ سوراخ موش

بدانش کہ آں با کنش یار نیست　　بجز ناخردمند را کار نیست

بزرگاں کہ تعلیم دیں کردہ اند　　بخرداں وصیت چنیں کردہ اند

کہ اے ہمچو خرداں روشن ضمیر　　چو صبح از صفا شیوۂ صدق گیر

بہر کار دل با خدا راست دار　　کہ از راستکاری شوی رستگار

بطاعت چہ حاصل کہ پشتِ دوتاست　　چو روئے دلت نیست با قبلہ راست

ہمی باش روشن دل و صاف رائے　　بہ انصاف با بندگانِ خدائے

دمِ صبحگاہاں چو گرداں سپہر　　بہ آفاق مگشائی جز چشم مہر

ازاں چرخ را پرتوے حاصل ست　　کہ ہر ذرہ را مہر او شامل ست

چو باید بزرگیت پیرانہ سر | بچشمِ بزرگی بہ پیراں نگر
بخصم درونی کہ آں نفس تست | ز تو بردباری نباشد درست
نصیحت گری بر دلِ دوستاں | بود چوں دمِ صبحگہ بوستاں
بدرویش محتاجِ بخشش نمائی | فروبستہ کارش بخشش گشائی
تواضع کُن آں راکہ دانشور ست | بدانش ز تو قدرِ او برتر است

اسی طرح شاعر نے دُوسرے مقامات پر بھی جیسے یوسف و زلیخا کے خاتمہ پر اپنے فرزند کو نصیحت کی ہے۔

اُوپر جن مثنویوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جامی نے نظامی کی خوب پیروی کی ہے، اور اس شاعر کی تصانیف کو اپنے لئے نصب العین قرار دیا ہے۔ جامی نے نظامی کے سبک کی پیروی کی ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ عام طور پہ اس نے نظامی سے سادہ تر اور بیشتر شیریں تر سخن سرائی کی ہے، حالانکہ یہ مسلّم ہے کہ بزمیہ یا داستانی مثنوی میں استاد نظامی یکتا ہنرور اور احساسات کے بیان میں بے ہمتا ہیں۔

جامی نے مسمط بھی لکھے ہیں اور نہایت دل نشیں اور پُر اثر مرثیے بھی کہے ہیں۔ ان کا ایک نہایت جاں گداز مرثیہ ان کے بیٹے صفی الدین کا مرثیہ ہے۔ اس مرثیہ سے ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے جو بہت مشہور ہے۔

زیرِ گل تنگدل اے غنچۂ رعنا چونی | بے تو ما غرقہ بخونیم تو بے ما چونی
سلکِ جمعیتِ ما بے تو گسست از ہم | ما کہ جمعیم چنینیم تو تنہا چونی
بر سرِ خاک توام ایکہ ازیں پیشترم | بودہ تاجِ سرِ امروزتہ پا چونی
بے تو در روئے زمیں تنگ شدہ بر من جا | تو کہ در زیرِ زمیں ساختہ جا چونی
می شود دیدۂ بینا زخیالے تیرہ | زیرِ خاک آمدہ اے دیدۂ بینا چونی
خورد غمہائے توام وہ کہ خیالِ تو گہے | می نپرسد کہ دریں خوردنِ غمہا چونی
رو بصحرائے عدم تاختی از شہرِ وجود | من ازیں شہر ملولم تو بصحرا چونی

جیساکہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، جامی صرف شاعر ہی نہیں تھے، شاعری کے سوا وہ دوسرے علوم جیسے دینی، لسانی اور تاریخی علوم میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں جامی نے فارسی نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے بعض مشہور ترین کتابیں یہ ہیں:

۱۔ نقد النصوص فی شرح نقش الفصوص: یہ کتاب فلسفہ اور تصوّف کی کتاب فصوص الحکم کے مصنّف شیخ محی الدین عربی (متوفّی سنہ ۶۳۸ء) کے عقائد کی شرح و تفسیر ہے اور نقش الفصوص خلاصہ ہے فصوص الحکم کا۔ اس کتاب میں جامی نے فصوص کے دوسرے شارحوں کے اقوال اور خاص کر شیخ صدر الدین قونیوی کے عقائد کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ نقد النصوص کی تالیف کا سال سنہ ۸۶۳ء ہے۔

۲۔ نفحات الانس: یہ (۶۱۴) علماء و فضلاء اور صوفی اولیاء کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ سنہ ۸۸۳ء میں تالیف ہوا۔ اس کتاب کی اصل محمد بن حسین سلمی نیشاپوری (متوفّی ۴۱۲) کی عربی کتاب طبقات الصوفیہ ہے۔ بعد میں خواجہ عبداللہ انصاری (متوفّی ۴۸۱) نے اسے ہروی زبان میں منتقل کیا اور اس میں اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ اس کے بعد جامی نے امیر علی شیر نوائی کی فرمائش پر اسے نئے سرے سے ادبی فارسی میں لکھ کر مکمّل کیا اور اپنے زمانے تک کے صوفیہ کے حالات کا اس میں اضافہ کیا۔

۳۔ لوائح: یہ کتاب نہایت عمیق عرفانی مقالات اور عارفانہ رباعیات پر مشتمل ہے۔

۴۔ لوامع: یہ ابن فارض کے خمریہ قصیدہ کی شرح ہے اور ۸۷۵ھ میں تالیف ہوئی۔

۵۔ شواہد النبوّۃ: اس کا سنہ تالیف ۸۸۵ھ ہے۔ اور یہ کتاب حضرت رسول اللہ صلعم کے مقامات کی شرح اور اصحاب کرام کی مدح میں لکھی ہے۔

۶۔ اشعۃ اللمعات: یہ کتاب سنہ ۸۸۶ء میں تالیف ہوئی اور شاعر عارف فخر الدّین عراقی (متوفّی ۶۸۸ء) کی کتاب لمعات کی شرح و تفسیر میں لکھی ہے۔

۷۔ بہارستان: اپنے صاحبزادے یوسف ضیاء الدین کو گلستاں پڑھانے کے دوران

میں اِس کتاب کی تصنیف کا ارادہ کیا اور گلستاں کی طرز میں ۸۹۲ھ میں اس کو تمام کیا۔ گلستاں کی طرح یہ کتاب بھی لطیف حکایات اور ظریف نکات سے مملو ہے۔ اس میں نہایت اچھے شعر آئے ہیں اور بعض علما اور شعرا کا ذکر بھی آگیا ہے۔

اوپر جن کتابوں کا ذکر ہوا اُن کے سوا جامی نے کئی رسالے بھی تصنیف کئے ہیں، اُن میں سے بعض رسالے دینی مسائل پر ہیں۔ جیسے ابی ذر عقیلی کی حدیث کی تفسیر، چہل حدیث (جس میں عربی متن دے کر ہر حدیث کی فارسی نظم میں شرح کی ہے، مناسک حج، رسالہ تہلیلیہ وغیرہ جامی نے علم و ادب اور عروض پر جو رسالے لکھے ہیں، اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں" رسالہ در علم قوافی" "رسالہ موسیقی"، "تجنیس الخط"، "منشات" اور "معجیات" وغیرہ صرف ونحو پر جو رسالے لکھے ہیں ان میں کتاب "فوائدالضیائیہ" جو شرح ملا جامی کے نام سے مشہور ہے اور تاریخ میں "تاریخ صوفیاں" وغیرہ شامل ہیں۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، جامی ایران کے مشہور شاعروں اور عارفوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جامی کے مشہور معاصر جیسے بابر، میر علی شیر نوائی اور دولت شاہ سمرقندی ان کا نام تعظیم و تکریم کے ساتھ لیتے ہیں اور انھوں نے جامی کی عظمت ایران اور ایران سے باہر دوسرے ملکوں میں ان کے کلام کی مقبولیت کا تذکرہ کیا ہے۔

جامی کا امتیازِ خاص وہ مقام اور مرتبہ ہے جو انھوں نے عالم تصوّف و عرفان میں حاصل کیا تھا اور وہ اس مشرب کے پیروؤں کے خلیفہ اور قطب مانے گئے ہیں۔

ہندوستان اور خاص کر ترکی عثمانی ادبیات پر جامی کے افکار و اشعار کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے، خود سلاطین عثمانی جیسے سلطان محمد فاتح (۸۵۵ — ۹۱/۰) جامی سے ارادت رکھتے تھے۔ اور ان سے خط و کتابت کرتے تھے۔ عثمانی شعرا میں سے بہت سے شاعروں نے جامی کے سبک اور ان کے عقائد کی پیروی اور تقلید کی ہے، اور عثمانی ادبیات کی بنیاد ایرانی ذوق اور ایرانی طرز پر رکھی ہے۔

جامی نے ۸۹۸ھ میں بمقام ہرات وفات پائی۔ نہایت شان و شوکت کے ساتھ آپ کا

جنازہ اُٹھایا گیا، اور علماء و فضلاء اور اُمرائے وقت کی موجودگی میں سپردِ خاک کیا گیا۔ آپ کی تاریخِ وفات کا مادّہ اس آیت سے نکالا گیا ہے وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ط

مغلوں اور تیموریوں کے دَور کا نثری ادب

مغلوں اور تیموریوں کے عہد میں مملکتِ ایران کے مختلف حصّوں میں فتنہ، وفساد اور انحطاطِ علم و ادب کے باوجود فارسی نثر میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ظاہر ہے اگر اس دَور کے ناگوار واقعات پیش نہ آئے ہوتے تو ایران کے ادب میں اور بھی ترقّی ہوئی ہوتی۔ کیونکہ جیساکہ اُوپر اشارہ کیا جاچکا ہے مغلوں کے استیلا کے وقت ایرانی ادبیات اور ایرانی تمدّن دونوں اپنے کمال پر پہنچ چکے تھے، بڑے بڑے استادوں اور بڑے بڑے صاحبانِ علم نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کردیا تھا۔ علم و معرفت کے ان خزانوں میں سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اسے ان کا ایک حصّہ سمجھنا چاہیئے اور یہ بھی بعض چھوٹے چھوٹے خاندانوں کے آفات سے محفوظ رہنے اور علم و دانش کی سرپرستی کرنے کی وجہ سے باقی بچ رہا۔ اتابکانِ فارس، آلِ جلایر، آلِ مظفر اور آلِ کرت کی دانش پروری یا متاخّر سلاطین مغول و آلِ تیمور کی حمایت اور تشویق کی وجہ سے ادب کے جو خزانے جمع ہوئے تھے اُن میں سے ملک میں امن و امان، باشندوں کی فراغت اور فتنہ مغول سے مامون ہونے کے باوجود صرف ایک حصّہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس دَور کی بعض اہم نثری تصانیف کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

تاریخی کتابیں

مغلوں اور تیموریوں کے دَور سے پہلے بھی تاریخ ایران پر اہم اور مشہور تصانیف عالم وجود میں آچکی تھیں۔ اُن میں سے بعض جیسے تاریخ طبری، تاریخ بیہقی، زین الاخبار اور راحت الصدور کا ذکر اس کتاب میں آچکا ہے۔ ایران میں تاریخ نویسی بہت پہلے سے شروع ہوچکی

تھی لیکن اس آخری دور میں تاریخ نویسی کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اور بعض ایسی مشہور کتابیں مغل اور تیموری بادشاہوں کے نام پر لکھی گئیں جو آج ایران کی عمومی تاریخ کے اہم ترین ماخذوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

تاریخ جہاں گشا: اس دور کی اہم ترین تاریخوں میں ایک تاریخ جہاں گشا ہے، یہ علاءالدین عطاملک جوینی بن بہاءالدین محمدؔ کی تصنیف ہے۔ عطاملک جوینی مغل امراء اور خاص کر ہلاکو خاں اور اباقاخاں کا درباری ملازم تھا اور ان کی طرف سے عراق، عرب اور دوسرے صوبوں کی حکومت پر مقرر تھا۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں مصنّف نے مغلوں کی عادات و اخلاق، ان کی فتوحات، اُن کے بادشاہوں کے حالات خاص کر چنگیز خاں کے حالات ۶۵۵ھ تک نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اسی کے ضمن میں خوارزمشاہیوں اور اسماعیلیوں کی تاریخ بھی لکھی ہے۔ اِس کتاب کی اہمیت اور شہرت کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ تقریباً تمام تاریخ نویسوں نے اس کتاب کے مضامین نقل و اقتباس کئے ہیں۔

عطاملک نے ۶۸۱ھ میں آذربائیجان میں وفات پائی، اور تبریز کے مقبرۂ سرخاب میں دفن ہوا۔

طبقات ناصری: طبقاتِ ناصری ایک عمومی تاریخ ہے اور ابتداء سے ۶۵۸ء تک کے حالات اِس میں بیان کئے گئے ہیں۔ اِس کتاب کے بہترین مضامین وہ ہیں جو ہندوستان کے حکمران خاندانوں کے حالات پر لکھے ہیں اور اس کے ضمن میں تاریخ ایران کے بعض اہم واقعات جیسے غزنوی دور کے حوادث، مغلوں کی سلطنت کی ابتداء اور خاص کر اسماعیلیوں کے قلع قمع کے واقعات جن کا خود مصنّف عینی شاہد رہا ہے، نہایت متین اور رواں طرز میں بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کا مصنّف ابو عمر عثمان منہاج الدین جُورجان کا رہنے والا تھا، اُس نے ہندوستان میں زندگی بسر کی۔ تین بار ہندوستان کے سلاطین کا سفیر بن کر ایران کا سفر کیا اور اس زمانے کے بہت سے اہم واقعات کا اپنی آنکھوں سے مُشاہدہ کیا۔

تاریخ یمینی : اس کتاب کی اصل ابو نصر عتبی کی عربی کتاب ہے عتبی سلطان محمود غزنوی کے دربار کا ملازم تھا، اور اس نے یہ کتاب محمود اور اس کے باپ سبکتگین کے حالات پر پانچویں صدی ہجری کی ابتداء میں لکھی تھی۔ ابو شرف ناصح گلپایگانی نے ساتویں صدی کے آخر میں اس کا ترجمہ نہایت رواں اور سلیس فارسی میں کیا۔

یہ کتاب محمود غزنوی کی تاریخ کی صحیح جزئیات پر مشتمل ہونے کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

جامع التواریخ : جامع التواریخ کا شمار اہم ترین اور مشہور ترین تاریخوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب وقائع عالم اور خاص کر مغلوں کی سلطنت اور غازان کی بادشاہت کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔ اِس کتاب کے مصنّف رشید الدین فضل اللہ ہمدانی کو اباقا غازان اور الجایتو جیسے مغل بادشاہوں کے پاس بڑا تقرب حاصل تھا۔ غازان کے دربار میں وہ منصبِ وزارت پر فائز تھا اور کافی اثر رسوخ رکھتا تھا۔ رشید الدین فضل اللہ نے اپنی یہ کتاب سنہ ۱۳۱۰ء میں ختم کی۔ اِس کتاب کی تیسری جلد بھی تھی جو جغرافیہ پر لکھی گئی تھی۔ یہ جلد اَب ناپید ہو گئی ہے۔

اِس کتاب کو مغلوں کی اہم ترین تاریخ کہا جا سکتا ہے، خواجہ رشید الدین نہ صرف ایک زبردست وزیر اور اہم سیاسی مرتبہ کا حامل مشہور محقّق تھا بلکہ وہ اور دُوسرے علوم و فنون میں بھی کافی بصیرت رکھتا تھا۔ اس نے دینی اور ادبی مسائل پر کئی مُفید اور اہم کتابیں لکھی ہیں ۱۳۱۸ء میں دشمنوں اور حاسدوں نے اِس دانشمند وزیر کے خلاف سازش کی، اور سلطان ابو سعید کے حکم پر تبریز میں قتل کر دیا گیا۔

تاریخ وصاف : یہ تاریخ ادیب شہاب الدین عبد اللہ شیرازی ملقب بوصاف حضرۃ کی تصنیف ہے۔ یہ رشید الدین فضل اللہ کا ہم عصر تھا۔ رشید الدین نے اس کی سرپرستی کی تھی اور اسے الجایتو کے دربار میں پیش کیا تھا۔ تاریخ وصاف اصل میں تاریخ جہاں گشا کا

تتمہ ہے اور ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی فتح سے لے کر ۷۲۸ء تک کے حوادث اِس میں درج
ہیں یعنی مغلوں کے آخری بادشاہ ابوسعید کے زمانے تک کے حالات پر یہ کتاب محتوی ہے
کتاب وصاف بے ضرورت طولِ کلام، تعقیدِ عبارت، تصنع اور اطناب کی وجہ سے دَورِ
مغول کی ثقیل فارسی کے سبک کا نمونہ سمجھی جاتی ہے، لیکن مصنّف کے زمانے کی نہایت اہم
اور مُفید باتیں اور تاریخی تفصیلات اِس کتاب میں درج ہیں۔

تاریخ گزیدہ: تاریخ جہاں گشا اور جامع التواریخ کی تصنیف کے بعد تاریخِ
گزیدہ تصنیف ہوئی ہے اور اسی سبک میں لکھی گئی ہے، اور اصل میں جامع التواریخ سے عمدہ
مطالب اس میں نقل کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۷۳۰ء میں ختم ہوئی۔ اور یوں اس کے
آخر میں تازہ مطالب آگئے ہیں۔ اس کے مصنّف حمد اللہ مستوفی قزوینی نے ایک اور مفصّل
تاریخ شاہنامے کی طرز میں لکھی ہے۔ اس کتاب میں ۷۵۰۰۰ شعر ہیں، اور ابتدائے اسلام
سے لے کر دورِ مغول تک کے واقعات اس میں بیان کئے گئے ہیں۔ مصنّف نے ۷۳۰ء
میں اِسے ختم کیا ہے، اور ظفر نامہ اس کا نام رکھا ہے۔ اس کے سوا اِسی مصنّف نے ایک
نہایت اہم جغرافیائی کتاب ایران کے شہروں اور راستوں کے بارے میں لکھی ہے، اس
کا نام نزہت القلوب رکھا ہے اور اسے ۷۴۰ء میں تصنیف کیا ہے۔ حمد اللہ مستوفی نے
۷۵۰ء میں بمقام قزوین وفات پائی۔

زبدۃ التواریخ: زبدۃ التواریخ ایک عمومی تاریخ ہے۔ اور چار جلدوں میں
لکھی گئی ہے۔ لیکن اِس کی تیسری اور چوتھی جلدیں جو بعدِ اسلام ایران کی عمدہ تاریخ تھی
اِس وقت نہیں ملتیں، شاید ناپید ہو گئی ہیں۔ زبدۃ التواریخ کا مصنّف نورالدّین
لطف اللہ معروف بحافظ آبرو ہرات کا رہنے والا تھا۔ اور تیمور اور اس کے بیٹے شاہ رُخ
اور خاص کر بایسنغر کے دربار سے تعلّق رکھتا تھا۔ اس نے یہ کتاب ۸۳۰ء میں
تصنیف کی ہے۔

اِس دور کی اور تاریخوں میں فصیحی خوافی کی تصنیف "مجمل فصیحی" قابلِ ذکر ہے۔ یہ ابتداء سے نویں صدی ہجری کے وسط تک کی ایک عمومی اور مختصر مفید تاریخ ہے، اس کے سوا عبدالرزاق سمرقندی کی تاریخ "مطلع السّعدین" بھی قابلِ ذکر ہے، اس میں سلطان ابوسعید ایلخانی اور ابوسعید تیموری کی ولادت یعنی ۷۰۴ھ سے لے کر ۸۷۲ھ تک کے درمیانی سالوں کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ اِسی طرح معین الدین اسفرازی کی تصنیف "تاریخ ہرات" بھی قابلِ ذکر ہے جو تیموری دَور کے آخر میں تصنیف ہوئی ہے۔

ظفرنامہ : ظفرنامہ دو جِلدوں میں تیمور کی مفصّل تاریخ ہے اور اِس میں تیمور کی ولادت سے لے کر اس کی وفات (۸۰۷ھ) تک کے واقعات درج ہیں۔ ان کا مصنّف شرف الدین علی یزدی ابتدائی تیموری دَور کے ادیبوں اور شاعروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ شاہ رُخ کے عہد (۸۰۷ھ — ۸۵۰ھ) میں اسے کافی شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے ۸۵۸ھ میں اپنے وطنِ عزیز میں انتقال کیا۔ اسی نام کی ایک اور کتاب ہے اور اس میں بھی وہی مطالب بیان کئے گئے ہیں جو ظفرنامہ میں آئے ہیں۔ یہ ظفرنامہ نظام الدین شامی کی تصنیف ہے۔ یہ مصنّف تیمور کا ہم عصر تھا اور اس نے ۸۰۴ھ میں خود تیمور سے اس کتاب کی تصنیف کا فرمان حاصل کیا تھا۔ اس کی پوری تفصیل خود ظفرنامہ نظام شامی کے دیباچے میں درج ہے۔ یہ دونوں ظفرنامے تاریخ وصاف کے برعکس نہایت سیدھی سادی فارسی اور پُرتکلّف عبارت آرائی اور انشاء پردازی سے خالی طرز میں لکھی گئی ہیں۔

رَوضۃ الصّفا : یہ سب سے اہم تاریخ ہے، جو تیموریوں کے دَور میں تصنیف ہوئی ہے۔ یہ کتاب سات جِلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں اسلام اور ایران کی تاریخ اور خاص کر تیموری دَور کے حالات، ابوالغازی سلطان حسین بالقیرا (متوفی ۹۱۲ھ) کی سلطنت کے آخر تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مصنّف محمّد بن خاوندشاہ

بن محمود معروف بہ میر خواند بلخ کے نجیب زادوں میں تھا اور میر علی شیر نوائی کے دربار کا متوسّل
تھا۔ اس نے ۹۰۳ھ میں بمقام ہرات وفات پائی۔ اس کتاب کا باقی حصّہ یعنی ساتویں جلد کے
مطالب کو جو مصنّف کی وفات کے بعد کے چند سالوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، مصنّف کے
پوتے خواند میر نے مکمّل کیا ہے۔ اس کے سوا خواند میر نے ۹۰۵ھ میں روضۃ الصفا کا ایک
خلاصہ "خلاصۃ الاخبار" کے نام سے تیّار کیا ہے۔

۲۔ تاریخ شعر و عروض

مغلوں اور تیموریوں کے دَور میں عمومی تاریخوں کے سوا ایران کی ادبی تاریخ اور
علم و شعر پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے مشہور کتابیں لباب الالباب، تذکرۂ
دولت شاہ اور کتاب المعجم ہیں۔

لباب الالباب: لباب الالباب ایرانی شاعروں اور ادیبوں کے حالات پر فارسی
کی نہایت اہم کتاب ہے۔ اس میں فارسی شعر کی ابتداء سے لے کر مصنّف کے زمانے تک
کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات درج ہیں۔ اِس کی دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد شعر کہنے
والے سلاطین، امراء، وزراء، علماء اور حکماء کے لئے مختص ہے، دُوسری جلد میں عام شاعروں اور
ادیبوں کے حالات درج ہیں۔ اس کتاب میں ۱۶۹ شاعروں کے نام اور حالات آئے ہیں، بظاہر
لباب الالباب ۶۱۸ھ کے قریب یعنی مغلوں کے استیلا کے زمانے میں تصنیف ہوئی ہے
اِس کتاب کے مصنّف محمد عوفی نے ایک اور کتاب جوامع الحکایات کے نام سے لکھی ہے
اور اس میں ادبی حکایتیں، اشعار اور مختلف مثلیں درج کی ہیں۔ عوفی کا باپ مرو
کا رہنے والا تھا، خود عوفی نے بخارا میں تعلیم حاصل کی، خراسان کے شہروں کا سفر کیا
اور اس کے بعد ہندوستان پہنچا۔ ہندوستان میں اس نے دہلی کے سلطان ناصر الدین قباچہ
(متوفّی ۶۲۵ھ) کے وزیر حسین بن شرف الملک کے نام لباب الالباب معنون کی۔ ناصر الدین

قباچہ نے ایرانی عالموں کی خاص طور پر سرپرستی کی تھی جو مغلوں کے حملوں میں ایران سے بھاگ کر ہندوستان آگئے تھے۔

تذکرہ دولت شاہ : لباب الالباب کے بعد فارسی کا اہم ترین تذکرہ دولت شاہ سمرقندی کا تذکرۃ الشعراء ہے۔ یہ تذکرہ ۸۹۲ھ کے لگ بھگ یعنی تیموریوں کی سلطنت کے آخر میں تصنیف ہوا ہے۔ اس میں ابتداء سے لے کر نویں صدی کے آخر تک کے تقریباً ۱۰۵ فارسی شاعروں کے حالات درج ہیں۔ اس تذکرہ کا مصنف دولت شاہ بن علاء الدولہ سمرقندی امیرزادوں اور ذی مرتبہ لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کا باپ امیر علاء الدولہ شاہ رُخ کے ندیموں میں شامل تھا۔ خود دولت شاہ بھی ہرات میں ابوالغازی سلطان حسین اور امیر علی شیر نوائی کا مقرب تھا۔ اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کا ہم عصر تھا۔ ان تینوں کے نام اس نے اپنی کتاب کے آخر میں لئے ہیں، ان کی مدح کی ہے اور ان کے فضائل گِنائے ہیں، مصنف نے فارسی شاعروں کا یہ تذکرہ امیر علی شیر نوائی کے نام معنون کیا ہے، کیونکہ اِسی عالم وزیر کی تشویق اور سرپرستی کی وجہ سے یہ تذکرہ لکھا گیا تھا۔

المعجم : محمد بن قیس رازی کی تصنیف المعجم فی معابیر، اشعار العجم، عروض، قوانی اور نقد شعر پر فارسی کی اہم ترین کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ان تینوں فنون کے قواعد کی جامع ہے بلکہ اس میں نہایت کارآمد مثالیں اور اشعار بھی آئے ہیں۔ اور بہت سے بڑے شاعروں اور خاص کر مصنف کے معاصروں کے حالات آئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کتاب کا مصنف رَے کا رہنے والا تھا، اور مغلوں کے حملہ کے زمانے میں خوارزم شاہ کے ساتھ ساتھ شہر بہ شہر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر کار مغلوں کے ڈر سے فارس بھاگ گیا۔ اور یہاں ۶۲۳ھ میں اتابک سعد بن زنگی کی خدمت اختیار کرلی اس زمانے میں اس کتاب معجم کو جسے فارس آنے سے پہلے اُس نے عربی زبان میں تصنیف کیا تھا، ۶۳۰ھ میں فارسی کا جامہ پہنایا۔

اوپر جن تصانیف کا ذکر کیا گیا اُن کے سوا تذکرہ، سوانح اور مراثی کی بہت سی ایسی کتابیں بھی ملتی ہیں جو اسی دور میں تصنیف ہوئی تھیں۔ ان میں سے مولانا عبدالرحمٰن جامی کی "نفحات الانس" سلطان حسین کی "مجالسِ عشاق" حسین واعظ کی تصنیف "روضۃ الشہداء" اور حسین واعظ کے بیٹے علی کی تصنیف "رشحات" قابلِ ذکر ہیں۔ روضۃ الشہداء حضرت امام حسین اور آپ کے ساتھیوں کے مصائب کے ذکر میں لکھی گئی ہے اور قدیم ترین کتاب ہے جس میں ائمہ کی مصیبتوں کا حال اتنی تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ مدتوں یہ کتاب عزا کی مجلسوں میں پڑھی جاتی رہی ہے اور "روضہ خوانی" کی اصطلاح اِسی کتاب کے نام سے نکلی ہے۔

۳۔ اخلاق

پچھلے دوروں میں علم اخلاق پر عربی اور فارسی زبانوں میں کئی کتابیں لکھی گئی تھیں ان کتابوں میں سے بعض کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ مغلوں اور تیموریوں کے دور میں بھی علماء اور حکماء نے اِس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں اخلاق ناصری، اخلاق جلالی، اخلاق محسنی اور انوار سہیلی وغیرہ شامل ہیں۔

اخلاق ناصری: اخلاقِ ناصری اصُولِ اخلاق یا حکمتِ عملی پر لکھی گئی ہے۔ اس کا مصنف مشہور حکیم نصیر الدین طوسی ہے۔ طوسی نے یہ کتاب قہستان میں اسماعیلیوں کے حاکم ناصر الدین عبدالرحیم بن ابی منصور کی فرمائش پر لکھی ہے۔ اصل میں یہ کتاب ابن مسکویہ کی اخلاقی کتاب "طہارۃ الاعراق فی تہذیب الاخلاق" کا ترجمہ اور خلاصہ ہے، اور طوسی نے اپنی طرف سے بھی اس میں بعض مطالب کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۶۳۳ھ کے لگ بھگ تصنیف ہوئی ہے۔

اخلاق جلالی: اس کتاب کا اصل نام لوامع الاشراق فی مکارم اخلاق

ہے اور تہذیبِ اخلاق، تدبیرِ منزل اور سیاستِ مُدن پر لکھی گئی ہے۔ مصنف کے بیان کے مطابق اس کتاب میں اخلاقِ ناصری سے بھی نقل و اقتباس کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مصنف جلال الدین دوّانی (متوفی ۹۰۸ھ) صوبہ فارس میں کازرون کے قریب قریہ دوّان کا رہنے والا حکیم و عارف تھا۔ اس نے یہ کتاب آق قونیلو سلطان بن حسن کی فرمائش پر نویں صدی کے نصف آخر میں تصنیف کی ہے۔

اخلاقِ محسنی : اخلاق محسنی "اصولِ اخلاق اور صفات پر لکھی ہوئی کتاب ہے"۔ اس میں چالیس باب ہیں۔ اس کا مصنف حسین واعظ کاشفی ہے، اور اس نے یہ کتاب ۸۹۰ھ میں ابو الغازی سلطان حسین کے نام لکھی ہے۔

انوارِ سہیلی : اس مشہور کتاب میں جانوروں کی زبان میں حکایتوں کے ذریعہ اصول اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی اصل کلیلہ و دمنہ ہے۔ اسکا مصنف بھی ملّا حسین واعظ کاشفی ہے۔ جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ واعظ کاشفی کا ارادہ تھا کہ ابو المعانی نصر اللہ کی کتاب کلیلہ و دمنہ کو بہتر انداز میں اور سادہ تر انداز میں بیان کرے، اور عربی اشعار اور امثلہ کو ترک کر دے لیکن اس کا یہ مقصد پورا نہ ہو سکا اور اس کتاب کا سبک اس زمانہ کے مروجہ پُر تکلف سبک کا تابع ہو گیا۔ لطافت اور متانت میں انوار سہیلی ہرگز کلیلہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود انوار سہیلی فارسی کی مشہور ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اور خاص کر ہندستان میں بہت مشہور و معروف ہے۔ حسین واعظ کا شمار سلطان حسین کے عہد کے مشہور عالموں میں ہوتا تھا۔ اس نے اور بھی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن انوار سہیلی میں اس نے فارسی زبان پر اپنی قدرت اور مہارت کا خوب ثبوت دیا ہے۔

مغل اور تیموری دور کے علماء اور عارف جنھوں نے بیشتر عربی میں تصنیف و تالیف کی ہے

شہاب الدین سہروردی : ابو حفص محمد بن محمد مشہور بہ شہاب الدین اپنے دادا شہاب الدین

(جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے) کی طرح زنجان کے قریہ سہروردکے رہنے والے تھے۔ آپ کا زیادہ تر قیام بغداد میں رہا۔ اور عبّاسی خلیفہ النّاصرلدین اللہ آپ کا بڑا ادب اور احترام کرتا تھا۔

شیخ اپنے زمانے کے بہت بڑے بزرگوں اور عارفوں میں شمار ہوتے تھے، تصوّف اور سلوک میں عوارف المعارف آپ ہی کی تصنیف ہے۔ آپ نے ۶۳۲ھ میں وفات پائی۔

نجم الدین رازی: شیخ نجم الدین ابوبکر عبداللہ بن محمّد رازی بھی اپنے زمانے کے زبردست عالموں میں شمار کیے جاتے تھے۔ مغلوں کے حملہ سے پہلے اردبیل پھر بلادِ رُوم تشریف لے گئے اور وہاں اپنی کتاب "مرصاد العباد من المبدءِ الی المعاد" جو معانی اور تصوّف پر ہے، فارسی زبان میں تصنیف کی، آپ نے ۶۶۵ھ میں وفات پائی۔

خواجہ نصیر الدین طوسی: ابوجعفر نصیر الدین محمد بن محمد بن حسن طوسی کے اجداد قُم کے نواح کے رہنے والے تھے۔ نصیر الدین نے ۵۹۷ھ میں بمقام طوس ولادت پائی۔ یہیں تعلیم حاصل کی، علومِ حکمت، ریاضی اور نجوم میں انتہائی تبحّر حاصل کیا، اور ایران کے چوٹی کے حکیموں اور عالموں میں شامل ہوا۔ مغلوں کے حملوں سے پہلے خواجہ اسماعیلی امیروں کی ملازمت میں تھا۔ پھر مغلوں کے زمانے میں ہلاکو کے دربار کے مقربوں میں شامل کیا گیا، اور اس کا ندیم و مشیر بن گیا۔ بڑے بڑے سفروں میں ہلاکو کے ساتھ رہا اور اس کی رہنمائی کی۔ مغل امراء خواجہ کی بات پر بہت بھروسہ کرتے تھے، خاص کر نجوم میں خواجہ کی مہارت کی وجہ سے اسے علمِ نجوم کی تحقیق اور رصد پر مقرر کیا۔ اس نے علم نجوم میں کئی تحقیقیں کیں، اس لئے مراغہ میں ہلاکو کے حکم سے خواجہ کی نگرانی میں ایک بڑی رصدگاہ تعمیر کی گئی، اور خواجہ نے اسی رصدگاہ میں ایلخانی زیج کے نام سے اپنی زیجیں مرتّب کیں۔

خواجہ کی اہم تصنیفیں ریاضی، منطق اور نجوم پر ہیں۔ ان میں سے علم ہندسہ پر "تحریر اقلیدس"، ہیئت پر "تحریر مجسطی"، منطق اور حکمت پر "شرح اشارات ابوعلی" شامل ہیں۔ طوسی سے پہلے بھی امام فخر الدین رازی نے ابوعلی کے اشارات کی شرح لکھی تھی۔

اور اس کے ضمن میں ابو علی سینا پر اعتراضات کئے تھے۔ خواجہ نے اشارات میں ان اعتراضوں کا جواب دیا ہے۔ اس کے سوا اس نے "تجرید العقائد" کے نام سے ایک کتاب حکمت، کلام اور شیعہ عقائد کے اثبات میں لکھی ہے۔

خواجہ نصیر الدین نے فارسی میں جو اہم کتابیں لکھی ہیں اُن میں سے اخلاقِ ناصری کے سوا (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) منطق میں "اساس الاقتباس"۔ ہیئت میں "تذکرۂ نصیریہ" تصوف میں رسالہ "اوصاف الاشراف"۔ نجوم میں "سی فصل"، اور عروض و قافیہ میں "معیار الاشعار" جیسی کتابیں بھی شامل ہیں۔

مغلوں کے دربار میں خواجہ نصیر الدین کے نفوذ و اثر سے ایران کے علم و ادب کو بڑا فائدہ پہنچا، کیونکہ اس نے بے شمار عالموں اور ان کی کتابوں کو تباہی اور بربادی سے بچا لیا۔ خواجہ نصیر الدین نے ۶۷۲ھ میں بمقام بغداد وفات پائی۔

قاضی بیضاوی: ابو الخیر ناصر الدین عبد اللہ بن عمر فارس کے علاقہ بیضا کے رہنے والے تھے، اور شیراز میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور تھے۔ آپ کا شمار عالمِ اسلام کے بہت بڑے مُقرّروں اور فقیہوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی مشہور ترین تصانیف میں ایک اہم کتاب تفسیر قرآن ہے جو انوار التنزیل و اسرار التاویل کے نام سے موسوم ہے۔ آپ کی ایک اور کتاب طوالع الانوار و مطالع الانظار توحید پر ہے۔ علم اصول پر آپ کی ایک کتاب منہاج الوصول ہے۔ ایک اور کتاب ہے تاریخی مضامین کا خلاصہ، اسے نظام التواریخ کے نام سے فارسی میں لکھا ہے۔ قاضی بیضاوی نے اپنی زندگی کا آخری زمانہ تبریز میں گذارا۔ اور اسی شہر میں ۶۸۵ھ میں وفات پائی۔

ذکریا قزوینی: عماد الدین ذکریا بن محمود قزوینی فارسی شعر و ادب میں ایک اچھوتے انداز کا مصنّف ہُوا ہے۔ وہ جغرافیائی علوم میں کافی مہارت رکھتا تھا۔ اس کی مشہور ترین کتاب عجائب المخلوقات و غرائب الموجودات ہے۔ یہ کتاب حیوانی دُنیا کے

عجائبات پر لکھی ہے۔ اس کی ایک کتاب آثار البلاد واخبار العباد ہے۔ یہ کتاب تاریخ اور جغرافیہ پر لکھی ہے۔ اس میں ایران کے انیس مشہور شاعروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ قزوینی نے ۶۸۲ھ میں وفات پائی۔

قطب الدین شیرازی

قطب الدین محمود بن مسعود شیرازی ۶۳۴ھ میں بمقام شیراز پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار ایران کے مشاہیر حکماء میں ہوتا ہے اپنے زمانے کے بیشتر علوم جیسے طب، نجوم، حکمت اور موسیقی میں کمال رکھتے تھے، اس کے سوا ادبی ذوق اور شعر گوئی کا سلیقہ بھی انہیں خوب تھا۔ انہوں نے مدتوں آذربائجان میں زندگی بسر کی اور خواجہ نصیرالدین کی مجالسِ درس سے استفادہ کیا، اور مراغہ کی رصدگاہ کے کام میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ اس کے بعد بلادِ روم چلے گئے۔ یہاں مولانا جلال الدین رومی سے ملے اور پھر تبریز واپس گئے۔ ۷۱۰ھ کے قریب اسی شہر میں وفات پائی۔ شطرنج کھیلنا خوب جانتے تھے اور انہیں چنگ بجانا بھی خوب آتا تھا۔

ان کی اہم تصانیف میں طب پر شرح قانون ابن سینا، اور حکمت پر شیخ شہاب الدین سہروردی کی شرح حکمت الاشراق ہے۔ اس کے سوا ان کی کتاب درۃ التاج فارسی زبان میں حکمت کی کتابوں میں نہایت اہم اور بلند پایہ کتاب سمجھی جاتی ہے۔ نجوم میں انہوں نے التحفۃ الشاہیہ ونہایۃ الادراک کے نام سے ایک تصنیف اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

قاضی عضد الدین ایجی

قاضی عبدالرحمٰن بن احمد فارس کے مشہور عالموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ شیخ ابواسحاق اور آلِ مظفر کے ہم عصر تھے اور یہ حکمراں خاندان آپ کا بڑا ادب اور احترام کرتے تھے۔ اسی طرح آپ خواجہ حافظ کے بھی ہم عصر تھے۔ آپ کی مشہور کتابوں میں کتاب مواقف، فوائد غیاثیہ اور شرح مختصر ابن حاجب ہیں۔ یہ سب کتابیں علمِ کلام پر ہیں۔ آپ نے ۷۵۶ھ میں وفات پائی

قطب الدین رازی

قطب الدین محمد بن محمد بن رازی، عضدالدین ایجی کے شاگرد تھے اور اپنے زمانے کے بڑے علما میں شمار کیے جاتے تھے۔ آپ نے اپنی زندگی کا آخری زمانہ بلادِ شام میں گذارا۔ حکمت اور منطق پر کتابیں لکھی ہیں ان میں کاتبی قزوینی کی کتاب "الرسالۃ الشمسیہ" کی شرح شرح شمسیہ کے نام سے لکھی ہے۔ ان کی ایک اور کتاب ہے لوامع الاسرار فی شرح مطالع الانوار قطب الدین رازی کی مشہور تصانیف میں ایک کتاب محاکمات بھی ہے۔ فخر رازی اور خواجہ نصیر طوسی نے اشارات کی شرح میں جو اختلاف کیا ہے، ان پر اس کتاب میں محاکمہ کیا ہے۔

قطب الدین رازی نے ۷۶۶ھ میں ملک شام میں وفات پائی۔

مغلوں اور مغلوں سے پہلے کے دوروں میں جتنے شاعر، ادیب، عالم اور حکیم گذرے ہیں ان میں سے صرف چند کا ذکر ان ابواب میں کیا گیا ہے۔ مغلوں اور تیموریوں کے دور نے بہت سے عارف، حکیم، منجم مصور اور خطاط پیدا کیے ہیں۔ نقاشی، تذہیب، اور خوشنویسی کو تیموریوں کے دور میں خاصی ترقی ہوئی۔ اس دور میں یہ صنعتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ ان فنون میں ایران نے سیکڑوں فن کار پیدا کیے،

صفوی دور میں نقاشی، تذہیب، قالین بافی اور کاشی کاری کو جو کمال حاصل ہوا تھا اصل میں ان فنون کی بنیادیں بہت پرانی تھیں۔ ان فنون میں سلجوقی اور تیموری دوروں ہی میں ترقی کے آثار پیدا ہو چکے تھے، اور ترقی کرتے کرتے صفوی دور میں اپنے اس انتہائی کمال کو پہنچے۔

ماخذ

فارسی تذکرے (ان کی جامع فہرست کتاب کے آخر میں دی گئی ہے)

دورِ مغول کا خلاصہ :

براؤن : تاریخ ادبیات ایران، ج ۳ ۔ آقای عباس اقبال : تاریخ مغول

سعدی :

پروفیسر ہنری ماسہ (فرانسیسی)؛ سعدی۔ آقای میرزا عبدالعظیم خاں قریب : مقدمہ گلستاں، طبع طہران۔ براؤن : تاریخ ادبیات ایران۔ اتھے : انگلستان کے کتب خانوں کی فہرستیں۔ سعدی نامہ : باہتمام وزارت فرہنگ طہران ۱۳۱۶ھ

شیخ شبستری :

دیوان گلشن راز مع شرح محمد لاہیجی، لیتھو چھاپ طہران۔

مولانا جلال الدین رومی :

ولدنامہ با تصحیح و مقدمہ آقای ہمائی طبع طہران۔ منتخبات دیوان شمس تبریزی، باہتمام و مقدمہ آقای ایزدگشپ، اصفہان۔ مکتوبات مولانا جلال الدین با مقدمہ آقای ولد چلپی طبع استنبول، ۱۳۵۶ھ۔ آقای حسین شجرہ : شخصیت مولوی۔

مولانا کے ہم عصر اور مرید افلاکی کی تصنیف مناقب العارفین (قلمی)

ریو : فہرست، ج ۲۔ براؤن۔ اتھے اور نکلسن

آقائی فروزان فر : مولانا جلال الدین محمد (مولانا کے سوانح حیات پر تحقیقی مقالہ) طہران ۱۳۱۵ھ

امیر خسرو :

امیر خسرو کے مفصل ترین حالات کے لیے ملاحظہ ہو ریو کی فہرست ج ۲۔ کلیات امیر خسرو، مطبوعہ، قلمی (کتاب خانہ سپہ سالار، طہران)

خواجو کرمانی :

مقدمہ روضۃ الانوار، از آقای حسین سرور، طبع طہران باہتمام آقائی کوہی کرمانی

آقای سعید نفیسی : خواجو، طبع طہران

اوحدی مراغہ :

جام جم۔ طبع طہران، باہتمام آقائی وحید دستگردی۔

ابن یمین :

آقای رشید یاسمی : شرح حال ابن یمین، طبع طہران۔ دیوان ابن یمین (قلمی)

ملک آقای مہدی بیابانی۔ دیوان ابن یمین۔ با مقدمہ آقای سعید نفیسی طہران ۱۳۱۸ھ

سلمان ساوجی :

آقای رشید یاسمی : شرح حال سلمان ساوجی طبع طہران۔ دیوان سلمان ساوجی

دیوان سلمان ساوجی قلمی۔

جمال الدین عبدالرزاق :

آقائی سعید نفیسی : جمال الدین عبدالرزاق۔ مقالہ مجلہ ارمغان

دیوان کامل جمال الدین۔ باہتمام وحید دستگردی، طہران۔

خواجہ حافظ :

شبلی نعمانی : شعر العجم (اردو) جلد اول (آقای فخر داعی نے اس کتاب کا فارسی میں

ترجمہ کیا ہے، اور باقی جلدیں بھی ترجمہ ہو رہی ہیں) گل اندام : مقدمہ دیوان حافظ۔

سیف پور فاطمی : شرح حال حافظ۔ نشریات روزنامہ اخگر۔ طہران۔

براؤن، لسٹے اور دوسرے مستشرقوں کی تحقیقیں۔

خلخالی مرحوم : مقدمۂ دیوان حافظ۔ طبع خلخالی، طہران۔

آقای ہژبر سید عبدالرحیم خلخالی : شرح حافظ، طبع طہران

آقای محمد معین : حافظ شیریں سخن، طبع طہران۔ آقای محمود مومن : حافظ چہ می گوید۔

مرحوم سید عبدالرحیم خلخالی : حافظ نامہ۔ طبع طہران۔

آخریں دیوان مصحح حافظ۔ باہتمام آقایان محمد قزوینی و دکتر غنی، طہران ۱۳۲۰ھ

آقائی سعید نفیسی : احوال و آثار حافظ۔ طہران ۱۳۲۱ھ

آقای مسعود فرزاد : دل شیدای حافظ (رسالہ)

جامی :

مرحوم تربیت : تقویم تربیت، طبع تبریز۔ آقای سعید یاسمی : مقدمہ سلامان و ابسال، طبع طہران — بریکنو (فرانسیسی) : سلمان و ابسال کا فرانسیسی ترجمہ، تصوف ۔ عروض اور جامی کے سوانح حیات کے بارے میں مفید مقدمہ کے ساتھ۔ طبع پیرس۔ سنہ ۱۹۱۱ء

آقای محیط : مقدمہ بہارستان، طبع طہران — ریو : فہرست ج ۲۔

کمال خجندی :

دیوان کمال خجندی (قلمی) ملک آقائی مہدی بیابانی۔

تاریخ، اخلاق، تذکرہ، عروض اور حکمت وغیرہ کے لیے ملاحظہ ہوں :

اقای میرزا محمد خاں قزوینی : تاریخ جہاں کشا، المعجم فی معائر اشعار العجم، تذکرۃ الشعراء دولت شاہ کے مقدمے، طبع یورپ — المعجم فی معائر اشعار العجم، طبع طہران، باہتمام آقای مدرس رضوی، طہران ۱۳۱۴ھ — درۃ التاج تالیف قطب الدین شیرازی کوشش و تصحیح آقای سید محمد شکوۃ (۱۳۱۸ — ۱۳۲۰)

منتخب اخلاق ناصری با مقدمہ و اہتمام آقای جلال ہمائی طہران سنہ ۱۳۲۰ھ

نامہ دانشوراں — روضات الجنات — مجالس المومنین — قصص العلماء

بروکلمان (جرمن) : تاریخ ادبیات عرب

نکلسن (انگریزی) : تاریخ ادبیات عرب

ہوار (فرانسیسی) : تاریخ ادبیات عرب

۵۔ صفوی دور سے قاچاری دور کے ختم تک

تیموریوں کی سلطنت کا بانی تیمور لنگ بڑا طاقتور حکمراں تھا۔ اس نے سربداروں، آل کرت، مظفریوں اور جلایروں کی سلطنت ختم کر کے پورے ایران پر قبضہ کر لیا۔ تیمور کی وفات کے بعد اس کی اولاد نے سو سال تک حکمرانی کی، لیکن ان میں تیمور کی سی بات نہ تھی۔ چنانچہ تیموری سلطنت پر روز بروز زوال آتا گیا۔ جلایروں نے پھر سر اُٹھایا اور قرہ قوینلو اور آق قوینلو حکمراں خاندان نمودار ہوئے اُنھوں نے آذر بائیجان پر قبضہ جما لیا اور ایران کے دوسرے حصوں پر بھی چھاپے مارنے لگے۔ اسی دوران میں اسماعیل نامی ایک دلیر فتحمند جوان نمودار ہوا۔ یہ شخص شیخ صفی الدین اردبیلی کی اولاد میں تھا اور صفوی خاندان کا نام ان ہی شیخ صفی الدین کے نام سے نسبت رکھتا ہے۔ اس خاندان میں ایک شخص اسماعیل حیدر نے پہلی بار اپنے خاندان کی روحانی سیادت کے ساتھ سیاسی قیادت کو بھی ملا لیا۔ اس نے اوزون حسن آق قوینلو کے ساتھ جنگ کی۔ اسماعیل نے ۹۰۶ھ میں بمقام تبریز تخت سلطنت پر جلوس کیا اور اس طرح صفویوں کی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ پھر اس شخص نے کچھ ہی مدت کے اندر پورے ایران پر قبضہ کر لیا۔ صفویوں نے تقریباً دو سو چالیس سال تک ایران پر حکومت کی۔ لیکن ان کے آخری بادشاہوں میں وہ بات نہ تھی جو ان کے پہلے بادشاہوں میں تھی۔ ان آخری صفوی بادشاہوں کے زمانے میں افغانوں نے ایران پر حملہ کیا اور ان کے پایۂ تخت اصفہان پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران میں نادر شاہ افشار نے ظہور کیا، افغانوں کو ملک سے نکال باہر کیا اور صفویوں کی سلطنت کا خاتمہ کر کے ۱۱۴۸ھ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا اور اس طرح افشاریہ خاندان کی بنیاد رکھی۔ نادر شاہ افشار نے تین سال کی قلیل مدت میں بغداد سے لے کر دہلی تک تمام ملکوں کو ایرانی سلطنت کا ایک جز بنا دیا۔ کریم خاں زند

(۱۱۶۳ سنہ ۱۱۹۳ھ) نے افشاریوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور چند سالوں کی جنگ و پیکار کے بعد قاچاریوں نے زندیوں کا تختہ الٹ دیا۔ افغانوں کے حملے، افشاریوں کی سلطنت اور زندیوں کے اقتدار کے ہنگامہ خیز زمانہ کی مدت بس نصف صدی ہے، آقا محمد خاں قاچار نے سنہ ۱۱۹۳ھ میں تختِ سلطنت پر جلوس کیا اور پھر ایک بار ایران کی طوائف الملوکی کی کشمکش سے نجات ملی۔ قاچاری خاندان نے تقریباً ایک سو پچاس سال تک ایران پر حکومت کی۔

اوپر جن خاندانوں کا ذکر ہوا ہے ان میں ایران کی ادبی تاریخ کے لحاظ سے صفویوں اور قاچاریوں کا دور اہمیت رکھتا ہے۔ صفویوں کی سلطنت کے اختتام اور قاچاریوں کے دورِ حکومت کی تاسیس میں پچاس سال کا فصل ہے۔ اس زمانہ میں بھی ایران اہلِ علم و فضل سے خالی نہ تھا۔ لیکن ملک کے اندر مختلف خاندانوں کی خانہ جنگیوں اور ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے نادر شاہ اور کریم خان زند کو اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ فراغت کے ساتھ بیٹھ کر ادبیات کی ترقی میں حصّہ لے سکتے۔

صفوی بادشاہ متعصب شیعہ تھے۔ اس لیے اُنھوں نے شیعیت کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں مذہبی نظم و نثر کو کافی ترقی نصیب ہوئی۔ شاعروں نے بادشاہوں کی مدح لکھنے کی بجائے نعت رسول، منقبت اولیاء اور آلِ رسول کی مدح اور اُن کے مرثیہ کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ علماء نے شیعوں کے آثار و اخبار اور شیعی فقہ و حدیث کی شرحیں لکھنی شروع کیں۔ پچھلے دوروں میں دینی مسائل عام طور پر عربی میں لکھے جاتے تھے لیکن اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ دینی مسائل بیشتر فارسی زبان میں لکھے جانے لگے۔ شیخ بہائی کی "جامع عباسی"، مجلسی کی "حلیۃ المتقین" اور ان کی دوسری کتابیں حدیث اور دوسرے دینی علوم میں قزوینی کی "ابواب الجنان" جیسی کتابیں فارسی میں لکھی گئیں اکیلے مجلسی نے (ان کا ذکر آگے آئیگا) دینی مسائل پر فارسی میں پچاس کے لگ بھگ کتابیں

اور رسالے لکھے ہیں۔ ایک طرف صفوی بادشاہ اکثر مذہبی سیاست کی بنا پر ازبکوں، افغانوں
روسیوں اور عثمانی ترکوں سے لڑتے رہے ہیں تو دوسری طرف انہوں نے علم و ادب کی
سرپرستی بھی کی ہے۔ ان کے درباروں سے بہت سے مورخ، عالم اور فقیہ وابستہ تھے
بعض سلاطین اور شہزادے جیسے سلطان ابراہیم، شاہ عباس، القاص میرزا، شاہ طہماسپ،
اور سام میرزا خود بھی ادبی ذوق رکھتے تھے اور شعر کہتے تھے۔ جیسا کہ آگے ذکر آئیگا سام میرزا
نے شعراء کا تذکرہ بھی مرتب کیا ہے۔

فنونِ لطیفہ کی جو ترقی تیموریوں کے دور میں شروع ہوئی تھی اُسے صفوی دور میں اور
بھی رونق حاصل ہوئی۔ اس دور کے مشہور مصوروں اور خوش نویسوں میں کمال الدین بہزاد
سلطان حسین بایقرا کے دربار کا اُستاد تھا اور صفوی دور کی ابتدا میں بھی بقید حیات رہا۔ اس کے
بعد میرک، سلطان محمد اور میر سید علی جیسے اُستاد پیدا ہوئے اور یہ سب کے سب تبریز
میں شاہ طہماسپ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح علی رضا عباسی اس فن میں
بہت مشہور تھا۔ اس دور میں قالین بافی کی صنعت کو اوجِ کمال نصیب ہوا کاشی کاری
اور فنِ تعمیر سے بھی صفوی بادشاہوں کو بڑی دلچسپی رہی۔ چنانچہ صرف اصفہان کی مسجدیں
ہی اس دور میں ان فنون کی حیرت انگیز ترقی اور زیبائی و رعنائی کی شاہد ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود صفوی دور کو مجموعی حیثیت سے ایران کے ادبی انحطاط کا
زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اصل میں مغلوں اور تیموریوں کے دور کی بربادیوں نے علم و ادب کے
میدان میں آنے والی صدیوں میں اپنا اثر دکھایا ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ دور بڑے بڑے
شاعروں کے وجود سے خالی ہے، بلکہ اس دور میں متقدمین کی نظم کا اہم موضوع یعنی غزل
اور عرفانی شعر دونوں متروک ہو گئے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ صفوی بادشاہوں نے ان دونوں
اصنافِ سخن سے اعراض کیا۔ فارسی نظم و نثر میں صریحاً تنزل شروع ہو گیا اور فارسی نظم و نثر
کی وہ لطافت اور سلاست جو ہمیں مغلوں کے دور سے پہلے ملتی ہے، بالکل ختم ہو گئی۔ اس

کی جگہ عبارت پردازی، صنائع وبدائع لفظی گورکھ دھندے بہت زیادہ استعمال کیے جانے لگے۔ شعر میں مبتذل اور بھرتی کے مضامین کا رواج ہوگیا۔ شاعر اور ادیب اپنے خیالات کو تشبیہوں، استعاروں، ایہام اور صنعتوں میں ادا کرنے میں مصروف ہوگئے اور ان کے پیش نظر عجیب وغریب معانی رہنے لگے۔ اس زمانہ میں سیکڑوں شاعر، نثر نویس اور مصنف ایران اور ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اسی سبک کی پیروی کرنے لگے۔ ہندوستان میں اس سبک کی بہت زیادہ پیروی ہوئی۔ اسی لیے اس سبک کا نام سبک ہندی ہی رکھ دیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندی سخن پردازوں نے اس طرز میں ایرانی شاعروں اور نثر نویسوں سے زیادہ غلو سے کام لیا ہے۔ اور الفاظ کے طنطنہ، ان کی زیب وزینت اور معانی میں باریکی اور پیچا پیچی سے بہت کام لیا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ صفوی دور اچھی نظم ونثر سے بالکل محروم ہے۔ اس دور کے شعرا میں (اور ان کی تعداد بہت کافی تھی) صائب تبریزی، وحشی، کلیم، عرفی، ہاتف اور ہندوستان میں فیضی جیسے شاعروں نے اپنے خوش آیند نغمے الاپے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں نے متقدمین کی پیروی کی ہے اور قدیم طرز کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ وہ سبک جو ہندی سبک (یعنی وہ سبک جسے صفوی دور کے بیشتر شاعر جنھوں نے ہندوستان میں زندگی بسر کی ہے، اختیار کیا ہے) کے نام سے مشہور ہے۔ تمام کا تمام معنی آفرینی، اغراق اور پیچ در پیچ عبارتوں ہی سے بھرا نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سے لطیف اور پر لطف مضامیں بھی ملتے ہیں۔ اور یہ مضامین ان باکمال شاعروں کی نکتہ رسی، باریک بینی اور دقیق نظری کا نمونہ ہیں اس کا ثبوت وہ کلام ہے جس کا ذکر صائب، عرفی اور فیضی کے بیان میں آئیگا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ طرز باریک بینی دقیقہ رسی اور لطیفہ کاری کے ہنر کی نمائندہ ہے۔ گہرے غور اور پختہ فکر کے بغیر ان کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ حقیقت صائب، فیضی، عرفی، کلیم اور دوسرے شاعروں کے اشعار

کے مطالعہ سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی مضمون آفرینی ایرانی ادبیات کی ایک خاص چیز ہے اور مغربی ادبیات میں اس کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

... ٭ ...

صفوی دور کے اہم ادبی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ فارسی زبان اور فارسی ادب کا ایران کے باہر اور خاص کر ہندوستان میں پھیلنا ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے ایران کی اصلی زبان قدیم ہندوستان کی زبان سنسکرت کے ساتھ رشتہ رکھتی ہے۔ ان دونوں ملکوں کے قدیم عقائد اور قدیم داستانیں بھی ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں اور غالباً ان سب کا ماخذ ایک ہی ہے۔

ہندوستان میں فارسی زبان ابتدائی اسلامی صدیوں ہی میں پہنچ چکی تھی۔ کچھ تو ہندوستان میں پارسیوں کی وجہ سے اور کچھ سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے۔ غزنویوں اور غوریوں کی سلطنت کے قیام کے بعد سے یہ زبان ہندوستان میں پھیلنے لگی اور مغلوں کی سلطنت قائم ہونے کے بعد تو اوج کمال پر پہنچ گئی۔

ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی مشہور شہنشاہ بابر ہوا ہے۔ بابر کا سلسلہ نسب پانچ واسطوں سے تیمور سے جا ملتا ہے۔ اس نے ۹۳۲ھ میں پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت قائم کر لی اور اس کی قائم کی ہوئی یہ سلطنت ہندوستان میں تین سو سال سے سے زیادہ قائم رہی۔

بابر اور اس کا بیٹا ہمایوں اور اس کا پوتا اکبر اور اکبر کا بیٹا جہانگیر اور جہانگیر کے جانشین یہ سب کے سب ایرانی علوم اور ادبیات کے بڑے زبردست سرپرست اور فارسی زبان کے بہت بڑے حامی تھے۔ انہیں فارسی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا اور ایرانی سخنوروں کی تصانیف اور اشعار ان کے مطالعہ میں رہتے تھے۔ ان کے دربار کی زبان بھی فارسی تھی اور ان کے دربار میں ایرانی اور فارسی کے ہندی شاعروں اور عالموں کا بہت بڑا مجمع تھا۔ خود ان بادشاہوں نے

فارسی میں شعر کہے ہیں اور فارسی شاعری کی ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

نہ صرف فردوسی کے شاہنامہ اور سعدی کی گلستاں، حافظ کے دیوان، جامی کی تصانیف اور نثر کی علمی، ادبی اور تاریخی کتابوں جیسے ایرانی استادوں کے شاہکاروں کا مطالعہ ہندوستان میں عام ہوگیا تھا بلکہ بہت سے ایرانی شاعر اور علما و فضلا ہندوستان آنے لگے اور اُن کی کافی قدر و منزلت کی جانے لگی۔ یہاں اُنھوں نے کمال فراغت کے ساتھ اپنے نغمے فضا میں بلند کیے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ بہت سے شاعر، عالم، ادیب اور مورخ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں اُنھوں نے فارسی میں شاعری اور تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ حد یہ کہ فارسی زبان کے اثر سے ہندوستان کی سب سے اہم زبان اردو زبان عالم وجود میں آئی۔ یہ زبان ہندی، فارسی اور عربی کا مرکب ہے۔ اس زبان میں نظم و نثر دونوں نے فارسی کی طرز اور فارسی کا سبک اختیار کیا اور ہندوستان اور ایران کے شاعر اس زبان میں طبع آزمائی کرنے لگے۔

اس طرح مشہور شعرا ہیں صائب تبریزی، فیضی دکنی[1]، عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، ظہوری اور خجندی نے ہندوستان میں شہرت حاصل کی، انھوں نے متقدمین کی پیروی کی اور وہ سبک اختیار کیا جو ہندی سبک کے نام سے مشہور ہے۔ اور ایسے اشعار جن کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے لکھنے شروع کیے۔ ان کے سوا بے شمار عالم، مصنف، خوش نویس، مصور اور منشی پیدا ہوئے۔ انھوں نے ہندوستان کے بادشاہوں کی سرپرستی میں ایرانی افکار اور ایرانی صنائع کی ترویج میں بہت بڑا حصہ لیا۔

ہندوستان کے مغل بادشاہوں نے خاص طور پر فنِ تاریخ کو بڑی ترقی دی ہے۔ ان کے زمانے میں عمومی تاریخ اور خاص طور پر ہندوستان کی تاریخ پر بہت سی اہم اور مفید کتابیں فارسی میں تصنیف ہوئیں۔ ان میں سے مثال کے طور پر بعض کتابوں کے نام یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

---

[1] فیضی کی نسبت دکن کی جانب کرنا درست نہیں معلوم ہوتا۔

تاریخ الفی: یہ احمد بن نصر اللہ کی تصنیف ہے اور اسلام کی ایک ہزار سالہ تاریخ ہے۔ اس کتاب میں ۹۹۷ھ تک کے واقعات درج ہیں اور یہ شہنشاہ اکبر کے حکم پر لکھی گئی ہے۔

منتخب التواریخ: یہ محمد یوسف بن شیخ کی تصنیف اور عمومی تاریخ ہے۔ اس میں شہنشاہ شاہجہاں کے جلوس یعنی ۱۰۱۷ھ تک کے واقعات درج ہیں

منتخب التواریخ: یہ عبدالقادر بدایونی کی تصنیف اور ہندوستان کی عمومی تاریخ ہے۔ اس میں شہنشاہ اکبر کے چالیس سالہ دور یعنی ۱۰۰۳ھ تک کے واقعات درج ہیں۔

گلشن ابراہیمی: یا تاریخ فرشتہ۔ محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ استرآبادی کی تصنیف ہے اور اس میں ۱۰۱۵ھ تک کے وقائع درج ہیں۔

اکبرنامہ: ہندوستان میں آل تیمور اور اکبر کی مفصل تاریخ ہے اور اس کا مصنف شہنشاہ اکبر کا دانشمند وزیر ابوالفضل ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور اسی کتاب کی چوتھی جلد کا نام آئین اکبری رکھا ہے۔

اسی طرح اور بھی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں جیسے روضۃ الطاہرین، مراۃ العالم، مراۃ الصفا، طبقات اکبر شاہی وغیرہ۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایران اور ادبیات ایران کے لحاظ سے ان کتابوں کا مطالعہ بہت مفید اور سودمند ہے۔

ہندوستان کے بادشاہوں نے بعض ہندی کتابوں اور مشہور داستانوں کو فارسی میں منتقل کرنے کا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ انہی کی سرپرستی میں قصے کہانیوں کی بہت سی کتابیں، مہابھارت اور راماین کی داستانیں فارسی میں ترجمہ ہوئیں

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے فارسی میں ہندی کا سبک ایران کے فارسی سبک کی عین نقل ہے، مگر تکلف اور عبارت آرائی کا شوق ہندوستان میں زیادہ رہا ہے رفتہ رفتہ ہندوستان کے فارسی گو شاعروں نے بعض اور نئے پیچیدہ مضامین بھی وضع کیے اور ایسے

مخصوص الفاظ اور محاورے استعمال کیے جن کا رواج ایران میں نہ تھا۔

اس زمانے میں فارسی ادب نے ایشیائے کوچک اور عثمانی ممالک میں بھی اپنا اثر و نفوذ پیدا کر لیا اور ان ملکوں میں فارسی کا خاصا رواج ہو گیا۔ ان ملکوں میں فارسی کا اثر رومی سلجوقیوں کی سلطنت (۴۷۰۔۷۰۰ھ) کی ابتداء کے ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ اور مغلوں کے حملوں میں بہت سے مصنف، عالم، حکیم، شاعر اور عارف جیسے شیخ شہاب الدین سہروردی، نجم الدین رازی، مولانا جلال الدین رومی وغیرہ ان ملکوں میں پناہ گزین ہوئے۔ ان لوگوں کی وجہ سے ان ملکوں میں فارسی ادب کا کافی چرچا ہوا۔ مولانا جلال الدین رومی کے صاحبزادے سلطان ولد عثمانی ادب کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور آپ کی مثنوی ولدنامہ کی نقل ایک عرصہ دراز تک عثمانی ادب میں ہوتی رہی۔

عثمانی شاعروں اور مصنفوں نے نہ صرف ترکی نظم و نثر میں راست ایرانی زبان کے سبک، اس کی طرز، ترکیب اور معانی کی تقلید شروع کی، ایران کے اُستادوں کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھا، اور خاص طور پر عارف شعراء ـــ جیسے مولانا روم، حافظ، اور جامی وغیرہ ـــ کے کلام کی پیروی کی بلکہ ان میں سے بعض شاعروں نے خود فارسی میں شعر کہے اور حقیقت یہ ہے کہ فضولی ذواللسان کی طرح بہت سے اچھے شاعر بھی یہاں پیدا ہوئے۔ عثمانی ادب پر فیضی، عرفی، صائب اور جامی نے بھی کافی اثر ڈالا ہے۔

سلطان محمد، سلطان بایزید اور سلطان سلیم جیسے عثمانی سلاطین اور ان کے جانشین بھی فارسی زبان اور فارسی ادبیات سے خاص لگاؤ اور ذوق رکھتے تھے۔ اُنھوں نے خود فارسی زبان میں شعر کہے ہیں اور یہ ایرانی شاعروں سے خاص ارادت رکھتے تھے۔ عثمانی مصنفوں میں ضیا پاشا نے فارسی گو شاعروں کا تذکرہ بھی لکھا ہے۔

بارہویں صدی ہجری کے آخر میں ایرانی ادبیات نے پھر زندگی کی ایک نئی کروٹ لی مغلوں کے دور کی طرز اور ہندی سبک پہ زوال آنے لگا۔ شاعروں اور مصنفوں نے منوچہری،

عنصری، فرخی، معزی، انوری اور خاقانی جیسے متقدمین کا اتباع شروع کر دیا۔ پیچیدہ مضامین، مضامین کی تکرار اور پُر تکلف عبارتیں لکھنے کا رواج بتدریج کم ہوتا گیا۔ شاعر اور ادیب متین سیدھی سادی اور سلیس نثر اور نظم لکھنے لگے۔ دور از کار تشبیہیں، استعارے اور مضامین نظم سے خارج کیے گئے۔ نثر سے سجع، تکلف، تکرار اور لفاظی دور کی گئی۔ نشاط، قاآنی، قائم مقام اور ان کے دوسرے ہمعصر ادیبوں اور شاعروں نے مصنفوں اور شاعروں کی طرز کو دوبارہ زندہ کیا۔

اس لیے ادبی نقطۂ نظر سے قاچاروں کا دور کچھ کم اہم نہیں تھا۔ اسی دور میں قدیم سبک کو زندہ کیا گیا۔ اور بہت سے عالم اور ادیب اس دور میں پیدا ہوئے۔ علمی اور تاریخی کتابیں بھی کافی لکھی گئیں اور تکملۂ روضۃ الصفا، ناسخ التواریخ، نامۂ دانشوران، قصص العلماء، مجمع الفصحاء، اور ایسی ہی دوسری بلند پایہ کتابوں نے ہمارے ذخیرہ کو مالا مال کیا۔ بعض قاچاری بادشاہ اور شہزادے خود شاعر اور مصنف تھے، چنانچہ فتح علی شاہ نے اپنے اشعار کا دیوان یادگار چھوڑا ہے۔ اور ناصر الدین شاہ نے قصیدے اور غزلیں لکھی ہیں۔ قاچاری شہزادے جیسے رضوان، سلطان، فرخ، فخر، قاچار وغیرہ نے شعر کہے ہیں۔ قصائد، غزلیں اور مثنویاں لکھی ہیں۔ نائب السلطنت عباس میرزا کے بیٹے فرہاد میرزا نے شعر کہنے کے سوا اپنے والد کی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔ فرہاد میرزا انگریزی زبان سے بھی واقف تھا۔ اس لیے اس نے انگریزی نصاب کی ایک کتاب بھی نظم کی ہے۔ اس کے سوا اس نے شیخ بہائی کی کتاب خلاصۃ الحساب کا فارسی میں ترجمہ کیا اور عام جغرافیہ کی ایک کتاب "جام جم" کے نام سے لکھی ہے اور اس کتاب کے اکثر مطالب ایک انگریزی کتاب سے لیے ہیں۔ عباس میرزا کا بھائی محمود مرزا بھی اپنے زمانے کا مشہور ادیب اور مورخ گذرا ہے۔ مختصر یہ کہ قاچاری دور فارسی سبک، شعراء، علماء ادباء اور تصانیف کی کثرت کے لحاظ سے ایرانی ادبیات کی ترقی کا دور کہا جا سکتا ہے۔

اس قاچاری دور میں ایران اور یورپ کے درمیان لسانی اور ادبی روابط کی ابتداء

ہوئی۔ اسی عہد سے فارسی زبان میں مغربی علوم، قصص اور ادبیات کے ترجمے شروع ہوئے جیسے داستانِ تلماک۔ اس کے سوا فارسی زبان میں انگریزی، روسی، فرانسیسی اور دوسری یورپی زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحیں بھی داخل ہونے لگیں۔

صفوی اور قاچاری دور کے مشہور شاعر

محتشم کاشانی

صفوی دور کا مشہور ترین شاعر محتشم کاشانی، شاہ طہماسپ کے دربار کا شاعر تھا۔ جوانی میں اس شاعر نے عاشقانہ شعر لکھے تھے، غزلیں کہی تھیں اور بعض قصائد بھی لکھے تھے۔ لیکن صفوی دربار میں دینی مسائل کی طرف رجحان اور شیعیت کے احساسات کو دیکھ کر اس نے ایک نئے موضوع پر طبع آزمائی شروع کردی۔ اس نے ایسے اشعار اور ایسی نظمیں لکھنی شروع کردیں جن میں اہل بیت کی مصیبتوں کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں اُسے بڑی شہرت حاصل ہوئی اور اس کے مرثیے دور دور تک مشہور ہوگئے، بلکہ اسے ایران کا سب سے بڑا مرثیہ گو شاعر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اگرچہ محتشم کاشانی سے پہلے بعض شاعروں نے اور اس کے بعد بہت سے شاعروں نے اس طرز میں طبع آزمائی کی لیکن ان کے کلام میں وہ بات نہیں جو محتشم کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ دردناک اشعار کہنے کا پہلا محرک اس شاعر کے لیے اپنے بھائی کی موت تھی۔ بھائی کی وفات نے شاعر کو بہت متاثر اور بیتاب کیا تھا اور اس نے بھائی کی یاد میں نہایت پُراثر، غم انگیز اور لطیف شعر لکھے تھے۔

محتشم کاشانی نے عاشقانہ قطعے اور غزلیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں بعض شعر بڑے جاندار اور بڑے بامعنی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

کمند مہر چناں پارہ کن کہ گر روزی — شوی زکردہ پشیماں بہم توانی بست

دلی دارم کہ در تنگی درو جز غم نمی گنجد — غمی دارم ز دل تنگی کہ در عالم نمی گنجد

محتشم کاشانی کے مشہور مرثیوں میں ایک مرثیہ وہ ہے جو ان اشعار کے ساتھ شروع ہوتا ہے :-

بازایں چہ شورش است کہ در خلق عالمست | بازایں چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتمست
بازایں چہ رستخیز عظیم است کز زمیں | بی نفخ صور خاستہ در عرش اعظمست
گویا طلوع می کند از مغرب آفتاب | کاشوب در تمامی ذرات عالمست
گر خوانمش قیامت دنیا بعید نیست | ایں رستخیز عام کہ نامش محرمست

شہیدانِ کربلا کے مرثیہ میں محتشم کاشانی کا ترجیع بند بھی مشہور ہے ۔

محتشم کاشانی نے ۹۹۶ھ میں وفات پائی ۔

عُرفی شیرازی جمال الدین محمد عرفی ابن بدر الدین[1] صفوی دور کا مشہور شاعر ہے ایس نے ہندوستان میں زیادہ شہرت پائی ہے ۔ عرفی شیراز میں پیدا ہوا یہیں تعلیم کی تکمیل کی اور جوانی میں ہندوستان کا سفر کیا ، اور یہاں فارسی گو شاعروں اور ادیبوں سے میل جول بڑھایا ، اس دوران میں اس کی شاعری کی شہرت شہنشاہ اکبر کے دربار میں پہنچی ۔ اکبر کا دربار اس وقت شاعروں ، ادیبوں اور عالموں کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا ، عرفی کو بھی اس دربار میں بار حاصل ہو گیا ۔ عرفی نے قصیدے ، غزلیں اور قطعے لکھے ہیں اور انہیں خاص طور پر ہندوستان اور ترکی میں بڑی شہرت اور حُسن قبول حاصل ہوا ہے ۔ ان ملکوں میں اس کی کافی تقلید ہوئی ۔ عرفی کے مشہور قصیدوں میں ایک قصیدہ وہ ہے جو حضرت علیؓ کی شان میں لکھا گیا ہے ، اس قصیدہ کا مطلع ہے :

جہاں بگشتم و دردا کہ ہیچ در شہر و دیار | ندیدہ ام کہ فروشند بخت در بازار

عرفی نے نظامی کی تقلید میں خمسہ لکھنا شروع کیا تھا ، لیکن مخزن الاسرار اور خسرو شیریں کے جواب میں دو مثنویوں سے زیادہ نہ لکھ سکا ۔ عرفی کی شاعری ایک مخصوص رنگ رکھتی ہے اور اسے ہندوستانی فارسی کا رنگ کہا جا سکتا ہے ۔ اس لحاظ سے عرفی کی شاعری کا رنگ

---

[1] عام تذکروں میں زین الدین آیا ہے ۔

امیر خسرو اور فیضی کے سبک سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ طرز بجائے خود شیریں اور دلنشین ہے شاید بیان کی یہی دل آویزی ہے کہ جس کی وجہ سے خود اپنے زمانے میں عرفی کو اپنے کلام کی داد مل گئی تھی اور خود اسے اپنی شہرت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے کئی جگہ اپنی تعریف آپ کی ہے، مثلاً ایک جگہ کہتا ہے:

نازش سعدی بمشت خاک شیراز از چہ بود　　　گر نمی دانست باشد مولد و ماوائے من

عرفی نے دیوان اشعار کے سوا گلشن راز کے نام سے ایک ترجیع بند اور نفیسہ کے نام سے نثر کی ایک صوفیانہ کتاب بھی یادگار چھوڑی ہے۔ عرفی نے عین عالم شباب میں بمقام لاہور ۹۹۹ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت اس کی عمر چھتیس ۳۶ سال سے زیادہ نہ تھی۔

صائب تبریزی محمد علی صائب ابن میرزا عبد الرحیم اصل میں تبریز کے رہنے والے تھے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:۔

صائب از خاک پاک تبریز است　　　ہست سعدی گر از گل شیراز

شاہ عباس کے زمانہ میں صائب کے والد ہجرت کر کے اصفہان چلے گئے اور وہیں ۱۰۱۰ھ میں صائب پیدا ہوئے۔ تحصیل علم کے بعد ابتدائے جوانی میں حج کیا اور اس کے بعد ہندوستان کا رخ کیا اور کابل میں مقیم ہو گئے۔ کابل کا والی ظفر خاں شاعرانہ مذاق رکھتا تھا، اس نے صائب کی سرپرستی کی۔ پھر خضر خاں کے ذریعہ وہ شاہجہاں کے دربار میں پہنچے اور انہیں بڑا تقرب حاصل ہوا۔ کابل اور ہندوستان میں وہ کوئی چھ سال تک مقیم رہے، خود کہتے ہیں:

شش سال بیش رفت کہ از اصفہاں بہند　　　افتادہ است توسن عزم مرا گذر

صائب نے ہندوستان کا سفر ۱۰۳۶ھ میں کیا تھا۔ اس سفر کی ایک بڑی وجہ وطن میں اپنی بے قدری تھی۔ چنانچہ ان اشعار میں یہی مضمون ادا کیا ہے۔

بلند نام نگردد کسیکہ در وطنست　　　ز نقش سادہ بود تا عقیق در یمنست

دل رمیدۂ ما شکوہ از وطن دارد　　عقیق ما دل پرخونی از یمن دارد

اس کے بعد صائب کے والد نے صائب کو ہندوستان سے واپس بلا لیا۔ چونکہ صائب کے کلام کی شہرت ہندوستان اور ایران میں خوب پھیل چکی تھی اس لیے شاہ عباس ثانی نے انہیں اپنے دربار میں طلب کیا اور اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا۔ صائب نے اس بادشاہ کی شان میں مدحیہ قصیدے لکھے اور شاہ جہاں اور شاہ عباس ثانی کے درمیان جو لڑائی ہوئی، تھی اس کا حال نظم کیا۔

صائب نے اپنے اشعار میں اپنے ہمعصر اور پچھلے شاعروں کا نام لیا ہے اور خواجہ حافظ کے ساتھ خاص ارادت کا اظہار کیا ہے۔ خواجہ حافظ کے کلام کا اثر صائب کے کلام پر بہت زیادہ رہا ہے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:

زبلبلان خوش الحاں ایں چمن صائب　　مرید زمزمہ حافظ خوش الحاں باش

اس کے سوا سعدی شیرازی کے کلام سے بھی صائب بہت متاثر ہوئے ہیں شیخ نے فرمایا تھا:

قیامت می کنی سعدی بدیں شیریں سخن گفتن　　مسلم نیست طوطی را درایامت شکرخائی

اس کے جواب میں صائب کہتے ہیں:

دریں ایام شد ختم سخن بر جامۂ صائب　　مسلم بود گر زیں پیش بر سعدی شکرخائی

اپنے زمانے کے شاعروں کے ساتھ ایسی محبت اور وابستگی کے باوجود ان میں سے بعض بدخواہ شاعر ان سے حسد رکھتے تھے، چنانچہ صائب نے اس کی شکایت بھی کی ہے۔

صائب خود نہایت دیانت دار اور نیک آدمی تھے۔ اس لیے انھیں اپنے زمانے کے ریاکار زاہدوں سے نفرت تھی۔ صائب نے اپنے زمانے کے ایسے دوں ہمت عالموں پر لطیف تنقید کی جو دین کے نام سے صرف شکم پروری جانتے تھے۔ فرماتے ہیں

کار با عمامہ و قطر شکم افتادہ است　　خم در ایں مجلس بند گیہا با فلاطوں کمند

مخور صائب فریب فضل از عمامہ زاہد   کہ در گنبد ز بی مغزی صدا بسیار می پیچد

عقل و فطنت بجوی نستانند   دور دور شکم و دستار است

مضمون آفرینی، نازک خیالی اور باریک اندیشی یہ صائب کے سبک کی خصوصیات ہیں اور یہی چیزیں ہندی سبک کی جان ہیں۔ اس کے سوا صائب نے صنائع اور محسنات شعری سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً ارسال المثل، استعمال مجاز، مراۃ النظیر اور اشعار میں امثال کا لانا ہے۔

صائب کی طرز کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں چند شعر نقل کیے جاتے ہیں تاکہ اس قسم کے اشعار میں جس طرح کی مضمون آفرینی، پند و نصیحت کے مضامین اور شعر کے دو مصرعوں میں ایک میں مثل اور دوسرے میں تشبیہ سے کام لیا جاتا ہے، اس کا مشاہدہ کیا جا سکے:

عشق بے پروا چہ می داند زیان و سود را   شعلہ یکساں می شمارد چوب بید و عود را

صدائے آب رواں خواب را گراں سازد   ز خوش عنانی عمر است خواب غفلت ما

غیر از خدا کہ ہرگز در فکر آں نبودی   ہر چیز کز تو گم شد وقت نماز پیدا است

کثرت موج ترا در غلط انداختہ است   ورنہ در سینۂ دریا گہر راز سے کیست

با نزاکت ہستی از غم ایام خار غم   آلودہ[1] شد ز سنگ و خشت کہ بار ریخت

از شیشہ بے می و می بے شیشہ طلب کن   حق را ز دل خالی از اندیشہ طلب کن

[1] آسودہ ہونا چاہیے۔

ریشۂ نخلِ کہن سال از جواں افزوں تر است　　بیشتر دلبستگی باشد بدنیا پیر را

از تیرِ آہِ مظلوم ظالم اماں نیابد　　پیش از نشانہ خیزد از دل فغاں کماں را

موج از حقیقتِ گہرِ بحر غافلست　　حادث چگونہ درک نماید قدیم را

چسود ایں کہ کتب خانۂ جہاں از تست　　نہ علم آنچہ عمل می کنی ہماں از تست

گریۂ شمع از برائے ماتمِ پروانہ نیست　　صبح نزدیکست و در فکرِ شبِ تارِ خود ست

آدمی پیر چو شد حرصِ جواں می گردد　　خواب در وقتِ سحرگاہ گراں می گردد

یا سبو یا خمِ مے یا قدح بادہ کنند　　یک کفِ خاک دریں میکدہ ضائع نشود

از پشیمانی سخن در عہدِ پیری می زنم　　لب بدنداں می زنم اکنوں کہ دنداں نماند

صفوی دور کے دوسرے شاعروں میں بابا فغانی شیرازی (متوفی ۹۲۵ھ) بھی ہیں سلطان یعقوب آق قونیلو کے دربار سے فغانی کا تعلق تھا، اور انہوں نے حضرت علی کی مدح میں قصیدے لکھے ہیں۔ ہاتفی خرجردی مولانا جامی کے پوتے تھے ۹۲۰ھ میں وفات پائی۔ نظامی کے خمسہ کے جواب میں خمسہ لکھا ہے۔ اس میں لیلیٰ مجنوں، شیریں و خسرو، ہفت منظر اور تیمور نامہ کے نام سے مشہور مثنویاں نظم کی ہیں۔ ان کے سوا ہاتفی نے ایک شاہنامہ بھی لکھا ہے اور اسے شاہ اسمٰعیل صفوی کے نام معنون کیا ہے۔ اس دور کا ایک اور شاعر

ہلالی چغتائی (متوفی ۹۳۹ھ) بھی قابل ذکر ہے یہ اچھا غزل گو شاعر تھا اور اس نے شاہ درویش کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی ہے

اس دور کے بعض شاعروں کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

اہلی شیرازی (متوفی ۹۴۲ھ) نے بہترین قصیدے اور غزلیں لکھی ہیں۔

وحشی بافقی (متوفی ۹۹۱ھ) کرمان کے قصبہ بافق میں پیدا ہوا۔ اس کی غزلیں مشہور ہیں۔ اس نے مسمط بھی لکھے ہیں۔ فرہاد و شیریں کے نام سے ایک مثنوی شروع کی لیکن اسے مکمل نہ کر سکا۔ اس کی وفات کے بعد وصال شیرازی نے اس مثنوی کو مکمل کیا۔

زلالی خوانساری (متوفی ۱۰۲۴ھ) شاہ عباس اعظم کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ یہ میرداماد کا مرید اور مداح تھا۔ اس نے سات مثنویاں نظم کی ہیں اور ان ہی مثنویوں کی بناء پر اس کی شہرت ہے۔

امیر خسرو اور عرفی کے سوا اور جن ایرانی شاعروں نے صفوی دور میں ہندستان میں شہرت پائی اور یہاں جاہ و منزلت حاصل کی ان میں ذیل کے شاعر قابل ذکر ہیں:

نظیری نیشاپوری (متوفی ۱۰۲۱ھ)

ظہوری ترشیزی (متوفی ۱۰۲۴ھ)

طالب آملی۔ (متوفی ۱۰۳۶ھ)

ابو طالب کلیم ہمدانی (متوفی ۱۰۶۱ھ) شاہجہاں کے دربار کا ملک الشعراء تھا اس کے اشعار ہندوستان میں بہت مشہور ہوئے۔

شبلی نعمانی ہندوستان کے مشہور عالموں میں ہیں۔ انہوں نے اردو زبان میں اپنی مشہور تصنیف شعر العجم میں کلیم کی مضمون آفرینی اور بدیع الخیالی کی بہت تعریف کی ہے۔ ذیل میں کلیم کے چند شعر نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:-

روزگار اندر کمیں بخت ماست　　　　دزد دائم در پے خوابیدہ است

دل گماں دارد کہ پوشیدست رازِ عشق را　　شمع را فانوس پندارد کہ پنہاں کردہ است

از ہنر حال خرابم نشد اصلاح پذیر　　ہمچو ویرانہ کہ از گنج خود آباد نشد

واصل ز حرف چون و چرا بستہ است لب　　چوں رہ تمام گشت جرس بیزباں شود

ما ز آغاز و ز انجام جہاں بے خبریم　　اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتاد است

ہندوستان کے مشہور ترین فارسی گو شاعروں میں امیر خسرو دہلوی، عرفی شیرازی اور فیضی قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ فیضی نے ہندوستان میں اپنی زندگی بسر کی لیکن اس نے متانتِ سخن اور استحکام شعر میں وہ مقام حاصل کیا ہے کہ ایرانی شاعروں میں اور اس میں آسانی کے ساتھ تمیز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا اثر ہندستان اور عثمانی ممالک میں بہت زیادہ رہا ہے۔

فیضی ابن مبارک شاہ ۹۵۴ھ میں ہندستان کے پایۂ تخت آگرہ میں پیدا ہوا۔ اس کا بھائی شیخ ابوالفضل اکبر کے دربار کے مورخوں اور عالموں میں شامل تھا اور اُس نے اکبری دور سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ فیضی نے فارسی شعر و سخن میں مہارتِ تامہ حاصل کی تھی اور اکبر کے دربار کا ملک الشعراء بن گیا تھا۔ اس نے قصیدے اور غزل دونوں میں بلند مقام حاصل کیا ہے اور قدما کے سبک کی بہت اچھی تقلید کی ہے۔ اس نے ہندستان میں فارسی کی ترویج میں نہ صرف بہت بڑا حصہ لیا ہے اور ایران سے ہندستان آنے والے شاعروں کی سرپرستی کی ہے بلکہ عثمانی ممالک میں بھی اس کے اثر سے فارسی ادبیات کی ترویج میں کافی وسعت پیدا ہوئی۔ اس کے دیوان میں قصیدے، مرثیے، ترکیب بند، قطعات اور غزلیں ہیں۔ اس شاعر نے بھی اور شاعروں کی طرح نظامی کی تقلید میں خمسہ کہنے کی

کوشش کی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں اُس نے نظامی کی مثنوی شیریں خسرو کے جواب میں نل دمن کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے۔ اس مثنوی کے مطالب ہندی حکایات سے لیے گئے ہیں۔ فیضی نے ہندی علوم اور ہندی ادب کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ چنانچہ فارسی زبان میں مہابھارت کا ترجمہ اسی کا کیا ہوا ہے۔ فیضی کے پُراثر اشعار میں وہ مرثیہ بھی شامل ہے جو اس نے اپنے بیٹے کی موت پر کہا ہے:

اے روشنی دیدہ روشن چگونہ   من بے تو تیرہ روزم و تو بے من چگونہ
ماتم سراست خانۂ من در فراقِ تو   تو زیر خاک ساختہ مسکن چگونہ
بر خاک و خس کہ بستر و بالین خوابِ تست   اے یاسمیں عذار سمن تن چگونہ

فیضی کا یہ مرثیہ بلا اختیار جامی کے اس مرثیہ کی یاد دلاتا ہے جو جامی نے اپنے بیٹے کی وفات پر لکھا تھا۔

فیضی نے سنہ ھ میں وفات پائی۔

یہاں یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ ہندوستان کا آخری بڑا فارسی گو شاعر جس نے ایک لاکھ سے زیادہ شعر کہے ہیں اور نثر میں کتابیں بھی لکھی ہیں، وہ **عبدالقادر بیدل** ہے۔ بے شبہ بیدل نے غزل میں بلند پایہ عرفانی شعر کہے ہیں۔ نہایت درجہ استادانہ مثنویاں لکھی ہیں اور اس کا کلام ہندی سبک کا بہترین نمونہ ہے۔ بیدل کے کلیات میں غزلیں اور منظوم پند و حِکَم کے سوا نثر میں نکات کے نام سے ایک رسالہ بھی ملتا ہے۔ بیدل نے سنہ ۱۱۳۳ھ میں بمقام دہلی وفات پائی۔

ہاتف اصفہانی

سید احمد ہاتف اصفہانی کو افشاریوں اور زندیوں کے دور کا سب سے بڑا شاعر سمجھنا چاہیے۔ اس کا خاندان آذربائجان کے قصبہ اردباد کا رہنے والا تھا۔ لیکن اس نے اپنی تمام عمر اپنے مقام ولادت اصفہان میں گذاری اور ایک عرصہ تک قم اور کاشان میں مقیم رہا۔ ہاتف نے علوم متداولہ کی تحصیل کے سوا عربی زبان

میں بھی تبحر پیدا کیا تھا اور ایک روایت کی رو سے اس زبان میں شعر بھی کہے ہیں۔

ہاتف کے دیوان میں قصیدے، غزلیں، قطعے اور رباعیاں ہیں۔ اس نے غزل میں کمال پیدا کیا اور سعدی اور حافظ کے سبک کی پیروی کی ہے۔ اس نے بڑے اچھے قطعے لکھے ہیں، اور ان میں بزرگوں اور دوستوں کی وفات کا مرثیہ لکھتے ہوئے مادہ تاریخ نکالا ہے۔ ہاتف کی شہرت کا انحصار بڑی حد تک اس کے عرفانی ترجیع بند کی وجہ سے ہے، حق یہ ہے کہ الفاظ کے حسن ترکیب اور معنی کی باریکی کے لحاظ سے داد سخن دی ہے۔ ہاتف اپنے زمانہ کے شاعروں میں صباحی اور آذر سے دلی خلوص رکھتا تھا اور ان کے ساتھ سخن سرائی کرتا تھا۔ اس شاعر نے ۱۱۹۸ھ میں وفات پائی۔

ہاتف کے ترجیع بند کا آخری بند یہاں نمونے کے طور پر نقل کیا جاتا ہے۔ اس میں شاعر نے یہ صوفیانہ عقیدہ پیش کیا ہے کہ دنیا حقیقت الٰہیہ کا مظہر ہے۔ یہ دنیا جس ذات کی مظہر ہے وہ ایک ہے اور اسے معرفت کی آنکھ اور بصیرت کی نظر حجابات اور کثرات سے آگے دیکھتی ہے:

یار بے پردہ از در و دیوار — در تجلی است یا اولی الابصار

شمع جوئی و آفتاب بلند — روز بس روشن و تو در شب تار

گر ز ظلمات خود رہے بینی — ہمہ عالم مشارق الانوار

کور وش قائد و عصا طلبی — بہر ایں راہ روشن و ہموار

چشم بگشا بگلستاں و ببیں — جلوۂ آب صفا در گل و خار

ز آب بیرنگ صد ہزاراں رنگ — لالہ و گل نگر در آں گلزار

پا براہ طلب نہ و از عشق — بہر ایں راہ توشۂ ای بردار

شود آساں ز عشق کارے چند — کہ بود نزد عقل بس دشوار

یار گو بالغدو والآصال — یار جو بالعشی و الابکار

صد رہت لن ترانی ار گوید　　باز می دار دیدہ بر دیدار
تا بجائے رسی کہ می نرسد　　پائے اوہام و پایۂ افکار
بار یابی محفلی کانجا　　جبرئیل امیں ندارد بار
ایں رہ آں زاد راہ واں منزل　　مرد راہے اگر بیا و بیار
ورنہ دمرد ارراہ چوں دگراں　　بارمی گوی وپشت سرمی خار
ہاتف ارباب معرفت کہ گہی　　مست خوانند شاں گہے ہشیار
ازمے وبزم وساقی مطرب　　وز مغ و دیر رشاہد وزنار
قصد ایشاں نہفتہ اسرار سیت　　کہ بایما کنند گاہ اظہار
پے بری گر براز شان دانی　　کہ ہمین است سرآں اسرار

کہ یکے ہست وہیچ نیست جزاو
وحدہٗ لا الٰہ الّا ہُو

ہاتف کا بیٹا سید محمد سحاب (متوفی ۱۲۲۲ھ) بھی بڑا خوش گو شاعر تھا۔ یہ فتح علی شاہ کا ہم عصر اور اس کے دربار کا قصیدہ گو شاعر تھا۔ رشحات کے نام سے ایک تذکرہ بھی اس سے منسوب کیا جاتا ہے جسے وہ مکمل نہ کر سکا۔

سبکِ قدیم کی طرف بازگشت

جیسا کہ اس باب کے شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے مغولی اور تیموری دور کے پر تکلف سبک اور خاص کر دور صفوی کی مضمون آفرینی، نکتہ سنجی اور جملہ بندی ۔۔ اسے سبک ہندی کا نام دیا گیا ہے ۔۔ کے رواج کے بعد قدما کے اسلوب سے رجوع کرنے کی نئی تحریک ایران میں شروع ہوئی۔ اس نہضت جدید کی ابتداء بارہویں صدی ہجری کے آخر میں ہوئی اور اس کا بڑا مرکز اصفہان تھا۔ اس طرح کی سخن گوئی کے اولین علم بردا

سید محمد شعلہ اور میر سید علی مشتاق تھے۔ یہ بڑی اچھی غزلیں لکھتے تھے اور شاعری کا سچا ذوق رکھتے تھے۔ اسی طرح میرزا محمد اصفہانی، عاشق اصفہانی، لطف علی آذر بیگدلی، سید احمد ہاتف اور سلیمان بیدگلی صباحی بھی ایسے ہی شعر کہنے والے تھے اور شعر و سخن میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ اس نہضت جدید کا نتیجہ یہ نکلا کہ نئے نئے افکار نے رواج پایا اور شاعروں نے پچھلے متقدمین — جیسے فردوسی، عنصری، فرخی، منوچہری، خاقانی اور انوری — کی پیروی شروع کر دی۔ اور ان کی طرز سخن، ان کے شیوۂ بیان اور ان کے مضامین کا احیا کیا۔ اس نہضت کی وجہ سے سو سے بھی زیادہ غزل گو اور قصیدہ نویس شاعر قاچاری دور میں ہوئے۔ ان لوگوں نے نظم و نثر میں قبل مغول شاعروں اور ادیبوں کی پیروی کی۔ یہاں ان میں سے بعض بڑے بڑے ایرانی شاعروں کا ذکر کیا جاتا ہے:

مجمر اصفہانی سید حسین طباطبائی متخلص بہ مجمر بارہویں صدی ہجری کے آخر میں اصفہان کے نواح زوارہ میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں ادبی علوم کی تحصیل کی اور خاصی استعداد پیدا کرلی۔ اس کے بعد مجمر اس انجمن میں شریک ہو گئے جو شعراء کی ایک جماعت نے نشاط کی صدارت میں قائم کی تھی۔ خود نشاط اور مجمر میں بھی گاڑھی دوستی ہو گئی۔ مجمر ایک عرصہ تک اصفہان میں مقیم رہے، اس کے بعد وہ طہران آئے اور اپنے ذہن کی جودت، نادر خیالی اور حسن شہرت کی وجہ سے بہت جلد فتح علی شاہ کے دربار میں تقرب حاصل کرلیا۔ فتح علی شاہ نے انہیں مجتہد الشعراء کا لقب عطا کیا۔ یہ لقب ان سے پہلے ہاتف کے بیٹے سحاب کے لیے مخصوص تھا۔ اور ملک الشعراء کے بعد اسی کا رتبہ سمجھا جاتا تھا۔ مجمر کئی سال تک فتح علی شاہ کے بیٹے حسن علی میرزا کے ندیم رہے اور باپ اور بیٹے دونوں نے انہیں انعام و اکرام سے سرفراز کیا۔

مجمر اول درجہ کے قصیدہ گو تھے۔ انہوں نے اپنے بیشتر قصیدے بادشاہ، ان کے بیٹو اور اعیانِ مملکت کی مدح میں لکھے ہیں۔ مجمر نے پچھلے استادوں اور خاص کر انوری، خاقانی اور

معزی کی طرز اُڑائی۔ مثلاً امیر معزی کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے:

اندر ہلاکِ گردوں وز صنع ہائے یزداں زیبا ترین عالم فرخ ترین گیہاں

اس قصیدے کے جواب میں مجمر نے قصیدہ لکھا ہے:

در عرصہ دو گیتی از آشکار پنہاں زیبا ترین بدیعی کامد ز فیض یزداں
از عقلہاست اول وز نفسہاست قدسی از عضوہاست دیدہ وز عرقہاست شریاں
از پیکہاست جبریل وز مژدہ ہاست بعثت از اصلہاست توحید وز فضلہاست ایماں

مجمر کے رندانہ اور عارفانہ قصائد میں ایک قصیدہ وہ ہے جو عید کی تہنیت میں لکھا گیا ہے اور اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

المنۃ للہ کہ بدل گشت دگر بار سجادہ بہ پیمانہ و تسبیح بزنار

ایک اور قصیدہ جو مجمر نے بادشاہ کے شکار کی تہنیت میں لکھا ہے، اس کا مطلع ہے:

گو صبا را کہ رہ قصر ملک برگیرد قدم از آں سوے افلاک فراتر گیرد

اس قصیدے سے بھی شاعر کی قادر الکلامی اور ہنرمندی ظاہر ہے۔

ذیل میں چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ اشعار کلام میں متانت، پختگی اور وزن و آہنگ کے لحاظ سے خراسانی سبک اور قدما کی طرز کا نمونہ ہیں اور مجمر اس سبک کا احیاء کرنے والے لوگوں میں ہیں:

دوش از دیدۂ مردم چو عروس خاور کرد رخسار نہاں از پس نیلی معجر
از پی جلوہ در ایں کاخ زر اندود زروی پردہ برداشت دو صد لعبت سیمیں پیکر
من ازیں رشک شدم تا کہ بخلوتگہ طبع پردہ بردارم از روی عروسان نکر
خلوتی دیدم چوں روضۂ رضوان و در آں لعبتانی بہ پس پردۂ عصمت اندر
گاہ در پردہ ولی پیدا چوں مردم چشم گاہ بی پردہ ولے پنہاں چوں نور بصر
زآنمیان بود یکی شاہ و تمامی بندہ زآں میان بود یکی ماہ و سراسر اختر

پی مشاطہ گیس خواستم آوردن پیش ۔۔۔ خامہ از برگ سمن غالیہ از عنبر تر

مجمر نے دوسرے شاعروں کی بھی پیروی کی ہے۔ انہوں نے ایک قصیدہ عبدالواسع جبلی کی طرز میں لکھا ہے۔ اپنے ہم عصر شاعروں سے بھی ان کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ ان شاعروں میں نشاط اصفہانی کی ایک قصیدے میں مدح کی ہے۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے:

چیست آں غنچہ کر نشگفتہ زباد سحر است ۔۔۔ غنچہ نشنفتہ کسی کش زصبا پردہ دار است

مجمر نے ہزل اور ہجو میں اشعار، بادہ گساری کی تعریف میں قطعے اور غزلیں بھی کہی ہیں ان کی غزلیں بڑی بلند پایہ ہیں۔ یہی حال ان کے قطعات اور ترکیب بند کا ہے۔ اس کے سوا انہوں نے خاقانی کی مثنوی تحفۃ العراقین کی سبک پر ایک مثنوی بھی لکھی ہے نثر میں بعض قطعات ان کی یادگار ہیں۔ اور ان کی طرز شیخ سعدی کی طرز پر ہے۔ مجمر نے معمے دلغز بھی لکھے ہیں۔ ان کی فردیات صائب کی یاد تازہ کرتی ہے۔ مجمر نے عین جوانی کے عالم میں بمقام طہران ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی اور قم میں سپرد خاک کیے گئے۔

نشاط میرزا عبدالوہاب نشاط اصفہانی ملقب بہ معتمد الدولہ اپنے زمانے کے بہت بڑے ادیبوں اور شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ اس کے سوا انہوں نے سیاسیات میں بھی بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ وہ فتح علی شاہ کے دربار کے بڑے امیروں میں گنے جاتے تھے۔ ادبی ذوق اور بدیع الخیالی کے لحاظ سے وہ بے مثال تھے۔ حکمت، ریاضی اور ادبی علوم میں کمال رکھتے تھے۔ نہایت نیک منش، خوش مشرب اور نکتہ سنج تھے مختلف قسم کے خط اور خاص کر شکستہ خط لکھنے میں انہیں استادانہ کمال حاصل تھا۔

نشاط نے نہایت بلند آہنگی مستعدی اور سچی محبت سے کام لے کر اصفہان کو شعر و ادب کا مرکز بنا دیا تھا۔ انہوں نے شاعروں کی ہمت بندھائی اور انہیں ایران کی نئی ادبی زندگی کے بانیوں کے حلقہ میں شامل کرلیا۔ یہ نشاط اور ان کے دوست ہی تھے جنہوں نے فارسی ادبیات کی قدیم سنت کو نئے سرے سے زندہ کیا۔ اور قدما کی طرز میں شعر کہنا

شروع کیا۔ ایک مدت تک وہ اہل طریقت و سلوک کی صحبت میں رہے اور جو کچھ ان کے پاس تھا وہ سب ان کی خدمت میں لٹا دیا۔

فارسی اور عربی نظم و نثر میں انہیں کافی مہارت حاصل تھی۔ خاص کر ان کی غزل بڑی اُستادانہ اور بڑی پیاری ہوتی تھی۔ غزل کے سوا انہوں نے قصیدے، مثنوی اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ قصیدے میں انہوں نے پچھلے اُستادوں کی پیروی کی ہے اور انہی کے رنگ میں شعر کہے ہیں۔ مثلاً امیر معزی کا ایک قصیدہ ہے جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

از دور ہائے گردوں و ز صنع ہائے یزداں — زیبا ترین عالم فرخ ترین گیہاں

نشاط نے اس قصیدہ کے جواب میں قصیدہ لکھا ہے۔ مجمر نے بھی اسی زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ نشاط کہتے ہیں:

زیبا ترین اشیا فرخ ترین اعیاں — از ہر چہ ہست پیدا و ز ہر چہ ہست پنہاں

از مرغہا ہزار است از وقتہا سحر گہ — از فصلہا بہار است از نوعہا ست انساں

از عہدہا شباب است از آبہا شراب است — از انجم آفتاب است از ماہہا ست نیساں

از سنگہا دل دوست از عیشہا غم اوست — از تیغہا ست ابرو از دشنہا ست مژگاں

از زیبہا ست افسر از طیبہا ست عنبر — از عضوہا ست دیدہ از خلقہا ست احساں

از انبیا محمدؐ از شہرہا مدینہ — از شاخہا ست طوبیٰ از باغہا ست رضواں

از بحرہا ست آں دل از ابرہا ست آں کف — از روحہا آں تن از عقلہا ست آں جاں

اس کے سوا انوری کے اس قصیدے کے جواب میں جس کا مطلع ہے:

شاہا صبوح فتح و ظفر کن شراب خواہ — نزد و ندیم و مطرب و چنگ و رباب خواہ

یہ قصیدہ لکھا ہے:۔

شاہا ہلال ماہ نو از آفتاب خواہ — ابروے یار بیں و ز ساقی شراب خواہ

غزل میں بھی نشاط نے مشہور شاعروں کی پیروی کی ہے اور صوفیانہ غزلیں بھی لکھی ہیں مثال کے

طور پر ذیل کی غزل ہی لیجیے، بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ غزل لکھتے وقت سعدی کی وہ مشہور غزل ؎

مشنو اے دوست کہ غیر از تو مرا یارے ہست

نشاط کے پیش نظر رہی ہے کہتے ہیں:

زاہد ار رہ نہ بہ خانۂ خماری ہست — وجہ می ار نرسد خرقہ و دستاری ہست
رفتنش بے سببی نیست از ایں رہ کہ طبیب — گذرد بر سر آں کوچہ کہ بیماری ہست
می رسد یار و بیماراں نگرانست ولے — ہمہ دانند کہ پنہاں بمنش کاری ہست
زرفیقاں بسلامت رہ منزل گیرید — کہ مرا تا بدر دیر مغاں کاری ہست
غم گرفتہ است فرو مجلس میخواراں را — مگر امروز دریں میکدہ ہشیاری ہست
گل فردوس نگیرد زکف جو رکسی — کہ دریں بادیہ اش قسمتی از خاری ہست
شاید از بر سر کوی تو بود جاے نشاط — بلبلی ہست بہر خانہ کہ گلزاری ہست

اسی طرح ذیل کی غزل میں خواجہ حافظ کی پیروی کی ہے:

ای فروغ ماہ از شمع شبستانِ شما — چشمۂ خور جرعۂ در بزم مستانِ شما

ذیل کے اشعار میں حافظ کی وہی طرز اور وہی رندانہ اور عارفانہ مضامین ملتے ہیں:

عمر بگذشت و نماندست جز ایامی چند — بہ کہ بایاد کسی صبح شود شامی چند
بحقیقت نبود در ہمہ عالم جز عشق — زہد و رندی و غم و شادی از و نامی چند
زحمت بادیہ حاجت نبود در رہ دوست — خواجہ برخیز بروں آئی ز خود گامی چند
طبع خاکی بنہ و چاک بر افلاک انداز — مرغ کز دام بر آید چہ بود بامی چند
شیخ را باک گر از طعنہ خاصاں نبود — عن چہ باکم بود از سرزنش عامی چند
آتشی بر سر ایں کوی بر افروخت نشاط — در نگیرد ولی از شعلہ او خامی چند

نشاط کے کلام اور اشعار کا مجموعہ گنجینہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں

نشاط کے نثری قطعات میں مراسلے، منشآت، مناجات، مقالات، دیباچے اور شکایات شامل ہیں۔ ان میں دربار کی رسمی انشاء اور اپنے زمانے کے ترسل کی طرز کی نمائندگی کی ہے پچھلی صدی کی درباری انشاء اور خاص کر دورِ مغول کے سبک سے سادہ تر ہے لیکن ہمارے زمانے کی انشاء کے مقابلہ میں پُر تصنع اور پُر تکلف ہے اور اسے قاچاری دور کے دیوانی سبک کا نمونہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ کم وبیش یہی طرز اس دور کے دوسرے منشیوں کی تحریر میں جلوہ گر ہے اور بتدریج سادہ اور سلیس ہوتی گئی ہے۔

نشاط نے سنہ ۱۲۴۴ھ میں وفات پائی۔ منصف قاچار نے تاریخ وفات نکالی ہے:

از قلب جہاں نشاط رفتہ

صبا فتح علی خاں صبا، فتح علی شاہ کے زمانے کے مشہور قصیدہ گو شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ نے جوانی میں صباحی بیدگلی سے تلمذ حاصل کیا۔ بادشاہ کی طرف سے صبا اپنے مولد کاشان اور قم کی حکومت پر فائز تھے۔ اس کے بعد وہ دربار کے ایک رکن بن گئے انہیں بادشاہ کا تقرب حاصل ہوتا گیا۔ اور آخر کار وہ ملک الشعرائی کے لقب سے سرفراز کیے گئے۔ صبا نے قصیدے، غزل، رباعی اور مثنوی زیادہ کہی ہیں، اور سب سے بڑھ کر قصیدہ میں کمال پیدا کیا تھا۔ انہوں نے ترجیع بند بھی خوب لکھے ہیں۔ ان کے اشعار کی تعداد دس سے لے کر پندرہ ہزار تک لکھی ہے۔

صبا کے اکثر مشہور قصیدے فتح علی شاہ شہزادوں اور فتح علی شاہ کے دربار کے امیروں کی مدح میں ہیں۔ صبا نے دیوان کے سوا مثنویاں اور منظوم رسالے بھی لکھے ہیں مثنویوں میں ان کی اہم ترین مثنوی شاہنشاہ نامہ ہے۔ یہ شاہنامہ کی تقلید میں اسی وزن میں لکھی گئی ہے۔ اسے صبا نے سنہ ۱۲۰۷ھ کی جنگ کے بعد لکھنا شروع کیا اور اُسے فتح علی شاہ کے نام معنون کیا ہے۔ اس کے سوا خداوند نامہ کے نام سے ایک اور مثنوی شاہنامہ کے وزن پر لکھی ہے۔ اسی طرح عبرت نامہ اور گلشن صبا نامی مثنویاں بھی ان کی یادگار ہیں۔

صبا نے ۱۲۳۸ھ میں وفات پائی۔

صبا کو قدماء کے سبک کے زندہ کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے قصیدوں میں بھی قدماء کی اسی طرز سے کام لیا گیا ہے اور ہر شعر میں اس کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً ان کا توحیدیہ قصیدہ جس کا مطلع ہے:

تعالی اللہ خداوند جهاندار جہاں آرا کزو شد آشکارا گل ز خار و گوہر از خارا

فرخی کے انداز کی نشاندہی کرتا ہے۔ ذیل کے قصیدے میں منوچہری کے سبک کی پیروی کی ہے:

چو کرد ایں لالہ سوے برہ آہنگ شد آذر گوں ز آذریوں لب رنگ

زمیناگوں زمینہا آہواں را زمرد فام شد سم شبہ رنگ

کمان رستم اینک بیں کہ دارد بروے چرخ چاچی را پر آژنگ

ہوا از عکس آں چوں پر طاؤس زمیں از فیض آں چوں پر تو رنگ

صبا نوروز اور بہار سے بہت متاثر ہیں اور اوپر جو بہاریہ قصیدہ نقل ہوا ہے ایسے بہت سے قصیدے اُنہوں نے لکھے ہیں۔ انہوں نے پرلطف نوروزیے بھی لکھے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک نوروزیہ ہے:

شاہد جاں پرور نوروز تن آراستہ آفتاب و ماہ از مشکیں پرن آراستہ

اس قصیدے میں قدرت کے کرشموں کو بڑے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔

وصال شیرازی میرزا شفیع شیرازی نام، میرزا کوچک عرف، تخلص وصال، فتح علی شاہ اور محمد شاہ کے عہد کے مشہور شاعروں میں تھے۔ شعر بہت کہے ہیں۔ ان کے دیوان میں پندرہ ہزار سے زیادہ شعر ملتے ہیں۔ وصال کا کمال غزل کا کمال ہے اور انہیں اپنے زمانے کے اچھے غزل گو شاعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ انہیں مثنوی گوئی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ان کی مثنویوں میں سے ایک مثنوی بزم وصال استاد فردوسی کی طرز میں لکھی گئی ہے۔ وصال نے وحشی کی مثنوی فرہاد و شیریں کو مکمل کیا اور حق یہ ہے کہ اس کام

کو بڑے اچھے طریقہ پر پورا کیا ہے۔ اس کے سوا وصال نے زمخشری کی اطواق الذہب کا فارسی
میں ترجمہ کیا ہے۔ وصال اپنے زمانے کے بہترین خوشنویسوں میں شمار ہوتے تھے اور علم موسیقی
سے بھی خوب واقف تھے۔ اسی فضل وکمال کی وجہ سے وصال کے ایک ہمعصر شاعر علی اکبر
بسمل شیرازی نے اپنے تذکرہ "تذکرۂ دلگشا" میں وصال کی بڑی تعریف کی ہے اور انہیں اہلِ
کمال لوگوں میں بے مثال قرار دیا ہے۔

وصال نے ۱۲۶۲ھ میں بمقام شیراز وفات پائی۔

وصال بھی متقدمین کے سبک کے پیرو تھے۔ قصیدہ بھی انہی کے قصیدے کو پیش
نظر رکھ کر لکھا ہے۔ ذیل کے یہ چار شعر انہوں نے زلزلہ کی تعریف میں لکھے ہیں:

زبس کز بوم من این بوم لرزید — گسست او را زیکدیگر مفاصل

زشتہای زمین خیزد بخاری — عفن چوں بوی سحر از چاہ بابل

رسوم این دیار از بس تزلزل — چناں شد محو چوں رسم فضائل

بزیر گل ہمہ خورشید رویاں — کہ نتواں گفت جز ماندو دن از گل

وصال نے اپنے ہم عصر شاعروں سے بھی شعر بازی کی ہے۔ ان شاعروں میں قاآنی
بھی شامل ہے۔ انہوں نے قائم مقام جیسے بزرگوں کی مدح بھی کی ہے۔

غزل کی صنف میں وصال نے سعدی اور حافظ کی پیروی کی ہے۔ سعدی کی ایک
مشہور غزل ہے، اس کا مطلع ہے:

تفاوتی نکند قدر پادشاہی را — گر التفات کند کمترین گدائی را

اس غزل کے جواب میں وصال نے غزل لکھی ہے۔ اس کے دو شعر یہ ہیں:

بغیر دیر مغاں دل ندید جائی را — کہ فرق می ننہد از شہی گدائی را

سلوک وادی خونخوار عشق یکتا نیست — چہ راہ گمشدہ را چہ رہنمائی را

وصال کی ایک اور غزل کا شعر ہے:

(۲)

تاریخ ادبیات ایران

پختہ در کعبہ و بتخانہ مجو از من پرس　　بد درآں سوختۂ چند و دریں خامی چند

اپنے ہم عصر شاعر نشاط کی طرح وصال نے بھی یہ غزل حافظ کی غزل پر لکھی ہی۔
ذیل میں نشاط کی مشہور غزلوں میں سے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ان میں شاعر
نے بڑے لطیف مضامین پیش کیے ہیں:

زنہار میازار زخود ہیچ دلی را　　کز ہیچ دلی نیست کہ راہی بخدا نیست

... ⁘ ...

ہر طرف سوختہ ای از غم او می نالد　　ایں چہ شمع است کہ عالم ہمہ پروانہ اوست

... ⁘ ...

اشکم زسر گذشت ہماں سوز شم بجاست　　در حیرتم کہ سوختن من در آب چیست

... ⁘ ...

از کعبہ و کنشت چو مقصود روی اوست　　گر رہ بکعبہ نیست مقیم کنشت باش

... ⁘ ...

با ہر ہنر مقابلہ کردیم عشق را　　فضل از محبت است و ہنرہا ہمہ فضول

... ⁘ ...

بزیر پردہ چوں درمہ سحابی　　سخن بی پردہ گویم آفتابی

وصال کا خاندان علم و ادب کا پرستار خاندان تھا۔ وصال کے بیٹے وقار، میرزا محمود حکیم
میرزا ابوالقاسم فرہنگ، داوری اور یزدانی سب کے سب اہل کمال، صاحب ہنر اور ادیب تھے۔
میرزا وقار اپنے باپ کے کمالات کے سچے وارث ہوئے۔ خوش نویسی میں انھوں نے
بڑی مہارت پیدا کی اور خاص کر خط نسخ بڑا استادانہ لکھتے تھے۔ نہایت پاکیزہ خط میں انھوں
نے کئی کتابیں اور دیوان لکھے ہیں۔ ان میں مثنوی معنوی بھی شامل ہی۔ وقار شعر بھی کہتے
تھے اور بعض اچھے ترجیع بند اور مسمط بھی انھوں نے لکھے ہیں۔

میرزا محمود حکیم نہ صرف طب کے علم میں مہارت رکھتے تھے بلکہ وہ بڑا پاکیزہ شاعرانہ ذوق بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے کئی مزے دار قصیدے لکھے ہیں اور نستعلیق خط خوب لکھتے تھے۔

میرزا ابوالقاسم اور ان کے دوسرے بھائی بھی اہل ہنر تھے۔ فرہنگ نے یورپ کا سفر کیا تھا اور پیرس کی تعریف میں انہوں نے ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ قصیدہ موضوع کی تازگی کا حامل ہے۔ انہوں نے بعض اچھے مسمط بھی لکھے ہیں۔

قائم مقام ایران کے نئے ادبی سبک کے ایک رہبر میرزا ابوالقاسم قائم مقام بھی ہیں۔ یہ میرزا عیسیٰ قائم مقام (جو میرزا بزرگ کے نام سے مشہور تھے) کے بیٹے تھے۔ ابوالقاسم قائم مقام ۱۱۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ فتح علی شاہ، اس کے وزیر عباس میرزا نائب السلطنت اور والی آذربائجان کے دربار میں بڑے ذی اثر لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ محمد شاہ کے عہد میں بھی مملکت کے اہم امور ان ہی کے ہاتھوں میں تھے۔ قائم مقام اپنے ہم عصر شاعروں میں نشاط وغیرہ کے ساتھ دوستی اور ربط ضبط رکھتے تھے۔

قائم مقام کو علوم حکمت اور ادب میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ فارسی اور عربی نظم ونثر دونوں پر انہیں استادانہ عبور حاصل تھا۔ ان کے اشعار اور ان کے منشآت فصاحت اور بلاغت کے نمونہ ہیں۔ مغلوں کے بعد کا وہ سبک جس میں پر تکلف عبارتیں، پیچیدہ مضامین، مبہم معانی اور دور از کار تشبیہیں رائج ہو گئی تھیں ان سے ہٹ کر اس بے مثل ادیب کی تحریریں آنکھوں کو خاص طراوت بخشتی ہیں۔ قائم مقام کی طرز گفتار متقدمین اور خاص کر سعدی کی طرز کی بے اختیار یاد دلاتی ہے۔

قائم مقام کے اشعار کا بڑا حصہ قصیدے اور مدح پر مشتمل ہے لیکن انہوں نے قطعے اور رباعیاں بھی خوب لکھی ہیں۔ اس کے سوا غزلیں ہیں۔ ایک مثنوی جلائر نامہ اپنے غلام جلائر کے نام سے نظم کی ہے اور اس میں درباریوں کی حالت اور فوجی اور دیوانی

عہدہ داروں کی برائیوں کا مضحکہ اڑایا ہے۔

قائم مقام کے پر اثر قطعات ہیں ایک قطعہ وہ ہے جو انہوں نے روس کے حملہ اور ایران کی شکست پر لکھا ہے۔ یہاں اس قطعہ سے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں ان اشعار سے شاعر کے تاثر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

روزگاریست آنکہ گہ عزت دہد گہ خوار دارد	چرخ بازیگر ازیں بازیچہ ہا بسیار دارد
مہر اگر آرد بسے بیجا و بے ہنگام آرد	قہر اگر دارد بسے ناساز و ناہنجار دارد
گہ نظر با پلکنیک و با کپتان و افیسر[۱]	گاہ با سرہنگ و با سرتیپ با سردار دارد
لشکری را گہ بکام گرگ مردم خوار خواہد	کشورے را گہ بدست مرد مردم دار دارد
گہ بتبریز از پطربرگ اسپہی خونخوار راند	گہ بہ تفلیس از خراساں لشکری جرار دارد

عجیب اتفاق ہے کہ اس زمانے کے خونی واقعات یعنی تیرہویں صدی کے وسط کے زبردست خطرات کا عکس شاعروں کے کلام میں نظر آنے لگا، اور مرحوم قائم مقام نے وطن دوستی کے احساسات کا اظہار بڑے نادر انداز میں کیا ہے۔ اس کے سوا قائم مقام نے جو لطیف، حزنیہ اور شکوائی اشعار لکھے ہیں ان میں ایک قصیدہ بھی ہے یہ قصیدہ انہوں نے اپنی غزل کے بعد یعنی ۱۲۳۹ھ کے بعد لکھا ہے۔ ذیل کے اشعار اسی قصیدے سے لیے گئے ہیں اور مسعود سعد کے سبک کی یاد دلاتے ہیں:

اے بخت بد اے مصاحب جانم	ای وصل تو گشتہ اصل حرمانم
اے بیتو نگشتہ شام یک روزم	اے با تو نرفتہ شاد یک آنم
اے خرمن عمر از تو بربادم	وے خانہ صبر از تو ویرانم
ہم کوکب سعد از تو منحوسم	ہم مایہ نفع از تو خسرانم
تیغست ستارہ و تو جلادم	سجنست زمانہ تو سجانم

---

[۱] روسی زبان میں فوجی عہدہ داروں کے نام۔

گویا اس مرد بزرگ نے ان دردناک اشعار میں ایک طرف اپنے وطن ایران کی حالت اور دوسری طرف اپنے غمناک انجام کی پیش گوئی کر دی تھی۔

محمد شاہ کے حکم پر قائم مقام کو ۱۲۵۱ھ میں بمقام طہران قتل کر دیا گیا۔

قاآنی میرزا حبیب متخلص بہ قاآنی ۱۲۲۲ھ کے قریب یعنی فتح علی شاہ کے عہد میں بمقام شیراز پیدا ہوئے۔ ان کے والد میرزا محمد علی خود بھی شاعر تھے اور گلشن تخلص کرتے تھے۔ میرزا حبیب نے جوانی میں خراسان کا سفر کیا اور یہاں علوم اور ادبیات کی تعلیم حاصل کی اور یہیں سے ان کی شعر گوئی کا آغاز ہوا۔ اس وقت وہ حبیب تخلص کرتے تھے۔ ان کی شعر گوئی کی شہرت بڑھی تو میرزا حسن علی میرزا شجاع السلطنت جو اس زمانہ میں صوبہ خراسان کا حاکم تھا، انہیں اپنے دربار میں بلایا اور اپنا مقرب بارگاہ بنایا۔ اسی کے حکم پر میرزا حبیب قاآنی تخلص اختیار کیا۔ یہ تخلص شجاع السلطنت کے بیٹے اوکتا قاآن سے نسبت رکھتا تھا۔ ایک مدت تک قاآنی خراسان اور کرمان میں شجاع السلطنت کے حضور میں حاضر رہے۔ پھر اسی شہزادے نے قاآنی کو فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں پیش کیا۔ قاآنی خراسان، شیراز اور کرمان میں ایک عرصہ تک رہنے کے بعد طہران آیا اور یہاں اس کی شہرت اور بڑھی اور محمد شاہ اور خاص کر ناصر الدین شاہ قاچار کے دربار میں اس کا رسوخ بہت بڑھ گیا۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے قاآنی پہلا ایرانی شاعر ہے جس نے فرانسیسی زبان سیکھنی شروع کی تھی۔

صائب کے بعد قاآنی صفوی اور قاچاری دور کا سب سے بڑا ایرانی شاعر ہے۔ طرز سخن، کلام کی خوبی اور صفائی، الفاظ کے حسن انتخاب، بندش اور قدماء کی طرز کے اتباع میں اس دور کا شاید ہی کوئی شاعر قاآنی کی برابری کر سکے۔ قاآنی نے خاص طور پر قصیدہ میں بڑی ہنرمندی اور کمال کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی غزلوں سے بھی اُستادانہ شان

ٹپکی پڑتی ہے۔

قاآنی نے مسمط اور ترجیع بند میں بھی بڑی اُستادی کا ثبوت دیا ہے اور اسے بڑے اونچے درجے پر پہنچایا ہے لیکن قاآنی کے کلام میں عبارت کی حلاوت زیادہ اور فلسفیانہ اور اخلاقی معنی کم ہیں۔ اس کے مدحیہ قصیدے بہت ہیں، اور یہی اس کے کلام کا شاہکار ہے۔ اس کے کلام کی طرز خراسانی شاعروں کی طرز ہے اور خاص طور پر منوچہری کی طرز سے بہت مشابہ ہے۔ قاآنی کے اکثر قصیدے ناصرالدین شاہ کی مدح میں ہیں۔ ان میں سے بہت سے قصیدے بڑی حلاوت اور بڑی شیرینی کے حامل ہیں ان قصیدوں کو وہ قدرتی مناظر سے شروع کرتا ہے۔ ایسے ہی ایک مسمط کا یہ بند ملاحظہ ہو:

بنفشہ رستہ از زمیں بطرف جوئبارہا ویا گسستہ حورعین ز زلف خویش تارہا
ز سنگ اگر ندیدۂ چساں جہد شرارہا بہ برگہائے لالہ بیں میان لالہ زارہا
کہ چوں شرارہ می جہد ز سنگ کوہسارہا

ذیل میں ایک اور مسمط سے کچھ بند پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں لطف بہار کے شوق اور روئے گلزار اور نغمۂ جوئبار کے عشق کا بڑا دلکش انداز میں اظہار کیا ہے:

باز برآمد بکوہ رایت ابر بہار سیل فرو ریخت سنگ از زبر کوہسار
باز بجوش آمدہ مرغان از ہر کنار فاختہ و بوالملیح صلصل و سبک و ہزار
طوطی و طاؤس و بط سیرہ و سرخاب و سار

ہست بنفشہ مگر قاصد اردی بہشت کز ہمہ گلہا دمد بیشتر از طرف کشت
وز نفسش جوئبار گشت چو باغ بہشت گوئی با غالیہ بر رخش ایزد نوشت
کای گل مشکیں نفس مژدہ براز نوبہار

دیدۂ نرگس بباغ باز پراز خواب شد طرۂ سنبل براغ باز پر از تاب شد
آب فسردہ چو سیم باز چو سیماب شد باد بہاری بجست زہرہ دی آب شد

نیمشباں بیخبر کرد ز بستاں فرار

قاآنی نے جو قصیدے نوروز کی آمد، بہار کی تعریف اور بادشاہ کی مدح میں لکھے ہیں ان میں شاعر کا تغزل اپنے پورے کمال پر ہے اور حق یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک قصیدہ اچھوتے لطفِ ضمیر اور طبعِ منیر کا نمونہ ہے۔ قاآنی نے اپنے تمام قصیدوں میں پچھلے استادوں کی پیروی کی ہے اور بڑے سلیقہ اور ہنرمندی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے۔ لیکن وہ خود بھی سخن پردازی کے تمام مراحل طے کر چکا تھا اور اس طرح کے اشعار کہنے میں قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ اسے نوازا تھا۔ قاآنی کے اکثر قصیدوں سے پچھلے استادوں کے استفادہ کا رنگ صاف جھلکا پڑتا ہے۔ مثلاً یہ قصیدہ ملاحظہ ہو:

اگر نظامِ امورِ جہاں بدستِ قضاست چرا ہر آنچہ کند امرِ شہریار رضاست

یہ قصیدہ استاد انوری کا وہ قصیدہ یاد دلاتا ہے جو ذیل کے مطلع سے شروع ہوتا ہے:

اگر محولِ حالِ جہانیاں نہ قضاست چرا مجاریِ احوال بر خلافِ رضاست

اسی طرح اس قصیدہ میں:

آنچہ می بینم بہ بیداری نبیند کس بخواب زانکہ در یک حال ہم در رحمتم ہم در عذاب

اس استاد کی پیروی کی ہے جس نے کہا تھا:

ایں کہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب خویشتن را در چنیں نعمت پس از چندیں عذاب

ایک اور قصیدہ ہے:

غم و شادی ست کہ بایکدگر آمیختہ اند یا مہ روزہ بنوروز در آمیختہ اند

اس قصیدہ میں خاقانی کے اس قصیدے کو اپنے سامنے رکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

می و مشکست کہ با صبح در آمیختہ اند یا بہم زلف و لبِ یار در آمیختہ اند

قاآنی کے دیوان میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جو قدیم استادوں کی سبک سے نمایاں طور پر متاثر ہیں۔

ذیل کے دو قصیدوں میں شاعر نے بہار کی قدرتی دلفریب روح کو اپنے کلام میں جلوہ گر کیا ہے اور ان قصیدوں پر منوچہری کے سبک کا اثر نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

کار طرب و روز می و فصل بہار ست — جاں خرم و دل فارغ و شاہد بکنار ست
باد سحر از آتش گل مجمرہ سوز ست — خاک چمن از آب رواں آئینہ دار ست
تا می نگری کوکبہ سوری و سرو است — تا می شنوی زمزمہ صلصل و سار ست
سوری بچہ ماند ہی کی بیضۂ الماس — کاں بیضۂ الماس پر از عود قمار ست
مانا ز سفر تازہ رسید ست بنفشہ — کش بر خط مشکیں اثر گرد و غبار ست

...   ⁂   ...

بہار آمد کہ از گلبن ہمی بانگ ہزار آید — بہر ساعت خروش مرغ زار از مرغزار آید
بجوشد مغز جاں چوں بوی گل از گلستاں خیزد — بہ پرد مرغ دل چوں بانگ مرغ از شاخسار آید
خروش عندلیب و صوت سار و نالۂ قمری — گہی از گل گہی از سرو بن گہ از چنار آید
یکے گیرد بکف لالہ کہ ترکیب قدح دارد — یکے بر گل کند تحسیں کز و بوے نگار آید
یکے بیند چمن را بے تامل مرحبا گوید — یکے بوید سمن را مات صنع کردگار آید
یکے بر لالہ پا کوبد کہ ہی ہی رنگ می دارد — یکے از گل بو جد آید کہ بخ بخ بوی یار آید
یکے بر سبزہ می غلطد یکی بر لالہ می رقصد — یکی گاہے رود از ہش یکی گہ ہوشیار آید
ز ہر سوئے نوائے ارغنون و چنگ و نے آید — ز ہر سوئے صدائے بربط و طنبور و تار آید

یہ پُر بہار اشعار جن میں بہار کی ساری رعنائی اور زیبائی کی تصویر الفاظ میں اُتر آئی ہے، ان سے ظاہر ہے کہ خود شاعر بھی صبح کے دلفریب منظر سے متاثر ہوا تھا، اس تاثر کو اس نے نہایت جوش و خروش اور روانی کے ساتھ الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ ذیل کے قصیدے میں بھی شاعر کی اسی بہار پرستی کا جذبہ نمایاں ہے۔ قدرت کے فسوں سازِ قلم کے نقوش کی مدح میں اس پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے:-

راستی را کس نمی داند کہ در فصل بہار — از کجا گردد پدیدار ایں ہمہ نقش و نگار
عقلہا حیراں شود کز خاک تاریک نژند — چوں برآید ایں ہمہ گلہاے نغز کامگار
کیست آں صورت گر ماہر کہ بے تقلید غیر — ایں ہمہ صورت برد بے علت و آلت بکار
چوں نپرسی کایں تماثیل از کجا آمد پدید — چوں نجوئی کایں تصاویر از کجا شد آشکار
خیری از مہر کہ شد زینساں بگلشن زرد روے — لالہ از عشق کہ شد زینساں بستان داغدار
از چہ بے زنگار سبز ستا ز ریاحین بوستاں — از چہ بے شنگرف سرخ ستا ز شقائق کوہسار
باد بے عنبر چرا شد ایں چنیں عنبر فشاں — ابر بے گوہر چرا گشت ایں چنیں گوہر نثار
برکف ایں تسبیح یاقوت از چہ گیرد ارغواں — بر سر ایں تاج زمرد از کہ دارد کوکنار
برق از شوق کہ می خندد بدینساں قاہ قاہ — ابر از ہجر کہ می گرید بدینساں زار زار
چوں مجوساں بلبل از ذوق کہ دارد زمزمہ — چوں عروساں گلبن از بہر کہ بندد گوشوار
ابر غواصی نداند از کجا آرد گہر — باد رقاصی نداند از چہ رقصد در بہار

قاآنی نے دیوان اشعار کے سوا پریشاں کے نام سے ایک کتاب نثر میں لکھی تھی یہ کتاب سعدی کی گلستاں کی طرز پر لکھی گئی ہے اور اس میں اُستاد شیراز کے سبک کی پوری پوری پیروی کی گئی ہے۔ اس کتاب میں چند اشعار کے سوا جتنے شعر آئے ہیں وہ سب کے سب اسی کے کہے ہوئے ہیں، چنانچہ خاتمہ پر کہتا ہے:

نیست در و عاریت ہیچ کس — خاص منست آنچہ در وہست و بس
جز دو سہ بیتے ز عرب و ز عجم — کامدہ جاری بزبانِ قلم

گلستاں کی طرح "پریشاں" کی حکایتیں بھی آداب، سیرت، نصیحت، آپ بیتی، لطائف اور ایسی ہی دوسری باتوں پر مشتمل ہیں۔

قاآنی نے ۱۲۷۰ھ میں بہ مقام طہران وفات پائی۔

فروغی بُسطامی

میرزا عباس بسطامی، فروغی تخلص کرتے تھے۔ آغا موسیٰ کے بیٹے تھے اور ۱۲۱۳ھ میں بہ مقام عتبات پیدا ہوئے۔ اس کے بعد مازندران آئے اور ساری میں مقیم ہو گئے۔ کچھ دنوں تک یہ فتح علی شاہ کے دربار میں رہے اور اس کی مدح کی۔ کچھ عرصہ تک کرمان میں حسن علی میرزا شجاع السلطنت کی خدمت میں رہے۔ یہ شہزادہ قاآنی کا بھی سرپرست تھا۔ اسی شہزادہ نے اپنے بیٹے فروغ السلطنت کی نسبت سے فروغی تخلص عطا کیا۔ فروغی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ ریاضت، درویشی اور عزلت گزینی میں گذارا اور عارفوں کی صحبت میں اپنی زندگی بسر کی۔ فروغی کی مہارت غزل کی مہارت ہے اور اس صنف میں وہ اپنے ہم عصر غزل سراؤں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ان کے اشعار کی تعداد بیس ہزار تک بیان کی گئی ہے۔ ان کی غزلیں ان کے ہم عصروں میں مشہور اور ان کی زبانوں پر تھیں۔ فروغی نے غزل سرائی میں چوٹی کے غزل گو شاعروں — جیسے حافظ اور سعدی — کی پیروی کی ہے اور خود اپنا ایک مخصوص رنگ پیدا کیا ہے، اکثر نئے نئے مضامین پیدا کیے ہیں اور ان کی بیشتر غزلیں بڑی شیریں اور بڑی دلکش ہیں۔ مثال کے طور پر یہ غزلیں ملاحظہ ہوں:

پایۂ عمر گراں مایہ بر آبست بر آب ‏ ‏ ‏ ہمہ جا شاہد ایں نکتہ حبابست حباب

...

اندوہ تو شد وارد کاشانہ ام امشب ‏ ‏ ‏ مہمان عزیز آمدہ در خانہ ام امشب

...

یکشب آخر دامن آہ سحر خواہم گرفت ‏ ‏ ‏ داد خود را زاں ہمہ بیداد گر خواہم گرفت

یہ غزلیں اور ایسی ہی دوسری غزلیں بڑا وجدانی اثر پیدا کرتی ہیں۔ ذیل کی غزل میں کیسی عرفانی روح، کیسی آزادگی کے ذوق اور کیسی رندانہ سرمستی کا اظہار کیا ہے۔

خدا خواں تا خدا داں فرق دارد ‏ ‏ ‏ کہ حیواں تا بانساں فرق دارد

موحد را بمشرک نسبتے نیست ‏ ‏ ‏ کہ واجب تا بامکاں فرق دارد

محقق را مقلد کے تواں گفت ۔۔۔ کہ دانا تا بناداں فرق دارد

مناجاتی خراباتی نگردد ۔۔۔ کہ سر جسم تا جاں فرق دارد

من وابروے یار و شیخ و محراب ۔۔۔ مسلماں تا مسلماں فرق دارد

مخواں آلودہ دامن ہر کسے را ۔۔۔ کہ داماں تا بداماں فرق دارد

من و می خانہ خضر و راہِ ظلمات ۔۔۔ کہ مے با آب حیواں فرق دارد

مخواں دورِ فلک را دور ترسا ۔۔۔ کہ دوراں تا بدوراں فرق دارد

مکن تشبیہ زلفش را بسنبل ۔۔۔ میان ناناں تا بہ زاغاں فرق دارد

مبر پیش دہانش غنچہ را نام ۔۔۔ کہ خنداں تا بخنداں فرق دارد

رخش را مہ مگو ہرگز فروغی ۔۔۔ کہ خور با ماہ تاباں فرق دارد

فروغی نے ۱۲۷۴ھ میں وفات پائی۔

سروش اصفہانی

میرزا محمد علی متخلص بہ سروش اصفہان کے نواح میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں کسب کمال اور معرفت حاصل کی اور اپنی فطری استعداد کا اظہار کیا۔ جوانی ہی میں شعر کہنے لگے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سروش ایرانی شہروں کی سیر کے لیے نکلے اور تبریز میں مقیم ہو گئے۔ پہلے نائب السلطنت کے بیٹے قہرمان میرزا کا تقرب حاصل کیا، پھر ناصرالدین میرزا ولیعہد کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ جب ولی عہد بادشاہ ہوا تو سروش اس کے ساتھ طہران آئے۔ عیدوں اور سرکاری تقریبوں میں تہنیتی اشعار پڑھنا ان کا کام تھا۔ ناصرالدین شاہ نے انہیں بڑے بڑے انعام اور صلے دیے۔ ان کی وجہ سے سروش صاحبِ مال و جاہ بن گئے۔ ناصرالدین شاہ نے انہیں شمس الشعراء کا لقب بھی عطا کیا تھا۔ انہوں نے بہت سے قصیدے، غزلیں اور مثنویاں لکھی ہیں۔ اور قدماء کے سبک کی اتباع کی ہے اور خاص کر فرخی، ناصر خسرو، منوچہری اور معزی کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس لحاظ سے انہوں نے شعر و سخن میں کافی استعداد کا ثبوت دیا ہے۔

سروش نے جو اشعار کہے ہیں ان میں بادشاہ اور امراء کی مدح میں قصیدے، غزلیں،

ساقی نامہ اور الٰہی نامہ کے نام سے مثنویاں لکھی ہیں۔ اُنھوں نے حضرت علی اور ائمہ کی مدح میں بھی بہت سے قصیدے لکھے ہیں۔ سروش کا دیوان زینت المدائح کے نام سے جمع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

سروش نے ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی۔

یہاں سروش کے اس قصیدے سے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں جو انھوں نے فرخی کے قصیدے: "برآمد نیلگوں ابرے ز روی نیلگوں دریا" کے جواب میں لکھا ہے اور اس قصیدے کی طرز میں معزی اور دوسرے شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے:

دو ابر بانگ زن گشت از دو سوی آسماں پیدا   بہم ناگاہ پیوستند و برشد از دو سو غوغا

چو پیوستند باہم بانگ ہیجا از دو سو برشد   سوی ہم تاختن کردند گفتی از پے ہیجا

الا اے ابر کوشندہ کہ بے کینی خروشندہ   چرا بے کیں خروشی گرنہ ای کالیوہ و شیدا

ز گردہ تیرہ ات خورشید روشن رخ بروں تابد   چناں کز گرد لشکر شہ سوار دلدل شہبا

سروش کی سب سے نمایاں خصوصیت بہار اور نوروز کے تہنیتی قصیدے ہیں۔ یہ قصیدے بڑی مہارت سے لکھے گئے ہیں۔ ایسے ہی ایک قصیدے سے دو شعر پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ قصیدہ منوچہری کے سبک میں لکھا ہے۔

نوروز نو آئیں ترا مسال زیبا راست   اے ترک بدہ بادہ کہ عید است و بہار است

گلبن چو یکے حور بہ بر کردہ حریر است   ہاموں چو یکے حلہ پر نقش و نگار است

سروش کے بعض اشعار میں ناصرالدین شاہ کے زمانے کے واقعات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً ایران میں پہلی بار ٹیلی گراف کا سلسلہ قائم کرنے کی اہمیت کا شاعر نے اس طرح ذکر کیا اور اس زبردست ایجاد کی شاعرانہ تعبیر کی ہے۔

منت ایزد را کہ آساں کرد بر عشاق کار   زیں ہمایوں کارگہ کاندر جہاں شد آشکار

عاشقاں بی پیک و نامہ در سوال و در جواب   یا نگاریں در میاں فرسنگ اگر باشد ہزار

آفریں بر روزگار شہریار کامگار	کارہا در روزگار شہریار آساں شدست
یافت از شاہنشہ گیتی نشاں افتخار	کرد ایں فرخندہ خدمت اعتضاد السلطنۃ

ذیل کے اشعار میں شاعر نے مناظر کی تصویرکشی اور دلکشی جلوہ گاہوں کی عکاسی میں اپنی پوری توانائی صرف کی ہے:۔

باد چوں مشاطہ اش در حلیہ و زیور کشید	تا عروس نوبہاری پردہ از رخ برکشید
موی حوران بہشتی در دُر و گوہر کشید	ژالہ بر سنبل بداں ماند کہ رضوان بہشت
دست مشک آلود را بر شاخ سیسنبر کشید	باغباں در بوستاں گوئی ہمہ شب مشک سود

محمود خاں ملک الشعراء

محمود خاں کاشان میں پیدا ہوئے، لیکن ان کا خاندان آذربائجان سے تعلق رکھتا تھا اور زندیوں کے عہد میں عراق میں منتقل ہوا تھا۔ محمود خاں کے والد محمد حسین خاں عندلیب اور ان کے دادا فتح علی خاں صبا دونوں مشہور شاعر تھے اور انہیں فتح علی شاہ کے دربار میں ملک الشعرائی کا عہدہ حاصل تھا۔ ناصر الدین شاہ کے زمانے تک عندلیب کو یہ لقب حاصل رہا۔

محمود خاں شعر و سخن میں مہارت کے سوا دوسرے علوم و فنون میں بھی اپنے زمانہ کے یکتا لوگوں میں شمار ہوتے تھے اور حکمت، حدیث، تفسیر، ادبی علوم اور خطاطی، نقاشی اور منبت کاری میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے میں ایرانی ذوق و استعداد کے مظہر اور صنائع لطیفہ کا کامل نمونہ تھے۔ شعر و سخن میں بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے اور خاص کر قصیدہ میں قبل مغول دور کے استادوں کی پیروی کی ہے اور اس میں اپنا مخصوص لطیف انداز نکالا ہے۔ اپنے ہم عصر شاعروں میں وہ عنصری، فرخی، منوچہری، معزی اور ادیب صابر کے سبک سے بہت قریب رہے ہیں۔ محمود خاں کو ناصر الدین شاہ کے دربار میں بڑا مرتبہ اور بڑا اعزاز حاصل تھا اور ملک الشعرائی کے لقب سے سرفراز کیے گئے تھے۔ ان کے دیوان میں دو ہزار پانچ سو شعر ہیں۔

محمود خاں نے ناصر الدین شاہ قاچار کے قتل سے دو سال پہلے ۱۳۱۱ھ میں وفات پائی۔

محمود خاں کے اکثر قصیدے ناصر الدین شاہ اور ان کے درباریوں کی مدح میں ہیں۔ ان میں تاریخی اشارے بھی ملتے ہیں۔ جیسے جلوس، سفر، جشن اور بزم کے رسوم کا ذکر۔ مثلاً محمد شاہ کی وفات اور ناصر الدین شاہ کے جلوس کے قصیدے میں یہ اشعار ملتے ہیں

چو تخت ملک تہی ماند از محمد شاہ — کہ نوشہ باد روانش بعالم دیگر
بشہر تبریز اندر خبر رسید بشاہ — کہ حال دگر شد ز کینۂ اختر
از آں خبر بنگویم ملک چہ گفت و چہ کرد — از آں کہ کس بشنیدن نمی کند باور
ہمی بگشت دروں دو چشم خسرو آب — ہم از فراق پدر ہم ز سوزش کشور
ز بہر ساز سفر چوں ز سوک شہ پرداخت — بگشت در سر خسرو ہزار گونہ فکر
بخواند پیش پے مصلحت خدیو بزرگ — ہر آنکہ بود بدرگہ ز کہتر و مہتر
چو صف زدند بپای سریر تن در تن — خدیو ایراں برداشت مہر گنج و گہر
بگفت کز روش دہر و گردش گردوں — فتادماں سفری پر ز ہول و پر ز خطر
تہی شد ست سرگاہ کے ز شاہ و کنوں — برفت بایدماں تا بتخت گاہ پدر
سپاہ جملہ پراگندہ ملک شوریدہ — چگونہ باید برگ سپاہ و ساز سفر

ذیل کے اشعار نوروز کی آمد اور بہار کی مناظر کشی پر لکھے ہیں۔ ان اشعار سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ استاد نے متقدمین کی طرز کو اختیار کیا تھا، اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فارسی شاعری میں کیسا بلند ذوق اور کیسا اچھا ملکہ رکھتے تھے:

بسحرگاہاں قمری چو درآید بسخن — سوے باغ آی نگارینا لختی بامن
من سپیدہ دم فردا بسوی باغ شوم — کہ گل سوری از خندہ کشود ست دہن
یکسوی دست زنو رستہ بنفشہ است کبود — سوی دیگرش سفید است ز نشگفتہ سمن

رعد می نالہ و می بالد از آں نالہ گیاہ | ابری گرید می خندد از آں گریہ چمن
ہر کجا بگذری از نالہ خود روے براہ | شمعی افروختہ بینی ز بر سبز لگن
لب ہر جوی پر از لالہ شد و مرزنگوش | زیں سپس خیمہ نگارا بلب جوی بزن
دست در دامن شادی زن و در نوبت گل | درکش از دست غم و اندوہ گیتی دامن
غم یکی میوہ تلخ ست از وہیچ مخور | واں درختی کہ غم آرد بر از بیخ بکن
در دل اندیشہ مدار از شب آبستن از انک | کس نداند کہ چہ می زاید ایں آبستن

اس کے سوا ان کے یہ جاندار اور نشاط آور اشعار مناظر قدرت سے ان کی دلبستگی، اس پر وجد اور ان کی تخلیق پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں:

از کوہ بر شدند خروشاں سحابہا | غلطاں شدند از بر البرز آبہا
باد صبا بیامد و بر بوستاں گذشت | بگرفت زلف سنبل از آں باد تابہا
دوشینہ بادہای تر از سوی بوستاں | بر روی گل زدند سحر گہ گلابہا
چوں صد ہزار جام بلوریں واژگوں | بر آبداں ز ریزش باراں حبابہا
خوباں سپیدہ دم بسوی بوستاں شدند | از بہر دیدن رخ گل باشتابہا
وقتی خوش است عاشق دلدادہ را کنوں | در خانہ داشتن نتواں باطنابہا
زیں فصل و باہا کہ کتاب زمانہ است | تو اختیار فصل طرب کن زبابہا
جز روز خرمی بنود در حساب عمر | ما برگرفتہ ایم ز گیتی حسابہا

دوسرے شاعر جن شاعروں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ان کے سوا بھی قاچاری دور میں بہت سے شاعر پیدا ہوئے۔ یہ شاعر مختلف اصناف سخن میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ ان میں سے یغمائی جندقی، شہاب ترشیزی، مغلق طہرانی، رضا قلی خاں ہدایت، صبوری مشہدی، اور فتح اللہ خاں شیرازی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب اچھے شاعر تھے اور ان سب نے قدما کے سبک کو زندہ کرنے میں بڑی کوشش کی ہے اور ان کی

طرز میں بڑے اچھے شعر کہے ہیں۔

صفوی اور قاچاری دور کا نثری ادب

ا۔ تاریخی کتابیں

حبیب السیر حبیب السیر ایک عام تاریخ ہے۔ یہ غیاث الدین بن ہمام الدین خواندمیر کی تصنیف ہے۔ اس میں ابتدائے بشر سے لے کر شاہ اسمٰعیل صفوی کی وفات یعنی ۹۳۰ھ تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے یہ کتاب روضۃ الصفاء سے چھوٹی ہے اور تین جلدوں میں تمام ہوئی ہے صفوی دور کی ابتداء اور شاہ اسمٰعیل کی سلطنت کی جو تفصیل اس میں بیان کی گئی ہے وہ بڑی اہم ہے۔ کیونکہ خود مصنف اس بادشاہ کا ہمعصر تھا۔

یہ کتاب ختم کرنے کے بعد خواندمیر نے ہندوستان کا سفر کیا اور یہاں اس نے اس کتاب کی نظر ثانی کی۔ خواندمیر نے ۹۴۱ھ میں ہندوستان میں وفات پائی اور دہلی میں دفن ہوا۔ اس مصنف نے حبیب السیر اور روضۃ الصفا کے تکملہ کے سوا اور دوسری کتابیں بھی تالیف کی ہیں ان میں سے ایک دستور الوزرا بھی ہے۔ اور اس میں ابتدائے اسلام سے لے کر تیموریوں کی سلطنت کے اختتام تک کے وزرائے اسلام کا حال بیان کیا ہے یہ کتاب ۹۱۴ھ میں تمام ہوئی ہے۔

صفوۃ الصفا اور احسن التواریخ پہلی کتاب یعنی صفوۃ الصفا ابن بزاز کی تصنیف ہے اور آٹھویں صدی کے وسط میں صفویوں کے اجداد اور خاص کر شیخ صفی الدین کے حالات اور کرامات پر لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب دسویں صدی کے وسط یعنی شاہ طہماسپ کے دور میں پھر نئے سرے سے تصنیف ہوئی ہے۔ احسن التواریخ کا مصنف حسن بیگ راملو ہے۔ یہ اپنے زمانے کے عالموں اور فاضلوں میں گنا جاتا تھا۔ اس نے یہ کتاب دسویں صدی کے وسط میں پھر تصنیف کی ہے اور ۹۰۰ھ سے ۹۷۵ھ تک یعنی شاہ طہماسپ کے دور حکومت تک کے واقعات اس میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

تاریخ عالم آرائے عباسی۔ عالم آرا شاہ عباس اول اور اس کے اجداد کی سلطنت کی تاریخ ہے۔ اسے شاہی دربار کے ایک منشی اسکندر منشی نے تصنیف کیا ہے۔ اور شاہ عباس کی وفات اور اس کے بیٹے شاہ صفی کی ۱۰۳۸ھ میں تخت نشینی پر ختم کیا ہے۔

ان تاریخوں کے سوا جن کا ذکر اس باب کے مقدمہ میں ہو چکا ہے اور بھی اہم تاریخی کتابیں تالیف ہوئی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

قاضی احمد غفاری کی تصنیف نگارستان اور جہاں آرا یحیی بن عبد اللطیف قزوینی کی تصنیف لب التواریخ۔ تاریخ ایلچی نظام شاہ جو خاص کر شاہ طہماسپ کے زمانے کے واقعات کے لحاظ سے نہایت اہم کتاب ہے۔

تاریخ نادری۔ تاریخ جہانگشائے نادری نادر شاہ کی سلطنت کے حالات پر ایک ہی مشہور کتاب ہے۔ اس میں نادر شاہ کی سلطنت کی ابتدا سے لے کر اس کی موت یعنی ۱۱۶۰ھ تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مصنف میرزا مہدی خاں بن محمد نصیر استرآبادی نادر شاہ کے ندیموں اور درباریوں میں شامل تھا۔ اور نادر شاہ کے مختلف سفروں اور مہموں میں اس کے ساتھ رہا تھا۔ اس طرح اس نے ایک اور تاریخ اسی بادشاہ کے نام "دُرۂ نادرہ" کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب کا طرز نہایت پر تکلف اور عبارت آرائی کا نمونہ ہے۔

زبدۃ التواریخ۔ یہ محمد حسن بن عبد الکریم کی تصنیف ہے۔ اس میں صفویوں کے آخری دور اور افغانوں کے حملہ کے حالات درج ہیں۔ ان واقعات کا مصنف خود شاہد عینی ہے۔

تاریخ زندیہ۔ یہ علی رضا بن عبد الکریم کی تصنیف ہے۔ اور اس میں کریم خاں زند کے جانشینوں کے حالات درج ہیں۔

مجمل التواریخ۔ یہ ابو الحسن بن محمد امین گلستانہ کی تصنیف ہے۔ اس میں نادر شاہ

کے بعد کے پینتیس ۳۵ سالہ واقعات اور خاص کر افشاریوں اور زندیوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

متمم روضۃ الصفا- خواند میر کے نواسے غیاث الدین میر خواند نے تاریخ روضۃ الصفا کی ساتویں جلد کو مکمل کیا ہے۔ اور اس میں سلطان حسین بایقرا کی وفات (۹۱۲ھ) کے بعد تک کے حالات لکھے ہیں اور اس میں سلطان کی اولاد و احفاد اور اس کے زمانے کے مشاہیر کا ذکر بھی شامل ہے۔ قاچاریوں کے عہد میں رضا قلی خاں ہدایت نے اور تین جلدوں کا اضافہ کیا ہے۔ اور اس میں ناصر الدین شاہ کے عہد تک کے واقعات درج کیے ہیں۔ اس طرح تکملہ کو ملا کر روضۃ الصفا کی دس جلدیں ہو جاتی ہیں۔

زندیہ خاندان سے متعلق اور بھی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک میرزا محمد کی تاریخ گیتی کشا قابل ذکر ہے۔ اس تاریخ کے دو ذیل بھی لکھے گئے ہیں۔ ایک ذیل میرزا عبدالکریم بن علی رضا نے اور دوسرا ذیل محمد رضای شیرازی نے لکھا ہے۔

ناسخ التواریخ | یہ ایک مشہور عام تاریخ ہے اور قاچاری دور میں تصنیف ہوئی ہے یہ فصیح فارسی میں متقدمین کی طرز پر لکھی گئی ہے اور اپنے ملحقات ملا کر کوئی پندرہ بڑی بڑی جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں اسلامی تاریخ اور بعد اسلام ایران کی تاریخ سب سے زیادہ مفصل ہے۔ اس کتاب کا پہلا مصنف میرزا تقی سپہر ناصر الدین شاہ کے دربار کا مستوفی تھا اور اپنے زمانہ کے علماء میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس مصنف نے ناسخ التواریخ کی گیارہ (۱۱) جلدیں لکھیں اور اس کے بعد عباس علی خاں سپہر نے جو ناصر الدین کے قتل تک مقربان دربار میں سے تھے، ائمہ کے حالات اور ناصر الدین شاہ کے عہد کی تفصیل پر اور کچھ جلدیں لکھیں۔ عباس علی خاں سپہر نے ان جلدوں کے سوا اور بھی کتابیں لکھی ہیں۔ انھوں نے ابن خلکان کی کتاب وفیات الاعیان کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور وہ علم و فن میں بڑے یکتا تھے۔

تاریخ منتظم ناصری تاریخ منتظم ناصری ایک عام تاریخ ہے اور اس میں ابتدائے اسلام سے لے کر مصنف کے زمانے تک کے واقعات تین جلدوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مصنف محمد حسن صنیع الدولہ ناصرالدین شاہ کے دربار میں وزیرالطباعت تھا، اور یہ کتاب اس نے ۱۲۹۸ھ سے لے کر ۱۳۰۰ھ کے دوران میں تصنیف کی ہے۔ صنیع الدولہ نے اور کتابیں بھی لکھی ہیں، ان میں سے ایک کتاب مراۃ البلدان کے نام سے ایران کے جغرافیہ پر ہے اور دو جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

قاچاری دور میں بعض قاچاری سلاطین کے دورِ حکومت کی مخصوص تاریخیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے عبدالرزاق بن نجف قلی کی ماثر سلطانیہ محمود میرزا کی تصنیف تاریخ صاحبقرانی اور فضل اللہ منشی کی تصنیف تاریخ ذوالقرنین قابل ذکر ہیں۔ یہ تینوں کتابیں فتح علی شاہ کے زمانے میں اسی کے نام پر لکھی گئی ہیں۔

۲۔ تذکرے سیر اور سوانح

تحفۂ سامی تحفۂ سامی نویں صدی ہجری کے آخر سے لے کر دسویں صدی ہجری کے وسط تک کے شاعروں کا تذکرہ ہے۔ ان میں سے اکثر شاعر کتاب کے مصنف شاہ اسمٰعیل صفوی کے بیٹے سام میرزا کے ہم عصر ہیں۔ یہ تصنیف ۹۵۷ھ میں تمام ہوئی اور خود سام میرزا کو شاہ اسمٰعیل ثانی کے حکم پر ۹۸۳ھ میں قتل کر دیا گیا۔

مجالس النفائس اس کتاب کی اصل امیر شیر علی نوائی کی ترکی تصنیف ہے۔ اس دانشمند وزیر نے اس کتاب میں اپنے ہم عصر شاعروں اور ادیبوں کے حالات بیان کیے ہیں۔ شاہ علی نامی ایک شخص نے شاہ عباس کے عہد میں اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار یہ شاعروں کا عام تذکرہ ہے اس کا مصنف تقی الدین محمد کاشی ہے اور شاہ عباس کے عہد میں تصنیف ہوا ہے۔

مجالس المومنین یہ کتاب شیعہ عالموں، فقیہوں، بادشاہوں، شاعروں اور صوفیوں کے حالات اور ان کے اقوال پر لکھی گئی ہے۔ اس کا مصنف قاضی نور اللہ شستری اپنے وطن سے ہندوستان آئے اور لاہور میں مقیم ہو گئے۔ پھر شہنشاہ اکبر کی طرف سے شہر لاہور کے قاضی مقرر کیے گئے۔ یہیں ۹۹۳ھ میں مجالس المومنین کی تصنیف کا کام شروع کیا اور یہیں ۱۰۱۰ھ میں اسے ختم کیا۔ اس کتاب کا انداز بیان دور مغول کی بعض پر تکلف تصانیف کی بہ نسبت سادہ اور شیریں ہے۔

ہفت اقلیم یہ عام تذکرہ ہے اور اس میں اقالیم کی ترتیب سے شاعروں کی طبقہ بندی کی گئی ہے۔ اس کتاب کا مصنف احمد رازی ہے۔ احمد رازی کا باپ خواجہ احمد، شاہ طہماسپ صفوی کی طرف سے رے کا کلانتر مقرر تھا۔ امین احمد نے ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا۔ اس کتاب کی تصنیف پر اس نے چھے سال صرف کیے اور ۱۰۰۲ھ میں اسے ختم کیا۔ اس کے اتمام کی تاریخ اس جملہ سے نکالی ہے:

"تصنیف امین احمد رازی"

آتش کدۂ آذر آتش کدہ اس دور کے لکھے ہوئے تذکروں میں مشہور ترین تذکرہ ہے اس کا مصنف لطف علی بیگ آذر بیگدلی آذر ۱۱۳۴ھ میں بمقام اصفہان پیدا ہوا۔ قم میں تعلیم حاصل کی اور یہاں چودہ سال تک مقیم رہنے کے بعد کئی سفر کیے۔ نادر شاہ کا ہم عصر تھا اور جب نادر شاہ کی فوجیں ہندستان سے لوٹیں تو آذر مشہد میں مقیم تھا۔ اوائل جوانی میں آذر نے اپنے فطری رجحان کی بنا پر شعر کہے، متقدمین کی طرز کی پیروی کی اور اپنے ہم عصر شاعروں میں خاص کر سید علی مشتاق کے سبک کی اتباع کی۔ آذر کے اشعا

پاکیزہ اور آبدار ہیں۔ غزلوں کے سوا آذر نے "یوسف زلیخا" کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔

آذر نے تذکرہ آتش کدہ کو چالیس سال کی عمر میں یعنی ۱۱۷۴ھ میں مرتب کیا۔ اس میں اقالیم کے لحاظ سے شاعروں کی طبقہ بندی کی ہے اور (۸۴۲) شاعروں کا حال لکھا ہے۔ شاعروں کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے اور آخر میں اپنے سوانح حیات بھی درج کیے ہیں۔

ریاض العارفین اور مجمع الفصحاء | یہ دونوں کتابیں آخری دور میں تصنیف شدہ تمام تذکروں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے مصنف محمد ہادی خاں کے بیٹے رضا قلی خاں طبرستانی متخلص بہ ہدایت ۱۲۱۵ھ میں یعنی فتح علی شاہ کے عہد میں بمقام طہران پیدا ہوئے۔ رشد و نمو اور تحصیل کمالات کے بعد محمد شاہ اور ناصرالدین شاہ کے درباروں میں اونچے منصبوں پر فائز ہوئے۔ اور خاص کر ناصرالدین شاہ کی جوانی میں شاہ کی تربیت ہدایت ان کے سپرد کی گئی۔ ریاض العارفین صوفی اور عارف شاعروں کا تذکرہ ہے اس میں شاعروں کے کلام سے انتخاب اور اسی طرح خود مصنف کی مثنویوں کا انتخاب بھی درج ہے مجمع الفصحاء کی دو جلدیں ہیں۔ اس میں ایران کے بادشاہ، شہزادے، امیر اور مشہور شاعروں کے سوا وسطی اور آخری دور کے (۷۰۰) سے زیادہ شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب درج ہے۔ خود مرحوم رضا قلی خاں بھی اچھا شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا تخلص ہدایت تھا اور خود اپنی تصریح کے مطابق انہوں نے تیس ہزار سے زیادہ شعر لکھے ہیں انہوں نے اپنے قصیدوں اور غزلوں کا نمونہ مجمع الفصحاء میں دیا ہے اور اسی کتاب میں اپنا مختصر سا حال بھی لکھا ہے۔ اس کتاب میں ہدایت نے اپنی دوسری تصانیف تکملہ روضۃ الصفا، اور لغت انجمن آرا وغیرہ کا نام لیا ہے۔ ہدایت نے ۱۲۸۸ھ میں وفات پائی۔

نامۂ دانشوراں | ایران کے عالموں اور ادیبوں کے مفصل حالات اور سوانح حیات پر فارسی کی سب سے زیادہ مفصل اور اہم کتاب نامۂ دانشوراں

ہے۔ یہ کتاب ناصرالدین شاہ کے عہد میں کئی عالموں نے مل کر تصنیف کی ہے اور سات جلدوں میں چھپی ہے۔ نامۂ دانشوراں کے مصنفوں میں حاجی میرزا ابوالفضل ساوہ ای، میرزا حسن طالقانی، میرزا عبدالوہاب اور خاص کر شمس العلما، عبدالرب آبادی قابل ذکر ہیں شمس العلما، عبدالرب آبادی نے بعض مذکورہ مصنفوں کی وفات کے بعد ایک اور ادیب غیاث ادیب کی مدد سے اس تصنیف کو مکمل کیا اور اُسے ساتویں جلد تک پہنچایا۔

صفوی اور قاچاری دور میں اور بہت سے تذکرے تصنیف ہوئے ہیں ان میں سید علی کی تصنیف بزم آرا (دسویں صدی) لطف اللہ رازی کی تصنیف تذکرہ میخانہ (دسویں صدی) علی قلی خاں والہ کی تصنیف ریاض الشعرا (بارھویں صدی)، آزاد حسینی کی خزانۂ عامرہ (بارھویں صدی)، ابوطالب تبریزی کی خلاصۃ الافکار (بارھویں صدی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں ہندوستان میں اور بعض ایران میں تصنیف ہوئی ہیں۔

نجوم السماء یہ شیعہ فقیہوں کا تذکرہ ہے اور اس میں صفوی دور سے لے کر قاچاری دور کے وسط تک کے فقیہوں کے حالات درج ہیں۔ تیرہویں صدی کے آخر میں یعنی ناصرالدین شاہ کے دور حکومت میں محمد صادق ابن مہدی نے یہ کتاب تصنیف کی ہے۔

یہاں اس موضوع پر ایک کتاب قصص العلما، کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ اس موضوع پر یہ کتاب اہمیت سے خالی نہیں۔ اس کتاب کے مصنف محمد بن سلیمان تنکابنی ہیں اور انہوں نے اپنی کتاب میں (۱۵۳) شیعہ عالموں کا حال درج کیا ہے۔

۳۔ مذہبی اور فلسفہ کی کتابیں

جامع عباسی یہ کتاب شیعی احکام فقہ پر لکھی گئی ہے اور شیخ محمد بن حسین عاملی ملقب

یہ بہاء الدین مشہور بہ شیخ بہائی کی تصنیف ہے۔ شیخ بہائی صفوی دور اور خاص کر شاہ عباس کے دربار کے مشہور، محترم اور مقرب عالموں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کا وطن جبل عامل تھا اور وہ ۹۵۳ھ میں بمقام بعلبک پیدا ہوئے۔ ان کے والد عزالدین حسین ۹۶۶ھ میں ایران ہجرت کر گئے اور تیرہ سال کی عمر میں شیخ بہائی ایران آئے۔ ان کی پوری عمر ایران میں بسر ہوئی اور عربی و فارسی میں کتابیں لکھیں جن کی تعداد رسالوں کو ملا کر (۸۸) کے قریب پہنچتی ہے۔ ان میں نان و حلوہ اور شیر و شکر نامی مثنویاں بھی شامل ہیں۔ ان کے سوا خلاصۃ الحساب اور تشریح الافلاک اور اربعین ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ کشکول کے نام سے انہوں نے نوادر، حکایات، علوم، اخبار، امثلہ اور فارسی اور عربی اشعار کا مجموعہ بھی مرتب کیا تھا۔ عاملی نے فارسی اور عربی میں شعر بھی کہے ہیں۔

شیخ بہائی عاملی نے ۱۰۳۱ھ میں بمقام اصفہان وفات پائی۔ ان کا جنازہ مشہد لایا گیا اور ان کی وصیت کے مطابق اس مقام کے پائیں میں انہیں دفن کیا گیا جہاں وہ مشہد کے قیام کے دوران میں درس دیا کرتے تھے۔

دوسری کتابیں صفویوں کے دور میں فارسی میں دینی مسائل پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ صرف اکیلے محمد باقر مجلسی نے اتنی کتابیں لکھی ہیں کہ ان سب کا نام گننا بھی یہاں ممکن نہیں۔ ان کی لکھی ہوئی کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں:-

عین الحیات، مشکوٰۃ الانوار، حلیۃ المتقین، معراج المومنین، حق الیقین، حیات القلوب، جلاء العیون وغیرہ یہ سب کتابیں نہایت رواں اور سلیس فارسی میں لکھی گئی ہیں۔

دوسری دینی کتابوں میں جو کتابیں قابلِ ذکر ہیں وہ یہ ہیں: تنبیہ الغافلین حضرت علیؑ کی "نہج البلاغہ" کا ترجمہ ہے اور مترجم کا نام فتح اللہ کاشانی ہے۔ محاسن الادب نصیر الدین

استرآبادی کی تصنیف ہے اور اخلاق پر لکھی گئی ہے۔ حیدر خوانساری کی زبدۃ التصانیف اور حیدر رفیع الدین کی شجرہ الٰہیہ بھی اخلاق پر لکھی گئی ہے۔ سید احمد بن زین العابدین اصفہانی کی لوامع ربانی و مصقل صفا نصرانیوں کے عقائد پر لکھی گئی ہے اور ابن عمر محرابی کی حجۃ الهند ہندی عقائد پر لکھی گئی ہے۔

صفویوں اور قاچاروں کے دور میں جو اہم اخلاقی اور دینی کتابیں فارسی میں لکھی گئیں، ان میں رفیع الدین محمد واعظ قزوینی متوفی ۱۱۰۵ھ کی ابواب الجنان اور احمد بن مہدی نراقی کی معراج السعادۃ قابل ذکر ہیں۔ معراج السعادۃ نراقی کے والد مہدی کی عربی کتاب جامع السعادات کا ترجمہ ہے اور یہ ترجمہ فتح علی شاہ کے حکم پر کیا گیا ہے۔ نراقی شعر و ادب کا بھی ذوق رکھتے تھے۔

گوہر مراد | یہ کتاب حکمت اور کلام کے مسائل پر عبد الرزاق بن علی بن حسین لاہیجی کی تصنیف ہے۔ اس مصنف کا تفصیلی ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ حکمت پر فارسی میں یہ کتاب شاہ عباس کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔

اسرار الحکم | یہ کتاب حکمت الٰہی پر حاجی ملا ہادی سبزواری کی تصنیف ہے۔ مصنف نے توحید کے اثبات اور دینی عقائد کے اصول کی تفہیم کی ہے۔ یہ کتاب ناصر الدین شاہ کی خواہش پر لکھی گئی ہے۔

۴۔ لغت کی کتابیں

پچھلے دوروں میں بھی لغتیں لکھی گئی تھیں۔ اور ان میں سے بعض کا ہم ذکر کر چکے ہیں لیکن اس آخری دور میں اور خاص کر صفوی دور میں فارسی فرہنگیں بہت زیادہ لکھی گئیں ان میں سے بعض مشہور فرہنگوں کے نام یہ ہیں:

فرہنگ جہانگیری۔ اس لغت کا مصنف جمال الدین حسین انجو شہنشاہ اکبر

اور اس کے بیٹے شہنشاہ جہانگیر کے دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ ان دونوں بادشاہوں نے اس کی سرپرستی کی تھی اور انعام واکرام سے سرفراز کیا تھا۔ حسین انجو نے اپنی لغت شہنشاہ اکبر کے حکم پر لکھنی شروع کی تھی۔ اور اسے ۱۰۱۷ھ میں ختم کی اور اسے شہنشاہ جہانگیر کے نام معنون کیا۔ اس لغت کی ایک خوبی یہ ہے کہ ہر لفظ کے ساتھ مثال اور نظیر میں اساتذہ کے شعر پیش کیے ہیں۔

مجمع الفرس مجمع الفرس بھی فارسی کی مشہور لغتوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کا مصنف محمد قاسم کاشانی معروف بہ سروری ہے۔ سروری نے یہ کتاب شاہ عباس اول کے عہد میں اس بادشاہ کے نام پر ۱۰۰۸ھ میں لکھی ہے۔

برہان قاطع یہ کتاب مذکورہ دونوں لغتوں کے برخلاف فارسی لغات کے سوا فارسی میں مستعمل عربی، یونانی اور دوسرے اجنبی الفاظ پر بھی حاوی ہے۔ اس کا مصنف محمد حسین بن خلف تبریزی متخلص بہ برہان ہے۔ اس لغت کی تصنیف میں فرہنگ سروری اور فرہنگ جہانگیری سے بھی استفادہ کیا ہے۔ برہان نے یہ کتاب ۱۰۶۲ھ میں ختم کی ہے اور اسے ہندوستان میں دکن کے علاقہ گولکنڈے کے بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے نام معنون کیا ہے۔ اس کتاب میں صحت اور دقت نظر سے کم کام لیا ہے اور بعض الفاظ کی اصل و فصل معلوم نہیں۔ اس کے باوجود یہ لغت مفصل اور مفید ہے۔

فرہنگ رشیدی فرہنگ رشیدی عبدالرشید کی تصنیف ہے۔ یہ شخص ہندستان میں پیدا ہوا اور شہنشاہ اورنگ زیب کے دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ کتاب فرہنگ سروری اور فرہنگ جہانگیری کے مقابلہ میں زیادہ دقت نظر اور زیادہ احتیاط کے ساتھ لکھی گئی ہے، اور بعض لحاظ سے ان دونوں لغتوں پر ترجیح رکھتی ہے۔ کتاب کا سنہ تصنیف ۱۰۶۴ھ ہے۔

غیاث اللغات غیاث اللغات محمد غیاث الدین کی تصنیف ہے اور ہندستان کے

فارسی شناسوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ ان میں فارسی، عربی اور ترکی کے وہ تمام اہم الفاظ درج کیے گئے ہیں جن سے فارسی اشعار اور آثار کے مطالعہ میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ لغت سنہ ۱۰۲۰ھ میں تصنیف ہوئی۔

انجمن آرا فرہنگ انجمن آرائے ناصری فارسی زبان کا تازہ ترین مشہور لغت اور جامع الفصحا کے مصنف رضا قلی خاں ہدایت کی آخری تصنیف ہے۔ یہ تمام تر فارسی الفاظ کی لغت ہے اور اکثر الفاظ کے ساتھ نظیر کے طور پر فارسی مثالیں اور اشعار درج کیے ہیں۔ اس کے مقدمہ میں زبان کی تاریخ اور اس کی ساخت پر بحث کی ہے اور ایک ضمیمہ میں فارسی امثال اور ضرب المثلیں درج کی ہیں۔ مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں فرہنگ جہانگیری سے کافی استفادہ کیا ہے۔

اس دور کے عربی نویس علماء اور حکماء

صفوی اور قاچاری دور عالموں اور دانشمندوں کے وجود سے خالی نہ تھا۔ اس دور میں بڑے بڑے فقیہوں کے سوا بڑے بڑے حکیم اور فلسفی بھی پیدا ہوئے اور انہوں نے اسلامی فلسفہ کی بنیادوں کو بہت اونچے درجے پر پہنچایا۔ بڑی بڑی تحقیقاتیں پیش کیں، قدرت کا گہرا مطالعہ کیا اور نہایت کارآمد کتابیں لکھیں۔

کہنا چاہیے کہ اس دور کے سب سے بڑے حکیم صدرالدین شیرازی گذرے ہیں۔ حکیم صدرالدین متانت فکر، اصابت نظر، اور تحقیق و ابتکار کے لحاظ سے ارسطو اور ابوعلی سینا کے جواب تھے۔ انہوں نے حکمت کا نہایت گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس فن میں وہ بڑی ندرت رکھتے تھے۔

صفوی اور قاچاری دور کے مشہور محدثوں میں شاہ عباس اعظم کے معاصر احمد بن محمد ہیں جو مقدسی اردبیلی کے لقب سے مشہور ہیں، اور ملا محمد تقی مجلسی کے فرزند ملا محمد باقر مجلسی ہیں۔

جیساکہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے مجلسی نے شیعہ عقائد اور اخبار سے متعلق فارسی زبان میں بہت سی کتابیں اور رسالے لکھے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر ان کی سب سے اہم کتاب بحار الانوار جو عربی زبان میں لکھی گئی ہے (۲۴) جلدوں میں تمام ہوئی ہے۔

ذیل میں اس دور کے مشہور حکما، کا ذکر کیا جاتا ہے:

میر داماد میر محمد باقر بن محمد استر آبادی صفوی دور کے مشاہیر فلسفیوں اور حکیموں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے والد محقق ثانی کے داماد تھے، اس لیے میر محمد کا لقب بھی میر داماد ہو گیا تھا۔ یہ استر آباد میں پیدا ہوئے، مشہد میں تعلیم پائی اور اصفہان میں سکونت پذیر ہوئے۔ اپنے ہم عصروں میں بڑے محترم سمجھے جاتے تھے اور ان کی مجلس درس دنیا والوں کی نظر میں ایک نعمت سمجھی جاتی تھی۔ جن لوگوں نے ان کی مجالس درس سے استفادہ کیا ہے ان میں صدر الدین شیرازی بھی تھے جو بعد میں علم و حکمت میں بہت مشہور ہوئے۔ میر داماد نے بہت سی فلسفیانہ اور دینی کتابیں لکھی ہیں اور یہ سب کی سب عربی زبان میں ہیں۔ ان میں سے صراط مستقیم اور قبسات مسائل حکمت پر اور کشف الحقائق حکمی اور دینی مسائل پر لکھی ہیں۔ میر داماد اشراق تخلص کرتے تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ انہوں نے مشرق الانوار کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔

ملا صدرا صدر الدین محمد شیراز کے رہنے والے تھے، ان کے والد کا نام ابراہیم تھا۔ انہوں نے فلسفہ کی کچھ تعلیم میر داماد سے بھی حاصل کی تھی۔ انہیں ایران کے آخری دور کا سب سے مشہور فلسفی سمجھنا چاہیے۔ ان کے فلسفیانہ افکار عمیق اور دقیق ہیں اور وہ خود ایک مقام اور مشرب خاص کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی فکر مشائی کے ساتھ اشراقی ذوق کو بھی شامل کر لیا تھا۔ حکمت میں ان کی تصانیف اہل علم کے لیے مرجع اور ماخذ ہیں۔ ان میں مشہور کتابیں اسفار، شواہد ربوبیہ، مشاعر اور المبدا و المعاد ہیں۔ ان کے سوا مختلف علمی مسائل پر بھی انہوں نے بہت سے رسالے یادگار چھوڑے ہیں۔ ملا صدرا نے

شیخ کلینی کی کتاب اصول کافی کے ایک حصّہ کی شرح بھی لکھی تھی۔ اور قرآن کریم کی چند سورتوں کی تفسیر بھی لکھی ہے۔

شیخ صدرا نے مکہ کے سفر سے واپس ہوتے ہوئے ۱۰۵۰ھ میں وفات پائی۔

مُلا محسن فیض محمد بن مرتضیٰ معروف بہ ملا محسن فیض کاشانی صفوی دور کے مشہور فقیہوں اور حکیموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ ملا صدرا کے شاگرد تھے اور شیراز میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی تھی۔ بہت سی کتابیں ان کے نام سے منسوب ہیں۔ ان میں سے اصول المعارف اور کلمات مکنونہ حکمت پر لکھی ہیں۔ تفسیر میں صافی اور حدیث میں وافی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ملا محسن شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے دیوان میں تقریباً چھ سات ہزار شعر ہیں۔

لاہیجی لاہیجی بھی صفوی دور کے مشہور علماء اور حکماء میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ بھی ملا صدرا کے شاگرد تھے۔ کلام اور فلسفہ پر نہایت اہم کتابیں — جیسے گوہر مراد — فارسی میں لکھی ہیں۔ اس کے سوا عربی میں بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک شوارق الالہام کے نام سے خواجہ نصیر الدین طوسی کی کتاب تجرید کی شرح بھی ہے۔

ابوالقاسم فندرسکی صفوی دور کے زبردست حکماء میں ابوالقاسم فندرسکی بھی ہیں۔ یہ فندرسک کے رہنے والے تھے جو استرآباد کا ایک گانوں ہے۔ ابوالقاسم ریاضی اور حکمت میں اُستاد تھے اور حکمت پر اُنھوں نے بعض اہم اور مفید کتابیں لکھی ہیں۔ فارسی میں شعر بھی لکھتے تھے اور ایک قصیدہ متقدمین کی طرز پر لکھا ہے۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے:

چرخ با این اختراں نغز و خوش و زیباستی   صورتی در زیر دارد ہرچہ بر بالاستی

حاجی مُلا ہادی مولانا حاجی ملا ہادی اپنے زمانے کے مشہور عالم حاجی محمد سبزواری کے بیٹے تھے پہلے مشہد میں اور اس کے بعد اصفہان میں علومِ حکمت

فقہ اور اصول کلام کی تحصیل کی اور قاچاری دور کے درجہ اول کے عالموں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ان کی مشہور ترین تصنیف ایک عربی نظم ہے جو منطق اور حکمت کے مسائل پر لکھی گئی ہے۔ پھر اس کی شرح دو حصوں میں لکھی ہے۔ پہلے حصے کا نام لیالی المنتظمہ اور دوسرے حصہ کا نام غرز الفرائد رکھا ہے۔ یہ دونوں حصے یکجا شرح منظوم کے نام سے مشہور ہیں شیخ نے اسرار الحکم کے نام سے حکمت الٰہی پر فارسی میں بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کے سوا اسرار تخلص کے ساتھ حکیمانہ اور صوفیانہ غزلیں بھی لکھی ہیں۔

شیخ نے ۱۲۸۹ھ میں وفات پائی۔

ماخذ

(ا) تاریخ

تاریخ گیتی گشا: تصحیح آقائی نفیسی، طہران ۱۳۲۷ھ

دستور الوزراء، تصحیح آقائی نفیسی، طہران ۱۳۱۷ھ

شرح حال شیخ بہائی، بقلم آقائی نفیسی، طہران ۱۳۱۶ھ

مجمل التواریخ۔ بسعی واہتمام مدرس صفوی۔ طہران ۱۳۲۰ھ

(ب) فارسی تذکرے

صفوی دور کی ادبی تاریخ کا خلاصہ: براؤن، تاریخ ادبیات ایران جلد ۴

تحفۂ سامی: تصنیف سام میرزا، پسر شاہ اسمٰعیل۔ طبع مجلہ ارمغان

تاریخ زبان وادبیات ایران در بار مغول (۲ جلد) از محمد عبد الغنی الہ آبادی (ہند) انگریزی ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء

شعر العجم۔ از شبلی نعمانی۔ انتخاب دیوان جامی۔ مرتبہ آقائی پژمان

دیوان جامی، طبع ہند۔ مثنویات جامی۔ مسجد سپہ سالار کا قلمی نسخہ

مقدمہ آقای کمالی بر منتخبات اشعار صائب، طبع طہران۔
اشعار برگزیدۂ صائب، با مقدمۂ مبسوط۔ باہتمام آقای زین العابدین مؤتمن۔ طہران سنہ ۱۳۲۰ھ۔
مقدمۂ دیوان ہاتف۔ نشریات مجلۂ ارمغان۔ طہران
ارمغان (سال ۱۳) میں شہاب تبریزی سے متعلق آقای محیط کے مقالات
مقدمہ از ڈاکٹر رضا زادہ شفق بر مثنوی لیلیٰ مجنوں مکتبی۔ طبع طہران
مقدمہ آقای بہار بہ کلمات غرای مکتبی۔ طبع طہران باہتمام آقای کوہی
"محمود خاں ملک الشعراء" پر آقای نفیسی کا مقالہ۔ مجلہ مہر۔ سال اول شمارہ (۱۱)

(ج) قاچاری دور کے شعراء

مجمع الفصحاء   براؤن جلد ۴   شاعروں کے دیوان
دیوان مشتاق، باہتمام آقای حسین مکّی، با مقدمہ، طہران
دیوان فروغی بسطامی، از طرف آقائی علی غفاری، طہران، ۱۳۲۰ھ
دیوان قاآنی طبع طہران ۔ دیوان مجمر طبع طہران
دیوان قائم مقام۔ معہ مقدمہ آقای عبدالوہاب فراہانی۔ نشریات مجلۂ ارمغان، طبع طہران۔
قائم مقام۔ از آقای باقر قائم مقامی۔ طبع طہران

(د) علماء، حکماء اور محدثین

نامۂ دانش وراں
روضات الجنات (عربی) از محمد باقر خوانساری
قصص العلماء، از محمد بن سلیمان تنکابنی
مجالس المومنین، از قاضی نور اللہ شوستری

(۵) علماء، حکماء، اور شعراء کے حالات پر بعض اہم تاریخی کتابیں

راحۃ الصدور، تاریخ گزیدہ، حبیب السیر، تاریخ فرشتہ

روضۃ الصفا، ناسخ التواریخ۔

Unit IV

دورِ مشروطیت کی ادبیات پر ایک نظر

ایران میں مشروطیت کا دور ۱۳۲۴ھ قمری کے فرمان سے شروع ہوتا ہے۔ مشروطیت نتیجہ تھی ایک مسلسل سیاسی، علمی اور ادبی جدوجہد کا۔ اس جدوجہد کی تفصیل کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں ایرانی ادبیات نے پچھلے موضوعوں اور قدیم طرزوں میں ایک نئی تازگی پیدا کی۔ ذیل میں اس کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ بیرونی زبانوں اور خاص کر فرانسیسی زبان نے قاچاری دور کی ابتدا میں ایران میں قدم رکھا اور ان زبانوں کا رواج ہوا۔ ایران اور یورپ میں آنا جانا زیادہ ہوا تو اس ملک کی ادبی تصانیف نظم ونثر، افسانے اور ناول ایران میں پڑھے جانے لگے۔ اس میل ملاپ کے نتیجہ کے طور پر نہ صرف بہت سی یورپی زبانوں کی کتابیں فارسی میں ترجمہ ہوئیں اور بہت سے فرنگی الفاظ فارسی میں داخل ہو گئے۔ بلکہ بہت سے نئے ادیبوں نے مغربی طرزِ ادا اور مغربی سبک ہی اختیار کر لیا۔ اس معاملہ میں بعض ادیبوں نے اتنا غلو کیا کہ ان کی طرز فارسی سبک اور فارسی طرز سے خارج ہو گئی ہے۔

۲۔ جو نئے موضوع ادبیات میں داخل ہوئے ان میں آزادی کے افکار، اجتماعی اور سیاسی عقیدے، سیاسی حقوق کا حصول، افکار کی آزادی کا مسئلہ، آزادی فطرت اور وطن پرستی کے جذبات ہیں۔ یہ سب موضوعات نثر اور نظم میں داخل ہو گئے اور بڑے بڑے اور خوش فکر شاعران پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ انہوں نے بہترین الفاظ اور دلنشین طرز

میں اس قسم کے افکار کی ترجمانی شروع کی۔ عارف قزوینی جیسے شاعر نے ملی افکار کو عوام میں پھیلایا۔ اس دور کے بڑے شاعروں میں جو گذر چکے ہیں ادیب الملک فراہانی اور ادیب پیشاوری کا نام لیا جا سکتا ہے۔ خواتین میں پروین اعتصامی قابل ذکر ہیں۔ زندہ ادیبوں میں آقای محمد تقی بہار (ملک الشعراء) کا ذکر ضروری ہے۔ یہ قصیدہ کی طرز کے استاد اور تاریخ و ادب کے ماہر ہیں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہمارے دور میں بہت سے شاعر، ادیب اور ادب نواز پیدا ہوئے۔ انہوں نے فارسی نظم و نثر کو زندہ کیا ہے، اس کو زیادہ سلیس اور زیادہ رواں بنایا ہے۔ اس میں تازہ معانی اور موضوع پیش کیے ہیں اور اپنے آپ کو اپنے قدیم بزرگوں کا سچا سپوت ثابت کیا ہے۔ ان شاعروں اور ادیبوں کے حالات اور اشعار پر بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، مثلاً آقای اسحاق (ہند) آقای اسد اللہ ایزد گشسب، پروفیسر براؤن، پرفیسر پژمان، آقای جہانبانی، آقای دنشا "ایرانی"، آقای رشید یاسمی، آقای حسین مکی آقای سعادت، نوری اور دوسرے مصنفوں نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ اس موضوع پر بڑی معلومات آفریں کتابیں ہیں۔

۳۔ عام طور پر فارسی نظم اور نثر قدیم زمانے سے عوام کی زندگی سے دور اور عوام کی ضرورتوں کے ذکر سے بالکل خالی رہی لیکن اس دور میں یہ کمی دور ہو گئی۔ اور ادب عوام کی زندگی اور ان کے ذہن سے نزدیک تر ہو گیا۔ عوام کی ضرورتوں نے ادب کے لیے تازہ موضوع فراہم کیے اور اجتماعی مسائل نے ادبیات میں راہ پائی۔ نئے لکھنے والوں نے ان موضوعات پر لکھنے کے سلسلہ میں الفاظ کی زینت اور جملوں کی زیبائش سے کہیں زیادہ اپنے مطالب واضح اور اپنے بیان کو زیادہ سے زیادہ صاف روشن کرنے پر توجہ کی ہے۔

۴۔ اس دور میں نئے مدرسے قائم ہوئے، روزنامے اور رسالے جاری ہوئے۔ ان سب چیزوں نے مل کر علم اور معارف کی اشاعت اور پھیلاؤ میں بہت بڑی خدمت انجام

دی ہے۔ان کی وجہ سے ادبیات نے عوام تک راہ پائی اور علم وادب خواص کے طبقوں سے نکل کر عوام کے زمرے سے متعارف ہوا اور علم وادب کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کی جانے لگی۔

۵۔ عالموں، فاضلوں، مصنفوں، مولفوں اور عوام نے ایران کے قدیم مصنفوں کی علمی اور ادبی تصانیف سے دلچسپی لینی شروع کی۔ وزارت فرہنگ کی طرف سے درسی کتابوں کی تصنیف اور مغربی تصانیف کی نظم ونثر کی کتابوں کی تصحیح اور ان کی چھپائی کا خاص اہتمام کیا جانے لگا اور پچھلے زمانے کی بہت سی تصانیف اہم نوادر، اور آثار عالموں اور فاضلوں کے اہتمام سے جدید طریقہ پر تصحیح پاکر طبع اور شائع ہوئے۔

۶۔ علمی اور تاریخی مسائل کی تحقیق اور تنقید کو کافی ترقی ہوئی۔اس میں اصل سے رجوع، منظم فکر کے تحت اسناد اور اصل سے پوری پوری مطابقت کے اصولوں سے کام لیا جانے لگا۔اس طرح بعض بڑے بڑے مسلمان مصنف جو اپنے زمانے میں گم نام رہے اب زندہ کیے گئے۔اس کام میں مغربی عالموں کے طریقۂ تنقید سے بھی پورا پورا استفادہ کیا۔حقیقت میں اس حیثیت سے مغربی مستشرقوں کی تصنیفوں اور ان کی تحقیقاتوں نے ایران کی نئی ادبی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔اسی اثر نے ایرانیوں کے دل میں اپنے پچھلے مصنفوں کے آثار کو زندہ کرنے کی لگن پیدا کی یہی اثر علمی مطالب کی تحقیق اور اُن سے لگاؤ پیدا کرنے میں بڑا زبردست عامل رہا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فن میں جتنے عالم اور فاضل ایران نے پیدا کیے ہیں ان میں سب سے زیادہ قابل احترام **محمد بن عبدالوہاب قزوینی** کی ذات گرامی ہے۔

۷۔ عبارت آرائی، مبالغہ، غیر فطری مضامین اور تشبیہیں، اور پیچیدہ بیانی جو قدیم ایرانی ادبیات کی ایک خصوصیت تھی، اس کے خلاف مہم شروع کی گئی۔اس دور کے بعض مصنفوں نے قدیم مضامین، پرانی تشبیہوں، اور پچھلے اسلوب ومعانی کو بہت بڑی حد تک ترک کردیا ہے۔ان کی جگہ وہ نئے نئے مضامین کو جگہ دے رہے ہیں شاعری

میں نئے نئے اوزان اور نئے نئے سانچوں سے کام لے رہے ہیں۔ نثر میں وہ عربی طرز کی جملہ بندی اور کثرت سے عربی الفاظ کے استعمال کے مخالف ہیں۔ اس جگہ وہ ایرانی طرز کو زندہ کرنا اور فارسی الفاظ کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض لوگ تو اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ خالص فارسی الفاظ استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ یہ دور ایک لحاظ سے یعنی بڑی حد تک موضوع اور ادبی طرز ادا کے لحاظ سے ایک انقلابی اور عبوری دور ہے۔ اس دور میں قدیم طرزوں کی بنیادیں ہل گئی ہیں اور نئے اصولوں نے اب تک پوری طرح اپنی واضح شکل اختیار نہیں کی ہے۔ تاہم بعض نئے ادیبوں اور شاعروں نے بعض ایسی دلکش اور دلربا چیزیں پیش کی ہیں کہ یہ چیزیں ایک عمدہ اور بہتر سبک کی نوید دے رہی ہیں۔

فارسی سبک پر ایک اجمالی نظر

فارسی زبان دنیا کی اہم زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ زبان ہندوارو پائی اصل کی قدیم زبان کی ایک شاخ ہے۔ اس زبان میں جو ادب ملتا ہے اس کی تاریخ کم سے کم ڈھائی ہزار سال تک پیچھے جاتی ہے۔

قدیم یونانی تاریخوں، یہودیوں کی مذہبی کتابوں، اوستا کی داستانوں اور عربی تاریخوں کی رو سے ایران میں مادیوں اور ہخامنشیوں کے عہد میں ادب، اخلاقی قوانین اور احکام پر کتابیں موجود تھیں۔ لیکن اب ہخامنشی کتبوں کے سوا اس عہد کی اور کوئی چیز ہم تک نہیں پہنچی،

ایران قدیم میں دو زبانیں رائج تھیں۔ ایک اوستائی زبان جس میں اوستا لکھی گئی ہے۔ دوسری زبان قدیم فارسی یا "پارسی باستان" یہی زبان ہخامنشی دور کی عام زبان تھی اور اس دور کے سارے کتبے اسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ پارسی باستان اور اوستا کے

الفاظ بالکل سیدھے سادے، بامعنی اور بے تکلف ہیں۔ صرف اوستا میں، جیسی کہ مذہبی کتابوں کی عام طرز ہے، مکررات زیادہ آئے ہیں۔ سلوستانی ادب یا ادبیات مزدیسنا میں اوستا کے سوا اور بھی چیزیں ہمارے ہاتھ آئی ہیں اور صدیاں گذر جانے کے باوجود نظم اور نثر کے تھوڑے بہت نمونے ابھی تک باقی چلے آرہے ہیں۔

پارسی باستان میں زمانے کے ساتھ ساتھ بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے اس کی قواعد اور اس کے الفاظ کا تلفظ سادہ سے سادہ تر ہوتا گیا۔ یہی زبان اشکانیوں اور ساسانیوں کے دور میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی اسی زبان کو پہلوی زبان کہا جاتا تھا۔ اس زبان میں ادب پر بہت سی کتابیں اور اشعار لکھے گئے تھے۔ ساسانی کتبوں کے سوا ساسانی دور کے آخر سے لے کر ابتدائے اسلام تک پہلوی زبان کی سو کتابیں ہم تک پہنچی ہیں۔

ایران قدیم کے اشعار کا وزن حروف ہجا کا وزن ہوتا تھا۔ اور تاریخوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسمی جشنوں کے موقعوں پر سرود خواں بادشاہوں کے درباروں میں اپنے منظومے پڑھا کرتے تھے۔ گویا اس زمانے میں منظوم کلام کا رواج ہو چکا تھا۔

آج کل کی فارسی زبان صرف اپنی ترکیب کے لحاظ سے پہلوی زبان سے قریب تر ہے۔ اس میں الفاظ، قواعد اور تلفظ کی بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس کی ابجد، اس کے بہت سے الفاظ اور اس کے لکھنے کی طرز عربی زبان سے لی گئی ہے۔

پہلوی زبان کی جو تھوڑی بہت کتابیں باقی رہ گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلوی زبان کی نظم اور نثر دونوں نہایت سادہ اور رواں تھے۔ سادے سیدھے جملوں میں اپنا مطلب ادا کیا جاتا تھا۔ اس میں تعقید، طول بیانی، تفصیل، استعارے اور مجاز سے کام نہیں لیا جاتا تھا اور لیا بھی جاتا تھا تو بہت کم۔

ایران پر عربوں کے قبضہ کے دو سو سال بعد تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں سیاسی

بیداری کے ساتھ ساتھ ادبی بیداری بھی ایران میں شروع ہوئی۔ فارسی زبان کے بہت
سے بڑے بڑے شاعر ایسے شعر کہنے لگے جو عروض کے وزن کے مطابق تھے۔ اور نثر میں
کتابیں بھی لکھی ہیں۔ عربوں کے قبضہ کے دوران میں بھی فارسی زبان ناپید ہونے نہیں پائی
بلکہ ایران میں ہجائی وزن کے فارسی اشعار گائے جاتے رہے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کی
بہت سی کتابوں میں ایسی بہت سی روایتیں ملتی ہیں۔

بعد اسلام نظم و نثر کی زبان کو سامانیوں کے عہد میں وسعت حاصل ہوئی۔ پھر یہ
زبان غزنویوں اور سلجوقیوں کے عہد میں اپنے اوج کمال پر پہنچی۔ اسی دوران میں سیکڑوں
بڑے بڑے شاعر، حکیم اور مصنف پیدا ہوئے۔

اگرچہ ان دوروں میں فارسی ادبیات عربی الفاظ اور عربی اسلوب سے بہت
زیادہ متاثر ہوئی، لیکن اس نے اصلی خصوصیتوں کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اس زمانہ کی
نظم اور نثر کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور روانی ہے۔ اس دور کی تصانیف
میں عبارت آرائی، مضامین کی تکرار، طول طویل جملے اور واقعیت سے دور مضامین
بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں

ادبی موضوع عبارت تھے قصیدے سے۔ یہ قصیدے زیادہ تر بادشاہوں، امیروں
اور بزرگوں کی مدح میں لکھے جاتے تھے۔ اس کے سوا بیان حال، پند و عبرت کے لیے
بھی اسی سے کام لیا جاتا تھا۔ ان قصیدوں میں تشبیب اور تغزل دونوں ہوتے تھے۔
اسی طرح علمی، اخلاقی، ناصحانہ، رزمیہ، داستانی، دینی اور تاریخی قطعات بھی لکھے جاتے
تھے۔ پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد سے حکیمانہ، عالمانہ اور صوفیانہ قطعات بھی لکھے
جانے لگے۔ شعر کے اصناف میں قصیدے اور قطعات کے سوا غزلیں، رباعیاں، مثنویاں
اور مسمط بھی لکھے جانے لگے۔ اس دور کے شاعروں کا کلام رودکی سے لے کر عنصری، فرخی
منوچہری، دقیقی، فردوسی، ناصر خسرو، قطران، سنائی، انوری، معزی، خیام، خاقانی، ادیب صابر

اور نظامی تک سب ایک ہی طرز کا تھا۔ انہوں نے ایسے مطالب کو جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

اس عہد میں نثر کی ابتدائی کتابیں بھی لکھی گئی تھیں۔ جیسے ترجمہ تاریخ طبری، ابوریحان بیرونی کی التفہیم، ابوعلی سینا کا دانش نامہ، گردیزی کی زین الاخبار، تاریخ بیہقی، قابوس نامہ، چہار مقالہ، کلیلہ و دمنہ۔ یہ سب کتابیں نہایت سادہ اور بے تکلف نثر میں لکھی گئی ہیں، اور حشو و زوائد، مکررات اور کنایوں سے پاک ہیں۔

سلجوقی دور کے آخر سے فارسی شاعری کے سبک میں تبدیلی شروع ہوگئی اور عربی کے مغلق الفاظ، عربی ترکیبیں اور علمی اور مذہبی اصطلاحیں نظم اور نثر میں آہستہ آہستہ بار پانے لگیں، اور چھٹی صدی ہجری کے مشہور شعرا جیسے انوری اور خاقانی کے اشعار میں اس کے آثار نمودار ہونے لگے۔

اس دور کے بعض شاعروں اور اس کے بعد تو اکثر شاعروں نے مغلق گوئی، فضل فروشی، قافیہ پردازی اور نکتہ پردازی شروع کر دی، اور پڑھنے والے کو مبہوت کرنے کے لیے معمے اور دقیق علمی مسائل نظم میں ٹھونسنے لگے۔

نثر میں مرکب اور مسلسل عبارتیں اور بڑے بڑے جملے لکھے جانے لگے۔ بے جا مترادفات استعمال ہونے لگے۔ عربی جملے، سجعے اور صنعتیں شروع ہوگئیں۔ سعد و راوینی کا مرزبان نامہ، راوندی کی راحۃ الصدور، مقامات حمیدی، تاریخ یمینی کا ترجمہ اور اسی طرح کی کتابیں اس کی مثالیں ہیں۔ اقسامِ شعر میں قصیدہ، غزل، قطعہ، مثنوی، رباعی اور ترجیع بند لکھے جاتے تھے۔ مدح، وصف، بیانِ حال، اظہارِ عشق، مرثیہ، پند و نصیحت، دینی مطالب، علمی اور صوفیانہ مسائل، زبان کے قواعد اور عروض کے محاسن ان کے موضوع تھے۔

مغل اور تیموری دور میں جو عام تباہی اور قتل و غارت گری ہوئی۔ اس میں شمالی ایران اور خاص کر خراسان کے علمی اور ادبی آثار فنا ہوگئے۔ کتاب خانے ویران اور مدرسے

برباد ہو گئے۔ شاعر اور عالم یا تو قتل ہوئے یا اس ملک سے بھاگ گئے۔ ایک عرصہ تک ادبیات میں خلل سا پڑ گیا اور چھٹی صدی کے برخلاف جس میں بہت سے شاعر پیدا ہوئے، اس دور میں بہت کم شاعر اُبھرے لیکن اس کے باوجود جب مغلوں اور تیموریوں نے ایرانی تمدن اختیار کر لیا اور قتل و غارت گری چھوڑی تو پھر بہت سے شاعر اور مصنف پیدا ہونے لگے اور خاص کر فنِ تاریخ پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ علم نجوم، نقاشی، خطاطی کو خاص طور پر تیموریوں کے دور میں ترقی حاصل ہوئی۔

مغلوں اور تیموریوں کے دور میں فارسی سبک بگڑنا شروع ہوا، اور خاص کر یہ بگاڑ نثر میں بہت زیادہ رونما ہوا۔ تصنع اور تکلف زیادہ ہونے لگا۔ طول طویل جملے، مغلق ترکیبیں، ٹھنڈے استعارے، پُر تکلف اور بے جا سجع عربی کی تقلید میں کثرت سے استعمال کیے جانے لگے، عربی جملے داخل کیے جانے لگے، جملہ معترضہ کی بھرمار ہو گئی، استعارے، تشبیہیں، ایہام، مبتدا اور خبر میں زیادہ سے زیادہ فصل، چھوٹی چھوٹی باتوں میں مبالغہ، خواص کی مدح میں اغراق ـــ یہ سب اس دور کے سبک کی خصوصیات ہیں۔ اس سبک کی مثالیں تاریخ وصاف اور تاریخ معجم سے لے کر تاریخ نادرہ درۂ نادرہ تک برابر ملتی چلی آتی ہیں لیکن اس کے ساتھ گنتی کے کچھ ایسے استاد بھی ملتے ہیں جنھوں نے نظم و نثر دونوں میں پچھلے سادہ سبک ہی کو اختیار کیا اور سعدی اور حافظ کی نظم و نثر میں یا تاریخ جہاں گشا اور طبقات ناصری کی انشا میں نہایت پاکیزہ اشعار اور تحریریں لکھی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے زمانہ کے پُر تصنع اور مبہم اسلوب کے خلاف گویا قلمی جہاد کیا ہے۔

اس دور میں غزل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی اور دونوں طرزوں میں لکھی جاتی رہیں۔ اس سے پہلے قصیدہ کو جو اول درجہ حاصل تھا وہ اس سے چھن گیا سعدی اور حافظ جیسے استادوں نے اس فن کو اوجِ کمال پر پہنچایا۔ مدحیہ قصیدوں پر

بھی یہی رنگ چڑھ گیا۔ شاعر ممدوح یا معشوق کو حد سے زیادہ سراہنے لگے۔ تملق، چاپلوسی، خوشامد اور نفس کی تحقیر میں حد سے زیادہ مبالغہ ہونے لگا۔ صوفیانہ شاعری نے بھی زور پکڑا اور اس کے مکمل نمونے اسی دور نے پیش کیے۔ اسی دور نے اس صنعت کے بہترین استاد مولانا جلال الدین رومی، حافظ اور جامی کو جنم دیا۔

مغل دور کے غیر فطری سبک کو صفویوں کے دور میں اور ترقی ہوئی۔ عجیب و غریب ترکیبیں، نامانوس الفاظ، مسلسل صنعتیں، نکتہ گوئی، مضمون آفرینی، پیچیدہ اور باریک معانی پیدا کرنے کا عام رواج ہوا۔ خاص کر ہندستان میں رہنے والے شاعروں نے اس طرز میں بہت زیادہ افراط سے کام لیا اور نتیجے کے طور پر ایک پُر تکلف اور مصنوعی سبک کی بنیاد ڈالی جسے بعضوں نے ہندی سبک کے نام سے یاد کیا ہے۔ لیکن اس افراط کے باوجود ہندی سبک میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ اگر ایک طرف اس میں پیچیدہ، مصنوعی اور مبالغہ آمیز مضامین (جیسے کہ ذیل کے شعر میں موجود ہیں) ہیں تو دوسری طرف اس میں لطیف اور دلنواز مضامین بھی ملتے ہیں۔ ایسے اشعار کے نمونے صائب اور ان کے معاصروں کے بیان میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو جو اسی سبک کا نمونہ ہے:

شمع را بر سر نمی دانم ہوای روی کیست   بوی گل می آید از دود پر پروانہ ام

کہتا ہے محبوب اتنا گل اندام ہے کہ شمع کے سر میں صرف اس کی خواہش ہی اسے اتنا معطر بنا دیتی ہے کہ اس شمع کی آگ میں جلنے والے پروانے کے دھوئیں سے گلاب کی بو آتی ہے۔ انصاف یہ ہے کہ اس شعر میں حد درجہ مضمون آفرینی، باریک اندیشی، اغراق اور مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس مبالغہ کے باوجود جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اس سبک کے بڑے شاعروں کی لطافت اور ہنرمندی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس قسم کے مضامین نہایت دقیق اور مشکل ہوتے ہیں اور یہ خصوصیت دنیا کی تمام ادبیات میں

صرف ادبیات ایران ہی کا مایۂ امتیاز ہے اور کسی قوم نے بھی اس نکتہ پردازی مضمون آفرینی اور دقیقہ سنجی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ اس لیے یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مندرجہ بالا شعر اور اسی قسم کے اشعار جو صائب وغیرہ کے بیان میں نقل ہوئے ہیں اور ذیل کے اشعار سے یہ ظاہر ہے کہ یہ اشعار ایران کے متاخر اور معاصر شاعروں کے خیال کی نزاکت کا ثبوت ہیں :۔

نمی خواہم کہ گردد ناخن من بند در جائی ... مگر گاہی کہ خارے را برآرم از کفِ پائی

... ⁘ ...

بہوش باش دمی را بسہو نخراشی ... بناخنی کہ توانی گرہ کشائی کرد

... ⁘ ...

شیشہ نزدیک تر از سنگ ندارد خویشی ... ہر شکستی کہ بہر کس برسد از خویش است

... ⁘ ...

شمع ایں حوصلہ را بر ہمہ کس روشن کرد ... کہ تواں تا بسحر گریۂ بی شیون کرد

... ⁘ ...

گریہ و سوز دو افروز دو خاموش شود ... ہر کہ چوں شمع بخندد بشب تار کسے

... ⁘ ...

گل سر سبد عمر چشم بیدار است ... بر غم دیدۂ گلچیں روزگار مخسپ

... ⁘ ...

بوی گل خود بہ چمن راہنما شد ورنہ ... مرغ مسکیں چہ خبر داشت کہ گلزاری ہست

... ⁘ ...

از دوری تو جاناں دانی چہ ماند در دل ... از کارواں چہ ماند جز آتشی بمنزل

... ⁘ ...

در بیخبری از تو قاصد مرحلهٔ من بیشم ۔۔۔ تو بی خبر از من من بی خبر از خویشم

...

من عاشقم دلیلِ من این قلب چاک چاک ۔۔۔ در دست من جز این سند پاره پاره نیست

جیساکہ اوپر کے اشعار سے ظاہر ہے ایسے اشعار، قطعات، تمثیلی پند آمیز ابیات عام طور پر لکھے جانے لگے۔ صائب اور فیضی جیسے شاعروں کے پاس خاص کر ایسے اشعار زیادہ ملتے ہیں، چنانچہ ان کے نمونے صائب اور فیضی کے بیان میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ نثر میں تاریخی کتابوں کے سوا شیعہ مذہب سے متعلق بہت سی کتابیں صفوی دور میں لکھی گئیں۔ اور یہ بالکل بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ صفویوں کے دور میں فارسی نظم و نثر سے علوم حکمت اور عرفان خارج کر دیے گئے اور ان کی جگہ مرثیہ، مذہبی مسائل، فقہ، مناقب ائمہ اور شیعہ عقائد نے لے لی۔

زندیوں کی حکومت کی ابتداء کے بعد سے ایک نئی ادبی تحریک شروع ہوئی اور ہاتف، مشتاق، نشاط، صبا، سروش اور قاآنی جیسے شاعر پیدا ہوئے۔ ان شاعروں نے قدماء کی طرز کو پھر سے زندہ کیا اور اس طرح مغلوں اور صفویوں کے عہد کا سبک بتدریج غائب ہوتا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک سادہ تر اور فصیح تر سبک لینے لگا۔ فارسی نثر میں بھی نشاط، قائم مقام، سپہر اور ہدایت جیسے ادیب پیدا ہوئے ان ادیبوں نے قدیم نثر کو پھر زندہ کیا اور نثر میں حشو و زوائد، مترادفات اور پیچ در پیچ جملے لکھنے کا رواج ترک ہو گیا۔

مغلوں سے پہلے کے دوروں میں ایران کی ادبی زندگی اور معیار سبک کا مرکز خراسان اور ایک حد تک آذربائجان تھا۔ اس کے بعد صوبۂ فارس نے اہمیت حاصل کر لی صفوی دور کے بعد عراق نئے سبک کا مرکز قرار پایا

اس آخری دور میں قصیدہ اور غزل دونوں ساتھ ساتھ ترقی کرتے رہے اور ایک کو دوسرے پر برتری حاصل نہیں ہوئی لیکن چونکہ متقدمین کے سبک کو میزان قرار دیا گیا

تھا، اس لیے فطری طور پر غزل کی بہ نسبت کسی قدر قصیدے پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔

اس دور میں فنِ تاریخ اور سیر و سوانح کو بھی خاصی ترقی ہوئی۔ روضۃ الصفا اور ناسخ التواریخ جیسی عام تاریخیں، اور آتش کدہ اور مجمع الفصحا جیسے تذکرے لکھے گئے اسی طرح بہت سی مذہبی کتابیں بھی فارسی زبان میں لکھی گئیں۔

دورِ مشروطیت کے ساتھ ہی سیاسی انقلابات نے ادبیات میں بنیادی تبدیلیاں کر دیں یعنی شعر، مضامین اور تصانیف میں اجتماعی مطالب اور مسائل پر زیادہ توجہ کی جانے لگی۔ اس علمی طرز اور علمی روش نے خود الفاظ کو روشن اور اجاگر کر دیا اور منشیانہ عبارت پردازی اور صنائع لفظی نے سادہ اور فصیح عبارتوں اور جملوں کے لیے اپنی جگہ خالی کر دی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ادبیاتِ ایران کی پوری تاریخ میں صرف عربی زبان ہی دینی اور علمی زبان رہی ہے۔ ایران میں اسلام کی ابتدا سے لے کر آج تک ابو علی سینا، ابو ریحان بیرونی، فخر رازی، خواجہ نصیر الدین طوسی سے لے کر ملا صدرا، حاجی ملا ہادی جیسے ایرانی علماء و فضلاء نے علومِ حکمت جیسے نجوم، طب، ریاضی طبیعیات وغیرہ پر اپنی اہم ترین تصنیفیں عربی میں لکھیں اور فارسی کی طرف کم توجہ کی ہے۔ ان کی نظر صرف معانی کی طرف معطوف اور علمی حقائق کی شرح و بسط کی طرف متوجہ تھی اس توجہ نے لازمی طور پر نظم و نثر حتیٰ کہ عام خط و کتابت اور خواص کی بات چیت پر بھی اپنا اثر ڈالا۔ بہت سی ایسی اصطلاحیں اور ترکیبیں جن میں عربی سے احتراز کیا جا سکتا تھا، عام طور پر رائج ہو گئیں۔ اس سے فارسی زبان کی موزونی متاثر ہونے لگی۔ اس کے سوا فنی اصطلاحیں جو عربی سے لی گئی تھیں مصر اور ترکی کے رستے ہماری زبان میں داخل ہونے لگیں جیسے بلدیہ، عدلیہ، نظمیہ، ارکان حرب اور ایسی ہی بہت سی ترکیبیں جیسے عرضِ اندام اور نقطۂ نظر وغیرہ جن میں سے بعض غلط بھی ہیں۔ فارسی میں نمودار ہونے لگیں۔ ان دونوں نے مل کر فارسی زبان کے مخصوص آہنگ میں بگاڑ پیدا کر دیا۔ دوسری طرف نئے نئے علوم و فنون

کے رواج کی وجہ سے نئی اصطلاحیں گھڑنے کی ضرورت پیش آئی اور مترجم اور معلم ان اصطلاحوں کے وضع کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ ان اسباب کی بنا پر آج سے کوئی پچاس سال پہلے لکھنے والوں میں ایک نئی ادبی تحریک شروع ہوئی۔ ان لوگوں نے فارسی زبان سے بے ضرورت الفاظ، آرائشی اور بیکار جملے اور بھرتی کی فضول ترکیبوں کو نکالنا شروع کیا اور ان کی جگہ صحیح اور فصیح فارسی الفاظ استعمال کرنے لگے۔ اس ادبی تحریک نے آخر کار فرہنگستان ایران کی تاسیس کی صورت اختیار کی۔ ادھر کئی سال سے یہ انجمن اپنا کام کر رہی ہے اور "واژہ ہای نو" کے نام سے بہت سی کتابیں مرتب کر کے شائع کر چکی ہے۔

ماخذ

افسوس ہے کہ سبک کے موضوع پر ایرانی عالموں نے اب تک کچھ نہیں لکھا اس لیے اس کتاب کے مصنف کو خود ہی نئے سرے سے اس موضوع پر تحقیقات کرنی پڑی[1]۔ ذیل میں چند محدود اور مختصر ماخذ جو مصنف کے پیش نظر رہے اور جن سے استفادہ کیا گیا ہے ترتیب زبانی کے لحاظ سے درج کیے جاتے ہیں:۔

مقدمہ مجمع الفصحاء، از مرحوم ہدایت۔

شعر العجم، از شبلی نعمانی۔ اس کتاب کے کچھ حصے آقای فخر داعی نے اردو سے فارسی میں ترجمہ کر کے شائع کیے ہیں۔

فارسی نظم و نثر کے سبک پر یورپی مستشرقوں کی تحقیقات، خاص کر اتہ اور براؤن

آقای ملک الشعراء بہار کے مضامین کا سلسلہ۔ مجلۂ ارمغان، سال (۱۳) اور

مجلہ مہر، سال (۵)

---

[1] آقائی رضازادہ شفق کی کتاب چھپنے کے کچھ ہی دنوں بعد آقای ملک الشعراء بہار نے اس موضوع پر اپنی قابل قدر کتاب "سبک شناسی" کے نام سے تین جلدوں میں چھاپی ہے اور ایک حد تک اس کمی کو پورا کر دیا ہے (مترجم)

تاریخ ادبیات ایران، ازآقائی ہمائی، ج ۲ ص ۲۶۱ سے آخر تک۔
مقدمہ دیوان ہاتف۔ طبع طہران، ازآقای عباس اقبال۔
گلستاں اور کلیلہ و دمنہ کے مقدمے، ازآقای عبدالعظیم قریب، طبع جدید طہران۔
سخن وسخنوراں ج ۲، ازآقای فروزانفر
مقدمہ دیوان مشتاق، طبع طہران، ازاقای حسین مکی۔
مقدمۂ اشعار برگزیدۂ صائب، از ز۔ موتمن، طبع طہران۔
قائم مقام، ازآقای باقر قائم مقامی۔ حصہ سوم
سخن سنجی، ازآقای دکتر لطف علی صورت گر، طہران۔

ایرانی ادبیات کی اہمیت اور اس کی قدروقیمت

اگر ایرانی ادبیات کی تاریخ ہخامنشی دور سے شمار کی جائے تو کوئی ڈھائی ہزار سال سے ہمارا وطن نظم و نثر میں ادبی آثار کا حامل نظر آتا ہے۔ ذیل میں ہم اس دور کی اہمیت اور قدروقیمت کا خلاصہ اس طرح کر سکتے ہیں۔

ا۔ کیا عبارت کے لحاظ سے اور کیا معانی کے لحاظ سے ہر تمدن میں آریائی ادبیات کا پایہ بہت بلند ہے۔ ایران کے عالم اور ایران کے شاعر حکمت، فلسفہ اور اجتماعی و اخلاقی مسائل کو قدیم ترین زمانے سے بہترین فارسی سبک میں پیش کرتے آئے ہیں۔ حدیہ کہ بڑے بڑے قصیدے جو امیروں کی خوشامد اور وزیروں سے انعام حاصل کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں ان میں بھی لطیف معانی اور دلکش مضامین درج کیے ہیں کہ اس صفتِ شعر کو ایرانی قوم کی استعدادِ فکر اور وسعتِ خیال کے ایک نمونہ کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے فارسی قصیدوں میں طولِ کلام، عبارت پردازی، قافیہ پیمائی اور اخلاقی برائیاں موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود قصیدے میں بہت سی بنیادی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

(۱) قصیدہ گو شاعروں نے اونچے درجے حاصل کرنے، سلاطین سے انعام پانے اور لوگوں سے داد لینے کے لیے بڑی محنت سے کام لیا ہے اور فارسی میں بہترین ترکیبیں ایجاد کیں، موزوں ترین الفاظ استعمال کیے اور انہیں زندہ کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنی زبان کی بقا کے لیے بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

(۲) تملق گوئی کو مذموم جانتے ہوئے بھی اُنھوں نے نہایت اچھوتے مضامین نہایت نازک تشبیہیں، ماہرانہ اور اُستادانہ تخیلات مدحیہ قصیدوں میں پیش کیے ہیں۔

یہ چیزیں ایرانی قوم کی تیز فکر، بلند تخیل اور لطیف قریحہ گوئی پر دلالت کرتی ہیں اور ہر قوم ایسے لطیف معانی پیش نہیں کرسکتی۔

(۳) فارسی قصیدوں میں نہایت بلند پایہ اخلاقی مضامین درج کیے گئے ہیں۔

(۴) قصیدوں میں ضمنی طور پر بہت سے تاریخی مطالب، عادات اور حکایتیں آئی ہیں ان سے پچھلے زمانے کی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

(۵) ایرانی امثال اور حکیمانہ اقوال ان میں جمع ہو کر محفوظ ہو گئے ہیں۔

(۶) قصیدوں کی ابتدا میں وہ بے نظیر تغزل درج ہے جو ایرانی استادوں کے لطیف احساسات اور قدرت کلام کا بین ثبوت ہیں۔

(۷) بادشاہوں کی مدح وستائش کے ضمن میں جو پند ونصیحت کی گئی ہے وہ بڑے دلکش اور شیریں انداز میں کی گئی ہے۔ اس پُراثر کلام نے سخت گیر اور ظالم مغول جیسے بادشاہوں کے اخلاق کی سختی کو یکسر بدل دیا۔ اس لحاظ سے یہ قصیدے بہت زیادہ قابل قدر اور قابل تعریف ہیں۔

(۸) ایسے قصیدے جو بالکل دینی اور اخلاقی ہیں، وہ چاپلوسی اور خوشامد سے یکسر خالی ہیں۔ ان میں علمی، حکیمانہ مطالب یا شاعر نے خود اپنے حالات یا اپنے افکار درج کیے ہیں۔ ایسے قصیدوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ ایرانی ادبیات نے قصیدہ، قطعہ، نثر، اشعار، امثال، حکیمانہ اور اخلاقی داستانوں کے ذریعہ عوام کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہ چیزیں قدیم زمانے ہی سے نہایت دلنواز اور فصیح فارسی میں لکھی جاتی رہی ہیں۔ ان چیزوں نے لوگوں کے اخلاق کے سدھارنے میں زبردست حصہ لیا ہے۔ اگر بعض شاعروں نے کبھی از راہِ تفنن اخلاق اور آداب کے خلاف اشعار لکھے بھی ہیں تو اُن کا یہ کلام بہترین اشعار کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔

۳۔ ایرانی ادبیات کی تاریخی قدر و قیمت بھی ہے۔ کیونکہ یہ ایران کے بے شمار عاقل ترین افراد کے اخلاق، افکار، آداب، احساسات، نصائح اور پند کا مجموعہ ہے جو صدیوں سے محفوظ چلا آرہا ہے اور ہم جو ان کے اخلاف ہیں، اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

۴۔ فارسی میں مدحیہ اور تعریفی قصیدوں کی زیادتی کی وجہ سے دوسرے اقسامِ نظم و نثر سے کہیں صرفِ نظر نہ کر لینا چاہیے۔ ایسے بہت سے شاعر ہیں جو ایک مستقل مسلک اور مقصد اپنے پیش نظر رکھتے تھے اور اپنے عالی مقاصد کے لیے شاعری کرتے تھے۔ جیسے مذہبی عقائد میں ناصر خسرو، صوفیانہ اور عرفانی مطالب میں شیخ عطار، شیخ شبستری، مولانا جلال الدین رومی، حافظ وغیرہ، آپ بیتی اور روحانی تاثرات کے بیان میں مسعود سعد سلمان، خاقانی، فلسفیانہ نقطہ نظر سے زندگی کی شرح میں عمر خیام اور پند گوئی میں سعدی وغیرہ۔ ایسے بہت سے بزرگوں نے ایسی گرانبہا یادگاریں چھوڑی ہیں کہ قیامت تک ان پر زوال آنا ممکن نہیں۔

۵۔ مخصوص ادبی آثار کے سوا بھی قدیم زمانے سے ہمارے زمانے تک فارسی زبان میں بہت سی علمی، فنی اور دینی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان میں سے ہر کتاب اپنے زمانے کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

۶۔ ایرانی ادبیات ہماری قومی زبان فارسی کی سب سے بڑی سند اور اس کی بہترین ضامن ہیں۔ یہ ہمارے سبک کی اور ہر زمانے کے بڑے بڑے شاعروں کی طرز کی میزان ہے۔ آج بھی یہ گرانبہا آثار اور تصانیف ایک طرف ہماری زبان کے محافظ اور دوسری طرف ہمارے نئے مصنفوں کے لیے نمونہ ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے شاعروں اور مصنفوں کی وجہ سے نہ صرف ہماری زبان تباہی اور بربادی سے بچ گئی بلکہ بہت سے فارسی الفاظ بھی اس وسیلہ سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ اگر شاہنامہ یا شاعروں کے قصیدے یا غزلیں اور دوسری بہت سی نثری تصنیفیں (جن کے ایک تھوڑے سے

حصے کا اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے) عالم وجود میں نہ آئی ہوتیں تو بہت سے فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبیں ناپید ہو جاتیں اور ایک عامیانہ زبان کے سوا اور کچھ باقی نہ رہتا۔

۷۔ بداعت یا اچھوتے پن کے لحاظ سے بھی ادبیاتِ ایران کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یعنی ایران کے بزرگوں نے لطیف علمی، اور اجتماعی معانی کو نہایت دلکش، زیبا اور خوش آئند عبارت میں ادا کیا ہے۔ جس طرح استخر فارس کی عمارتوں اور اصفہان کی مسجد شاہ میں ایرانی بداعت، ذوق، صنعت کاری اور حسن پرستی کی روح کا اظہار تناسب اور عظمت کی شکل میں اور اصفہان، مشہد اور اردبیل کی کاشی کاری میں رنگ آمیزی اور گلکاری اور ہم آہنگی کی صورت میں ہوا ہے، اسی طرح دلکش فارسی اشعار میں بھی روح —— دلربا طرز سخن، پیوند نظم اور رعایت وزن و تناسب کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ یہی چیز بے شائبہ تعلی ایرانی شاعروں اور ادیبوں کی سحر بیانی کی سب سے بڑی دلیل اور شاہد عادل ہے۔

تمت

ایرانی ادبیات کے لیے ماخذوں کی ایک جامع فہرست

(الف) مشہور فارسی تذکرے، مطبوعہ اور قلمی

۱۔ **لباب الالباب**۔ عام تذکرہ۔ دو جلد۔ از محمد عوفی۔ زمانۂ تصنیف ساتویں صدی ہجری کی ابتداء۔ طبع لیڈن سنہ ۱۳۲۱۔۱۳۲۴ھ

۲۔ **تذکرۃ الشعراء**۔ عام تذکرہ۔ از دولت شاہ سمرقندی۔ سنہ تصنیف ۸۹۲ھ طبع لیڈن ۱۳۱۸ھ

۳۔ **مجالس النفائس**۔ از امیر علی شیر نوائی (سنہ ۸۹۶) مصنف کے ہم عصر شاعروں کا تذکرہ۔ اصل ترکی میں لکھا گیا اور سنہ ۹۲۷ھ میں فخری بن امیری نے لطائف نامہ کے نام سے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا۔

۴۔ **جواہر العجائب یا تذکرۃ النساء**۔ مشہور شاعرہ عورتوں کا تذکرہ از فخری بن امیری

۵۔ **تحفۂ سامی**۔ نویں صدی ہجری کے بعد سے سنہ ۹۵۷ھ تک کے شاعروں کا تذکرہ اصل میں یہ تذکرہ دولت شاہ کے تذکرہ کا تکملہ ہے۔ اس کا مصنف شاہ اسمٰعیل کا بیٹا سام میرزا ہے۔ طبع طہران مرتبہ آقای وحید دستگردی۔

۶۔ **مذاکر الاحباب**۔ از نثاری بخارائی۔ میر علی شیر نوائی کے زمانے کے شاعروں کا تذکرہ۔ سنہ ۹۷۴ھ تک۔

۷۔ **نفائس المآثر**۔ شہنشاہ اکبر اور اس کے جانشینوں کے عہد میں ہندستان کے ایرانی شاعروں کا تذکرہ۔ از میرزا علاء الدین قزوینی۔ زمانۂ تصنیف سنہ ۹۷۳۔۹۸۲ھ

۸۔ **خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار**۔ مشہور اور عام تذکرہ۔ از تقی الدین کاشی عہد تصنیف سنہ ۹۸۵ھ

۹۔ہفت اقلیم ۔مفید جغرافیائی معلومات کے ساتھ شاعروں کا تذکرہ از امین احمد رازی۔ زمانۂ تالیف ۱۰۰۲ھ

۱۰۔منتخب التواریخ۔ ہندستان کی عام تاریخ مسلمانوں کی فتح سے شہنشاہ اکبر کے چالیسویں سنہ جلوس تک کے حالات شاعروں کے تذکرے کے ساتھ، طبع کلکتہ۔

۱۱۔آئینِ اکبری۔ شہنشاہ اکبر کے دورِ حکومت کی تاریخ کی تیسری جلد جو اکبر نامہ کے نام سے موسوم ہے اس میں شہنشاہِ اکبر کے ہم عصر فارسی گو شاعروں کے تذکرے پر ایک مستقل باب ہے۔ از ابوالفضل علامی۔ زمانۂ تصنیف ۱۰۰۶ھ طبع ہند۔

۱۲۔مجالس المومنین ۔ایران کے شیعہ مشاہیر اور شیعہ شاعروں کا تذکرہ زمانۂ قدیم سے لے کر صفوی دور تک از قاضی نور اللہ شوستری سنہ ۹۹۳۔۔۱۰۱۰ھ، طبع طہران۔

۱۳۔خزینۂ گنج ۔آٹھویں، نویں اور دسویں صدی کے شاعروں کا تذکرہ از الٰہی حسینی کتاب کا زمانۂ تالیف (۱۰۱۰۔ ۱۰۱۵ھ) میں مصنف شیراز میں مقیم تھا۔

۱۴۔بت خانہ ۔عام تذکرہ ۔امثلہ اور انتخابات کے ساتھ ۔گیارہویں صدی میں محمد صوفی اور حسن بیگ نے مل کر اس کی تصنیف کا کام شروع کیا اور دس سال بعد عبداللطیف بن عبداللہ گجراتی نے اس کی تکمیل کی۔ اس کا ایک ہی نسخہ کتب خانہ بوڈلین (کیمبرج) میں محفوظ ہے

۱۵۔مجمع الشعراء جہانگیری۔ شہنشاہ جہانگیر کے دربار کے مدح گو شاعروں کے ایک تذکرے کا ایک حصہ۔ از قاطع ۔اس کا ایک ہی نسخہ کتب خانہ بوڈلین میں محفوظ ہے۔

۱۶۔طبقات شاہجہانی ۔ شاہ جہاں تک تیموری دربار کے شاعروں کا تذکرہ۔ از محمد صادق (گیارہویں صدی) اس کا ایک ہی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

۱۷۔مراۃ العالم ۔گیارہویں صدی تک کی عام تاریخ ۔تاریخ شعر پر ایک مفصل باب از محمد بقاء۔

۱۸۔جامع مفیدی۔ یزد کی تاریخ اور یزد کے عالموں اور شاعروں کا تذکرہ، از محمد مفید

یزدی (گیارہویں صدی) اس کا ایک ہی نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

۱۹۔ تذکرہ نصر آبادی۔ از محمد طاہر نصر آبادی، مصنف کے ہم عصر شاعروں کا تذکرہ۔ زمانۂ تصنیف ۱۰۸۳-۱۰۹۲ھ، طبع طہران۔

۲۰۔ مرآۃ جہاں نما۔ تکملہ مرآۃ العالم (نمبر ۱) از محمد بقا۔

۲۱۔ مرآۃ الخیال۔ عام تذکرہ۔ مشہور شاعروں کے حالات کے ساتھ، از شیر خاں لودھی (بارہویں صدی) طبع کلکتہ۔

۲۲۔ کلمات الشعراء۔ جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کے دربار کے شاعروں کا تذکرہ از محمد افضل سرخوش (بارہویں صدی)

۲۳۔ ہمیشہ بہار۔ جہانگیر کے دربار سے لے کر محمد شاہ (۱۱۳۱ھ) کے جلوس تک کے ایرانی شاعروں کا تذکرہ۔ از اخلاص (بارہویں صدی)

۲۴۔ سفینۂ خوش گو۔ عام تذکرہ تین جلدوں میں (بارہویں صدی کے وسط میں)

۲۵۔ تذکرۂ ندرت۔ عام تذکرہ، قرنوں کی ترتیب کے ساتھ۔ از علی فطرت متخلص بہ ندرت۔ اس کا ایک ہی نسخہ انڈیا آفس لندن میں محفوظ ہے۔

۲۶۔ ریاض الشعراء۔ عام تذکرہ، از علی قلی خاں والہ داغستانی (بارہویں صدی ہجری)

۲۷۔ منتخب الاشعار۔ تذکرہ اور منتخب کلام، از محمد علی خاں مبتلائی مشہدی (بارہویں صدی)

۲۸۔ تذکرۂ حسینی۔ عام تذکرہ، از میر حسین دوست سنبلی (بارہویں صدی)

۲۹۔ مجمع النفائس۔ عام تذکرہ، از سراج الدین احمد خاں آرزو (بارہویں صدی)

۳۰۔ تذکرۃ المعاصرین۔ از شیخ علی حزیں، مصنف کے معاصروں کا تذکرہ (بارہویں صدی)

۳۱۔ دقائق الاشعار۔ فارسی نظم و نثر کے نمونوں کا انتخاب، از میر عبدالوہاب (بارہویں صدی) اس کا ایک ہی نسخہ کتب خانہ بادلین میں محفوظ ہے۔

۳۲۔ سرو آزاد۔ ہندستانی شاعروں کا تذکرہ، از میر غلام علی آزاد بلگرامی (بارہویں صدی)

۳۳۔ مقالات الشعراء۔ شہنشاہ عالمگیر اول کے عہد سے لے کر عالمگیر دوم کے دور تک کے شاعروں کا تذکرہ (بارہویں صدی)

۳۴۔ مقالات الشعراء۔ ہندوستان کے بعض بڑے ایرانی شاعروں کے حالات از میر علی شیر قانع، (بارہویں صدی) اس کا ایک ہی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۳۵۔ حدیقۃ الصفا۔ عام تاریخ۔ ایران کے شاعروں پر ایک مفصل باب کے ساتھ۔ از یوسف علی ابن غلام علی خاں (بارہویں صدی)

۳۶۔ خزانۂ عامرہ۔ عام تذکرہ، از غلام علی آزاد (بارہویں صدی)

۳۷۔ مراۃ الصفا۔ عام تاریخ، ایران کے شاعروں کے تذکرہ کے ساتھ از محمد علی بن محمد صادق (بارہویں صدی)

۳۸۔ آتشکدہ۔ عام تذکرہ، از لطف علی بیگ آذر بیگدلی اصفہانی متخلص بہ آذر۔ (بارہویں صدی) طبع کلکتہ و بمبئی۔

۳۹۔ لب لباب۔ ریاض الشعراء (نمبر ۲۶) کا انتخاب، از قوام الدین علی۔ اس کا ایک ہی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۴۰۔ انیس الاحباء۔ از انیس۔ مصنف کے عہد کے شاعروں کا تذکرہ، تاریخ تصنیف بارہویں صدی کا آخری اور تیرہویں صدی کا ابتدائی حصہ۔

۴۱۔ خلاصۃ الکلام۔ (۱۱۹۸) رزمیہ، بزمیہ، اور صوفیانہ مثنویوں کا انتخاب، از علی ابراہیم خاں خلیل (بارہویں صدی) اس کا ایک ہی نسخہ باڈلین کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۴۲۔ عقد ثریا۔ محمد شاہ کے عہد سے لے کر شاہ عالم تک کے عہد کے ہندستان میں ایرانی شاعروں کا تذکرہ، از غلام ہمدانی مصحفی (بارہویں صدی)

۴۳۔ صحف ابراہیم۔ (۱۲۰۸) ایرانی شاعروں کا عام تذکرہ، از علی ابراہیم خاں مصنف خلاصۃ الکلام (نمبر ۴۱) تیرہویں صدی کی ابتداء۔ اس کا ایک ہی نسخہ باڈلین کے کتب خانہ

میں محفوظ ہے۔

۴۴۔ خلاصۃ الافکار۔ عام تذکرہ، از ابوطالب تبریزی اصفہانی (تیرہویں صدی کی ابتداء)۔

۴۵۔ مخزن الغرائب۔ (۱۲۴۷ھ) شاعروں کا عام تذکرہ، از علی احمد خاں ہاشمی (تیرہوں صدی)

۴۶۔ تذکرہ احمد اختر۔ فتح علی شاہ کے دور کے شاعروں کا تذکرہ (تیرہویں صدی) اس کا ایک ہی نسخہ کتب خانہ برلین میں محفوظ ہے۔

۴۷۔ ریاض الوفاق۔ از ذوالفقار علی خاں مست، کلکتہ میں مصنف کے ہم عصر شاعروں کا تذکرہ۔ اس کا ایک ہی نسخہ برلین کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

۴۸۔ تذکرہ دلگشا۔ از علی اکبر شیرازی۔ فتح علی اکبر شیرازی۔ فتح علی شاہ کے عہد کے شاعروں کا تذکرہ (تیرہویں صدی) طبع مدراس۔

۵۰۔ مجمع الفصحاء۔ آخری مشہور عام تذکرہ، از رضا قلی خاں ہدایت، دو جلد (تیرہویں صدی کا آخری زمانہ) طبع طہران۔

۵۱۔ ریاض العارفین۔ از رضا قلی خاں ہدایت، طبع طہران۔

(ب) تاریخ ادبیات ایران سے متعلق اہل یورپ کی مشہور ترین تصانیف

۱۔ تاریخ ادبیات ایران۔ از پروفیسر اڈورڈ براؤن، چار جلدیں، عہدِ قدیم سے عصرِ حاضر تک ۱۹۰۲ء تا ۱۹۲۴ء

A. Literary History of Persia By E. G. Brown

4 Vols. (1902-1924)

۲- تاریخ ادبیات ایران - از ہرمان اتہ -

Neupersische Litteratur

Von Hermann Ethe

یہ کتاب اصل میں "فقہ اللغۃ ایران" یعنی *Grundriss der iranischen Philologie* کا ایک مضمون ہے جو اشتراسبرگ جرمنی سے ۱۸۹۶ - ۱۹۰۴ میں شائع ہوئی یہ مضمون الگ کتابی صورت میں بھی چھپ چکا ہے -

۳- برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست - ۳ جلدیں، اور ایک اشاریہ،

A Catalogue of Persian MSS.

in the British Museum 4 Vols.

By Rieu, London, 1879-1895

ان تین مشہور اور اہم کتابوں کے سوا ایتالو پیزی *Italo Pizzi* کی کتاب ادبیاتِ ایران بھی بہت اہم کتاب ہے - ان مستقل تصانیف کے سوا یورپ کے عالموں نے مختلف شاعروں کے حالات پر محققانہ مضامین اور مقالے بھی لکھے ہیں - ان میں منوچہری کے کلام پر کازیمیرسکی کا مقدمہ، انوری سے متعلق ژوکووسکی کی تحقیقات، خیام کے بارے میں کرسٹن سن کے مطالعات، خاقانی کے بارے میں ژوکووسکی اور خانیکوف کی تحقیقات، نظامی کے بارے میں باخر کے ملاحظات، سعدی پر ماسہ کی معرکۃ الآرا کتاب وغیرہ ان کی چند مثالیں ہیں۔ اس قسم کی تحقیقات میں ایک اور اہم کتاب پروفیسر نلدکے کی کتاب ایران کی رزمیہ شاعری ہے، جس میں فردوسی اور شاہنامہ کا گہرا مطالعہ پیش کیا گیا ہے - کتاب کا نام ہے:

Das Iranische Nationalepos

Von Th. Noeldeke.

انڈکس

اشخاص

ا

د

ش

ص

غ

۲- کتب

آ

ج

چ

ح

MAKTABA JAMIA LTD

مکمّل لغات القرآن

(چھ جلدوں میں)

قرآن کریم کے الفاظ کی شرح اور اُس کے معانی و مطالب کے حل کرنے اور سمجھنے کے لئے اُردو میں اس سے بہتر اور جامع کوئی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس عظیم الشان کتاب میں الفاظ قرآن کی مکمل اور دل پذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ بحثوں کی تفصیل بھی ہے۔ ایک مدرس اس کتاب کو پڑھکر قرآن مجید کا بہترین درس دے سکتا ہے اور ایک عام اُردو خواں اس کے مطالعہ سے نہ صرف قرآن شریف کا ترجمہ بہت اچھی طرح کر سکتا ہے بلکہ اس کے مضامین کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے، اور اہل علم و تحقیق کے لئے اس کے علمی مباحث لائق مطالعہ ہیں" لغاتِ قرآن" کے ساتھ الفاظ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے بڑی سہولت سے نکالے جا سکتے ہیں۔"مکمل لغات قرآن" اپنے انداز کی لاجواب کتاب ہے جس کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

جلد		صفحات	تقطیع	غیر مجلد	مجلد
جلد اوّل	صفحات	۳۳۴	بڑی تقطیع	غیر مجلد چار روپے آٹھ آنے	مجلد پانچ روپے آٹھ آنے
جلد دوم	〃	۳۳۶	〃	غیر مجلد پانچ روپے	مجلد چھ روپے .. ..
جلد سوم	〃	۳۳۲	〃	غیر مجلد پانچ روپے	مجلد چھ روپے - ..
جلد چہارم	〃	۳۸۶	〃	غیر مجلد پانچ روپے	مجلد چھ روپے .. ..
جلد پنجم	〃	۵۰۰		غیر مجلد چھ روپے آٹھ آنے	مجلد سات روپے آٹھ آنے
جلد ششم	〃	۳۲۴		غیر مجلد چار روپے آٹھ آنے	مجلد پانچ روپے آٹھ آنے

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۲۱۲)

مکتبۂ بُرہان اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶۔

بابا

خشنہ

خشنہ کا خشیع ہو جاتا ہے

[illegible]

"نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے ہم نہ ادھر کے رہے"
اگر ادھر جیتے رہے پھر بھی انتظار رہا -

جس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی -